UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224081
UNIVERSAL
LIBRARY

جملہ حقوق محفوظ

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی، ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے۔ اسلئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

تعداد اشاعت ۵۲۰۰

ایڈیٹر

حکیم محمد یوسف حسن

قیمت فی پرچہ پانچ آنہ ۔ ویلیو بک سٹال پر ۶ر ۔ سالانہ چندہ معہ محصول ڈاک و خرچہ وی پی ۷ر ۔ ممالک غیر سے ۸ شلنگ

نیرنگِ خیال

"ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا"

Checked 1978

فہرست مضامین

سنہ ۱۹۲۴ء و سنہ ۱۹۳۰ء	از ایڈیٹر	۲
✓ قرآنی کے اخلاق و عادات		۵
	از جناب محمد عبدالقوی صاحب ایم اے علیگ لکھنؤ یونیورسٹی	
ر ناٹنٹ ایڈیٹر	مفتی غلام جعفر صاحب بی اے	۸
✓ علی گڑھ سے ٹورنٹو	از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے	۱۲
	پروفیسر شاستری کالج ۔ ٹورنٹو (جنوبی افریقہ)	
آرٹ کا ایک مجسمہ	از جناب محمد عطاء الرحیم صاحب بی اے ال ال بی علیگ	۱۷
نپولین کی سماجی کمزوریاں	از جناب منظور رسروش ۔ مولوی فاضل بھوپال	۲۰
پُراسرار مصری رومال	خواجہ عبدالکریم صاحب ایم ۔ اے	۲۷
میر باقر حسین مرحوم	از کنور محمد یٰسین علی خاں صاحب	۳۰
کاہلی	از جناب شرف الدین احمد صاحب بی اے علیگ	۳۵
ایکٹرس	بدرالدین صاحب بدر	۳۷
کاش میں حسین ہوتی	محترمہ قدسیہ بیگم لکھنؤ	۴۱
گمشدہ ستارے	جناب عتیق اللہ خاں بی ۔ اے ۔ علیگ	۴۴
مآل سوز (نظم)	جناب اختر انصاری دہلوی	۴۵
فیڈریشن سے کیا مراد ہے؟	مترجم	۴۶
حصۂ نظم:۔		
تجلیات ظفر	جناب ظفر ہاشمی مدیر چغتائی	۵۰
آبِ رواں	جناب اختر انصاری دہلوی	۵۱
ماتا کی تڑپ	از جناب سید کاظم صاحب نشتر لکھنوی	۵۲
تاثرات	حضرت فگار کے قلم سے	۵۳
گلبانگِ عمل	از جناب آزاد انصاری (مالیگاؤں)	۵۴
غزلیات باندازِ قدیم	رامپور کے دو شاعروں کا کلام	۵۵
انتخاب	مختلف شعراء کا کلام	۵۶
نقد و نظر	م ۔ و ۔ ت	۵۷
اخبار علمیہ		۵۸
اشتہارات		۶۱ سے ۷۲

کمرہ [illegible] محمد یوسف [illegible] حکیم محمد یوسف حسن نے دفتر نیرنگ [illegible]

نیرنگِ خیال

۱۹۲۴ء ——— ۱۹۳۰ء

۱۹۲۴ء کا نیرنگ خیال

جولائی ۱۹۲۴ء میں "ہندوستان کے اس مشہور و مقبول" رسالہ نیرنگ خیال کا پہلا نمبر شایع ہوا تھا۔ جس کے مقالۂ افتتاحیہ کے صفحہ ۴ پر ہم نے نیرنگ خیال کے متعلق مندرجۂ ذیل سطور شایع کی تھیں +

"ہم نے نیرنگ خیال کا اجراء اردو ادبیات میں اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے کیا ہے۔ ہمارا مدعا قوم کے احاطہ نظر کو وسعت دینا ہے۔ اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ مہذب دنیا کے ہر شعبۂ خیال کو ادبی لباس میں پیش کیا جائے۔ معاشرتی۔ مذہبی تعلیمی۔ تاریخی غرض ہر قسم کے مضامین ہونگے۔ مگر اس تنوع کے ساتھ ساتھ ایک مقصد وحید ہر وقت پیش نظر رہے گا۔ کہ ہر مضمون ایک ادبی تحریر ہو ——— ان تمام خصوصیات کے ہوتے ہوئے ہمارا رسالہ دنیا بھر کے رسایل سے ارزاں ہے۔ ہم اسے تجارتی فواید کے لئے نہیں چلا رہے۔ مگر ہم تجارتی اصولوں کے پابند رہیں گے۔ تاکہ اس رسالہ کی زندگی ایک رقص شرر ثابت نہ ہو۔ ہم نے مستقل سرمایہ سے کام کرنا شروع کیا ہے۔ اور اگر قوم نے ہماری مدد کی تو یہ رسالہ ایک سنہری خواب سے خوشتر حقیقت ثابت ہوگا۔ ہم اپنی خصوصیات کا مختصر اعادہ کرتے ہیں :-

(۱) ہم مستقل سرمایہ سے کام کر رہے ہیں۔ اس لئے نیرنگ خیال کے قبل از وقت بند ہو جانے کا ذرہ برابر بھی خطرہ نہیں +

(۲) ہمارے مضامین قومی احاطۂ نظر کی توسیع کے لئے ملک کی ہر ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہونگے +

(۳) لکھائی چھپائی اور کاغذ کی نفاست کا خیال رکھا جائے گا۔ ہر نمبر اس کے بعد کسی پہلو سے بھی گھٹیا نہ ہوگا +

(۴) ہمارا رسالہ ایک مصور رسالہ ہوگا۔ ہر ماہ ایک بلاک کی تصویر ہوگی۔ اور ایک خصوصیت مرقع الاخبار ہوگی یعنی واقعات حاضرہ کے متعلق تازہ ترین فوٹو ہم پہنچائے جائیں گے +

(۵) رسالہ کی ایک خصوصیت پابندیٔ وقت بھی ہوگی +

ہنوز ہم نفسے درچمن نے بینم بہارے رسید و من گل نخستینم"

یہ ہے وہ تحریر جو نیرنگ خیال کے پہلے نمبر میں شایع ہوئی تھی۔ کون جانتا ہے کہ وہ ساعت کتنی سعید ہوگی جس میں مندرجہ بالا خیالات جو برسوں کی ادبی اُمنگوں کا عکس تھے صفحۂ قرطاس پر نمایاں کئے گئے تھے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ اس تحریر کا لفظ لفظ صداقت سے لبریز تھا۔ اور آج سات سال کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ جولائی ۱۹۲۴ء میں نیرنگ خیال نے جو پروگرام پیش کیا تھا اس پر آج تک کتنا عمل ہوا ہے۔ اور ان درمیانی چھ سالوں میں نیرنگ خیال نے ترقی کی کتنی منزلیں طے کی ہیں۔ اس کا اندازہ قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں +

سید مبارک علی شاہ گیلانی مالک گیلانی پریس لاہور نے ہمارے گذشتہ سالنامہ کو دیکھ کر کہا تھا کہ نیرنگ خیال کے سالنامہ اور دیگر رسایل کے۔ الناس

ہیں یہ فرق ہے کہ نیرنگ خیال کا سالانہ اُس کے اعلانات کی روشنی میں زیادہ درخشاں نظر آتا ہے۔ اور باقی رسایل کے سالانہ اُن کے اعلانات کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت گھٹیا ہیں۔ اگر اعلانات اور پروگرام کی اشاعت کے بعد عملی کام کا نمونہ پیش کرکے کسی نے واہ واہ حاصل کی ہے تو وہ ہندوستان میں صرف ایک اور یقیناً ایک ہی رسالہ ہے۔ اور وہ نیرنگ خیال ہے +

بہت سے رسایل بلند بانگ دعوے پیش کرتے ہیں۔ بہت سے رسایل انقلابی پروگرام کے اعلانات سے کانوں کے پردے پھاڑتے ہیں۔ لیکن دنیا دیکھ لیتی ہے کہ فرسودگی اور بیچارگی۔ تہی دستی و کم مائگی کے سوا وہ اس بازار میں کوئی جنس پیش نہیں کرسکے۔ ہزاروں روپے کا خسارہ اُٹھاتے ہیں۔ نصف قیمت پر اپنی "متاعِ عزیز" بیچتے ہیں۔ لیکن وہ اُس اقدام اور عزت کا ہزارواں حصّہ بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ جو نیرنگ خیال کو حاصل ہے +

جولائی ۱۹۲۴ء میں نیرنگ خیال کا پہلا نمبر شایع ہوا تھا۔ اگر وہ آپ کے پاس موجود ہو تو اسے اس دوسرے نمبر کے بالمقابل رکھ کر دیکھئے۔ جولائی کا پرچہ ۵۶ صفحوں پر مشتمل تھا جس میں ۵۰ صفحے معمولی کے تھے۔ مرقع الاخبار ریتھو کی دستی (ہوندی) تصاویر کا نمونہ تھا۔ البتہ اسی آرٹ پر فوٹو بلاک کی صرف ایک رنگین تصویر یہ کتابت اوسط درجہ کی تھی۔ ٹائٹل گلابی رنگ کا اور ریتھو پر چھپا ہوا تھا۔ مضامین میں جناب ریاض حسین صاحب بی۔ اے کا مضمون ذاتی نشوونما۔ حضرت عمر بن عاص پر ایک مضمون خلط محمد سلم صاحب جہلم۔ مخترمہ بلقیس خاتون جمال کا افسانہ عصمت کی دیوی۔ ترکوں کی معاشرت پر ملک عبدالقیوم صاحب بی۔ اے کا مضمون جس معلومات پر مولانا عبدالشکور کا ایک مقالہ۔ حضرت چغتائی کے دو ادبی جواہر پارے (مجازی شراب اور راوی) حضرت ظہیر بدایونی کی ایک غزل۔ خلف اقبال بقلم حضرت تاثیر ایم اے کا ایک تحقیقانہ مضمون موجود ہیں۔ یہ تھی مختصر سی ابتدا جس سے ہم ہندوستان کے ادبی رسایل میں زندگی اور زندہ دلی کی لہر دوڑانے کے لئے میدانِ عمل میں نمودار ہوئے تھے۔ اور وہ تھا ہمارا نصب العین اور پروگرام جس کو ہم مضمون کی ابتدا میں نقل کرچکے ہیں +

اب دیکھئے زیرِ نظر نمبر کو سائز کے اعتبار سے اُس سے دوگنا ہے۔ اس کے ہر صفحہ میں بڑے سے بڑے صفحہ کے برابر مواد موجود ہے۔ حروف بھی زیادہ ہیں۔ اور سطریں بھی زیادہ ہیں۔ ہمارے ایک محتاط اندازہ کے نتائج مختلف رسایل کے حروف شمار کرکے نکالے ہیں۔ کتابت ایسی ہے کہ بیشتر رسایل ہمارے خوشخط کاتب کو چرا لینے کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ سائز کے ۶۰ صفحوں میں تیرہ سائز کے ۹۰ صفحات کے برابر مضامین درج ہوتے ہیں۔ اشتہارات کے صفحے صرف ۱۲ ہیں اور خدا کرے کہ یہ بڑھتے رہتے اگر بڑی رسایل کی طرح سو دو سو ہو جائیں۔ لیکن اس کا اطمینان رکھئے کہ ہم دوسرے رسایل کی طرح اشتہارات کے صفحوں پر مضامین کے صفحات زبان نہیں کریں گے۔ اس کا ٹائٹل آرٹ کے کاغذ پر دو رنگوں میں چھپا ہے۔ اور انشاء اللہ ہر شمارہ ہی پر ٹائٹل بدلتا رہے گا۔ تاکہ تنوع قایم رہ سکے۔ تصاویر میں سے ایک سہ رنگ ہے۔ اور صحیح معنوں میں آرٹ کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ دو آرٹ کی اور تصویریں ہیں۔ مرقع الاخبار یا تصویر افکار کے یہ عنوان پانچ چھ بلاک میں۔ جو واقعات کی رفتار کو مصوّر صورت میں پیش کررہے ہیں۔ ہمراہ اس قسم کا یا اس سے بہتر رسالہ پیش کرنا سہل اور فوائد ہوگا۔ کیونکہ ہم جو قدم اُٹھاتے ہیں وہ پیچھے نہیں ہٹایا کرتے۔ اور چندہ میں نہ تو بعض رسایل کی طرح کساد بازاری کی وجہ سے کمی ہوگی نہ مالی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیشی کا ہوگا۔ بس وہی سوا تین روپے سالانہ +

مضامین کے اعتبار سے دیکھئے تو نیرنگ خیال کا ہر معمولی نمبر اکثر رسایل کے خاص نمبروں پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ مولانا عبدالقوی ایم اے کا مضمون قرآنی کے اخلاق و عادات پر ایک علمی مقالہ ہے جسے ارباب ذوق دلچسپی سے پڑھیں گے۔ مفتی غلام جعفر صاحب بی اے نے نائٹ ایڈیٹر پر جو کچھ مزاحیہ رنگ میں لکھا ہے۔ وہ ہندوستان کے اخباری حلقوں میں مزے لے لے کر پڑھا جائے گا۔ جناب عبدالشکور صاحب ایم۔ اے سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو نیرنگ خیال کے قدیمی معاون ہیں۔ جنوبی افریقہ کے شاہی کالج کی پروفیسری پر تشریف لیگئے ہیں۔ آپ نے مجھے نہیں نیرنگ خیال کے ناظرین کو مخاطب کرکے یہ مضمون "مائی ٹو نیرنگ خیال" سے شروع کیا ہے۔ نیرنگ خیال کے ناظرین اس سفر کے دلکش تاثرات کا لطف اُٹھا کر بیحد مسرور ہونگے۔ ہم سیر و سیاحت کے مضامین شایع کرنے کے بیحد خواہشمند ہیں۔ اور اس سلسلہ میں گذشتہ چھ سال میں چھ سات مضمون شایع بھی کرچکے ہیں لیکن ابھی ہمارا مقصد پورا نہیں ہوا۔ سال بھر میں کم از کم چار مضمون تو

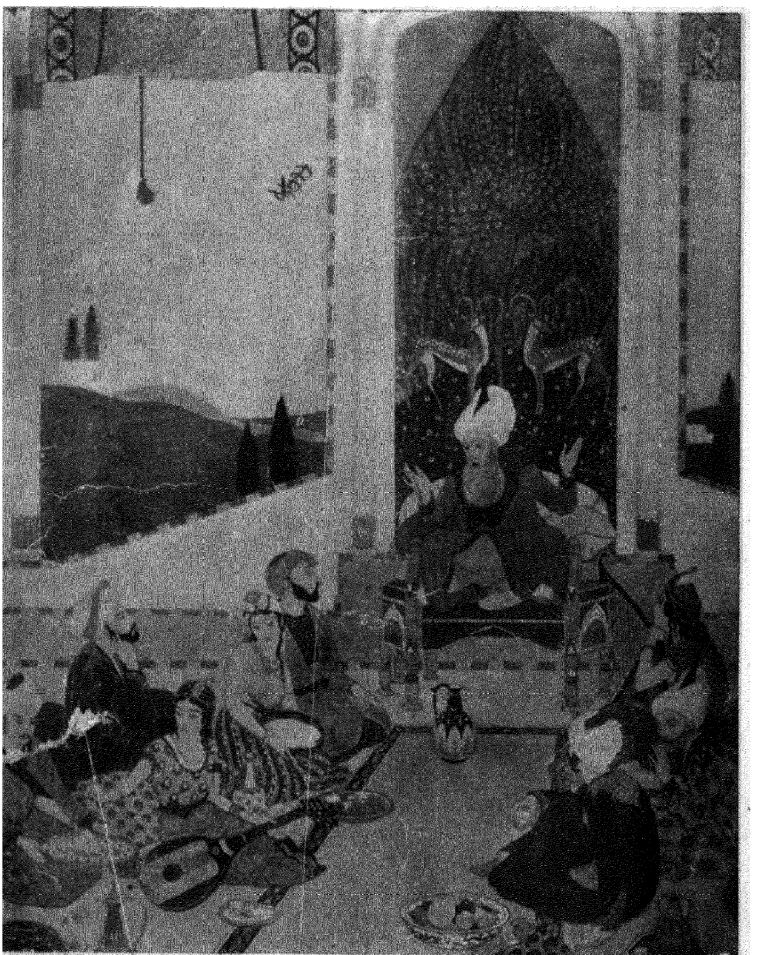
اس عنوان کی تحت میں ضرور ہی شایع ہونے چاہئیں۔ انگریزی رسایل کے ہر نمبر میں اس قسم کا کوئی نہ کوئی مضمون ضرور شایع ہوتا ہے۔ اُردو داں طبقوں کو اس جانب خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے۔ جناب محمد عطاء الرحیم صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے چیخوف کے افسانہ کا ترجمہ بھیجا ہے۔ جو آرٹ کے ایک مجسمہ کے عنوان سے شایع کیا جا رہا ہے۔ بعض اصحاب اس سے پیشتر بھی اس افسانہ کو اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن جس خوبی سے جناب محمد عطاء الرحیم صاحب نے پیش کیا ہے یہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ نیرنگ خیال کے افسانے پست یا حسن عشق کی بے معنی داستانوں سے لبریز نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن میں انسانی تخیل کی بلند پروازی۔ انسانی معاشرت کی اندرونی جھلک۔ پلاٹ اور نتیجہ کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ پُراسرار رومال ایک دوسرا افسانہ ہے جو خواجہ عبد الکریم صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ اس میں مصری روایات اور توہمات قدیم کے تاثرات نہایت خوبی سے نمایاں کئے ہیں۔ گمشدہ ستارے ایک ادبی افسانہ ہے جو آسکر وائلڈ کے رنگ میں لکھا ہوا ہے۔ اصل میں یہ کیٹلس منڈیز نامی ایک فرانسیسی مصنّف کا شاہکار ہے۔ جسے ایک نوجوان ادیب جناب عتیق اللہ خاں مگدبی اے نے لکھا ہے۔ نیرنگ خیال نے جستہ جستہ نئے ادیب روشناس کرائے ہیں اُن میں مکیہ صاحب انشاء اللہ نمایاں حیثیت حاصل کریں گے۔ آئندہ نمبر میں آپ کا ایک دلچسپ مضمون شایع کرنے کا ارادہ ہے۔ افسانوں کے علاوہ ایک ایکٹ کا ایک ڈرامہ جناب بدرالدین صاحب بدؔ نے لکھا ہے۔ جو نیرنگ خیال کے اوّلین معاونین میں سے ہیں۔ مشہور آسٹرین مصنّف مولنر نے جرمن زبان میں یہ ڈراما لکھا تھا۔ عورت کی فطرت کا سادہ اور چرتر دونوں پہلو اس ڈراما میں نہایت خوبی سے دکھلائے گئے ہیں۔ "کاش میں حسین ہوتی" محترمہ قانسیہ بیگم صاحبہ نے لکھنؤ سے بھیجا ہے۔ ایک معاشرتی مضمون ہے۔ جو بیحد دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ہم محترمہ قدسیہ بیگم سے درخواست کریں گے کہ وہ آیندہ بھی اپنے رشحات قلم سے نیرنگ خیال کو مزیّن کرتی رہیں گی۔ تاریخی مضامین میں سے جناب منظور سروش نے دنیا کے نامور ترین جنرل نپولین کی سماجی زندگی پر جو روشنی ڈالی ہے وہ تاریخی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں سے دلچسپ ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے بہادر بھی اپنی سماجی زندگی میں کمزوریوں کا کتنا خوفناک مرقع ہوتے ہیں +

مشاہیرِ ہند سے میر باقر حسین مرحوم پر کنور محمد یٰسین علی خاں کا مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔ سیاسیات کی تحت میں نیڈریشن (صوبوں کی اندرونی آزادی) کا مضمون خاص توجہ سے پڑھا جائے گا۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین صوبوں کی آزادی کی دو مختلف صورتوں کو دیکھ کر اندازہ کر سکیں گے کہ اُن کے لئے کس قسم کی فیڈریشن مفید ہو سکتی ہے۔ جناب شرف الدین احمد صاحب بی۔ اے عظیم آبادی نے کاہلی پر جس پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قادر الکلام ادیب دنیا کے جس عنوان پر چاہے کامیابی سے لکھ سکتا ہے +

اس کے علاوہ نظمیں ہیں۔ ریویو ہیں۔ معلومات ہیں۔ اور دنیا کے نامور ترین ادیبوں کے دلچسپ ادبی جواہر پارے ہیں جنہیں "ادب لطیف" کہا جاتا ہے لیکن نیرنگ خیال خانہ پُری کے لئے دنیا کی بیس زبانوں سے واہیات اور بے معنی چیزیں دو تین صفحوں میں چھپ کر نہیں پسند نہیں کرتا۔ وہ جگہ جگہ کالرج۔ اور شیکسپیئر۔ سروجنی نیڈو اور ٹیگور اور اسی قسم کے بلند پایہ ادیبوں کے جواہر پارے درج کرتا ہے۔ جو الفاظ کے گورکھ دھندے کے علی الرغم معانی و نتائج کے لحاظ سے زیادہ وقیع ہوتے ہیں +

ایڈیٹر نمبر کی کامیابی پر جو کچھ احباب اور ناظرین نیرنگ خیال نے لکھا ہے۔ اُس کا فرداً فرداً جواب دینا میرے احاطۂ اختیار سے باہر ہے۔ ہر شخص تعریف کے پُل باندھ رہا ہے۔ مبارکبادیں دی جا رہی ہیں۔ اور اس معمولی سے نمبر کو ہر پہلو سے کامیاب کہا جاتا ہے۔ میں تمام احباب اور قابل نظر کا مشکور ہوں۔ کہ اُنہوں نے میری مساعی کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ لیکن سب سے بڑا معرکہ ابھی ہمارے سامنے ہے۔ وہ سالنامہ ہے۔ ہم ہر سال کوشش کرتے ہیں کہ اپنے گذشتہ نمبر کو شکست دیں۔ اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پچھلے سال کا سالنامہ اتنا اچھا تھا کہ اس کو شکست دینے کے لئے خاص جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام ہر طرح سے میری مدد کریں گے۔ اتنا میں ابھی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں گذشتہ سالنامہ کو جیت چکا ہوں۔ انشاء اللہ اُس سے بہتر چیز پیش کرونگا +

ایڈیٹر



سلاد باد جہازی (الف لیلہ) کا جشن

قاآنی کے اخلاق وعادات

(از جناب محمد عبدالقوی صاحب ایم اے (علیگ) لکھنؤ یونیورسٹی)

قاآنی کے تفصیلی حالات اس وقت تک کسی سوانح نگار نے قلم بند نہیں کئے ہیں۔ اور نہ اس کی کوئی مکمل سوانح عمری موجود ہے۔ جو کچھ بھی اس کے حالات ہم تک پہنچے ہیں وہ کچھ تو تذکرہ نویسوں کی جستجو کا نتیجہ ہیں اور کچھ اس کی کتاب پریشاں میں جا بجا خود اُس نے لکھ دیئے ہیں یا اشارتاً اور کنایتاً اُس کی کلیات میں پائے جاتے ہیں +

سادگی

اکثر تذکرہ نویسوں کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ قاآنی نہایت پرگو علیم الطبع خوش مزاج اور نیک دل تھا۔ شان[1] و شوکت کے سامان مہیا ہونے کے باوجود سادگی اُس کا خمیر تھی۔ اور فروتنی اُس کی طبیعت ثانیہ۔ اکثر بازاروں میں اس طرح نکل جاتا تھا کہ عوام دیکھ کر بھی پہچان نہ سکتے تھے کہ یہ شخص حسان العجم۔ مجتہد الشعرا اور ملک الشعرا حکیم قاآنی ہے۔ یا کوئی متمول آدمی +

کریم النفسی اور مہمان نوازی

ایک[2] مرتبہ شیراز کے بازار میں ایک بڑھیا نے قاآنی کی ظاہری شکل و صورت دیکھ کر کہ ایک چیچک رو شخص جو معمولی لباس پہنے چلا جا رہا ہے بس سے کہا۔ کہ اے بندۂ خدا میں نے یہ سامان خریدا ہے۔ میں بوڑھی اور کمزور ہوں اس بوجھ کو گھر تک نہیں لے جا سکتی۔ اگر تو مزدور ہے تو مزدوری پر نہیں تو برائے خدا یہ سامان میرے گھر پہنچا دے۔ قاآنی نے فوراً اُس کا سامان اُٹھا لیا۔ دو چار قدم گیا ہوگا۔ راہگیروں نے جھپٹ کر اُس سے اسباب چھین لینا چاہا۔ اور حال معلوم ہونے پر بڑھیا کو ڈانٹا۔ بڑھیا بھی قاآنی کو پہچان کر اُس کے قدموں پر گر پڑی۔ اور معافی مانگنے لگی۔ مگر قاآنی نے ایک نہ مانی اور حاضرین کو مخاطب کر کے صاف کہہ دیا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی اس کام میں مانع ہوا تو زندگی بھر اُس سے نہ بولوں گا۔ بڑھیا کا سامان اُس کے گھر تک پہنچا دیا۔ اور اُسی دن ایک لونڈی اور ایک غلام بڑھیا کے لئے خریدے اور جب تک وہ زندہ رہی اُس کے کل مصارف کا کفیل رہا +

۱۲۴۸ھ[3] میں جب مشہد مقدس میں ایسی شدید بارش اور برف باری ہوئی تھی کہ امیر و غریب سب بے حال ہو گئے تھے۔ اور غیر معمولی سیلاب کی وجہ سے ایک ایک روٹی کو ترستے تھے۔ قاآنی کی مہربانی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس موقع پر اُس نے ایک قطعہ کہا تھا۔ ملاحظہ ہو:-

اکنوں کہ در رزق کشودہ است خداوند — انصاف نباشد کہ تو بر خلق ببندی
بر حالتِ خود گریہ کنی روز قیامت — بر حالِ تہیدست گرامروز نخندی

شوخی اور ظرافت

متانت اور سنجیدگی کے ساتھ قاآنی میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ چنانچہ ایک قطعہ میں دو ہکلوں کا مکالمہ اُنہیں کے لہجہ میں نظم کیا ہے۔ جس کی نظیر دوسرے شعراء کے کلام میں شاید ہی ملے۔ ایک بوڑھا اور ایک نوجوان وہ بدقسمتی سے ہکلے تھے۔ باہم ملے اور اس طرح پر لطف گفتگو ہوئی:-

پیر کے لال[4] سحرگاہ بہ طفلے الکن[5]
می شنیدم کہ بدیں نوع رہ آموخت سخن
کاے زدلفت مشعشعیم مشوش ہمہ ریک
وے زہجرت مشوشاغم مشعشعیم روشن

[1] نفحات قاآنی۔ مقدمہ۔ مطبوعہ جمل المتین پریس۔ بمبئی سنہ ۱۹۰۱ء [2] نفحات قاآنی۔ مقدمہ۔ مطبوعہ جمل المتین پریس +

[3] کتاب پریشان صفحہ ۱۹۔ ۲۰۔ مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۲۶۶ھ

[4] گونگا۔ مراد ہکلا۔ [5] ہکلا +

ہستیتر یا کیم و از شش شہد لذت
صد صبر و شکیبائم زرزفت از شتن

طفل گفتا ممکن را تو تقلید مکن
مگنگم شنو زہرم اے گگنستر ازنن

میخواہی ممشتے بکلامت بزنم
کہ بیفتد ممغزت میان دو دہن

پیر گفتا وو واللہ کہ معلوم است ایں
کہ کہ زادم من بیچارہ زمادر الکن

ہہہفتاد و ہہشتاد و سہ سال است فزوں
گگگنگ و للالم بہ خلاق زمن

طفل گفت نخدا را عصصنہ بار شکر
کہ بر رستم بجاں از للال و محن

ممکن ہم گگگنگم ہمثل تو شتو نا
تو شتو ہم گگگنگی ہمثل ممکن نا

جس زمانہ میں راقم الحروف مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں طالب علمی کی دلچسپ زندگی بسر کر رہا تھا اپنے بعض احباب سے اُردو کا بھی ایک شعر اسی صنعت میں سنا تھا جو بغرض تفنن طبع پیش کیا جاتا ہے :-

ہہجر میں تمہارے پہنچک گیا کلیجہ
ممممد تیں ہی گذریں ہہاں تم نہ آئے

قاآنی[۵] ایک جگہ لکھتا ہے کہ میرے ایک دوست نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ فلاں شاعر جب کسی کی مدح محرّر ہے تو اشعار کے ساتھ ایک طشت شکر کا بھی بھیجتا ہے۔ میں نے بے ساختہ جواب دیا "تا شعرش شیریں نماید"

عام چال چلن

فی زمانہ اکثر دیکھا جاتا ہے۔ کہ جب کبھی کوئی کسی شخص کی سوانح حیات پر قلم اُٹھاتا ہے۔ تو خواہ اُس میں کتنی ہی بُرائیاں کیوں نہ ہوں وہ حتی الامکان اپنے قلم کی روانی سے اُس کے سیاہ اعمالنامہ کو اسقدر دھوتا ہے کہ فرشتوں کو بھی اُس کی پاکدامنی پر رشک آتا ہے۔ اور وہ اس طرح نہ صرف اپنے فرض کی ادائگی سے قاصر رہتا ہے۔ بلکہ مدحت سرائی کا فرض انجام دیتا ہے۔ متذکرہ[۵] نویسوں نے اس کی کوشش کی ہے۔ کہ قاآنی کو سعدی۔ جامی۔ نظامی اور مولانا روم جیسے پاک نفس صوفیائے کرام کی طرح پاکباز اور مقدس ثابت کریں۔ مجھے حیرت ہے کہ اگر یہ حضرات سوانح قاآنی کی جستجو کی زحمت گوارا کرتے۔ اور اُسکے چال چلن سے کچھ بھی واقف ہونے کی کوشش کرتے تو ہرگز اس کی جرأت نہ کرتے کہ سعدی جامی اور مولانا روم جیسے پاک باطن صوفیائے کرام سے اس کا تقابل کریں۔ قاآنی سے ان پاکباز حضرات کا تقابل کرنا گویا اخلاق حمیدہ کا خون کرنا ہے +

قاآنی ایک رند مشرب شخص ہے۔ اپنے افعال میں آزاد ہے اور اخلاقی پابندیوں سے مستغنی۔ پروفیسر[۵] براؤن اس کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "عہد جدید کے شعرائے ایران میں سب سے بڑا اور بلحاظ اخلاق ارذل ترین قاآنی ہے" +

قاآنی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے افعال و خیالات کی پردہ پوشی نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اور جس ماحول میں جس طرح اُس کی زندگی بسر ہوتی ہے اُس کا علی الاعلان اظہار کرتا ہے۔ وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ اخلاقی دنیا میں اس کی نسبت کیا کہا جائے گا +

ہم اس سلسلہ میں خود اُسی کی زبانی نمونتاً چند ذیل کے واقعات نقل کرتے ہیں جن سے کسی حد تک اُس کی رندی اور ہوسناکی کا اندازہ ہو سکیگا

رندِ مشربی اور بوالہوسی

قاآنی کو شراب سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ جس کا وہ علانیہ اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ ایک[۵] جگہ کہتا ہے اور دیکھئے کس جوش کے ساتھ کہتا ہے جس سے از سر تا پا مستی ٹپکتی ہے :-

من از شراب میخورم ببانگ کوس میخورم
ببارگاہ تہتمتن ببزم طوس میخورم
پیالہ ہائے دہ منی علی الرؤس میخورم
شراب گیر می چشم مئے مجوس میخورم
نہ جوگیم کہ خوکنم ببرگ کو کنار ہا نا

---

[۱] موجودہ ام یونیورسٹی۔ [۲] کتاب پریشان صفحہ ۲۰ مطبوعہ بمبئی + [۳] انتخاب کلیات حکیم قاآنی صفحہ ۹ مطبوعہ کریمی پریس لاہور۔ [۴] منتخبات قاآنی۔ مقدمہ۔ مطبوعہ جمل المتین پریس لکھنؤ
[۵] تاریخ ادبیات فارسی۔ صفحہ ۱۱۰۔ جلد چہارم۔ براؤن + [۶] دیوان قاآنی منتخبہ صفحہ ۳۵۱۔ [۷] پوستہ +

قاآنی نے کتاب پریشاں[۱] میں ایک علوی زادہ کی حکایت لکھی ہے جو اُس کا شاگرد بھی تھا۔ اسی حکایت کے ضمن میں لکھتا ہے:-

سحر گاہان پیش از انکہ خروش خروس و نفیر کوس برخیزد باقدحے
بادہ ببالین علوی زادہ رفتم ..... گفتم اے عزیز خواب نوشین
بس است۔ خمار دوشیں را چارہ کن ..... گفت بجان عزیزاں
سوگند کہ تا عمر دارم شراب نہ نوشم و جز در کسب کمال نکوشم
اشکش از آستین پاک کردم و گفتم۔ قطعہ

مے بخور لیک با بداں منشیں ور نہ روزے کنند بدنامت
لاجرم چوں ہمی شدی بذام کے زنیکاں روا شدے کامت
بادۂ تلخ خور بشیرینی تا کہ شیریں شود ازو جامت

باوجود[۲] اس کے کہ قاآنی کے اہل وعیال موجود تھے۔ اُس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ مگر جب اس کو اپنے اہل وعیال یاد آئے۔ محض اس عذر پر کہ وہ اس کے نان ونفقہ کا انتظام نہ کر سکتا تھا۔ اس نے اُس کو ایک ہفتہ کے بعد چھوڑ دیا۔ حالانکہ لڑکی اس سے کسی طرح علیحدگی نہ چاہتی تھی۔ بہت روتی تھی اور ہر طرح اُس کے ساتھ بسر کرنے کو تیار تھی۔

ابن الوقتی

دنیا میں احسان فراموشی اور نمک حرامی سب سے بڑا اخلاقی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قاآنی کو اس کا ذرا پاس و لحاظ نہ تھا۔ جس شخص کی شان میں وہ آج قصیدہ خوانی کر کے فصاحت و بلاغت کی گنگا جمنا بہاتا تھا۔ کل اُسی شخص کی توہین و تذلیل کرنے میں اُسے مطلق پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ اُس میں بلند خیالی اور اعلیٰ اصولوں کا فقدان تھا۔ جب کوئی شخص کسی اعلیٰ منصب پر پہنچ جاتا اور صاحبِ اختیار ہوتا وہ اُس کی خوشامد اور مدحت سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ مگر جب وہ معتوب ہو کر شاہی نظروں سے گر جاتا تھا۔ تو قاآنی بھی طوطے کی طرح فوراً آنکھیں بدل لیتا تھا اور نہایت ذلیل ہجو اور فحش الفاظ لکھ کر اُس کی دھجیاں اُڑاتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا پورا ابن الوقت تھا۔ اکثر قصیدوں میں اُس نے محمد شاہ قاچار کے وزیر اعظم حاجی میرزا آقاسی کے محاسن اور عدل و انصاف کے ترانے گائے ہیں۔ لیکن جب وہ منصب وزارت سے علیحدہ ہو گیا۔ تو اُس کے جانشین میرزا تقی خاں امیر کبیر کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر اسی حاجی میرزا آقاسی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے:-

بجائے ظالمے شقی نشستہ عادلے تقی
کہ مومنانِ متقی کنند افتخارہا

یہ ظالم شقی وہی حاجی میرزا آقاسی ہے جس کی شان میں قاآنی کا وہ مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

دو قلاع کفر عہ باہم مصاحب
یکے تیغ خسرو یکے ملک صاحب

فحاشی

قاآنی فحش گوئی میں نہایت بیباک تھا۔ اُس کی یہ مخرب اخلاق شاعری اور فحش گوئی اُس کے اخلاق پر ایک بدنما داغ ہے +

قاآنی نے ایک جگہ پریشاں[۳] میں اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ اور اپنے معشوق کے حسن کی تعریف اور اپنے عشق کی داستان کو بہت پھیلا کر مزے لے لیکر بیان کیا ہے۔

قاآنی کی فحش گوئی اور پست اخلاقی کی اس سے بھی کہیں زیادہ قبیح مثالیں موجود[۴] ہیں۔ جن کو ہم دانستہ نظر انداز کرتے ہیں۔ اُس کی کتاب پریشاں بھی حیا سوز فواحشات کی کثرت سے داغدار ہے + (کتاب فحش آلود ہے)

ان واقعات و حقائق کی موجودگی میں مشکل ہے کہ دنیا اُس کی پاک باطنی عزت نفس اور اخلاق حمیدہ کی اسی طرح معترف رہے۔ جس طرح سعدی۔ جامی۔ نظامی اور مولانا روم ایسے پاکباز صوفیائے کرام کی +

محمد عبد القوی

*

نائٹ ایڈیٹر

(از جناب مفتی غلام جعفر صاحب بی۔ اے)

جانِ برادر

السلام علیکم۔ عید مبارک۔ واقعی آپ نے صحیح لکھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اگر تم اس خط کا ہی جواب بھیجو (جس کی توقع بہت کم ہے) تو میرے تیسرے عریضے کا جواب ہوگا"۔

آپ کے اس طعن کے باوجود میں یہی غنیمت سمجھتا ہوں کہ میں تیسرے مسرت نامے ہی کا جواب تحریر کر رہا ہوں۔ نہ کہ چوتھے پانچویں یا چھٹے کا۔

حضرت! آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر۔ مگر اس بیچ میرزی کی معذرت بھی شاید قابلِ سماعت ہو۔ سنئے۔ آپ کا پہلا خط جو پچھلے برس ستمبر کے مہینے کی کسی تاریخ کو یہاں پہنچا۔ اُس سے کئی روز قبل مولوی صاحب مجھے شملہ سے کشاں کشاں لے آئے۔ بس اک لمحہ بھر کی مہلت تو نہ دی۔ یوں کہئے جیسے کسی سیاسی بلوائی کے نام وارنٹ بلا ضمانت جاری ہوں۔ اور دیکھتے دیکھتے لبصد اق "بابہ دست دگرے دست بہ دست دگرے" دو غریب۔ پکڑ لائے۔ موٹر میں بٹھایا جائے اور کسی نیز معلوم مقام کو بھیج دیا جائے"۔

میں غریب اچھا بھلا لوئر بازار سے متصل چھوٹا شملہ کی طرف جا رہا تھا۔ کہ مولوی صاحب کا آدمی ملا۔ حکم سُنایا کہ بُلاتے ہیں۔ پس کلاک ہوٹل میں پہنچا۔ دیکھا کہ بستر بندھا رکھا ہے۔ ٹرنک کیل کانٹے سے درست ہیں۔ اور حضرت قبلہ پا بہ رکاب۔ فرمایا چلو اور ابھی ساتھ چلو۔ اور کل سے "مسلم انٹرسٹ" (زبان انگریزی کے روزناموں میں "ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا واحد نمائندہ اور وکیل") ملاحظہ ہو اشتہارہا کی سب ایڈیٹری کا کام سنبھالو۔

غرض بندہ اُلٹے پاؤں اپنے اسلامی ہوٹل کو بھاگا۔ دل دل کس گدھے نے اوا کرنا تھا۔ یہاں جیب میں رکھا ہی کیا تھا۔ منیجر صاحب کو آئیں بائیں شائیں بتایا۔ اور حضور مولانا کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کالکا کا رُخ کیا۔ مگر بندہ نواز اگر میں اسی طرح سے ساری حکایت لکھتا گیا تو یہ جواب ناتمام رہے گا۔ اور شاید پھر اگلے برس کی عید چھٹی کے دن باقی حصہ لکھ سکوں۔ اسلئے ہم ہر چہ گیرید مختصر گیرید اور اس کے علاوہ مقصد تو ان سطور سے یہی ہے۔ تاکہ اپنی معذرت پیش کروں پس مختلف واقعات اور حالات پر کودتا پھاندتا سیدھا مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں +

لاہور آیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب ایڈیٹری نہیں نائٹ ایڈیٹری ہے +

(بقدر مختصر) آپ ٹھہریئے سب انکلپڈیا نہیں آپ کو اخباری دنیا سے سوا اس کے کیا واسطہ کہ اگر کسی ایڈیٹر کو دفعہ ۱۲۴ الف مجموعہ تعزیرات ہند کے جرم کا مجرم پایا تو جھٹ گرفتار کر جیل اور مجسٹریٹ کے حوالہ کیا۔ پس جناب کو معلوم ہو کہ آج کل (میں اس وقت فقط لاہور کا ذکر کرتا ہوں) اور کچھ عرصے سے لاہور کی دنیائے صحافت میں ایک نئی وبا پھیلی ہے۔ جس کی درآمد بیشی کپڑے کے ساتھ براہِ راست انگلستان سے کی گئی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اب روزنامے انگریزی اُردو دونوں شام کو اور دو بار آفتاب کے وقت آسمان صحافت پر طلوع نہیں ہوتے۔ بلکہ طلوعِ آفتاب سے بھی پہلے یہاں تک صبح صادق تو کجا صبح کاذب سے بھی کچھ پہلے اندھیرا رات کے اندھیرے میں ہی سیاسی، اقتصادی، علمی اور ادبی خبیہ افشانی کرنے لگ جاتے ہیں +

اس حالت میں ضرور ہوا کہ ساری رات کام کیا جائے۔ ادارۂ تحریر کا سب سے گھٹیا آدمی (اور اخبار زیرِ بحث کی صورت میں حضور ایں جانب) رات کے نو بجے سفید کاغذ کو سیاہ کرنا شروع کرے۔ اور صبح تین بجے تک خامۂ گہر ریز سے لوگوں کے دماغی خزانے بھرنے کی ٹھہائے۔ کم از کم اپنی طرف سے کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔ اس کے بعد اگر پڑھنے والوں کا دماغ سلیم ہے تو فائدہ اُٹھائیں گے۔ ورنہ اپنا نصیب یعنی نائٹ ایڈیٹر صاحب تو اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے۔ ان کو اس سے کیا کہ دوسرے کو اپنی کوتاہ نظری کے سبب کچھ سمجھائی نہ دے +

تو حضرت! آپ کا یہ خاکسار ٹیک کم ستمبر ۱۹۲۹ء سے آج ۱۰ مئی ۱۹۳۰ء تک "مسلم انٹرسٹ" کی نائٹ ایڈیٹری کے فرائضِ ہنگامہ پرور کی ادائگی میں مشغول

رہا ہے۔ اور اس بات کی خبر اللہ میاں کے سوا کسے ہوگی کہ کب تک یہ سلسلہ جاری رہے۔ ظاہر تو جلد چھٹکارا پانا محال است و محال است و جنوں۔ اب آپ فرمائیں گے کہ اس طویل تمہید کو خط کا جواب نہ دینے سے کیا تعلق؟ مگر بھائی صاحب! جو کچھ عرض کیا گیا غیر متعلق نہیں +

دیکھئے۔ پنجاب کے شریف آدمیوں، متوسط الحال پڑھے لکھے لوگوں کے نظام تقسیم اوقات سے آپ باخبر ہیں ہی۔ کیونکہ آپ بھی تو اسی زمرہ میں ہیں مگر نائٹ ایڈیٹر کے اس نظام کا ڈھب ہی نرالا ہے۔ یہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے سب سے پہلے جہاں پر بھلا آدمی ۹ بجے رات کے بعد اوّل تو ۱۰۔۱۱ بجے تک بستر استراحت میں عروسِ خوابیدگی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ یا اگر کوئی خاص وجہ ہوئی۔ تھیٹر وغیرہ جانا ہوا۔ یا کوئی جلسۂ احباب منعقد ہوا۔ تو انتہا ایک دو بجے سو گئے۔ اور وہ بھی گاہے گاہے۔ لیکن نائٹ ایڈیٹر صاحب کا دن کا روبار کا وقت رات کے ۹ بجے شروع ہوتا ہے۔ اور حضرت صبح کے چار بجے تک برابر کام کئے جاتے ہیں۔ پھر جب پانچ بجے کے قریب گھر پہنچتے ہیں تو نیند رخصت۔ بستر پر لیٹتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر کروٹیں بدلتے ہیں۔ مگر نیند ہے کہ دور سے ہی سلام کرتی ہے۔ آخر ساری رات کی تکان اور پچھلے سے ۸ بجے تک کی کوفت بالکل نڈھال ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس تکے کے ماندے گدھے کی طرح جس سے اُس کی طاقت سے زیادہ کام لیا گیا ہو پڑ رہتے ہیں۔ لیجئے اس حالت میں دوپہر ہو گئی۔ عرصہ ہوا کہ بارہ بجے تھے اور یہ میاں اُٹھنا چاہتے ہیں لیکن قواعد قدرت کی جو خلاف ورزی کی ہے۔ اُس کا خمیازہ اُٹھاتے ہیں۔ دنیا سوتی ہے۔ اس لئے کہ اگلی صبح تازہ دم ہو کر از سر نو کام شروع کر دیگی۔ لیکن یہاں "تازہ دم ہونا" بجائے خود رہا۔ جسمانی سستی اور دماغی پراگندگی سے پالا پڑتا ہے۔ خیر جوں توں کر کے اُٹھے۔ نہائے دھوئے۔ چائے پی۔ اتنے میں شام کے چار بج گئے۔ نائٹ ایڈیٹر صاحب کے ہوش کچھ نہ کچھ بجا ہوئے اور دائرۂ انسانیت میں آئے +

اب اگلے روز (اے توبہ! رات) کے کام کی تیاری کرنے لگے۔ چونکہ اصلی تندرستی اور دماغ کی چستی جوہر شخص کا حق ہے۔ اور جو قدرت کا منشا ہے حضرت نائٹ ایڈیٹر کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے گھر بھر سے لڑنے کو موجود۔ اگر ذرا کوئی اونچی آواز سے بولا تو بگڑ کھڑے ہوئے۔ بس گھر کیا ہوتا ہے قبرستان۔ نہ بالکل سنسان۔ بیوی بچے سب کے سب ان کے کرے سے دُور ہی دُور بھاگتے ہیں۔ آدمی نہ ہوا طاعون ہوا۔ کہ سب خوف کے مارے اپنی جان چھپاتے پھرتے ہیں +

قصہ مختصر یہ کہ (میں اپنی ہی کیوں نہ کہوں سارے نائٹ ایڈیٹروں کو کیوں لے مروں۔ دو سے جانیں اور اُن کا کام جانے) کم از کم خاکسار کی تو پانچ مہینوں میں یہ کیفیت رہی ہے اور اب بھی ہے کہ نہ دین کے نہ دنیا کے بیوی نالاں۔ بچے پریشان۔ کوئی کچھ کہے۔ یہاں کسی بات میں دخل نہیں۔ تنخواہ ملی اُن کے حوالہ کی بسیاہ کریں۔ سفید کریں۔ ہمیں کیا۔ لڑکا مدرسہ جائے نہ جائے گھر میں کوئی بیمار ہو۔ مہمان آئیں۔ چلے جائیں۔ بندہ کو کسی سے واسطہ نہیں +

ابھی اگلے روز کا ذکر ہے کہ ایک عزیز کا انتقال ہوا۔ پیغام پہنچا۔ یہ کوئی صبح ۸ بجے کا ذکر ہوگا۔ اب آپکی بھاوجہ حیران ہیں کہ اس کمبخت کو بھی تو اطلاع دینی چاہئے۔ مگر جانتی تھیں کہ ابھی آسمان سر پر اُٹھا لیگا۔ کہیگا "دیکھو کیسے ظالم لوگ ہیں۔ اک گھڑی بھر بھی تو آرام نہیں لینے دیتے"! نتیجہ یہ ہوا کہ بیوی بچے گھر کے سب آدمی اُن عزیز کے ہاں گئے۔ اور نوکر سے کہہ گئے کہ میاں اُٹھیں تو اطلاع دیدینا۔ جب ہمیں بارہ بجے خبر ملی تو جنازہ جا چکا تھا۔ اس کی شکایت اُن کے ہاں کے لوگ آجتک کرتے ہیں +

یہ تو قصہ موت کا تھا۔ اب ایک لطیفہ سنئے۔ کسی کی شادی ہو۔ کوئی جلسہ ہو۔ تماشہ ہو۔ احباب تھیٹر یا سینما دیکھنے کے لئے کہیں۔ بلکہ ٹکٹ کے دام اپنی گرہ سے خرچ کرنے کو تیار ہوں۔ طرح طرح کے دم دلاسے سے کام نکالنا چاہیں مگر خصوصیات جانب ۶ نہ میں جنبد نہ جنبد گل محمدؐ +

ان حالات میں آپ خود ہی فرمائیے کہ جواب خط دینے کی کسے فرصت موت کی تقریب میں ہم شامل نہ ہوں۔ شادی کے جلسوں سے ہم کنارہ کریں۔ پھر دوستوں کے خطوں کا جواب چہ معنی دارد +

آج اگر جواب لکھ رہا ہوں تو اس کی خاص وجہ ہے۔ ہاں مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے۔ کہ آج جبکہ عید کا دن ہے۔ دنیا صبح سویرے نور کے تڑکے جاگی۔ اور عید کی خوشیاں منانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ لیکن ہم تھے کہ عید نمبر کی طباعت اور اُس کے لئے خاص مضامین کی تیاری کے سبب چار بجے دفتر سے روانہ ہونے کے بجائے خیر سے چھ بجے گھر پہنچے۔ اور آتے ہی انٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہے +

ہمیں کیا خبر کہ کب عید کی نماز ہوئی۔ گھر والوں نے کیا کیا تیاریاں کیں۔ اب دو بجے ہیں اور اس خیال سے کہ آپ کو عید مبارک تو لکھ بھیجوں۔ یہ رونا رو رہا ہوں +

ہاں، اور آج خط لکھنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ کل اتوار ہے اور چھٹیاں اکٹھی آگئیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خیال میں بڑی قوت ہے۔ ایک چھوڑ دو دو چھٹیوں کی آمد نے خیالوں کی بندھائی اور یہ خط لکھنے لگا +

تو حضرت یہ ہے بندہ کی معذرت۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں کہ ایک لحاظ سے سب دھندوں سے زیادہ اہم اور ضروری سوا ایک دھندے کے یعنی ع سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ ایک دنیا کی اصلاح کا خبط ہے کہ دماغ کو کسی بات کی فرصت ہی نہیں۔ پھر وہ خبط ہمارے وقت پر اس طرح طاری ہے کہ کسی اور کام یا تفریح کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم اس قاضی کی طرح ہیں جو شہر بھر کے اندیشے سے دبلے ہوگئے تھے +

چند روز ہوئے ایک صاحب دفتر میں آئے۔ اپنے کسی افسر کی شکایت شائع کرانا مقصود تھی۔ یہ ہمارے لنگوٹیے یار ہیں۔ کالج میں ہم اور یہ ہم سبق تھے۔ مگر ہم تھے ایڈیٹر۔ نائٹ ایڈیٹر بن کے مصروف آدمی۔ ان صاحب نے پہلے خط کے ذریعے وقت مقرر کرایا۔ تو ہم نے نہایت بے تکلفی سے رات کے بارہ بجے کا وقت دیا۔ یہ آئے اور آتے ہی بولے "ہاں! یہ کہاں کی شرافت ہے۔ کہ آپ تو ڈوبے تھے یاروں کو بھی لے ڈوبے۔ بھائی صبح دفتر جلد پہنچنا ہے۔ اور یہاں تم نے بارہ بجے ملنے کا ناداری حکم بھیج دیا"+

خاکسار۔ "حضور معاف فرمائیے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ فرمائیے کیا ارشاد ہے"

وہ۔ ارشاد تو آخر کرونگا ہی۔ کیونکہ آیا ہی اس غرض سے ہوں۔ لیکن بندۂ خدا! یہ کیا بیہودگی ہے۔ میں تو اسے کار مدوام خاک نہیں کہونگا۔ یہ تو تیری چند بہت ہے۔ آدھی رات کو جاگنا اور دن کو سونا ہے۔ تم آدمی سے جوان ہوتے جاتے ہو۔ چھوڑو بھی اس طریق کو۔ ذرا آئینہ میں شکل تو ملاحظہ کرو۔ چند مہینوں میں چند برس کی عمر بڑھ گئی ہے"+

خاکسار۔ "قبلہ! یہ چندیت کی بھی ایک ہی کہی۔ آپ نے سنا نہیں "رات کے وقت سوئے رہنا۔ جاگے پاک پروردگار"۔ سو بھائی جان! میں یہ تو نہیں کہتا۔ نعوذ باللہ نعوذ باللہ ہم نائٹ۔ ایڈیٹر پروردگار ہیں۔ مگر تم لوگوں کی دماغی پرورش ہم ضرور کرتے ہیں۔ دیکھئے ہمارا اپنا رنگ دیکھئے۔ آپ کے ذہن کا مرتبہ بلند کرنے۔ آپ کو دنیا کے حالات سے آگاہ کرنے کی خاطر ہم اپنی صحت تک قربان کر رہے ہیں"+

وہ۔ "ہاں! صحت اور صحت کے ساتھ انسانیت اور یہ بھی تو ذرا دبی زبان سے فرمائیے۔ تاکہ ایثار کے ساتھ جلب منفعت بھی ہے۔ بھلا ایک مہینہ [illegible] کے بھی تو نائٹ ایڈیٹری کی ہوتی۔ سنا ہے آپ کے مولوی صاحب [illegible] جل روپے کے لئے سخت پریشان ہیں۔ ایک مہینہ کی تنخواہ تو انہیں [illegible] ہوتی"+

خاکسار۔ "یہ خیر متعلق بات ہے۔ اور ادھر دیکھو۔ بھائی جس کام کے لئے آپ [illegible] کہ چلو۔ نائٹ ایڈیٹر کو کام کے گھنٹوں میں اتنی فرصت کہاں کہ گپ شپ [illegible] کریں"+

ان کی یہ کھری کھری باتیں سنکر ہم خفیف تو ضرور ہوئے مگر نائٹ ایڈیٹری کے رعب داب کی آڑ لے کر اور کم فرصتی کا بہانہ بنا کر بات کو ٹال گئے وہ سکرائے۔ ایک نگہ ترحم ہم پر ڈالی پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ ہم نے حالات متعلقہ [illegible] مضمون طبع کرنے کا وعدہ کیا اور انہیں رخصت کر دیا +

بھائی صاحب! یہ خط شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوا جاتا ہے۔ مگر ایک تو میں آپ کے تینوں خطوط کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ اور دوسرے صاحب! کیجئے گا کہ میں آپ کی نفسیات سے خوب واقف ہوں۔ جانتا ہوں کہ آپ کے دل و دماغ کی عادت میں معمولی مذمت کی شنوائی معلوم۔ ناکافی بہانوں کی دال گلنا مشکل۔ پس نائٹ ایڈیٹری کی باقی مصیبتوں کا ذکر بھی سنئے۔ شاید اسی طرح آپ کا دل پسیجے اور آپ جواب خطوط میں جو کوتاہی ہوئی ہے اسے معاف کریں۔ پھر تیسری بات یہ ہے کہ مطلب سعدی مگر است۔ اسے بھی ابھی ابھی بیان کئے دیتا ہوں۔ شاید آپ کی دستگیری سے نائٹ ایڈیٹری کی تکلیف سے نجات ملنے کی راہ نکل آئے۔ ہاں تو صحت خصت ہو رہی ہے۔ زندگی کم ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ شب بیداری بڑے ثواب کا کام ہے۔ مگر عبادت الٰہی کے لئے شب بیداری نہ کہ مارے باندھے کی شب بیداری اور روٹی کا ٹکڑہ پیدا کرنے کی خاطر شب بیداری +

اچھا اب دیکھئے۔ ہنسئے گا نہیں۔ ایں جانب کا مشغلہ نہ اڑائیے گا کیونکہ ایک نازک سا معاملہ عرض کرنے کو ہوں۔ زندگی کے ایام کی کمی اور صحت کی خرابی اس کی کیفیت تو آپ نے سن لی۔ یہ کمبخت نائٹ ایڈیٹری شہرت اور نام ریک کو بھی کیچڑ میں پھینکنے سے باز نہیں آتی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہ تو آپ جانتے ہیں کہ بندہ کبھی کبھی اور اب تو نائٹ ایڈیٹری کے زمانہ میں روزانہ بلاناغہ دخت رز سے ہم آغوش ہوا کرتے ہیں۔ ہمسایوں کو بھی کچھ نہ کچھ اس کا علم ہے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے سے اسے خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ ایک صاحب جو کچھ بے تکلف ہیں۔ ابھی کل کا ذکر ہے۔ فرمانے

لگے :- "قاضی صاحب! معاف کیجئے گا۔ مگر یہ وظیرہ تو اچھا نہیں۔ آپ پیتے ہیں۔ بیشک پیا کیجئے۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ دخل دے۔ مگر یہ راتوں کو گھر سے غیر حاضر رہنا اور صبح سویرے واپس آنا کہاں کی دانائی ہے۔ کہیں شراب وکباب کے ساتھ بازارِ حسن کی سیر سے کے خریدار تو نہیں بن گئے۔ قاضی صاحب میں پھر معافی مانگتا ہوں۔ مگر ماشاءاللہ آپ پڑھے لکھے ایم اے تک کی تعلیم۔ پھر اخبار نویسی پیشہ۔ اصلاح قوم وملک سے دن رات شغف۔ اس پر شراب کا شوق۔ کتنی بُری بات ہے۔ اچھا پھر شراب سے آگے نہ بڑھتے تو گو بُری بات تھی۔ مگر خیر مضائقہ نہ تھا۔ آپ تو دو قدم اور آگے نکل گئے۔ پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی اور اب آپ کو عیاشی کی سوجھی۔ محلہ بھر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ پیر بابا بالغ نظر و بلانا فہ ساری رات گھر سے غائب رہ کر علی الصبح اپنے دروازہ میں قدم رکھتے ہیں۔ براہ خدا اس بات سے باز آیئے" +

میں نے یہ سُنا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ حیران تھا کہ کیا جواب دوں۔ یہاں ساری رات آنکھوں کو تیل سے ملتا ہوں اور یہ لوگ مجھے عیاش بناتے ہیں۔ ان صاحب کو بتیرا سمجھایا۔ نائٹ ایڈیٹری کا قصہ سُنایا۔ مگر بھائی صاحب! سنتا کون تھا۔ وہ بولے تو آخر یہ کہ "حضرت! گنا دو تو آپ کرتے ہیں۔ اس پر دروغ گوئی بڑے افسوس کی بات ہے" +

میں نے بہت سر پیٹا۔ مگر انہیں یقین نہ آیا +

اب اور سنیئے۔ تمباکو نوشی کی عادت نے ایک دن ہوٹیک اور ہی گل کھلایا۔ میں جب صبح واپس آتا ہوں تو اوّل تو حقہ پیتا ہوں۔ اگر تمباکو ختم ہو یا سستی سر پر سوار ہو تو سگرٹ سے کام لیتا ہوں۔ ایک صبح تمباکو ندارد۔ سگرٹ کیس تھا اُسے دفتر میں بھول آیا۔ اب بات بنے تو کیسے۔ چار بجے صبح دوکانیں بند۔ پریشان تھا کہ اگر سگرٹ نہ ملا تو بُری بھلی نیند بھی نہ آئے گی۔ لگا بازاروں میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کہ شاید کوئی دوکان کھلی ہو یا کھلوا سکوں۔ مگر صاحب! کامیابی نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ آخر ریل کے اسٹیشن پر پہنچا۔ یہاں البتہ سگرٹ موجود تھے جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو ٹوٹا غائب۔ مظہر العجائب۔ لیکن اگر ٹوٹا ہوتا بھی تو یہ کیا فخر و رتھا کہ پیسے بھی ہونگے۔ یہاں تو ٹوٹے کا خالی ہونا ایک مرض مزمن ہو چکا ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ دن ہوتا تو کسی واقف دوکاندار سے اُدھار لے لیتا۔ خواہ اُس غریب کا بیل سال بھر تک بھی ادا نہ ہوتا۔ مگر ریل کے اسٹیشن والے تو اپنے باپ کو بھی اُدھار نہ دیں۔ ناچار گھر کو لوٹا۔ اب سات بج چکے تھے۔ تین گھنٹے اکادکت۔ الغرض آپ کی بھاوج صاحبہ سے چونّی مانگی۔ دکان کے نیچے پان والے کی دوکان کھل چکی تھی۔ سگرٹ کی ڈبیہ لی۔ اور دنیا و جہان کے تمباکو نوشوں (مع حضورِ ایں جانب) کو کوستے ہوئے۔ پانچ سات سگرٹ پھونکے۔ اور بستر میں لیٹے +

کہئے اب اور کچھ بھی لکھوں یا زیادہ سمع خراشی کئے بغیر حرفِ مطلب زبان پر لاؤں۔ لیجئے بے حیا کی بلا دور لکھ ہی ڈالتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ عید وید تو بس ہو چکی۔ چار بجنے کو ہیں۔ اور ابھی ہم بستر میں ہی بیٹھے یہ خط لکھ رہے ہیں۔ یکسی کل کا دن سخت خونفزدہ کر رہا ہے۔ مولوی صاحب کے ذمہ تین ماہ کی تنخواہ نکلتی ہے وہ دو۔ چار۔ چار۔ دس۔ دس روپے وہ گاہے گاہے عنایت فرمایا کرتے ہیں اور اسیطرح ہر مہینے کے دوران میں کم و بیش آدھی تنخواہ لے مرتا ہوں۔ اگر آج حساب کریں تو ساڑھے چار سو روپے بروئے حساب مرحمت کر سکتے ہیں۔ یعنی پورے تین ماہ کی تنخواہ۔ یہ ریلوڑی کا پیسہ چھ ماہ سے جاری ہے۔ اور ہم ہیں کہ انتہائی تکلیف میں۔ آپ کے بھتیجے صاحب کے امتحان کا واخلہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ادا نہ کیا تو سال بھر کی محنت ضائع۔ امتحان کے کمرہ میں کوئی گھسنے نہ دیگا۔ اس کے علاوہ مکان کا کرایہ تین ماہ کا بقایا۔ یہ تو ہوئیں دو رقمیں۔ ان پر مستزاد کوئی دو جن بمعہ بل۔ بالخصوص سگرٹ والے کا یعنی نائٹ ایڈیٹری کا جرمانہ۔ گھر میں ہوں تو چار پیسے کا تمباکو کفایتی۔ مگر نائٹ ایڈیٹری کے وقت ہر شب کم از کم تین پنجی کی دو ڈبیاں تو ہوں۔ یہ ہوئے ساڑھے سات آنے یومیہ۔ سگرٹ واپنتا لیس روپے مانگتا ہے۔ ان کی ہماری صاحب سلامت بھی اب "ما بخیر شما بسلامت" کا رنگ اختیار کر رہی ہے۔ بلکہ کر چکی ہے۔ کمبخت قینچی کی ڈبیا نے ہمارے انکے الفت کے رشتہ کو آخر کاٹ ہی ڈالا۔ کل ان کا نوٹس آیا کہ ایک ہفتہ میں بل ادا کرو ورنہ نائٹ ایڈیٹری دھری رہ جائیگی۔ اور جج عدالتِ خفیفہ کی کچہری میں حاضر ہونا ہوگا۔ خیر ڈگری کا ہونا فوقی کے وانٹ نکلنا تو ممکن ہے کہ دن سے نپٹ سکوں۔ مگر کچہری میں ٹھیک دس بجے پہنچیگا کون۔ یہاں تو سوتے تن بدن کا ہوش ہی نہیں ہوتا +

واللہ تعیں کرتا کہ مجھے ڈگری کا نوٹس نہیں۔ جج صاحب سے قسطیں مقرر کروا لیں گے مگر مقرر وہی کرائے جو کچہری جائے +

تو نتیجہ یہ ہوا کہ بھیّا! اپنی سب اپکچری کے صدقے میں اگر بہت نہیں تو دو سو روپے بواپسی ڈاک بلکہ بصیغہ تعجیل عنایت کر کے شکر گذار کرو۔ شکر شکر۔ شکر لبشکر اندر اندر۔ جو خاکسار شیراز فرار گئے ہیں۔ ننانوے سپر عمل کرو۔ محمود میاں اور بچوں کی طرف سے سلام ادب آپکی بھاوج بھی آپکو یاد فرماتی ہیں۔ آپکا برادرانہ مرہون منت اور آئندہ کی عنایات کا بھی سے شکر گذار۔ خاکسار سقی غلام جعفر

علی گڑھ سے ڈربن[1]

(از جناب عبدالشکور صاحب ایم۔ اے سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

از ممباسا (ساحل افریقہ)

۵ر اپریل ۱۹۳۰ء

مائی ڈیر نیرنگ خیال! السلام علیکم

آپ کو تعجب ہوگا کہ اس دور دراز ملک میں آپکا واقفکار کون ہے۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مجھے تو یہ امید ہے کہ اس سے بھی زیادہ پیش افتادہ اور دور از ہند مقامات پر بھی آپ کا کوئی نہ کوئی واقفکار نکلے گا۔ آپکی یہ ہر دلعزیزی قابل رشک ہے۔ اور اس لئے قابل مبارکباد۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ آگے آگے دیکھئے آپ کی جادہ طرازی کہاں سے کہاں پہنچتی ہے اس لئے دعا کرنا چاہئے کہ خداوند کریم آپ کو نظر بد کے گزند سے مامون و مصئون رکھے، آمین +

۱۶۔ اپریل کو شام کی پانچ بجے کی گاڑی سے علی گڑھ کو الوداع کہا۔ طلبا اور احباب اسٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی کے روانہ ہونے سے قبل دل بھر آیا۔ پرانے پرانے مخلص اور باوفا دوستوں سے گلے ملا۔ ان میں بعض ایسے بھی جن کے ساتھ زندگی کے دس بارہ سال گذرے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کی سنجیدہ ظرافت اور جن کے مزہ دار چٹکلے میری کم مایہ زندگی میں ہزاروں دلچسپیوں کے موجب ہوتے تھے۔ ان میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کے ساتھ روزانہ ٹینس اور برج ہوتی تھی۔ صدق و صفا کے ان مجسموں کو خدا کے سپرد کیا اُن کی بہترین دعاؤں کے انبار جیب کو اپنے ہمراہ لیا۔ گاڑی نے حرکت کی۔ اور ہر آن بعد علی گڑھ کی فضا مجھ سے دور ہونے لگی۔ ایسی حالت میں اگر میرا دل رو دیا ہو۔ اور میری آنکھیں پرنم ہوگئی ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ کیونکہ اپنی ہزاروں مزاوریوں کے باوجود میں اپنے حساس دل پر نازاں ہوں +

دیوبند کے مولوی مسجدوں کے ہمیشہ در ما۔ جمعیت العلما کے گرانڈیل علماء صوفیائے کرام۔ اردو اخبارات کے مطالعہ فرمانے والے نیم تعلیم یافتہ قراء ریلوے کے بابو۔ دفاتر کے کلرک۔ کونسل کے ممبر۔ اخبارات کے اڈیٹر اور خدا جانے کون کون جب جی چاہتا ہے علیگڑھ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے برائے خدا کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ تم علیگڑھ کو کیا جانو۔ تم اُس محبوب کی عنائی سے کیا واقف؟ تم کو ہند کے اس واحد درسگاہ کا کیا علم؟ علیگڑھ کو صرف وہی شخص جانتا ہے جس نے علی گڑھ میں اپنی زندگی کے کم سے کم دو تین سال گذارے ہیں۔ منٹو سرکل اب کہیں جا کر درخت اور پھولوں سے مزین ہوا ہے مگر اُس کی دلکشی نہ درختوں پر موقوف ہے۔ نہ پھولوں پر۔ سرسید ہال۔ سید محمود ہال حقیقتاً اب بھی مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کی دلفریبی نہ عمارت پر منحصر ہے نہ مکانات پر۔ اور کہیں کیوں جائیے اپنے اسٹاف کلب ہی کو لیجئے ہندوستان کے ہزاروں کلب اس سے کہیں زیادہ شاندار اور ٹپ ٹاپ ہونگے لیکن اس کلب کے ممبروں کو عید کے دن بھی چین نہیں آتا۔ کہیں قرارداد ہو کہیں جانا ہو۔ کسی سے ملنا ہو لیکن چکر کھا کر شام کو وہاں آنا لابدی ہوتا ہے۔ نہ صرف کلب بلکہ پورے علیگڑھ کی فضا کی یہ متقناطیسی کشش شاید اس لئے ہے کہ اپنی جس کی صحبت وہاں فراوانی کے ساتھ ملتی ہے۔ میں تو فطرت کے اسی لطف خاص کا شکار ہوا۔ افریقہ تو افریقہ ہے اگر میں انگلستان اور سوئٹزرلینڈ تک بھی ہو آؤں تب بھی وہ پاکیزہ صحبتیں حاصل نہ ہونگی جو "حصار علی" میں مجھے حاصل تھیں اور جن کی یاد ہمیشہ دل کے گوشہ گوشہ میں چٹکیاں لیتی رہے گی۔ اس لئے علی گڑھ سے رخصت ہونے میں مجھے وہی تکلیف ہوئی جو گوشت سے ناخن کے جدا ہونے میں ہوتی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ آخرالذکر تکلیف عارضی ہوتی ہے۔ میرے درد کی ٹیس رہ رہ کر اٹھیگی اور مجھے اکثر بیتاب کرتی رہیگی +

میرے علیگڑھ سے روانہ ہونے سے ایک روز قبل اولڈ بوائز کا ایک نہایت مہتم بالشان اور کامیاب ڈنر ہوا۔ اور مجھے اپنی خوش قسمتی پر فخر ہے کہ میں اُس میں شریک ہو سکا۔ مولانا محمد علی۔ بڑے بھائی شوکت علی۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ مسٹر ہارن اور ڈاکٹر سید راس مسعود کی صورتیں اب تک پیش نظر

ہیں۔ اور اُن کی پُرخلوص تقریروں کے الفاظ اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اولڈ بوائز کا ایسا کامیاب ڈنر مدت سے نہ ہوا تھا۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مُردہ ہو چکی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب حیات نو کے آثار ہویدا ہیں۔ فرقوں کا درمیانی صلیح پاٹا جا چکا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ ڈاکٹر راس مسعود کی ہمہ گیر شخصیت ہم بدنصیبوں کے لئے مسیحائی کا کام کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے لئے حالات نے نہایت اچھی فضا پیدا کر دی ہے۔ اور ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ اللہ پاک اُنہیں صحت۔ تندرستی دے اور اُن کے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔ اولڈ بوائیز ڈنر کے نقوش کو ختم کرنے سے قبل مجھے ایک ایسی ہستی کی یاد تازہ کرنا ہے۔ جس کے دامن پر ملائک نماز پڑھتے ہیں۔ اور جس کی طبیعت کی شرافت اور کریم النفسی دونوں ضرب المثل ہیں۔ ڈنر شروع ہونے سے قبل میرے پاس آئے۔ میرے عزم سفر پر میری ہمت افزائی فرمائی۔ مگر اُس پیکرِ اخلاص کو اس کا علم نہیں کہ اُس کے وہ دو تین فقرے میرے دل پر ثبت ہیں۔ اور حرزِ جان کی طرح مجھے عزیز ہیں +

۲۳ مارچ کو دلّی میں (مولوی سیّد اشفاق علی صاحب قبلہ کے ہمراہ) معمولی سامان سفر خریدا۔ کچھ احباب مل گئے۔ مگر سر پر سفر سوار تھا۔ اس لئے طبیعت بے کیف رہی۔ چہرہ اُترا اُترا۔ آنکھیں وحشت زدہ بال پریشان۔ ۲۴ کی صبح کو فرانٹیر میل سے روانگی ہوئی۔ اسٹیشن پر چند احباب اور اعزہ موجود تھے۔ خلاف اُمید طبیعت میں قدرے شگفتگی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ رات کے آٹھ گھنٹوں نے جدائی کے صدمہ کو انگیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مولوی سیّد اشفاق علی صاحب قبلہ بھی اسٹیشن پر تشریف فرما تھے۔ اُن کی خاص توجہات اور نوازشات کا شکریہ ادا کر کے اور سب احباب واعزہ کو گلے لگا کر دلّی سے چل دیا۔ درجہ خالی تھا۔ ریل بے پناہ تیزی کے ساتھ فرلانگ بھر رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو دلّی کی پرانی تباہ حال ٹوٹی پھوٹی عمارتوں اور گردو پیش کے مناظر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر اخبار پڑھا۔ مگر آخر کار میرے دل کی کمزوری نے مجھے گھیر لیا۔ وطن کی محبت کرنے والے حضرات کی تصویریں نظر کے سامنے آنے لگیں۔ علیگڑھ کے رنگین احباب کی یاد دل کو مسلنے لگی۔ بہت دیر تک اسی عالم خیالی میں پڑا سوچتا رہا۔ دل پر افسردگی کا غلبہ ہوا۔ اسی حالت میں کئی گھنٹے گذر گئے۔ ریل راجپوتانہ کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ گرد و پیش کے مناظر میں ایک گونہ تبدیلی واقع ہوئی۔ دل نے فوراً محسوس کر لیا۔ کہ اب ریل اُسی سرزمین میں ہو کر گذر رہی ہے۔ جو عرصہ دراز تک شجاعت و مردانگی اور حسن و عشق کا گہوارہ رہی ہے۔ ریل کی کھڑکی میں سے چند دیہاتی راجپوت نیاں نظر پڑیں۔ میں خیال کرنے لگا کہ پدمنی کی یہ بیسویں صدی والی بہنیں ہیں۔ چند راجپوت دیکھے۔ ایک خاص وضع کی پگڑی باندھے ہوئے۔ لمبی لمبی ڈاڑھیاں، کانوں تک چڑھائے ہوئے۔ اغلباً سولھویں و سترہویں صدی کے سورماؤں کے یہی نام لیوا ہیں۔ خیال تو ہوتا ہے کہ اب بھی راجپوتانہ کی نازنین کی آنکھوں میں جادو اور ماتھے پر بندی ہوتی ہوگی۔ اب بھی وہاں بات کے پکے اور تلوار کے دھنی راجپوت پائے جاتے ہوں گے +

۲۴ و ۲۵ کی درمیانی شب غیر معمولی کرب و بیچینی کے ساتھ ریل میں بسر ہوئی۔ اغلباً غشاق کو سہروفہ سورج کے غروب ہونے کے بعد اسی قسم کی بیچینی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اوّل تو بہت دیر تک آنکھ ہی نہ لگی۔ اور لگی بھی تو بار بار کھل جاتی تھی۔ میرے کمرے میں دو اور مسافر تھے۔ مگر دونوں بے خبر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ اور میں اُن کے مزاج کی یکسوئی اور فراغت خاطر پر رشک کر رہا تھا۔ اسی اُدھیڑ بن میں رات کا تین چوتھائی حصہ ختم ہو گیا۔ ہوا میں کچھ خنکی دوڑنے لگی۔ اور صبح ہوتے ہوتے میں بھی غافل سو گیا +

شہر بمبئی کا خیال آتے ہی مولانا شبلی مرحوم کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مولانائے مرحوم بمبئی پر اُسی طرح فدا تھے جس طرح سرابرکوٹ بٹلر لکھنؤ پر، مولانا چیدائی اور آپا لوکو باغ مصلے پر ترجیح دیتے تھے سرابرکوٹ بٹلر چیرمنزل کلب پر ہاپٹ پارک قربان کرنے کے لئے طیار پائے گئے مگر میں چونکہ صرف ایک دن بمبئی میں رہا اس لئے میں اس شہر کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں بیان کر سکتا کہ عمارتیں بیشمار اور نہایت عالی شان۔ سڑکیں نہایت وسیع کشادہ اور صاف۔ موٹروں کی کثرت۔ ٹریم کار کی فراوانی اور بجا حسن کی عُریانی۔

۲۵ تاریخ کو شام کے چار بجے سروٹس آف انڈیا سوسائٹی کی عمارت میں رائٹ آنریبل پنڈت سرینواس شاستری نے ہم لوگوں کو ایک نہایت پُرتکلف ایٹ ہوم دیا۔ اُن کے علاوہ سر چنی لال مہتہ، و دیگر ممتاز سوسائٹی موجود تھے۔ بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ جنوبی افریقہ کے مفصّل حالات بتاتے رہے۔ انگریزی حکومت کے رویہ پر تبصرہ فرمایا۔ ہندوستانیوں کی حالت کا نقشہ کھینچا۔ اور دعاؤں کے ساتھ ہمیں خیر باد کہا۔ شاستری جی کی شہرت اور قابلیت روز روشن کی طرح ہویدا ہے۔ لیکن خدا جانے کیوں ہمیں اُنکی فطرت ملا

صفات سے جو جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ اُن کی شخصیت کا ہم پر جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ اُن کی ذات سے ہمیں جو تقویت ملنی چاہئے تھی۔ وہ نہ ملی۔ اُن کے چہرہ پر بیچینی کے آثار تھے۔ مگر میں یہ عرض نہیں کر سکتا کہ کیوں؟

بمبئی سے دن کے تین بجے جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب کھانا سے فارغ ہو گئے۔ لیکن کھانے میں کچھ لطف نہ آیا۔ لطف کیا خاک آسکتا تھا۔ بائیس دن کے بحری سفر کا بخار سر پر چڑھا ہوا تھا۔ میں بدقسمتی سے اُن لوگوں میں سے ہوں جو ذرا سے سفر کے خیال سے مشتعل اور بدحواس ہو جاتے ہیں۔ یقیناً اُن لوگوں میں سے جو علیگڑھ سے منظور گڈھی تک جانے میں سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر میجر عبداللہ معاونت پر کمر ہمت نہ باندھ لیں تو شاید میرا سفر کرنا ناممکن ہو جائے۔ اسی لئے فطرت کی ستم ظریفی کی داد دینا چاہئے کہ مجھے وطن سے پھینکا تو کہاں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر مُمبکٹو میں کسی کالج کے کھولے جانے کی اسکیم پیش ہوئی تو اس خاکسار کو ہی وہاں بھیجا جائے گا۔

سہ پہر کے تین بجے (۲۶ مارچ سنہ ۳۰ء) کارآپارا نے حرکت شروع کر دی۔ اور جہاز کے مُہیب اور طاقتور انجن ہماری آرزوؤں کے مرکز کو تیزی کے ساتھ ہم سے دور کرنے لگے۔ جہاز کی پوری آبادی تقریباً ڈک پر پرے جمائے بمبئی کی جلد اوجھل ہو جانے والی اور جھلملاتی ہوئی تجلی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ہندوستانی مسافروں کی آنکھیں بمبئی پر لگی ہوئی تھیں اور ہر شخص اسی عروس البلاد پر حقیقتاً اپنی عزیزترین جذبات پیش کر رہا تھا مگر جہاز کے طاقتور انجن اپنے کام میں ہمہ تن مصروف تھے۔ کچھ عرصہ بعد بمبئی نے اُفق پر ایک چھوٹے سے دھبّہ کی صورت اختیار کر لی +

بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد جہاز مارمُگوا پر لنگر انداز ہوا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے قریب یہ ایک پرتگالی مقبوضہ ہے۔ جو پرتگال کی قدیم شان و شوکت اور حکومت کی دست کا ایک دھندلا سا خاکہ معلوم ہوتا ہے۔ اس جزیرہ پر ابتک پرتگالی تعلقہ موجود ہے جو کئی صدیوں کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہے۔ اور جس پر ابتک پرتگالی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ یہاں سے مسافروں کی ایک کثیر تعداد جہاز پر سوار ہوئی۔ سب گوآ کے باشندے تھے۔ ان کی وضع قطع، لباس اور تراش خراش بالکل ویسی ہی تھی جیسے ہندوستان میں ریزرو بینڈ چپڑاسی کی اُمت کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ بے تکلفی سے انگریزی بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض پرتگالی زبان پر بھی قادر پائے گئے۔ لیکن آپس میں اُن کی گفتگو ہمیشہ گوآنی زبان میں ہوتی تھی جسے ہندوستان کی گجراتی زبان سے دور کی سنا سبت معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب رومن کیتھولک ہیں۔ اور ان کو شاہ پرتگال کی جانب سے وہی حقوق حاصل ہیں جو خود پرتگال کے اصلی باشندوں کو حاصل ہوتے ہیں گوا میں مدارس کی کثرت ہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہونہار گوآنی پرتگال ہی جاتا ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم کر کے ایک گونہ حیرت ہوئی کہ ان میں سے اکثر افراد ممباسا کے انگریزی دفاتر میں ملازم ہیں۔ اور تلاش معاش میں بے تکلف سمندر کو عبور کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان جزیروں میں صنعت و حرفت کا چرچا بہت کم ہے۔ زراعت برائے نام ہے۔ علاقہ بالعموم پہاڑی اور جو زمین مسطح ہے وہاں ملیریا کے جراثیم اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ وہاں مستقل قیام ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو بسا وقات کے لئے باہر ہی جانا پڑتا ہے اور کینیا و یوگنڈا کے علاقہ میں یہ لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں +

مارمُگوا پر جہاز ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹھیرا۔ جہاز نے پھر حرکت شروع کر دی۔ اور آدھے گھنٹہ میں ہم پھر بحیرۂ ہند کے لق و دق میدان لرزاں میں پہنچ گئے۔ ڈک پر کھڑے ہو کر جہاں تک نظر جاتی تھی ہم نے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن چاروں طرف سوائے پانی کی ہزاروں امواج کے اور کوئی شے نظر نہ آتی تھی۔ گوا سے ۲۷ مارچ کو روانہ ہو کر یکم کی صبح کو ہم سیشلس پر پہنچے۔ یہی چند جزیروں کا ایک نہایت خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس مقام کی خوبصورتی کو نینی تال کے حُسن سے بہت قریبی مشابہت ہے۔ چاروں طرف اونچے اونچے اور چھوٹے چھوٹے جزیروں کا حلقہ، وسط میں نہایت خاموش اور پُرسکون سمندر کا ایک ٹکڑا جھیل کی صورت میں۔ اس مقام سے افریقہ کی فضا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں کے اصلی باشندے تقریباً حبشی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم قمیص۔ پتلون اور اسٹرا ہیٹ پہنتے ہیں۔ اس کا افسوس رہا کہ ہمیں سیشلس میں قرنطینہ کی وجہ سے جانے کی اجازت نہ ملی۔ ورنہ سُننے میں آیا ہے کہ یہاں کثرت سے عجائبات دستیاب ہوتے ہیں اور مسافران اشیا کو دل کھول کر خریدتے ہیں +

مارمُگوا کے ایک پنجاہ سالہ بزرگ ہمارے ہم سفر تھے۔ ان کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ صاحب گوآ کے باشندے ہیں۔ مگر مدت مدید سے ممباسا میں کسی اچھی آسامی پر مامور ہیں۔ نہایت زندہ دل، ملنسار دوست، یارباش

ہنس کھ پائے گئے۔ اُن کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں علیگڑھ کا نام لیوا ہوں۔ تو مجھے گلے لگا لیا۔ کہنے لگے آج تیس برس کا عرصہ ہوا علیگڑھ کالج کی محبت کا شرارہ دل میں موجود ہے۔ تمہارے کالج کے مشہور کرکٹ کھیلنے والے علی حسین صاحب سے ممباسا میں ملا تھا۔ ان کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا۔ کہ علیگڑھ کالج کیا چیز ہوگا۔ مگر میں غریب آدمی ہوں۔ عیسائی ہوں۔ اس لئے بیحد آرزوؤں کے باوجود میں اپنے بچوں کو علیگڑھ پڑھنے نہ بھیج سکا۔ میں نے سُنا ہے کہ علیگڑھ کالج امرا کے بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ مثلاً پرنس حمید اللہ خاں۔ پرنس رشید الظفر خاں۔ پرنس حامد علی خاں۔ یہ لوگ وہاں تعلیم پا سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ آپ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے دار العلوم میں محمود ایاز کی تمیز نہیں۔ ہر کرس ڈاکس تعلیم پا سکتا ہے۔ اور پاتا ہے۔ تین پونڈ ماہوار میں بخوبی وہاں کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔ ہزارہا مسلمان، ہندو، عیسائی بچے وہاں سے علم کی تشنگی بجھا کر جاتے ہیں۔ یہ سُن کر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُنہیں بہت مشکل سے یقین آیا کہ وہاں مسلمانوں کے علاوہ عیسائی بچے بھی تعلیم پا سکتے ہیں اور اسقدر کم داموں میں۔ اس کے بعد میں نے علیگڑھ لائف کے متعلق حالات اور وہاں کے قواعد و ضوابط شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے۔ میں جسقدر تفصیلات بیان کرتا تھا اُسیقدر اُن کی حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر کار اُن سے نہ رہا گیا۔ مجھے پھر گلے لگا کر بولے میاں! تم اسی جگہ کے نمایندے ہو جس کی میں نے مدت العمر پرستش کی ہے۔ اس دفعہ ہندوستان کو چکر لگاؤں گا تو ضرور علیگڑھ جاؤنگا۔ اور خود جا کر وہاں کے حالات معلوم کرونگا +

۸ر اپریل کو صبح کے وقت ہمارا جہاز ممباسا پہنچا۔ جہاز پر ہر قسم کا آرام موجود تھا۔ لیکن اس کا افسوس رہا کہ ممباسا تک کوئی ایسا صاحب ذوق نہ ملا جس سے دو گھڑی باتیں کر سکتا۔ ہمارے پانچ اور ساتھی ہیں۔ وہ مالابار کے وہ اردو جانتے ہی نہیں۔ اس لئے بھلا غالب۔ اقبال۔ خاقانی اور جگر کو کیا جانیں ایک گجراتی ہیں۔ ویسے تو سکنڈ کلاس کے مسافر ہیں۔ لیکن سارا وقت ڈک کے مسافروں کی سنگت میں گذارتے ہیں۔ ایک پنجابی ہیں، پانی پت کے چشم و چراغ۔ شاعروں کے خاندان کے تمام لیوا۔ لیکن ان کو بھی شاعری سے اُسیقدر رغبت ہے جسقدر کہ جلیل صاحب کو افسوس کوئی بلبل ایسی نہ ملی جس سے میں یہ کہہ سکتا

"بنال بلبل اگر با من سر یاریست"

خیر جوں توں کر کے ارسٹ ید معین۔ عاتق۔ نوشہ اور محمود کو دل ہی دل میں یاد کرتا ہوا۔ سفر کے ایام طے کر رہا ہوں۔ ممباسا پر اُترنے کی اجازت مل گئی ٹیکسی کرایہ کر کے ہم سب شہر میں پہنچے شہر میں پہنچکر ڈاک خانہ کی تلاش کی۔ وہاں سے خیریت رسی کا تار گھر کو روانہ کیا۔ وہاں سے اسٹیشن پہنچے۔ اتفاقاً ایک بزرگ محمد عالم صاحب مل گئے۔ یہ صاحب لاہور کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے ہم لوگوں کو ہندوستانی سمجھ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور اپنے موٹر میں سارے شہر کا گشت کرایا۔ شہر کا انگریزی حصہ نہایت پاکیزہ اور صاف ہے۔ ہر جگہ سبزی اور شادابی نظر پڑی۔ یہاں کے انگریزی باشندے گولف بہت کھیلتے ہیں۔ یہاں خرید فروخت میں کافی دقت اُٹھانا پڑی۔ ہمارے پاس روپے تھے۔ یہ لوگ پونڈ شلنگ میں بات کرتے تھے۔ یہ اندازہ مشکل سے ہوتا تھا کہ چیز گراں ہے یا ارزاں۔ ممباسہ میں بیس پچیس سے زائد ہندوستانیوں کی دوکانیں ہیں۔ اور یہ لوگ بالعموم ہندوستان کے مغربی ساحل کے باشندے ہیں۔ ممباسہ میں پہلی مرتبہ حبشیوں کو دیکھا۔ یہ لوگ بالعموم بہت اونچی اونچی ترکی ٹوپیاں اوڑھتے ہیں۔ عام طور سے نہایت توانا اور تندرست ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر ذہانت بالکل نہیں ہوتی جسمانی لحاظ سے انہیں پیل تن کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کی عورتیں باہر نکلتی ہیں۔ مگر سر سے پاؤں تک ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی۔ پولیس کے سپاہی عام طور سے یہی حبشی ہوتے ہیں۔ سیاہ فام، سیاہ پٹیاں، اور سیاہ جرسی پہنتے ہیں۔ کمر میں پیٹی کسی ہوتی ہے۔ سر پر بہت بلند ترکی ٹوپی جس کا چھند نما بائیں جانب لٹکا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ترکی ٹوپیاں سرخ یا عنابی دیکھی گئیں یہاں سیاہ۔ سبز۔ خاکی۔ عنابی۔ سرخ ہر رنگ کی ملتی ہیں۔ چوراہوں پر یہ حبشی سپاہی کھڑا ہو کر ٹریفک پر حکومت کرتا ہے۔ مگر اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے ہوتے ہیں تاکہ شب کی تاریکی میں اس کا ہاتھ نظر آسکے۔ حبشی نہایت تنومند اور محنتی ہوتی ہے۔ یہ لوگ بالعموم مزدور پیشہ ہیں۔ لیکن یہ اسی حالت میں گمن معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سروں پر بہت چھوٹے اور گھنے بال ہوتے ہیں۔ یہی حالت عورتوں کی ہے۔ حبشیوں کے بالعموم بہت کم داڑھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ بالعموم انگریزی لباس میں ہوتے ہیں۔ ایک میلی سی پوسیدہ پتلون یا نکر گھٹے میں قمیص۔ سر پر فلٹ ہیٹ اور منہ میں چرٹ۔ تمباکو حقیقتاً ان کی غذا ہے۔ ناممکن ہے کہ آپ کسی حبشی کے منہ میں چرٹ نہ دیکھیں بعض بعض حبشی بھی انگریزی لباس پہنتے ہے۔ سر پر سیاہ رومال کسا ہوا۔ نیچے

باڈس اور نراک۔ چھوٹی ایڑی کا انگریزی جوتہ۔ اور ٹانگوں میں اونچے موزے مگر یہ لباس جہانتک میرا خیال ہے صنعتیوں کے دولتمند طبقہ میں پایا جاتا ہے۔ مہاسہ خط استوا پر واقع ہے۔ اس لئے یہ خطہ نہایت گرم ہے۔

یہاں سال میں دو مرتبہ خوب جم کر بارش ہوتی ہے۔ اس لئے پیداوار خوب ہوتی ہے۔ یہ دراصل کینیا اور یوگنڈا کا بندرگاہ ہے۔ ان مقامات پر ریلوے کے دفاتر بنکوں اور کارخانوں میں بہت کثرت کے ساتھ ہندوستانی بالخصوص پنجابی ملازم ہیں۔ اس بندرگاہ پر چوبیس گھنٹے قیام کیا۔ اس لئے ہمیں اس شہر کو دو مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ شہر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ساحل افریقہ کا یہ پہلا بندرگاہ ہے جس پر ہم نے قدم رکھا۔ مگر خیال ہوتا ہے کہ عربوں کے عروج کے زمانہ میں افریقہ کا یہ کل ساحل مسلمانوں کے قبضہ میں ہوگا۔ زنجبار کے سلطان کا یہاں ایک گورنر رہتا ہے۔ اغلباً یہ اسی عروج قدیم کی ایک یادگار ہے۔ بہرحال یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر شیخ رفیداؤ سید مبین، روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مباسہ میں مسلمانوں کا ایک ہائی اسکول بھی ہے۔ یہاں سے دو تین روزانہ اخبار بھی نکلتے ہیں۔ دس پانچ قومی کام کرنے والے بھی موجود ہیں۔ مگر یہ سب ہندوستانی ہیں۔ یہاں کا اصلی باشندہ اب تک خواب غفلت میں مست ہے۔ قہوہ خانوں میں آکر قہوہ پیتا ہے۔ شارع عام پر ان قہوہ خانوں میں شطرنج کھیلتا ہے۔ غلط سلط عربی بھی بول لیتا ہے۔ بدن پر چوغہ اور سر پر ترکوش اوڑھتا ہے۔ دل دل میں انگریزوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ لیکن عام طور سے خاموش رہتا ہے۔ اور بغیر سیاسی معاشرتی اور تعلیمی معاملات پر غور کئے ہوئے بے عمل و غش زندگی بسر کرتا ہے +

ماٹی ڈیہ نیرنگ خیال! میں علیگڑھ اور ساحل ہند سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر ہوں۔ اور جہاز کا طاقتور انجن روز مجھے سینکڑوں میل بعید تر کر دیتا ہے۔ دعا کیجئے کہ پھر جلد ہندوستان کا ساحل نظر پڑے۔ اور دوستوں کی آغوش محبت میں آسودگی حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔ جدائی کے صدموں سے جب کبھی بیتاب ہوتا ہوں۔ تو یہ الاپنے لگتا ہوں:-

بنا کی ہجر کی راتوں کو بے نیاز سحر تعینات کے پردے اُٹھا دیئے تو نے

خدا گواہ ہے کہ یہ شعر کم از کم ڈیڑھ ہزار مرتبہ ادا کر چکا ہوں گا۔ مگر افسوس ہے تو اس کا کہ اس کی صدائے بازگشت سننے میں نہیں آتی۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ کہیں میرا الاپنا صدائے صحرا کے ہم پایہ نہ ہو۔ آہوں میں کمی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ کیا عجب ہے کہ محل کا یہ دہ بھی ہلنے لگا ہو +

باقی پھر عرض کرونگا +

خاکسار عبدالشکور

ثریّا

عہدِ حاضرہ کا بہترین معاشرتی ناول

نذر سجاد حیدر کے قلم سے

(صرف ۷۵ جلدیں باقی ہیں)

ہندوستان کی تمہرہ آفاق ادیبہ محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ کا لاجواب شاہکار ہے۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے۔ جو نیرنگ خیال میں بالاقساط چند ماہ تک شایع ہوتا رہا۔ لیکن اسطرح سے اس کا لطف زائل ہو رہا تھا ہم نے اسکی اشاعت کو روک کر اسے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ یہ ناول اسقدر دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت رعایتی صرف ۱۲

منگانے کا پتہ:- مینیجر نیرنگ خیال پٹکڈپو۔ بارود خانہ لاہور

آرٹ کا ایک مجسّمہ

از جناب محمد عطاء الرحیم۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز بغل میں دبائے ہوئے ساشا سمیر نوف اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا گھبرایا ہوا ڈاکٹر کوشلخوف کے آفس میں داخل ہوا۔

"کہو پیارے بچے تمہاری طبیعت اب کیسی؟ سب خیریت تو ہے؟" بچے نے نیم باز آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ایک ہاتھ دل پر رکھا اور لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا:۔

"میری ماں نے آپ کو آداب کہا ہے اور آپ کا شکریہ ادا کیا ہے ——— میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں ——— اور آپ نے میری جان بچائی ——— ہم دونوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا شکریہ کیسے ادا کریں"۔

"میاں تم بھی کیا باتیں کرتے ہو" ڈاکٹر نے بات کاٹ کر اور خوش ہو کر کہا "میں نے صرف وہی کیا جو میری جگہ کوئی اور کرتا"۔

"میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں ——— ہم غریب لوگ ہیں۔ آپکی محنت کا صلہ دینا ہماری بساط سے باہر ہے۔ اس لئے ہم دونوں بہت پشیمان ہیں۔ اماں اور میں جو کہ اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ ہم دونوں کی یہ آرزو ہے کہ ہم دونوں کی طرف سے یہ ناچیز تحفہ قبول کریں ——— یہ نہایت ہی کمیاب اور بیش قیمت صنعت گری کا نمونہ ہے۔ اور زمانہ قدیم کے اُستادوں کا شاہکار ہے"۔

"میاں تم فضول تکلیف کرتے ہو۔ مجھے اس کی مطلق ضرورت نہیں" ڈاکٹر نے منہ بنا کر کہا۔

"نہیں۔ نہیں" ساشا نے ہکلاتے ہوئے کہا:۔

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس کو قبول فرما دیں"۔

اُس نے کاغذ کو تار تار نا شروع کیا مگر اپنی التجا کو اس عرصہ میں بھی برابر جاری رکھا۔

"اگر آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مجھے اور اماں دونوں کو سخت تکلیف ہوگی۔ یہ انسانی صنعت گری کا نہایت ہی کمیاب نمونہ ہے۔ یہ میرے والد مرحوم کی نشانی ہے۔ میرے والد زمانہ قدیم کے مجسّمے اور تصویریں خریدا کرتے تھے اور امرا اور شوقین لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ اب ہم دونوں ——— میں اور اماں ——— اس تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہیں"! ساشا نے کاغذ اُتار کر نہایت انبساط میں اُس چیز کو میز پر رکھا۔

یہ ایک شمعدان تھا جو کہ نہایت ہی مرصّع اور زمانہ قدیم کی ہنرمندی اور صنعت گری کا نہایت ہی بہترین نمونہ تھا۔ ایک اونچی سی جگہ پر چند عورتوں کے مجسّمے تھے۔ یہ حضرت حوّا کے لباس میں ملبوس کچھ اس انداز میں کھڑی ہوئی تھیں کہ اس کو بیان کرنے کی نہ تو مجھ میں جرأت اور نہ ہمت۔ ایک نہایت ہی دلربا یا نہ تبسم ان کے لبوں پر تھا اور دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان کو نگرانی شمع کے فرائض سے فراغت مل جائے۔ تو یہ نیچے کود کر اس طرح کا رقص دکھائیں کہ ——— میں اس کے خیال سے بھی شرماتا ہوں۔

ڈاکٹر نے جونہی اس تحفہ کو دیکھا تو انہوں نے سب سمجھا لیا۔ کھانسی آئی۔ ناک صاف کی اور گویا ہوئے:۔

"ہے تو نہایت ہی کار۔ گری کی چیز" ڈاکٹر صاحب کچھ رُک رُک کر کہنے لگے "لیکن ——— میں کیا بیان کروں ——— ذرا یہ ——— میرا مطلب یہ ہے ——— ذرا مذاق عام سے مختلف ہے ——— اب کا عنصر تو اس میں کچھ ہے نہیں۔ تم سمجھے ——— لاحول ولا قوۃ ———"

"کیوں؟"

"کیوں؟ اس لئے کہ شیطان بھی اس سے زیادہ کوئی چیز بدصورت پیدا نہیں کر سکتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان ناپاک تصویروں کو میز پر رکھ میں اپنے تمام مکان کو نجس کر دونگا"۔

"ڈاکٹر صاحب فنون لطیفہ کے متعلق آپ کے خیالات کس قدر عجیب ہیں"۔ ساشا نے بگڑ کر کہا۔ "یہ تو کسی اُستاد کا شاہکار ہے۔ ذرا اس کی طرف دیکھئے تو۔ کمالِ فن کو تو ملاحظہ کیجئے۔ ہر مجسمے کا جوڑ جوڑ سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے تخیل سے روح کو وجد آتا ہے۔ ایک آہ خود بخود گلے تک آکر رُک جاتی ہے۔ اس قسم کے حُسنِ کامل کو دیکھ کر انسان دنیا اور دیگر علائق کو بھول جاتا ہے۔ ہو ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جان پڑی ہو ——— ذرا شوخئے پا کو تو دیکھئے۔ خیال تو کیجئے کہ کن کن کیفیات کو صنّاع نے مجسّم کر کے سامنے کھڑا کر دیا ہے"۔

"میاں" ڈاکٹر نے بات کاٹ کر کہا "میں ان تمام باتوں کو سمجھتا ہوں۔ مگر میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ اس کمرہ میں چھوٹے چھوٹے بچے آتے ہیں۔ عورتیں آتی جاتی ہیں"۔

"ضرور" ساشا نے کہا "اگر آپ اس کو جاہل غیر مہذب لوگوں کی نگاہ سے دیکھیں گے تو آپ کو یہ شمعدان ضرور مذاق سلیم سے گرا ہوا معلوم ہوگا۔ مگر آپ کا مطمحِ نظر تو ان لوگوں سے اونچا ہونا چاہئے تھا۔ اور اس لئے بھی کہ اگر آپ نے اس تحفہ کو قبول نہ کیا تو آپ مجھے اور اماں کو سخت اذیت پہنچائیں ——— میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں ——— اور آپ نے میری جان بچائی ہے ——— اس لئے ہم دونوں آپ کو اپنی عزیز ترین چیز تحفہ میں دیتے ہیں ——— افسوس صرف اتنا ہے کہ میرے پاس اس کا جوڑا نہیں"۔

"شکریہ ——— بہت بہت شکریہ ——— اپنی والدہ سے میرا سلام کہنا ——— مگر خدا کے لئے آخر تم خود اس بات کو سمجھ سکتے ہو ——— چھوٹے چھوٹے بچے اس کمرہ میں آتے جاتے رہتے ——— اور خواتین بھی یہاں اکثر آتی ہیں ——— مگر خیر اس شمعدان کو یہیں رکھ دو۔ تم سے بحث فضول ہے"۔

"آپ ڈاکٹر صاحب کیا فرما رہے ہیں"۔ ساشا نے خوش ہو کر کہا۔ "اس کو گلدان کے پاس رکھ دیجئے۔ مگر حیف وصد ہزار حیف کہ میرے پاس اس کا جوڑا نہیں۔ خیر مجبوری ہے ———"

ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتا ہوا ساشا رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب بہت دیر تک اس کو دیکھتے رہے اور سر کھجلاتے رہے۔

"یہ خوبصورت تو ضرور ہے۔ اس کو پھینکنا تو نہیں چاہئے۔ مگر اسکو میں یہاں رکھ بھی نہیں سکتا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ دنیا میں کون ایسا آدمی ہے کہ جس کو میں یہ شمعدان تحفہ میں دے دوں"۔

بالآخر بہت دیر سوچنے کے بعد اوخوف وکیل کا نام اُن کے ذہن میں آیا۔ جن سے کہ وہ قانونی مشورے لے چکے تھے۔ اور جن کی فیس اب تک ادا نہیں کی تھی۔

"کیا خوب" ڈاکٹر صاحب نے تبسم کے ساتھ فرمایا۔ "چونکہ اوخوف سے مجھ سے دوستی زیادہ ہے اس لئے وہ مجھ سے روپیہ تو لیں گے نہیں۔ اس لئے میں اس مجسمۂ بیحیائی کو اُن کے نذر کر دونگا۔ اور اس تحفہ کے لئے وہ بالکل موزوں ہیں۔ خیر شادی شدہ ہونے کے علاوہ عیش و نشاط کے دلدادہ بھی ہیں"۔

اس خیال کے آتے ہی ڈاکٹر صاحب نے اسکلی جامہ پہنایا۔ فوراً کپڑے پہنے شمعدان کو ہمراہ لیا اور اوخوف کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"میں آج تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تم مجھ سے روپیہ تو لیتے نہیں۔ اس لئے میں تم کو کسی اُستاد کا شاہکار نذر کرتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ یہ لاجواب ہے یا نہیں؟" اس کو دیکھتے ہی وکیل صاحب کہنے لگے:۔

"واہ وا! ——— کاریگری کا کس قدر تحیّر خیز نمونہ ہے۔ یا اللہ ان صنّاعوں کے دماغ میں بھی کسقدر عجیب عجیب خیالات آتے ہیں۔ یہ کس قدر دلفریب حسن کا نمونہ ہے۔ یہ تو بتاؤ یہ تم کو مل کیسے گیا؟"

جب ذرا وکیل صاحب کا جوش کم ہوا۔ تو پریشانی اور گھبراہٹ نے فوراً خوشی کی جگہ لے لی۔ اور وہ کن انکھیوں سے دروازہ کی طرف بار بار دیکھنے لگے۔

"مگر بھائی میں اس تحفہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ تم اس کو فوراً واپس لے جاؤ"۔

"کیوں؟" ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔

"اس لئے ——— اس لئے ——— کہ میری والدہ اکثر یہاں آتی ہیں ——— اور میرے موکل ہمیشہ یہاں آتے ہیں ——— اور اس کے علاوہ میں اپنے نوکروں کی نگاہ میں بھی ذلیل ہو جاؤنگا"۔

"بس چپ رہو! تم کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ کسقدر تم کو ذوق آدمی ہو ——— اسقدر خوبصورت چیز ——— اس کی بناوٹ ——— اسکی کاریگری ——— میں تم سے خفا ہو جاؤنگا اگر تم نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا"۔

"کاش کہ ان کا جسم انگور کی بیلوں ہی سے ڈھکا ہوتا ———" وکیل صاحب نے کہنا شروع کیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے ایک نہ سنی اور اس تحفہ کو اوخوف کے سر مار جلدی سے گھر کے باہر آ گئے اور وہاں پہنچکر اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر اس شمعدان سے گلو خلاصی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے جاتے ہی وکیل

نے سوچنا شروع کیا کہ شمعدان کا کیا کیا جائے +

"کسقدر خوبصورت چیز ہے! اس کو پھینکنا تو چاہئے نہیں مگر اس کا رکھنا نہایت ہی شرمناک ہوگا ——— مجھے بھی کسی اور کو نذر کر دینا چاہئے +

"ٹھیک ہے۔ میں اس کو سوشکن مشہور ایکٹر کو آج ہی شام کو دیدونگا۔ اس کو ایسی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ اور پھر آج رات کو کمپنی کا خاص تماشہ بھی ہونے والا ہے۔ مفت پاس ملنے میں آسانی ہوگی"+

اس مرتبہ بھی خیال آتے ہی اس پر عمل ہو گیا۔ اسی سہ پہر کو وہ شمعدان کاغذ میں لپیٹ کر سوشکن کو الکر دیدیا گیا۔ تمام شام اس کا کمرہ آدمیوں سے بھرا رہا۔ جو کہ غول در غول اس شمعدان کو غور سے دیکھتے رہے۔ اس تمام عرصہ میں کمرہ قہقہوں کی آواز سے گونجتا رہا۔ جن میں اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں بہت زیادہ مناسبت تھی۔ اگر کوئی ایکٹرس دروازہ پر آکر دستک دیتی تو سوشکن گھبرا کر کہتا کہ:-

"نہیں نہیں مجھے ذرا معاف کرنا۔ میں نے ابھی تک ٹھیک سے کپڑے نہیں پہنے"۔ تماشہ کے بعد ایکٹر نے غور کرنا شروع کیا +

"آخر میں اس کا کیا کروں؟ ——— میں اس کمرہ میں رہتا ہوں یہاں کئی ایکٹرس آتی رہتی ہیں۔ اور یہ کوئی تصویر تو ہے نہیں کہ آدمی الماری میں فوراً چھپا دے"+

"اس کو بیچ کیوں نہیں ڈالتے"، مصنوعی بال بنانے والے نے کہا۔

"ایک عورت ہے جو اس قسم کے عجائبات اور قدیم زمانہ کے صناعی کے نمونے کی تجارت کرتی ہے۔ اس کا نام سمیر نوا ہے ——— تم ابھی چلے جاؤ ——— اس کو ہر کوئی جانتا ہے۔ اور کوئی بھی تم کو اس کا مکان بتا دے گا"+

ایکٹر نے فوراً اس نصیحت پر عمل کیا +

———+———

دو دن کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک ہاتھ سے سر کا سہارا دیئے ہوئے اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ سے دوا کی گولیاں بنا رہے تھے۔ یکبارگی دروازہ کھلا۔ ساشا ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ مسکراہٹ سے اس کا چہرہ روشن تھا۔ خوشی میں اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز اخبار میں لپٹی ہوئی تھی +

"ڈاکٹر صاحب میں بھی کتنا خوش قسمت ہوں۔ آج میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ مجھے آپ کے شمعدان کا جوڑا مل گیا۔ اماں بہت خوش ہیں ——— میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں ——— آپنے میری جان بچائی"+

خوشی اور شکر کے ادا کرنے میں ساشا دُہرا ہو ہو جا رہا تھا۔ اور اس نے شمعدان کو میز پر رکھا +

ڈاکٹر صاحب نے اپنا دہن مبارک وا کیا۔ جیسے کہ کچھ کہنا چاہتے ہوں ——— مگر ایک لفظ بھی زبان سے نکلا ——— ان کی قوت گویائی نے تھوڑی دیر کے لئے بالکل جواب دیدیا +

(چیخوف)

احسان فراموشی

موسم سرما کی تُند ہوا تو چل، تو نہ تھم، آہ تو ایسی تکلیف دہ نہیں جیسی انسان کی احسان فراموشی +

تیرے دانت اسقدر تیز نہیں کیوں کہ تو کبھی دکھائی نہیں دیتی۔ گو تیری سانس قدرے تکلیف دہ ضرور معلوم ہوتی ہے + دنیا کی دوستی صرف ظاہری ہے.....

پس۔ کھیلیں کودیں، گانے گائیں..... یہ زندگی سب سے بہتر ہے +

سخت و نامہربان آسمان! تو سرد ہوتا چلا جا۔ تو ایسا تکلیف دہ نہیں۔ تیرا طیش اسقدر زہریلا نہیں جیسا انسان کی دوست فراموشی +

دنیا کی دوستی صرف ظاہری ہے +

پس کھیلیں کودیں، گانے گائیں..... یہ زندگی سب سے بہتر ہے +

(ترجمہ از شیکسپیئر) شہاب الدین رحمت اللہ

نپولین کی سماجی کمزوریاں

دُنیا کے نامور ترین جرنیل کی حیاتِ عشقیہ

تاریخ کے چند غیر معروف دلچسپ اوراق

(از جناب منظور سروش صاحب سروی فاضل بھوپالی)

مورخین نے جس کثرت سے نپولین بوناپارٹ کے حالات و واقعات قلمبند کئے ہیں۔ آج تک کسی دوسرے شخص کے متعلق اس کثرت سے حالات نہیں لکھے گئے۔ لیکن اُس کے حالات اور اُس کے جنگی کارناموں سے اگر بڑی بڑی ضخیم مجلدات بھری پڑی ہیں۔ تو یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ کیونکہ آج تک کوئی انسان اُس کے برابر عظیم الشان لڑائیاں نہیں لڑا۔ اور نہ کسی کو ایسی غیر معمولی فتوحات نصیب ہوئیں۔ چنانچہ اسی کا ثمرہ ہے کہ آج دنیا کا بچہ بچہ اس کے کارناموں کا مدّاح و معترف ہے۔ اور اس کا سخت ترین مخالف بھی اس حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا ✦

تاہم، اس بطل اعظم کی تمام تر شہرت بالعموم چند فوجی کارناموں کی رہینِ منّت ہے۔ اور دنیا اس کی اندرونی و خانگی زندگی سے بہت کم واقفیت رکھتی ہے۔ اس لئے ہم یہاں تاریخ کے اُن نادر نقوش کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا تعلق اُس کی "حیاتِ عشقیہ" سے ہے۔ اور جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "وہ صنفِ لطیف" کے مقابلہ میں اُس کے طریق کار کی کیا نوعیت تھی؟

نپولین کے الفاظ میں عشق "کاہل اشخاص کے لئے سامانِ تسکین" کا نام ہے۔ لیکن شاید اس نے یہ رائے حسن کے ساحرانہ تاثرات سے دو چار ہونے سے قبل قایم کی تھی۔ کیونکہ یہ ایک مسلّمہ واقعہ ہے کہ نپولین کے برابر کوئی دوسرا حسن کا پرستار نہیں گزرا ✦

نپولین اپنے عہدِ طفلی میں پیرس اور مارسیلز کی گلیوں میں جس طریقہ سے گھوما کرتا تھا اُس میں فارغ البالی کی نسبت حسرت و احتیاج کا عنصر زیادہ قوی نظر آتا ہے۔ جوتے پھٹے پُرانے۔ لباس بوسیدہ اور ادنیٰ درجہ کا۔ بال خشک اور اُلجھے ہوئے۔ بدن میلا کچیلا۔ چہرہ سے پریشانی اور بیکسی برستی ہوئی! مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی اُسے دیکھ کر افلاس و احتیاج کا ایک واضح نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ اور اگر اُس کے حسین گھونگر والے بالوں سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو حسن و جمال کے اعتبار سے بھی اسے کوئی نمایاں خصوصیت حاصل نہ تھی اس کے باوجود مورخین کا قول ہے کہ اکثر خواتین نے اُس سے بے اختیارانہ محبت کی! شاید اس کے حیا پرور انداز اور مخصوص کیفیت آگیں "گداز دسل" میں، جو اکثر اس پر طاری رہتا تھا۔ اس کی جاذبیت و دلکشی کا راز مضمر تھا!!

کہا جاتا ہے کہ جب وہ فائنسہ میں مقیم تھا۔ شہر کی اکثر نوجوان حسین ترین عورتیں اس پر فریفتہ تھیں، لیکن ان میں سے صرف کیرولائن کو لوبیرا اس کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ نپولین نے اس کے متعلق اپنے آخری ایام میں لکھا ہے:-

"یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں ہم دونوں سے بڑھ کر کوئی فائز المرام

اور شاد کام نہ ہوگا۔ ہم ایک ایسی پاکیزہ زندگی سے متمتع ہو رہے تھے کہ جو کسی کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی!..... ہم دونوں اکثر دیہاتی سبزہ زاروں اور باغات کی طرف نکل جاتے وہاں درختوں میں جھولا جھولتے۔ فواکہات کھاتے چشموں کا بہتا ہوا شفاف پانی پیتے۔ اور فطرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے! ایسا اوقات اسی طرح شہر کے ہنگاموں اور تمدن کے شور و غل سے دُور ــــ مسلسل کئی کئی دن گذار دیتے"+

لیکن مرورِ ایام کے ساتھ نپولین کا یہ جوشِ عشق بھی سرد پڑتا گیا۔ اور چند ماہ میں دونوں نے ایک دوسرے کو فراموش کر دیا+

بعد ازیں اُس نے جزیرہ کورسیکا کی ایک نوعمر دوشیزہ سے محبت کی پینگ بڑھائی۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ لیکن نپولین کی غیرت عاشقانہ بے اعتدالی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ صرف اتنی بات پر اُس سے ناراض ہو گیا کہ اُس نے کسی نوجوان سے مسکرا کر بات کر لی تھی۔ جب اُسنے نپولین کا یہ عالم دیکھا۔ تو اُس کی محبت نفرت سے تبدیل ہو گئی۔ اور اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو نپولین سے گلو خلاصی حاصل کر لے۔ یہانتک کہ اُس نے شراب میں زہر ملا دیا۔ اس رات نپولین زندگی کی بہ نسبت موت سے قریب تر ہو گیا تھا+

کچھ عرصہ کے بعد ایک دوسری خاتون میڈم پرمون نامی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور نپولین سے تقریباً ۲۰ سال بڑی۔ لیکن نپولین پر عشق نے ایسا غلبہ کیا کہ اُس کے بغیر ایک لمحہ چین نہ آتا تھا۔ مگر جب نپولین نے اُس سے شادی کی درخواست کی تو وہ بہت ہنسی اور کہا۔ تم لوگوں کو اپنے اوپر کیوں ہنساتے ہو؟ میری عمر کو دیکھتے ہوئے مجھ میں تمہاری بیوی بننے کی بجائے تمہاری "والدہ" بننے کی زیادہ صلاحیت ہے مناسب یہی ہے کہ اس محبت سے جو تمہیں ہم چشموں میں مضحکہ بنا دے قطع نظر کر لو"! یہ سُنکر نپولین اُس کے پاس سے واپس چلا آیا۔ اور عزم کر لیا کہ آئندہ کے لئے اُس کا خیال دل سے قطعاً بھلا دیگا+

چنانچہ دن کے بعد ایک مشہور ایکٹریس مونٹانسیہ پر مفتوں ہو گیا۔ یہ عمر میں اُس کی والدہ سے بھی زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ اُس کی پہلی شادی نپولین کے پیدا ہونے سے تیرہ سال قبل ہوئی تھی ــــ اور "بارراس" نے لکھا ہے۔ کہ اس وقت اُس کی عمر ستر سال کے قریب تھی! مگر کچھ دن بعد اُس سے بھی برگشتہ التفات منقطع کر لیا۔ اور سایہ فگنی میں طلب مجد و شہرت کی جانب متوجہ ہو گیا+

ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ عام طور پر نپولین کا سلوک صنفِ نازک کے ساتھ بہتر نہ تھا۔ وہ انہیں اپنی محبت کا یقین دلاتا اور اُن سے محبت کا متمنی ہوتا۔ لیکن جب عورت کے دل میں اُس کا خیال جاگزیں ہو جاتا تو اُس سے قطع تعلق کر لیتا اور اُس کی مایوسی و ناامیدی کی قطعاً پرواہ نہ کرتا۔ اس کا اندازہ میڈم فالسکا کے مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ وہ غضب کی حسین تھی اور نپولین کی تمنا تھی کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو اُس کا تقرب حاصل کرے لیکن وہ کچھ خطرناک پولین سے فیر مانوس تھی۔ نپولین نے بہت کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر ایک دن اُسے غصہ آگیا۔ اور گرج کر بولا "تجھے عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ میں تجھے کیونکر مطیع کرتا ہوں۔ اُس وقت تو مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہوگی۔ اس گھڑی کو جو میرے ہاتھ میں ہے دیکھ۔ جس طرح میں اسے چور چور کئے دیتا ہوں اسیطرح ــــ اگر تو نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ــــ تو میں پولینڈ[1] کی سلطنت کو ریزہ ریزہ کر ڈالوں گا۔ پیس ڈالونگا!!!" یہ کہہ کر گھڑی کو زور سے دیوار پر مارا۔ اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی ــــ میڈم فالسکا اس درجہ متاثر ہوئی کہ اُسے غش آگیا اور بیہوش ہو کر نپولین کے قدموں کے پاس گر پڑی ــــ جب اُسے ہوش آیا۔ ــــ تو نپولین نہایت توجہ اور دلسوزی سے اُس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کے بعد دونوں میں بہت ربط ضبط بڑھا۔ لیکن یہ محبت بھی چنداں دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور دوسری عورتوں کی طرح میڈم فالسکا کے عشق کا بھی انقطاع تعلقات پر خاتمہ ہوا+

اس شخص کے استبداد کے متعلق ــــ خصوصاً معاملاتِ محبت میں استبداد کے متعلق ــــ لطیف ترین واقعہ یہ ہے:-

جب وہ ایک معمولی شہری کی طرح مارسیلز میں مقیم تھا۔ اتفاق سے اُسی دور ان میں ایک مقامی تاجر کے خاندان میں اُس کی اور اُس کے بھائی کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس تاجر کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام جولیا تھا۔ اور چھوٹی کا بزیڈ نپولین نے جولیا سے۔ اور اُس کے بھائی نے چھوٹی بہن سے مراسم بڑھانے شروع

[1] میڈم فالسکا پولینڈ کی رہنے والی تھی+

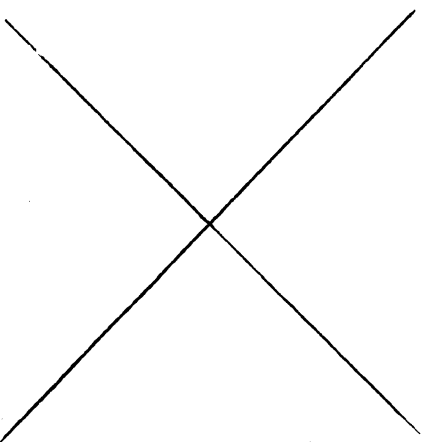
کئے اور بالآخر ان میں آپس میں نسبت قرار پاگئی۔ کچھ دن کے بعد نپولین نے محسوس کیا کہ وہ اس معاملت میں خسارہ میں ہے۔ اُس نے سوچا کہ اپنے بھائی کے ساتھ نسبتوں کا باہمی تبادلہ کرلے۔ اتفاق سے ایک دن چاروں ایک جگہ جمع ہوگئے نپولین نے اپنے بھائی کو مخاطب کرکے کہا "جوزف! تم اپنے معاملات میں بہت غیر مستقل مزاج واقع ہوئے ہو۔ اور یہی حال تمہاری منسوبہ کا ہے۔ مگر میرا اور میری منسوبہ کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہے" پھر دیزیرہ کو اپنی جانب کھینچکر کہا۔ "اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میری نسبت دیزیرہ سے ہو جائے اور تم جولیا کو اپنے عقد میں لے آؤ!!" اس طرح یہ مبادلہ بآسانی مکمل ہوگیا اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی۔ کہ اس کے خلاف اعتراضاً ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے لیکن اس کے کچھ دن بعد نپولین کو احساس ہوا کہ وہ شاہراہ ترقی پر تیزی سے گامزن ہے۔ اور اُس کے سامنے شہرت و عزت کا وسیع ترین میدان کھلا ہوا ہے۔ پس اُس نے دیزیرہ سے ـــــ باوجود اُس کی اشکبار ی و احتجاج کے ـــــ اپنے تمام تعلقات منقطع کرلئے۔ اور جلد ہی اُس کی یاد دل سے بھلا کر ایک دوسری نازنین کی رعنائیوں میں کھو گیا۔ جسے اُس کی تاریخ حیات میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ میری مراد جوزیفائن یا وائیکونٹس بوہارینہ سے ہے!

جوزیفائن اور نپولین کے تعلقات کی ابتدا اکتوبر ۱۷۹۵ء سے ہوتی ہے اُس وقت نپولین کا طائر اقبال شہرت کی فضاؤں میں پرواز کے جوہر دکھانے لگا تھا۔ اور عروس فتح اُس کے رایات سے ہمکنار ہونے لگی تھی۔ ایک دن اُسکے پاس ایک کمسن بچہ آیا اور یہ عرض کرنے کی اجازت چاہی کہ اُس کے والد کی تلوار اُسی کے پاس رہنے دی جائے۔ نپولین بچہ کی اولوالعزمی اور خوش بیانی سے بہت خوش ہوا۔ اور اُس کی درخواست منظور کرلی۔ دوسرے دن بچہ کی ماں جوزیفائن[1] دی بوہارینہ اس حسن سلوک کے لئے نپولین کا شکریہ ادا کرنے آئی جونہی نپولین نے اُسے دیکھا۔ نگاہ اوّلین میں متاع صبر و خود اُس کے قیامت خیز حُسن کے اندر کھو بیٹھا +

دوسرے ہی دن نپولین جوزیفائن کے مختصر مکان پر اس سے ملنے کے لئے جا موجود ہوا +

جوزیفائن اسے اپنے بے حیثیت عزت کدہ پر دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ کیونکہ نپولین کی شخصیت اُس وقت بھی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ اور فرانس کا ذرہ ذرہ اُس کی شہرت سے روشناس ہو چکا تھا۔ اس ملاقات نے نپولین کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ کیونکہ جب سے اس نے جوزیفائن کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی تھی۔ وہ اپنے دل میں ایک خاص اُمنگ اور غیر معمولی ولولہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں ایک اور صرف ایک خیال بسا ہوا تھا اور وہ خیال جوزیفائن کا تھا! اس وقت سے ایک لمحہ کے لئے بھی جوزیفائن کی تصویر خیالی اُس کی آنکھوں کے سامنے سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے لئے جوزیفائن کا قرب حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا +

مورخین کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ جوزیفائن کی ساحرانہ رعنائیاں دیکھتے ہوئے نپولین کی یہ بے قراری کوئی غیر معمولی چیز نہ تھی۔ جب دیکھنے والے کی نگاہیں اُس سے چار ہوتیں تو اُسے اپنے سامنے نزاکت و لطافت کا ایک مجسمہ



نظر آتا۔ جس کی مخمور آنکھوں۔ صاف اور شباب آگیں رخساروں۔ شاداب مرمریں رنگت، گداز، لوچدار اور متناسب جسم۔ قیامت آفریں اُٹھاں چڑھاؤ۔ موزوں اور جاذب توجہ قد و قامت اور پھر سب کے بعد لیکن سب سے زیادہ قاتل شیریں نرم اور نغمہ آفریں آواز میں وہ کھو جاتا۔ جذب ہو جاتا۔ اور مسحور سا رہ جاتا!!!

جوزیفائن بھی سمجھ گئی کہ نپولین دامِ عشق میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اُسے اپنا ستارۂ سعادت بلند ہوتا محسوس ہوا۔ غیر معمولی اسراف کے تخیل میں مشغول

[1] جوزیفائن کے شوہر اوّل کا نام وائیکونٹ الگزنڈر بوہارینہ تھا۔ وہ فرانس کے مشہور جنیلوں میں ہے۔ انقلاب فرانس کے زمانہ میں اُس کے لئے موت کا فتویٰ صادر ہوا اور ۱۷۹۴ء میں اس فتویٰ پر عملدرآمد ہوا (مترجم)

جو کچھ ترکہ میں چھوڑا تھا سب تباہ ہو چکا تھا۔ اور جو زیفائن قرضوں سے غیر معمولی طور پر گرانبار ہو رہی تھی۔ لہٰذا اُس کے لئے بھی سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ نپولین کی محبت کا جواب محبت سے دے۔ اور اس پر اپنے میلانِ طبع کا اظہار کرے۔ اس معاشقہ باہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ ۱۷۹۲ء میں جنرل نپولین بوناپارٹ کا عقد جوزیفائن دی بوہارنیہ سے ہو گیا۔ نکاح کے وقت جوزیفائن کی عمر نپولین سے سات سال زیادہ تھی۔ لیکن شادی کی سند میں جوزیفائن کی عمر ۲۹ سال اور نپولین کی عمر ۲۶ سال درج کی گئی +

شادی کے صرف دو دن بعد نپولین اُس سے رخصت ہو کر اپنی فوج میں شریک ہونے کے لئے اٹلی روانہ ہو گیا۔ لیکن اس طرح روانہ ہوا کہ آسکا دل جوزیفائن کے پاس تھا۔ اُس کی بیتابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ہر منزل سے جوزیفائن کے پاس اپنے حالات اور الم فراق کی صعوبتیں بیان کرنے کے لئے ایک قاصد روانہ کرتا جاتا تھا۔ اسے اپنے پہلے خط میں لکھتا ہے

"جب میں اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں اور مجھے اس میں تیرا دھوکہ محسوس ہوتا ہے تو ——— ایک ناقابل بیان مسرت کی موج میرے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے ..... مجھے آجکل الم فراق کے سوا دنیا کا کوئی امر اہم نظر نہیں آتا ——— !"

اُس کی تصویر دن رات نپولین کے حرزِ جان رہتی۔ جب کسی منزل پر پہنچتا اُسے اپنے سامنے رکھ لیتا۔ اور جب کوچ ہوتا جیب میں ڈال لیتا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی عالم میں جب وہ نیس پہنچا تو وہاں اُس کے ہاتھ سے ایک آئینہ چھوٹا اور گرتے ہی چور چور ہو گیا۔ اس معمولی واقعہ کو نپولین نے فالِ بد تصور کیا۔ اُس پر اس کا گہرا اثر ہوا اور اُس کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کی تصویر پھر گئی۔ اسی حالت میں بیٹھا اور جوزیفائن کو خط لکھا۔ جس میں تحریر تھا:-

"کاش تجھے قوت پرواز حاصل ہوتی اور تو اُڑ کر میرے پہلو میں آ بیٹھتی !!!"

مگر جوزیفائن کے مشاغل کی دلچسپیاں اُسے نپولین کے پاس جانے کی کہاں اجازت دے سکتی تھیں ؟ اُسے دارالسلطنت میں جو مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ اُس پر بڑے بڑے دولت و ثروت والے رشک کرتے تھے۔ تمام پیرس اُسے عظمت و استعجاب کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور ہر شخص اُس کی ہمسائیہ نشینی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا +

یونہی ہفتہ پر ہفتہ گزرتا چلا گیا۔ اس عرصہ میں نپولین نے متعدد معرکوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جو اُس کی تاریخ مجد و رفعت میں کئی نئی صفحات کے اضافہ کا باعث ہوئے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کے دماغ سے جوزیفائن کے خیال کو محو نہ کر سکا۔ روزانہ اُسے کئی کئی خط لکھتا جن میں اس درجہ سوز و گداز سے جذباتِ شوق کی لطیف ترجمانی ہوتی کہ شاید کسی عاشق نے بھی اپنے محبوب کو ایسے پُرکیف اور والہانہ انداز میں مخاطب نہ کیا ہوگا۔ آخر میں وفور اشتیاق کے عالم میں اُسے اپنے پاس بلانے کے لئے لکھنا شروع کیا۔ لیکن جوزیفائن پیرس کی دلچسپ زندگی کو ایک ایسی زندگی سے تبدیل نہیں کر سکتی تھی جو خطرات جنگ میں گھری ہوئی ہو۔ اور جس میں سکون خاطر اور اطمینان قلب کا کوسوں پتہ نہ ہو۔ نپولین نے اس معاملہ میں بار بار لکھا۔ اور وہ ہر مرتبہ بلطائف الحیل ٹالتی رہی۔ یہاں تک کہ نپولین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اور اُس نے نہایت سختی سے ترش لہجہ میں جوزیفائن کو اپنے پاس چلے آنے کا حکم دیا۔ اب اُس نے ایک نیا عذر تراش لیا۔ اور لکھا کہ میں حاملہ ہوں اور اس قابل نہیں ہوں کہ مشقت سفر برداشت کر سکوں۔ جب نپولین کو یہ معلوم ہوا تو فرطِ مسرت سے اُس کی حالت متغیر ہو گئی اور معذرت چاہتے ہوئے لکھا کہ:-

"میری جان و دل کی مالکہ! مجھے معاف کر دے۔ میں جلد بازی کر کے ایک ایسی خطا کا مرتکب ہو گیا ہوں کہ مجھے اس کی تلافی کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا ——— میں نے باوجود تیری علالت کے تجھے اتہام لگایا کہ تو پیرس چھوڑنا پسند نہیں کرتی ——— محبت آدمی کے حواس گم کر دیتی ہے۔ اور وہ اس بے خبری کے عالم میں اپنی غلطیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا ..... کاش مجھے ایک ہی دن کے لئے تیرا فریب نصیب ہو جائے ——— !!"

اس کے ساتھ اپنے بھائی جوزف کو لکھا:-

"جوزیفائن کی علالت نے میرے ہوش پراگندہ کر دیئے ہیں۔ کاش میں اُسے دیکھتا اور اُس سے بغلگیر ہو سکتا۔ اس کے ساتھ میری محبت جنون کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اور اُس کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے۔ اگر خدانخواستہ اس کی جان کو کوئی صدمہ پہنچ گیا تو میری حیات مستعار کا بھی خاتمہ سمجھنا چاہیئے"

لیکن کچھ دن کے بعد نپولین کو معلوم ہوا کہ جوزیفائن دراصل بیمار نہیں تھی۔ بلکہ وہ تفریحی دعوتوں اور تماشبینی دلچسپیوں میں پیشتر سابقی برابر حصہ لیتی رہی ہے!

اس وقت شدّت غم سے نپولین کی جو حالت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ اب اُسے جوزیفائن کی تمام باتوں کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ اُس نے اُسے لکھا کہ وہ فوراً بلا توقف اُس کے پاس چلی آئے۔ اس مرتبہ وہ نپولین کے قطعی حکم کو نہ ٹال سکی۔ اُس نے غم و افسوس کے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ پیرس پر الوداعی نگاہیں ڈالیں اور باصد حسرت و یاس وہاں سے روانہ ہو گئی +

جب وہ نپولین کے پاس پہنچی تو نپولین نے نہایت تپاک اور گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اُسے جلد ہی اُس سے جدا ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ جو سخت خطرہ میں گھر گیا تھا۔ ملحق ہونا پڑا۔ اور وہاں سے اُسے لکھا :-

"جدائی کے دن قریب تھا کہ تیرے آنسو مجھے مایوسی کے نذر کر دیں اور میری روح پرواز کر جائے ——— تو یہاں میرے پاس آ جاتا۔ کہ ہم کہہ سکیں کہ ہم نے اپنی زندگی میں خوش نصیبی اور مسرت کے ایام بھی بسر کئے ہیں" +

اس کے بعد پے در پے کئی خط اس مضمون کے بھیجے ۔ یہانتک کہ وہ اس کی آرزو پوری کرنے پر مجبور ہو گئی اور اُس کے پاس چلی گئی +

مورخین لکھتے ہیں کہ نپولین اُس کی اس طرح تعظیم کرتا تھا۔ جیسے کوئی خوش عقیدہ اپنے معبود کی تعظیم کرتا ہے +

نپولین کے ہمراہیوں میں ایک معمولی فوجی افسر چارلس نامی بھی تھا۔ وہ حسن و جمال میں لاثانی اور نپولین کے لشکر میں سب سے زیادہ خوبصورت نوجوان تھا۔ باوجود کمسنی کے معاملات عشق میں اُس کا تجربہ اتنا وسیع تھا۔ کہ دوسرے نوجوانوں کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہوگا۔ جب اُس پر جوزیفائن کی نگاہیں پڑیں تو بیساختہ فریفتہ ہو گئی اور پھر نپولین کے لشکر سے جدائی کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ چارلس کو بھی اُس کی گرویدگی کا احساس ہو گیا۔ اور اپنی فرصت کا بیشتر وقت اُس کی ہم نشینی میں صرف کرنے لگا +

لیکن ایسے معاملات زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہا کرتے۔ رفتہ رفتہ نپولین کو بھی جوزیفائن اور چارلس کے تعلقات کا علم ہو گیا۔ وہ یہ سنکر چیں بجبیں ہوا۔ مگر سوچا کہ مسافرت کا عالم ہے۔ اگر سزا دیتا ہوں تو مشکل ہے اور اگر خاموش رہتا ہوں تو مشکل ہے! آخر مصلحت اسی میں دیکھی کہ فی الحال درگزر کی جائے۔ البتہ اتنا کیا کہ چارلس کو فوراً پیرس روانہ کر دیا اور تاحکم ثانی وہیں مقیم رہنے کا حکم دیا +

جوزیفائن کو جب نفس واقعہ معلوم ہوا۔ تو بے حد خوف زدہ ہوئی۔ اور اُسے اپنے شوہر کی جانب سے سخت خطرہ کا احتمال ہو گیا۔ اسی حالت میں اپنی پھوپی کو لکھا :-

"میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ اور میری دلی تمنا ہے کہ کاش موت ہی مجھے ان مصائب سے نجات دلا دے" +

جب نپولین جنگ اطالیہ سے فارغ ہو کر پیرس واپس آیا تو جوزیفائن بھی اُس کے ہمراہ تھی اور تمام فرانس اُس کی عظمت و خوش اقبالی کے افسانوں سے گونج رہا تھا +

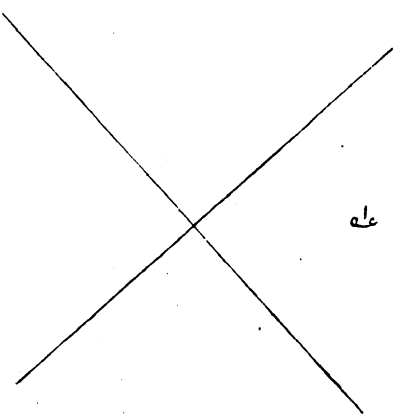
کچھ دن کے بعد ہی نپولین اُس سے دوبارہ رخصت ہو کر مصر روانہ ہو گیا۔ اور جوزیفائن سے وعدہ لے لیا کہ وہ جنگ ختم ہونے پر اُس کے پاس آ جائے۔ لیکن نپولین ابھی ساحل بھی نہ پہنچا ہوگا۔ کہ جوزیفائن مثل سابق دعوتوں اور تفریحات میں مصروف ہو گئی۔ تمام پیرس میں اُس کے طرز عمل پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں شدہ شدہ نپولین کے کان تک بھی یہ خبریں پہنچیں۔ یہ حالات معلوم کر کے غصہ سے اُس کا خون کھولنے لگا۔ لیکن کرتا تو کیا کرتا؟ مجبوراً ضبط کیا۔ اور مصلحت اسی میں دیکھی کہ خاموشی سے کام لے۔ لیکن مورخین کی رائے ہے کہ نپولین اُسی دن سے جوزیفائن کو طلاق دینے کے مسئلہ پر غور کرنے لگا تھا +

چند دن کے بعد جب جوزیفائن کو یکبارگی یہ معلوم ہوا کہ نپولین فرانس واپس آ گیا ہے۔ تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے قصد کیا کہ نپولین کے پیرس پہنچنے سے قبل اُس سے ملاقات کر کے دلوں کی کدورتیں صاف کر لے اور حتی الامکان اُس کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کرے خصوصاً اس وجہ سے اسے زیادہ پریشانی تھی کہ وہ قرض کے بوجھ میں بے طرح دبی ہوئی تھی۔ لیکن اُسے راستہ میں معلوم ہوا کہ نپولین ایک دوسرے راستے سے پیرس پہنچ چکا ہے یہ سُن کر وہ بھی فوراً پیرس کی جانب واپس روانہ ہو گئی +

لیکن اب حالات بہت متغیر ہو چکے تھے۔ جوزیفائن ایوان شاہی میں داخلہ کے لئے بیتاب تھی۔ اور نپولین نے اپنے آپ کو اُس کی جانب سے ہر الٹا لیا تھا۔ وہ عرصہ تک گھٹنوں پر جھکی ہوئی ہاتھ بلند کر یہ وزاری کرتی رہی ——— کاخ ایک دن گذر گیا اور دروازہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا ——— آخر نقاہت غالب ہونے لگی۔ یاس و ناامیدی بڑھتی گئی۔ مجبور ہو کر قصد کیا کہ اپنے کمرے میں واپس چلی جائے۔

مگر اس وقت خادمہ اُس کے دونوں بچّوں اوجین اور ہورٹانس کو لے کر اُس کے پاس آگئی اور وہ دونوں بھی اپنی ماں کے ساتھ دونا نو ہو کر معذرت خواہی اور طلب عفو میں شریک ہو گئے ..... اولاد کی محبّت نے جوش کیا اور نپولین زیادہ دیر تک معصوم بچّوں کی گریہ و زاری اور اضطراب برداشت نہ کر سکا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ جوزیفائن کو اُٹھا کر گلے سے لگایا۔ اُس کے آنسو پونچھے اور اُس کی لغزشوں کو دل سے معاف کر دیا +

اُس کی معافی مکمل تھی۔ اُس نے جوزیفائن کی تمام حرکات کو دل سے بھلا دیا۔ اور اُس کے ذمہ کا قرض ـــ جس کی مقدار دس لاکھ فرانک تھی۔ تمامہ ادا کر دیا۔ مگر اب جوزیفائن کا حسن زوال پذیر ہونے لگا تھا۔ اس کے برخلاف نپولین کا خورشید اقبال پورے عروج پر تھا۔ اس کو فرانس کا خود مختار شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ جوزیفائن بھی "ملکہ" بن چکی تھی لیکن جوزیفائن کی یہ عزت و شہرت دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ نپولین کو خاندان شاہی سے رشتہ داری قائم کرنے کا شوق چرایا ـــــ اور اُس نے جوزیفائن کو طلاق دے کر شہزادی میری لوئی سے عقد کر لیا جیسا کہ تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہے +



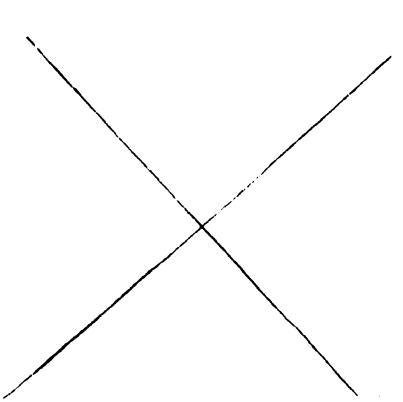
نپولین سے قطع تعلق کے بعد جوزیفائن پر جو زوال و ملال کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ہمیں تاب نہیں کہ اُس تفصیلات سے دو چار ہوں۔ لیکن اکثر مورخین اس معاملہ میں جوزیفائن ہی کو خطاکار تصوّر کرتے ہیں +

علہ تصاویر بہتر سے اڑ گئی ہے۔

میری لوئی کے متعلق مشہور ہے کہ آسٹریا میں اس سے چنداں الفت نہ تھی ..... باوجودیکہ نپولین اُسے جان سے عزیز رکھتا تھا۔ جب وہ جزیرہ "قدیسہ ہیلانہ" میں بستر مرگ پر پڑا تھا تو اُس نے اپنے معالج سے درخواست کی کہ اُس کا دل مرنے کے بعد اُس کے ایک قرابہ میں رکھکر میری لوئی کے پاس پہنچا دے اور اُس سے کہے کہ "نپولین کا دل ہمیشہ تیری محبّت میں سرشار رہا ہے۔ اور اسے تیری یاد بھی فراموش نہیں ہوئی"

معالج اس آخری وصیّت کی تکمیل کے لئے جب میری لوئی کے پاس پہنچا تو اُسے ایک چشم افسر سے جس کا نام نیپرج تھا" معروف اختلاط پایا۔ وہ اُس سے کہہ رہی تھی:-

"میرے دل میں نپولین کی محبّت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے،
مگر میں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کر سکتی کہ وہ میرے بچّے کا باپ ہے"



اس کے علاوہ بھی نپولین کو اپنی زندگی میں تعشق کے بہت سے واقعات پیش آئے۔ ابتدائی دور یا عروج اقبال کے عالم میں جن عورتوں سے اُس نے محبّت کی یا جن سے تفریح طبع کی خاطر تعلقات پیدا کئے۔ ان میں مندرجہ ذیل خواتین زیادہ مشہور ہیں:-

۱ - میڈموازل لوبری دی سان جرمن۔ اس حسینہ سے اُس کا تعارف فالنسہ میں ہوا تھا جب وہ کیرولائن کو پیہم کو دل سے بھلا چکا تھا +

۲ - میڈم تور۔ اس سے نپولین کے تعلقات اُس زمانہ میں رہے تھے جب

وہ ایک معمولی فوجی افسر تھا۔ اس کے ایک عرصہ کے بعد جب نپولین کی قسمت نے یاوری کی اور دولت و ثروت اُس کے قدموں پر نثار ہونے لگی تو میڈم نور بھی اپنے افلاس و احتیاج کی شکایت لے کر اُس کے پاس گئی۔ اور نپولین نے اُس کے لئے چھ ہزار فرانک سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا +

۳ - میڈم مالیانی۔ اپنے زمانہ کی سب سے مشہور حسینہ تھی +

۴ - میڈم پولین فوری جو فوجی افسر نپولین کی معیت میں مصر آئے تھے ان میں سے ایک کی زوجہ تھی نپولین سے قاہرہ میں اُسکا تعارف ہوا۔ اُسنے فاتون موصوفہ کے شوہر کو پیرس واپس کر دیا اور اُسے اپنے ہمراہ مصر میں ٹھہرالیا +

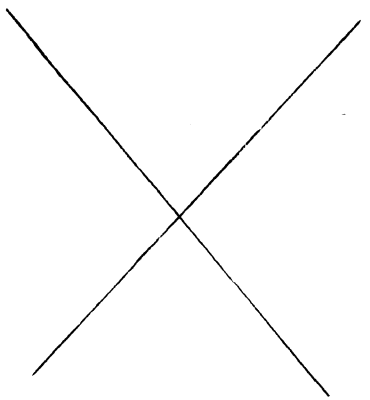
۵ - میڈم وازل چارج۔ مشہور ایکٹریس جس کے حسن و جمال کا بہت شہرہ تھا +

۶ - میڈم جرسینی۔ اطالوی ایکٹریس ہے۔ ڈیوک آف ولنگٹن بھی اُس کے پرستاران حسن میں شمار کیا جاتا تھا +

۷ - میڈم جزانی۔ یہ بھی اطالیہ کی رہنے والی تھی +

۸ - میڈم میرس۔ فرانسیسی کامیڈی کی مشہور ایکٹریس +

انکے علاوہ اور بہت سی خواتین ہیں جن کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں (مہند)



آبشار

(ماخوذ از کارج) ۔

(۱) حسن لازوال رکھنے والی چنچل چلبلی نوخیز !!!

تو اپنے بستر خواب مجوب جسم بھوری سے کوندتی پھاندتی آرہی ہے۔ میں تجھے اگر دست قدرت کی عالمگیر جنبش کہوں تو بجا ہے۔ بھلا کس فانی آنکھ نے تیرا عہد طفولیت دیکھا ہے۔ کس فانی کان نے تیری شیر خوارگی کے توتلے من موہن بول سُنے ہیں +

(۲) ترنم ریز کوہسار کی بیٹی !!!

تو اپنے وطن مالوف میں عروس صبح کیلئے آئینہ سیال تھی۔ ہاں دیدہ منتظر تھی۔ نہیں نہیں تو اس کے انتظار میں ہمہ تن چشم خواب رمیدہ تھی +

(۳) دوشیزہ عفیف دختر سنگ !!!

بادل تیری دہلیز پر ہوا کی معیت میں خدمتگار ہیں۔ گو تیری نقاب کی تار و پود ننھے ننھے روح افزا قطروں پر مشتمل ہے۔ مگر اس آبی نقاب کے دامن میں صبح صادق کے شگفتہ پھول ہیں۔ آفتاب عالمتاب کی نیمروزی کرنیں آنچل میں جلوہ ریز ہیں۔ چاند کی نقرئی شعاعیں اسکی خاموش شکنوں میں ٹکی ہوئی ہیں +

(۴) تو جگر گوشۂ سنگ نہیں بلکہ شیر خوارۂ جنت الفردوس ہے +

ہاں تو مولود مسعود ہے +

محمد بخش خاں۔ بی اے۔ بی ٹی۔ اے ڈی۔ آئی۔ جینیوٹ (جھنگ)

پُراسرار مصری رومال

(از جناب خواجہ عبدالکریم صاحب ایم اے)

سائنس و حکمت کی جدید کرشمہ سازیوں کے باوجود آج بھی جن بھوتوں کے قصص نہ صرف عوام کے لئے جاذب ہیں۔ بلکہ اکثر علماء و مدبران مغرب و مشرق ان کی حقیقت کے معتقد ہیں۔ اور جس طرح "عالم ارواح" اور اُسکے "باشندے" ہمارے نزدیک آج دلچسپ و دہشت انگیز ہیں۔ ویسے ہی قرن ہا قرن سے ہر ملک و ملت کے نزدیک عجیب و خوفناک رہے ہیں۔ بلکہ قوانین علم الغیب کی بدولت قدیم لوگوں نے وہ کارہائے نمایاں کئے ہیں اور ایسے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی ہے کہ آج ہم اُن کی محنت و ذہانت پر حیران ہیں +

یہ حقیقت ہے کہ "عالم ارواح" کے متعلق میرے ذاتی تجربات ایسے وسیع ہیں جو بظاہر بعید از عقل ہیں۔ اکثر "جلوہ آرائیاں" مجھے اپنے موکلوں کی بدولت نصیب ہوئی ہیں جو میرے یہاں روحانی مشورہ کے لئے اکثر آتے رہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ لندن۔ پیرس۔ بمبئی۔ ہندوستان۔ چین اور دیگر ممالک عالم میں مجھے اُن سے نبرد آزمائی کرنی پڑی ہے۔ بولو شیرو! کیا انسان بعد از موت بھی "اہل حیات" سے انتقام لے سکتا ہے؟"

لندن میں ایک آدمی نے مجھ سے سوال کیا جو میرے ایک دوست کا تعارفی رقعہ بھی ہمراہ لایا تھا۔ یہ ملاقاتی میرے عزیز دوست سٹیڈ کا دوست تھا جو ٹائیک جہاز کے ساتھ ہی ڈوب چکا تھا۔

"جہاز کی تباہی سے تین ماہ پیشتر" مسٹر ہنڈری میرے ملاقاتی نے کہا۔ "مجھے لندن میں مسٹر سٹیڈ سے ملاقات نصیب ہوئی۔ اور ہم نے دوران گفتگو میں جب "موت کی پیشینگوئیوں" اور "تحفظ قبور کے مصری سحر" ایسے موضوع پر بحث چھیڑی تو مسٹر سٹیڈ نے تسلیم کیا کہ مجھے مصری قابلوں کی اتفاقی سرگرمیوں کا جسقدر تجربہ ہے۔ وہ خود اُسے نہیں ہو سکتا +

میں ایک متمول آئرش امریکن ہوں۔ اور تجارت کے طفیل اتنا صاحب دولت ہو گیا ہوں۔ کہ اب مجھے کسی کام کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے دیرینہ شادی کی۔ اور محض قبروں کی کھدائی دیکھنے کے لئے مصر چلا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے مصائب کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا کہ اب میری جان کی بھی خیر نہیں"+

مسٹر ہنڈری ایک تعلیم یافتہ ہمدرد شخص تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ عمیق جذبات و پوشیدہ خوف سے متاثر ہو چکا ہے جسے معمول میں اُس سے ہمدردی سے پیش آیا۔ اُس نے کوئی سوالات نہ کئے۔ میں نے قیافہ بھانپ لیا کہ وہ مجھ سے سوالات کرنے اور مشورہ طلب کرنے آیا ہے +

"شیرو! کیا مردہ لوگ "اہل حیات" سے انتقام لے سکتے ہیں"۔ میرے ملاقاتی نے ایک پارسل کھولتے ہوئے سوال کیا جسے اُس نے کھول کر میز پر رکھ دیا۔ اور میں رکھتے ہی سمجھ گیا۔ کہ اُس میں ایک مصری رومال ہے +

"مشیرو!" اُس نے کہا۔ "کیا آپ اس قدیم چیز کے بارے میں کوئی رائے زنی کر سکتے ہیں؟"

میں قبل ازیں بلا فراعنہ کے اسرار و رموز سے آشنا تھا۔ اور اس قسم کی چیزوں کے بارے درس پا چکا تھا۔ میں نے رومال کو بغور دیکھتے ہوئے کہا ——

"میری رائے میں یہ کسی قبر پر سے اُتارا گیا ہے۔ جہاں اسے نعش پر سب سے آخر سینے کے قریب باندھا گیا ہوگا۔ چونکہ شکل میں یہ چمگادڑ سے مشابہ ہے۔ یہ چوتھے کے چوتھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عہد سلطنت میں "چمگادڑ" کے لقب سے ملقب تھا"+

مسٹر ہنڈری میری گفتگو سے بہت متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اور جب اُس نے رومال نیچے رکھ دیا اور یوں گویا ہوا:-

"شیرو! مجھ پر لعنت مسلط ہے —— یا جادو —— یا جو کچھ تم سمجھ لو۔ اس نے میری عزیز ترین بیوی چھین لی ہے۔ میرے منصوبے خاک میں ملا دیئے ہیں۔ میرے دوستوں سے خود کشی کرائی ہے۔ اب میری جان کے پیچھے پڑا ہے۔

خدارا آپ میرے مستقبل کو بہتر کردیں۔ صاف صاف کہیں خدا جانتا ہے کہ میں کن مصائب میں مبتلا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا حشر کیا ہوگا"+

جونہی اُس نے تقریر ختم کی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُسکی پیشانی عرق آلود تھی +

"بالفرض" میں نے آرام سے کہا۔ "آپ اُس آفت پر ذرا سی روشنی ڈالیں تو شاید میں آپ کی مدد کر سکوں"+

"آہ! میرے کرے میں اُس دل جلے نے جو داستان غم سنائی وہ ایسی دلسوز تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے +

اُس نے کہا کہ میں گذشتہ سال شہر ڈ ہوٹل قاہرہ میں فروکش تھا۔ اور وہیں میں نے جدید کھدائی کے بارے میں سنا جو وادئ سلاطین میں شروع ہونے والی تھی۔ کھدائی کے دوران میں ایک جرمنی ماہر آثار قدیمہ کی فوری موت کی وجہ سے کام رُک گیا۔ مصری کارگیروں پر دہشت طاری ہو رہی تھی۔ اُن کے خیال میں بڑی قبر جس کا ابھی بیرونی کمرہ ہی دکھائی دیا تھا۔ آسیب زدہ تھا۔ اور اسی وجہ سے جرمن کی موت واقع ہوگئی۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور خود کام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور اجازت بھی حاصل کر لی۔ رشوت کی بدولت مجھے اُور دیسی کام کرنے والے مل گئے۔ اور آخر تین کمرے نمودار ہو گئے جن کے آخر میں تابوت پڑے تھے۔ جن میں شاہی سامان پڑا تھا۔ اور دروازہ پر چوبس چہارم کی شاہی مہر ثبت تھی۔ آخری کمرہ کھولا گیا۔ اور بجلی کی عارضی روشنی میں ایک عجیب و غریب سنہری تابوت دکھائی دیا۔ جب سب کارگیروں نے اُسے ہاتھ تک لگانے سے انکار کر دیا۔ تو میں نے خود ڈھکنا اُٹھایا اور یکایک ایام کا راز طشت از بام ہو گیا۔ یہ نعش کسی پجارن کی تھی اور غالباً یہ کوئی نجومی پجاریوں کی شاہی درسگاہ کے شاہی اساتذہ میں سے تھا +

مشیر والٹر ہنڈری نے زور سے کہا "نعش کے سینے پر یہ رومال تھا اور جب میں نے اسے اُتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ برقی بتیاں مدھم ہو گئیں۔ اور جب پھڑ پھڑاتی ہوئی شکلیں میرے چہرے سے مس کرتی ہوئی محسوس ہوئیں تو میں اُنہیں چمگادڑ ہی سمجھا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا ہاتھ میں رومال لئے میں کمرہ سے باہر تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے گرتا پڑتا نکل آیا۔ اور پھر دل کڑا کر کے اس کام کی تکمیل کا ارادہ کیا۔ مگر تکان مجھ پر اسقدر مسلط تھی کہ غشی سی طاری ہو گئی۔ اور میں نے بقایا کام کل پر چھوڑ دیا۔ جب میں واپس ہوٹل پہنچا تو میری بیوی میرے چہرے پر خراشیں دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ —— وہ میرے قبروں کے کھدائی کے کام کی سخت دشمن تھی۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ آئندہ قبر کے پاس بھی نہ پھٹکونگا۔ دل بہلانے کے لئے ہم دریائے نیل کی سیر کرنے کے لئے گئے اور جب جنوبی کنارے پر خیمہ نصب کیا تو مجھے ذرا قرار ہوا۔ میں نے وہ رومال اتنا چھپا کر رکھا تھا کہ میری بیوی کو بھی اُس کے متعلق علم نہ تھا"+

پھر آبدیدہ ہو کر وہ آہستہ سے بولا :-

"آہ ایک رات ایسی بھیانک آوازیں سنائی دیں کہ ہم چونک پڑے میں نے جب غور سے دیکھا تو ہمارے سروں پر خیمہ کے گرد ایک برف سا سفید چمگادڑ اُڑ رہا تھا۔ اور بار بار کریہہ چیخیں مار رہا تھا۔ میں نے اُسے شور برپا کر کے بھگا دیا۔ اور پھر سو گیا۔ مگر مجھے خواب میں قبریں اور خوفناک شکلیں نظر آنے لگیں +

میری بیوی دن بدن اندوگیں نظر آنے لگی۔ وہ کسی نامعلوم چیز سے خوفزدہ نظر آتی تھی۔ آخر ایک دن صبح میں اُٹھتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مردہ پڑی ہے۔ یہ عجیب راز تھا۔ اطبا کی رائے میں کسی فوری صدمہ کی وجہ سے حرکت قلب بند ہو چکی تھی۔ اُس کا والد جو ٹیوٹن میں تھا۔ دفعتاً بیمار ہو کر راہی عدم ہو گیا۔ برف سا سفید چمگادڑ ہر وقت میری پریشانیوں کا باعث رہنے لگا۔ مشیر والٹر! خدا کے لئے بتاؤ۔ کیا یہ کوئی دماغی فتور ہے۔ یا کوئی ایسی شیطنت خیز بات ہے کہ عقل انسانی کام نہیں کر سکتی؟ میں نے البتہ یہ سُنا ہے کہ جو لوگ مصری مُردوں کی قبروں میں خواہ مخواہ دخل ہوتے ہیں اُن پر لعنت برسنے لگتی ہے۔ میں اسے ہمیشہ لغو اور توہم پرستی قرار دیتا رہا ہوں۔ لیکن اب ——" اور وہ زور سے تھرانے لگا۔ اور پھر ذرا اپنے آپ پر قابو پا کر بولا :-

رات کو خواب میں اکثر ایک دیوقامت چمگادڑ میرے سینے پر بیٹھکر میری روح قبض کر لیتا ہے۔ مجھے نیند سے خوف آتا ہے۔ آہ آپ بتائیں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے اُس سے تاریخ پیدائش لکھوائی۔ اور اُس کے ہاتھ کا معائنہ بھی کیا۔ میں حیران رہ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ ابھی وہ بے شمار آفات آسمانی کا شکار ہونے والا ہے۔ مگر ان حالات سے اُسے آگاہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ بلکہ خوب حوصلہ افزائی کی اور دلاسا دیا۔ اور موت کا خیال تک اُس کے ذہن سے خارج کر دیا +

روانگی سے پیشتر وہ یکلخت بولا :-

"شیرو! کیا آپ مجھ پر ایک احسان کریں گے؟ میں چند دن کیلئے کاروبار کے سلسلہ باہر جارہا ہوں۔ کیا میں آپ کے سپرد کر جاؤں۔۔۔۔۔۔"

اُس نے میرے ہاتھ میں چنگاڑ کی شکل کا رومال دیدیا +

مجھے اعتراف ہے کہ رومال چھوتے ہی میری رگ و ریشے میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ پیشے کے لحاظ سے مجھے ایسی چیزوں سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ مگر یہ کوئی عجیب چیز تھی جس نے مجھے بھی خونفزدہ کردیا۔

"آپ خائف تو نہیں ہوئے شیرو!؟" اُس نے پوچھا +

"نہیں!" میں نے زور سے کہا۔ "جب تک آپ واپس نہ آئیں۔ میں اسے اپنے پاس امانتاً رکھونگا"

چند ایام بعد میں مختصر عرصہ کے لئے اپنے مکان میں تفریح کے لئے گیا جو میں نے جزیرہ جرسے میں لے رکھا تھا۔ میں نے سونے سے پہلے وہ رومال بستر کے قریب میز پر رکھ دیا۔ مجھ پر نیند غالب آگئی۔ اور رہولناک خوابوں نے مجھے پریشان کردیا۔ میں وضع الشان کمروں کی سیر کر رہا تھا۔ جہاں ہیبتناک دیوتاؤں کے پتھروں پر نقش تھیں۔ منظر بدل گیا تو میں لامتناہی برآمدوں اور ستونوں میں سے گذرتا ہوا آگے جارہا تھا۔ آخر میں ایک چھوٹے سے تاریک کمرہ میں پہنچا۔ جو اسقدر تنگ تھا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے اپنے آہنی پنجہ میں میری گردن پکڑ رکھی ہے۔ میری آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ جاں لب تھا۔ ذرا سکت باقی نہ تھی۔ بالکل میں چیختے ہوئے بیدار ہوا۔ تو عرق میں غرق تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا۔ گویا اب بھی کوئی میری گردن مروڑ رہا ہے۔ خوابگاہ میں میرے بستر کے بالمقابل ایک بڑا در پچہ آج شب ماہتاب نور افشانی کر رہا تھا۔ اور پردے نہیں گرائے گئے تھے جب ذرا قرار ہوا تو سامنے کھڑکی کے شیشوں میں سے ایک چنگاڑ مجھے گھورتا نظر آیا یہ بے حس و حرکت کان کھڑے کئے اس طرح منتظر تھا۔ گویا میرے خون کا پیاسا ہے۔ پھر دفعتاً آنکھوں سے اوجھل ہوگیا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ میں بستر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ اور درختوں کی چوٹیوں پر چاندکی روشنی میں میں نے اُسے فضا میں تیرتے دیکھا۔ دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی مجھے گھٹے میں سخت درد محسوس ہوا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا وہ بھی حیران تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی زہریلے جانور نے کاٹا ہے ـــــ میں خاموش تھا +

لندن واپس آتے ہی ہنڈری اُس رومال کے لئے میرے یہاں آیا۔ اور میں نے یہ خطرناک چیز بخوشی واپس کردی۔ اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کے متعلق کوئی حیرت انگیز بات دیکھی ہے۔ خدا جانے کسی نے میرا زبان مقفل کردی۔ ہاں صرف یہ ضرور کہا کہ اُسے مصر واپس پہنچایا جائے۔ اور جہاں سے لیا ہے وہیں رکھ دیا جائے۔ وہ خاموش چلا گیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ موت کے منہ میں جارہا ہے۔ مگر تقدیر نے تاخیر کی۔ رومال کی دردانگیز یاد میرے دل سے محو ہوچکی تھی۔ کہ نیویارک ہیرلڈ میں جو میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ میری نظروں سے گذرا "ایک امریکن سیاح کی پُراسرار موت" کی سرخی گزری۔ مزید تفصیلات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ وہی ہنڈری ہے ڈاکٹروں کے نزدیک موت حرکت قلب بند ہوجانے سے واقع ہوئی تھی۔ جب متوفی کی مملوکہ اشیا کی مرتب کردہ فہرست دیکھی تو اُس میں وہ رومال درج نہ تھا۔ گویا وہ غائب ہوچکا تھا +

"طیوآوارہ"

اے سمندر تیری نیارت کیا ہے؟"
"ابدی استفسار کی زبان!"
"اے آسمان! تیری زبان کیا ہے؟"
"ابدی خاموشی کی زبان!"

کام کے لئے آرام ایسا ہی ہے جیسے آنکھوں کے لئے پردہ ہائے چشم۔

ننھی کلی جب شگفتہ ہوتی ہے۔ تو معصومی سے کہتی ہے "اری دنیا تو ابھی نہ مرجھائیو!"

خدا بڑی بڑی سلطنتوں سے بیزار ہوجاتا ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے پھولوں سے کبھی نہیں ہوتا +

ٹیگور۔

ظفر قریشی دہلوی

میر باقر حسین مرحوم

سچ ہے سوائے خدا کی ذات کے اور ہر چیز کو فنا ہے چمنستانِ دہر میں لاتعداد عندلیبانِ خوشنوا آئے اور اپنی اپنی زمزمہ سنجی سے دعوتِ لذتِ سماع دے کر اُڑ گئے۔ ہزاروں گلہائے رنگارنگ نے طوفانِ تعطر برپا کیا اور مرجھا گئے۔ اُن میں سے ہی میر باقر حسین صاحب مرحوم داستان گو بھی تھے۔ جو فن داستان کے لحاظ سے وحید العصر اور فرزانۂ روزگار تھے۔

سالِ گذشتہ حیات تھے۔ آج منوں خاک کے نیچے آرام کر رہے ہیں۔ واہ ری دنیا کئی مرتبہ اُجڑی اور لٹی۔ ماہرینِ زمانہ پریشان ہو کر نکلے اور جہاں سینگ سمائے چلے گئے۔ لیکن پھر بھی اُسی اُجڑے دیار کی خاک اور خطۂ مردم خیز نے وہ جوہر پارے پیدا کئے جو مطلعِ صحافت و شہرت پر نیّرِ اعظم ہو کر چمکے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی حضرت علامہ راشد الخیری حکیم ناصر نذیر فراق۔ مرزا سائل۔ حضرت بیخود وغیرہ وہ مایۂ ناز ہستیاں ہیں جنکو کانِ اُردو۔ جانِ اُردو۔ اور شانِ اردو عرض جو بھی کہو زیبا ہے۔ اُنہی قابلِ ترین ہستیوں میں سے خدا بخشے میر باقر حسین صاحب بھی تھے +

اکثر راقم پر عنایت فرماتے اور جب دل چاہتا تشریف لے آتے تھے۔ سادگی اور وضعداری کا یہ حال تھا کہ بھوجلا پہاڑی سے قرول باغ خدا جھوٹ نہ بلائے تو دو ڈھائی میل سے کم نہیں۔ بلکہ زائد ہی ہوگا۔ لیکن انکو وہاں سے پیدل آنا اور پیادہ پا ہی واپس جانا۔ ہاں اگر رات زیادہ ہو جاتی تھی تو مجبوراً سواری میں چلے جاتے تھے۔ ایک روز میں بسنری منڈی سے آرہا تھا کہ راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ کتاب بغل میں دبائے چلے آرہے تھے میں نے عرض کیا۔ "میر صاحب! اسقدر پیادہ پائی باعثِ تکلیف ہوتی ہوگی آخر سواری کیوں مطبوع خاطر نہیں ؟"

اپنی ٹانگوں پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ "میاں!! دو گھوڑے اللہ تعالےٰ نے دے رکھے ہیں جب تک یہ چلتے ہیں۔ کسی سواری کی ضرورت نہیں، ان کو بھی ساتھ لایا ہوں۔ اور ان پر ہی چلا جاؤں گا"

بات کرتے تھے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ معلومات اور تجربہ اسقدر وسیع تھا۔ کہ جس موضوع کو لیتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ بیدار مغز فلاسفر تنقید کر رہا ہے۔ نظم کی بابت تو نہیں کہا جا سکتا کہ فکرِ سخن کرتے تھے یا نہیں لیکن نثر کے تو اُستاد تھے +

جس روز جہاں کہیں داستان سنانی ہوتی تھی۔ فیرنی۔ زردہ۔ بالائی اُن کی خاص غذا تھی۔ افیون کی چسکی لگائی۔ سگریٹ کا کش اور ایک گلاس میں پانی سامنے رکھوالیا۔ دوزانو بیٹھ گئے اور داستان شروع کر دی۔ پھر تو یہ حال ہوتا تھا کہ مرلانا اور ہنسانا اُن کے اختیار میں تھا۔ منظر کی دلفریبی، محاورات کی چستی۔ بیان کی رنگینی اور الفاظ کی شوکت سے سامعین محو ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی مذاقیہ جملہ کہدیا ہے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے آنکھوں سے پانی نکلنے لگا۔ جس کو دیکھو رومال منہ سے لگائے کبھی کبھی کراہ رہا ہے اور چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ ہجر و فراق کی وہ تصویر دکھاتے تھے کہ طبیعت پر خاص اثر ہوتا تھا۔ رزم کا منظر ایسا پیش کرتے تھے کہ لڑائی کا میدان نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ جملہ آلاتِ حربیہ اُن کی زبان پر تھے۔ فوجوں کی ترتیب میسرہ میمنہ قلب و عقب میں نبرد آزمائیاں۔ جرار کی آراستگی۔ پہلوانانِ نامدار کے خود و زرہ بکتر جوشن و چار آئینہ کی سجاوٹ، گھوڑوں کی چلت پھرت اور موڑ توڑ کی تعریف۔ غرض معلوم ہوتا تھا کہ خانہ آباد کا مصنف شاہانِ ایران و توران کی جنگ کا خاکہ کھینچ رہا ہے۔ یہی حال بزم کا تھا۔ جشن فریدوں و بزم جمشیدی کا لطف آتا تھا +

اُن کی داستان جہاں تفریح و تفنن طبع کا باعث تھی وہاں حقیقت بیں نگاہوں اور گوشِ ہوش کے لئے مفید فصائح۔ دلچسپ و کارآمد معلومات اور پند و موعظت کا ذخیرہ بھی تھی۔ ایک روز طلسم ہوشربا کی داستان سنا رہے تھے۔ کہ عورتوں کا ذکر آگیا۔ داستان کا سلسلہ تو قطع کیا اور اس خبیث لطیف پر تنقید شروع کر دی۔ فرمایا۔ "عورت مجسم مسرت ہے۔ ایک نعمت ہے ایک خوش رنگ

پھول ہے۔ جس کی خوشبو مشام جان تک کو معطر بنا دیتی ہے مرد کے بہترین حصۂ جسم کا بہترین حصۂ نصف ہے۔ اس کی زیرکی اور دانائی کے سامنے افلاطون و ارسطو کی عقل بھی دنگ ہے۔ اگر بیوی گھر میں موجود ہے۔ تو مرد بہت سی برائیوں سے بچتا ہے۔ وہ روپیہ کماتا ہے اور بیوی حسن انتظام کے ساتھ اس کو خرچ کرتی ہے"۔

غرضکہ جہاں تک بھی ممکن ہو سکتا تھا عورتوں کی تعریف میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور پھر دفعتاً کہنے لگے:۔

"مگر ہندوستان کی عورتیں! پناہ بخدا۔ اللہ ان سے محفوظ رکھے، اخلاق اُن میں نہیں۔ تمدن سے یہ دور۔ معاشرت سے ناواقف، تہذیب سے ناآشنا۔ جاہل اور ناکارہ۔ خیر اونچے درجہ کی عورتوں سے قطع نظر فرمائیے اُنہیں اچھے علم کی روشنی نہیں پھیلی ہے۔ اور نہ اُن کا وہ تمدن اور ماحول جس میں اُنہوں نے پرورش پائی ہے۔ اس کا مقتضی ہو سکتا ہے کہ وہ عالی دماغ اور روشن خیال بن سکیں لیکن اُجلے پوش اور شرفا کے گھرانوں کا حال سُنئے تو حیرت ہو جائے گی۔ ایک نوجوان شخص فونیہ ہیفہ۔ در دگردہ یا قولنج میں دفعتاً گرفتار ہوتا ہے۔ اور اُس کی خالا اماں یا نانی ممانی یا پھوپھی جان مزاج پُرسی کو آتی ہیں۔ سب سے پہلا مورچہ تو یہ ہوتا ہے۔ کہ بڑی بی تو ڈولی سے اُتر کر مریض کی پلنگ کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہیں اور ماما اور کہاروں میں ڈیوڑھی پر وہ گفتگو اور تو تکا فضیحتی اور پھچ پھچ ہو رہی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی مریض اگر غنودگی میں ہے تو جاگ اُٹھتا ہے یا اُس کی طبیعت کو کچھ سکون ہوا تھا تو پھر پریشان ہو گیا۔ آخرکار صاحب خانہ (یعنی میزبانہ) اگر دریافت کرتی ہے۔ "اماں جان ڈولی والوں سے کیا کرایہ ٹھہرا تھا؟ بڑی بی کی ناک بھوں چڑھی اور پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں جھلا کر جواب دیا۔

"فوج یہ بندی فیر مردوں سے کلام کرتی اور تموے گنواروں سے کرایہ ٹھہراتی، ایسا دیدہ دلیر نہیں ہے۔ یہاں تو ہمیشہ ڈولی منگائی اور بیٹھ کر چلی آئی"۔

"لیجئے انتظام کی تو یہ حالت ہے کہ جس سواری پر تشریف لائی ہیں اُسکا کرایہ ہی نہیں ٹھہرایا۔ دو آنہ کی جگہ چار آنہ دینے پڑے وہ بھی اسقدر جھگڑے کے بعد کہ تمام گھر یہ ہیجان اور مریض کی طبیعت کو بھی غلبہ۔ خیر اس بلا سے نجات ملی تو اب مریض کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"میرے لعل تو کیسا ہے؟ ہائے دو روز کی بیماری سے ہی کیا حال ہو گیا سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے اور خون کا تو بدن میں نام نہیں رہا"۔

"مریض کو پختہ خیال ہو گیا کہ عوفناک بیماری سے سابقہ پڑا ہے اللہ ہی حافظ ہے۔ چاہئے تھا کہ مریض کے پاس بیٹھ کر تسلی و تشفی کرتیں۔ جلد صحتیاب ہونے کی اُمید بندھاتیں اور مرض کی شدت کا حال بیان کرتیں بجائے ایسی باتیں کرنے کے عزیز مریض کو آور پریشان کر دیا۔ ہیں اگر ہمت بہت زیادہ جوش آیا تو آنکھوں سے دو چار آنسو بھی نکل پڑے اور رُلائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ بھی کہہ گئیں۔ ہے ہے ہمارے محلہ میں اسے بھلا ہی سا نام ہے اُن کا جواں ہٹا کٹا لڑکا (مریض کی طرف اشارہ کر کے) اس کی جان سے دُور سات سات قرآن درمیان کتنی میتاں ہو جائے، بس اس بیماری میں دو ہی روز کے اندر چٹ پٹ ہو گیا"۔

"بس جو کچھ کسر تھی وہ بھی پوری کر دی۔ مریض کو یقین واثق ہو گیا کہ ایسی مہلک بیماری سے بچنا دشوار ہے۔ کیونکہ بڑی بی نے عنایت فرما کر ثبوت بھی بہم پہنچا دیا ہے۔ کہ اُن کے محلہ میں موت بھی واقع ہو چکی ہے"۔

"تو جناب یہ گفتگو کا ڈھنگ اور انداز ہے۔ موقع بے موقع، محل بے محل اُن کو بک دینے سے مطلب۔ بیٹھی ہوئی تو مریض کے پاس ہیں لیکن دل کا یہ حال ہے کہ نہ معلوم کیا کھانا تیار کیا جائے گا۔ جب مہمان آئی ہیں تو میزبانی کے پورے فرائض کیوں نہ ادا کئے جائیں۔ آخر خاموش نہ رہا گیا تو کہہ اُٹھیں "دُلہن! زیادہ تکلف کرنا میرا تو گھر ہے تمہارے کاجی اللہ رکھے اچھا ہو جائے۔ پھر جو کماؤ گی کھا لو گی۔ میں بھی پچھلے دنوں بیماری سے اُٹھی ہوں۔ ابھی تک حکیم صاحب کی دوا پی رہی ہوں، ثقیل غذا کا پرہیز ہے۔ اب تو تم اس وقت تھوڑے سے میٹھے چاول پکا ڈالو۔ بازار سے آدھ سیر دودھ منگا لینا اور میری چاند اگر ہو سکے تو تھوڑا سا سوجی کا حلوا بھی بنا ڈالنا جھٹ پٹ، تھوڑی سی ملائی بھی منگا لینا"۔

"مریض کو خود غذا ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ تمام گھر نے کھانا کھایا ہو یا نہ کھایا ہو مگر اُن کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ ایک جھگڑ کی لڑکی کو ساتھ لے آئی ہیں۔ اُس نے لپ جھپ پاندان پر پہنچ ایک بڑی سی گلوری بنا گال پھلا لیا اور جلدی جلدی چباتی ہوئی دُور کونہ میں جا کر نیچے کا ہونٹ باہر پھیلا پھیلا کر نیچی نظریں کر کے دیکھ رہی ہے کہ پان رچ گیا یا نہیں۔ اور پھر مکان کی سفید دیواروں پر پیک تھوک کر دیکھ رہی ہے کہ کلیر بخط مستقیم کیساں نیچے تک جاتی ہے یا نہیں اگر اتفاق سے خط ٹیڑھا ہو گیا تو دوبارہ سہ بارہ کوشش کی جا رہی ہے۔ غرض جب تک

پیک شروع سے آخر تک ایک لائن میں گلکاری نہیں بنائیگی اُس وقت تک یہی کوشش جاری رہیگی۔ بس حضرت! یہ اخلاق و عادات، معاشرت اور تہذیب کی حالت ہے۔ لہٰذا وہ ملک کس طرح ترقی کر سکتا ہے جہاں عورتوں کا یہ حال ہو۔ بچہ کی نگہداشت۔ غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی معلم اوّل ماں ہے۔ جب ماں کا یہ حال ہو کہ او خود گم است کرا رہبری کند۔ تو فرمائیے کس طرح ہندوستان بہترین تمدن اور ارتقا حاصل کر سکتا ہے"۔

ایک مرتبہ کہیں باہر کو تشریف لے گئے چار پانچ ماہ میں واپس آئے۔ میں نے دریافت کیا "میر صاحب! کہاں کہاں کی سیریں کیں۔ بہت عرصہ میں واپسی ہوئی؟"

فرمایا "قید سے رہا ہو کر آ رہا ہوں"۔

میں۔ (حیرت سے) "خیر باشد! قید کیسی؟!"

وہ۔ "حضرت! کیا عرض کروں!" (رئیس کا نام لیکر) "وہاں سے طلبی آئی تھی۔ میری شامتِ اعمال کہ وہاں پہنچ گیا"۔

میں۔ "آخر کیا ہوا؟"

وہ۔ "عرض کر چکا ہوں کہ قید تھی۔ خاطر تواضع تو خوب ہوئی۔ مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا۔ دونوں وقت عمدہ کھانا اور نوکر چاکر خدمت کو موجود۔ لیکن داستان آج ہوتی ہے نہ کل۔ رئیس اپنی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں میں مصروف مجوزِ خوش فروش! میں سخت پریشان نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن کا مصداق نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتا تھا کہ یا الٰہی اس زنداں سے نکال۔ آخر خدا خدا کر کے وہ روز آیا کہ ایک شب داستان سنانے کے لئے طلبی ہوئی۔ سجدۂ شکر بجا لایا اور گیا۔ جا کر دیکھا کہ دربار کا عجب رنگ ہے۔ بیہودہ گوئی۔ فحش مذاق کی گرم بازاری۔ چھبتیاں کسنے میں ہر ایک اُستاد پھکڑ بازی میں بے بدل۔ ایک جانب۔ بھانڈوں کا مجمع۔ دوسری طرف زنانِ بازاری کا جھمگھٹ۔ دونوں میں چوٹیں چل رہی ہیں لام کاف ہو رہا ہے۔ استغفر اللہ طبیعت کو سخت وحشت ہوئی۔ رئیس پر نظر ڈالی تو زرد رو اور کھوپڑی شریف کی ساخت کچھ ایسی تھی جس سے جھلک گیا کہ بالکل بودم لے دال ہیں۔ دانت پھاڑنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ رہا تھوڑی دیر کے بعد اپنی نقل کو دور سے اشارے سے چڑھا رہے تھے۔ داستان شروع کی۔ میں اپنا منہ نوچ کھسوٹ رہا ہوں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں سنتا۔ میں اپنی راگنی سنا رہا ہوں اور وہ اپنے الاپ میں مست ہیں۔ سخت کوفت ہوئی۔ خاموش ہو جاتا تھا۔ ٹھہر ٹھہر جاتا تھا جب متوجہ ہوتے تھے پھر شروع کرتا تھا۔ لیکن پھر وہی کچریاں پکنے لگتی ہیں۔ خیر خدا خدا کر کے میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوا۔ سمجھا کوئی خاک نہیں۔ کیونکہ اچھی طرح سے سنا ہی نہیں تھا لیکن واہ واا اور تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ مصاحبین میں سے ایک نے عرض کیا "خداوند!! بوستان خیال یا طلسم ہوشربا اور ایسی ہی سب داستانیں محض فرضی اور من گھڑت افسانے ہیں۔ رئیس صاحب نے فرمایا توبہ کرو توبہ کرو۔ کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں کہیں غلط ہوتی ہیں۔ غرض ایک شب داستان ہونے کے بعد پھر اسی مجلس میں ٹوالدیا گیا۔ بہت کوشش سے آٹھ روز کی رخصت لے کر آیا ہوں"۔

میں۔ "تو کیا اب پھر تشریف لے جائیگا؟"

وہ۔ "لاحول ولا قوۃ، خدا نہ لیجائے۔ پیچھے پی ہزار نعمت پائی"۔

میر صاحب مرحوم کے مختصر افسانے بہت پُر مذاق اور دلچسپ ہوتے تھے۔ ایک روز دوپہر کو تشریف لائے۔ میں نے مجبور کیا کہ کچھ سنا دیجئے۔ فرمایا:-

دو بھائی کسی ریاست میں ملازم تھے۔ جسقدر چھوٹا عقلمند تیز طرار معاملہ فہم اور دور اندیش تھا۔ اُسیقدر بڑا بھائی سیدھا سادا بیوقوف اور سادہ لوح تھا۔ چھوٹے بھائی کی اہلیہ اپنے باپ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ خاوند نے بہت کوشش کی کہ چند روز کی رخصت مل جائے تو خسرال جا کر بیوی کو لے آئے۔ لیکن کسی فوری ضرورت کی وجہ سے رخصت نامنظور ہوئی۔ آخر اُس نے بڑے بھائی سے کہا:-

"بھائی صاحب مجھ کو تو رخصت ملی نہیں۔ آپ کو آسانی سے ملجائیگی تکلیف تو ہوگی لیکن جا کر اپنی بھاوج کو لے آیئے"۔

بڑے بھائی کمر کس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور رخصت کی درخواست دیکر ایک ہفتہ کی اجازت لے لی۔ چلتے وقت چھوٹے بھائی نے جہانتک ممکن ہو سکتا تھا۔ اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ "بھائی صاحب! خدا کے لئے وہاں اپنی عقلمندی کا اظہار نہ فرمائیگا۔ ورنہ مجھ کو خفیف ہونا پڑیگا۔ ضرورت سے زائد گفتگو نہ کیجئے گا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہوگا کہ زیادہ تر آپ خاموش رہیں۔ جو کچھ سوال کیا جائے۔ اُس کے جواب میں جیسا موقع ہو ہاں یا نہیں!

کہہ دیا کرنا۔ اور جلد واپس آ جائیگا"۔

بڑے بھائی ٹٹو پر چارجامہ کس اور سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ رات کا وقت ایک جنگل بیابان میں ہوا۔ وہیں ڈیرا ڈال دیا۔ گھر سے روٹیاں پکوا کر لائے تھے۔ ایک کنوئیں پر چارجامہ بچھا کر کھانا کھایا۔ اور پانی پی کر آرام کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن فکر یہ درپیش ہوئی کہ ٹٹو تو خیر بندھا ہوا ہے اور چارجامہ اُن کے نیچے ہے۔ سر پر جو پگڑی ہے اگر اُس کو کوئی چور اچکا لے گیا تو کیا ہوگا۔ اُس کی حفاظت کا کوئی انتظام کرنا چاہئے۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد پگڑی سر پر اچھی طرح جمائی۔ اور کنوئیں میں سر لٹکا کر سو رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستار حماقت نذر چاہ ہو گئی۔ صبح کو اُٹھ کر دیکھا تو سب چیزیں موجود۔ لیکن جس کا خدشہ تھا وہی غائب۔ خیر اُٹھے اور ننگے سر چوروں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے پھر روانہ ہوئے۔ برسات کا موسم تھا۔ راستہ میں جا بجا پانی بھرا ہوا تھا۔ مکھیاں دق کرتی تھیں تو ٹٹو اپنی دُم سے اُڑاتا تھا۔ اور دُم تھی لانبی جس کی وجہ سے کیچڑ اور مٹی بھی ساتھ آتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام کپڑوں اور حضرت کے چہرے پر کیچڑ کی افشاں چُن گئی۔ ننھی ننھی بوندیں برس رہی تھیں۔ سر کھلا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دو تین چھینکیں آئیں اور نزلہ کی رپٹش شروع ہو گئی۔ ٹٹو کو جب مکھیوں نے بہت ستایا تو اُس نے زور زور سے دُم ہلانی شروع کی اور چھینٹیں جلدی جلدی آنے لگیں۔ اُنہوں نے گھبرا کر ہٹ رسید کیا۔ ٹٹو تو کُدک دُم بھاگا۔ ادھر یہ تیز ہوا کہ لاکھ روکا لیکن نہ رُکا۔ اب مصیبت پر مصیبت یہ کہ ٹٹو برابر دُم ہلاتا چلا جا رہا ہے۔ تمام کپڑے اور چہرہ کیچڑ میں لت پت۔ ناک سے ڈوبت ایسی بہہ رہی ہے کہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ رومال پاس نہیں۔ آستین سے خشک کرتے جا رہے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آستین میں بھی نے اچھی طرح سے کلف کر دیا ہے۔ راستہ میں جھاڑی اور درخت کی جو نیچی شاخیں ملتی ہیں ان میں اٹک اٹک کر کپڑے پھٹ رہے ہیں اور چہرہ لہولہان ہو رہا ہے۔ غرض بخرابی بسیار اس ہیئت سے کہ کپڑے تار تار۔ برہنہ سر کیچڑ میں سنے ہوئے۔ حواس باختہ اور چہرے پر کئی خراشیں موجود۔ حضرت چھوٹے بھائی کی خسرال آباد میں وارد ہوئے۔ فوج طفلاں نے جو اس مجسمۂ بوالعجب پر نظر ڈالی تو غول بیابانی سمجھکر وہ تالیاں بجائیں کہ ٹٹو کا بھی قافیہ تنگ ہو گیا اور گھبرا کر دو لتیاں مارتا ہوا جو چھٹا ہے تو ایک ہی سپاٹے میں اُس نشست گاہ کے رہنے والے آ کر ٹھیرے جہاں چھوٹے بھائی کے خسر صاحب تشریف رکھتے تھے۔

تمام گھر پریشان ہو گیا کہ داماد کے بھائی صاحب بایں ہیئت کذائی آئے ہیں۔ انکی خیر کرنا۔ کسی نے اُن کو سنبھالا۔ کسی نے ٹٹو کو پکڑا۔ لاکر کمرے میں بٹھایا اور بھائی کے خسر نے گھبرا کر دریافت کیا:۔

"آپ اسقدر پریشان کیوں ہیں؟ خیریت تو ہے"۔

کہنا چاہتے تھے "ہاں" لیکن بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں زبان سے نکلا "نہیں"۔

خسر صاحب۔ (زیادہ پریشانی کے ساتھ) "میاں تمہارے بھائی تو اچھی طرح سے ہیں؟"

آپ نے ایک آہ سرد کے ساتھ نیچی گردن کر کے جواب دیا "ہاں"۔

یہ جواب ہی ایسا تشفی ناک تھا کہ وہ زیادہ گھبرا گئے اور دریافت کیا "ارے بھئی کچھ بتاؤ تو سہی وہ خیریت سے ہیں۔ زندہ تو ہیں؟"

زبان کا بُرا ہو پھر نکلا "نہیں"۔

بس کہرام مچ گیا۔ جسے دیکھو مصروف آہ و فغاں۔ جو کوئی دریافت کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں صاحب کے داماد کا انتقال ہو گیا ہے اور بڑے بھائی خبر مرگ لے کر آئے ہیں۔ زنانخانہ میں بھی روز روشن سیاہ ہو گیا۔ غریب لڑکی کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئیں۔ اب آپ حیرت سے ہر ایک کو دیکھ رہے ہیں کہ آخر رنج و غم کی کیا وجہ ہے؟ لیکن سمجھے کہ یہ بھی کوئی رسم ہوگی۔

جب غمی کی رسمیں پوری ہو چکیں اور تیسرے روز مہمان رخصت ہو گئے تو آپنے چھوٹے بھائی کے خسر سے کہا "بھاوج کو لینے کے لئے آیا ہوں"۔

خسر۔ "ارے میاں جب چاہے لیجانا۔ اب اُس کا وہاں کیا رہا ہے غریب کی تقدیر میں بیوہ ہونا لکھا تھا۔ وہ پورا ہوا۔ عدت کے ایام گذر جائیں تو آپ کے یہاں بھیجدی جائے گی۔ پانچ چھ ماہ بعد آ کر لے جانا"۔

یہ جواب لے کر واپس چلے آئے۔ بھائی نے حیرت سے دریافت کیا:۔

"بھائی صاحب! کیوں تنہا کیوں تشریف لے آئے زنانی سواری کو کیوں نہیں لائے؟"

بڑے بھائی۔ "پانچ چھ ماہ بعد آ جائیگی"۔

چھوٹا بھائی۔ "آخر اس وقت آپ کے ہمراہ بھیجنے میں کیا عذر کیا؟"

بڑے بھائی۔ "کچھ نہیں وہ ذرا بیوہ ہو گئی ہیں۔ لہذا عدت بعد آئینگی"۔

چھوٹا بھائی۔ (کچھ حیرت اور غصہ سے) "جناب آپ کیا فرما رہے ہیں کچھ عقل پر

تو زور دے کر بات کیا کیجئے۔ بھلا میں تو زندہ بیٹھا ہوں وہ کس طرح بیوہ ہوئیں بڑے بھائی۔ بھئی تمہاری بھی عجیب باتیں ہیں۔ جب نانی اماں بیوہ ہوئیں تب بھی تم زندہ تھے۔ خالہ اماں رانڈ ہوئیں جب بھی تم موجود تھے پھوپھی رانڈ ہوئیں اُس وقت بھی تھے۔ آخر سہارے یہاں عورتیں بیوہ ہوئیں تم زندہ تھے۔ تو کیا تمہارے ہی مرنے سے رانڈ ہوتی ہیں +

(کنور) محمد یٰسین علیخاں

الوداع

اُن کا کمرہ باغ کی طرف کھلتا تھا۔ میں رنگترے کے گھنیرے بوٹوں کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ دروازہ کھلا اور وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کواڑ کے پیچھے چھپ گئی +

مجھے ایک چکّر سا آیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ پاؤں لڑکھڑائے اور میں نے پاس والے بوٹے کا سہارا لے لیا۔ ..... مجھ پر ایک مدہوش کیفیت طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہو۔ میری کنپٹیوں میں خون کا جو ہیجان تھا وہ ذرا کم ہوا تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ دھڑکتے ہوئے دل پر رکھ دیئے ..... اُنہوں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو بجائے درخت کے وہ مجھے سہارا دئے ہوئے تھیں

.....

میری آنکھیں بے اختیار اُنکی طرف اُٹھیں، وہ اُن کا شکریہ ادا کر رہی تھیں ـــ آہ ـــ میرا دل جانتا ہے اُنہوں نے میرے لئے کتنی تکلیف اُٹھائی! وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیں ـــ پھر اُن کے چہرہ پر تردّد کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُن کا ہاتھ بے اختیار اُن کے سینے پر گیا۔ نظریں زمین پر گڑ رہی تھیں ـــ میں بُت کی طرح ساکت تھا میں نے دیکھا کہ اُنکی آنکھیں بھر آئیں اور دو بڑے بڑے گول موتی رخساروں پر سے پھسلتے ہوئے اُن کے قدموں میں آ گرے۔ اُنہوں نے ایک گہری سانس لی۔ لوگ جسے آہ کے ساتھ سے تعبیر کرتے ہیں ـــ بالکل ایسے ہی جیسے کہ ایک غوطہ زن بہت دیر تک پانی میں رہنے کے بعد سر نکالکر والہانہ انداز سے سانس لیتا ہے ـــ آہ ـــ "تم چلے جاؤ گے ... کیا ـــ؟" اُنہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا "ہاں ـــ اسی شب کو" +

"اور پھر؟ ....."

"پھر ـــ" اُنہوں نے انگشتری اپنی انگلی سے نکال کر مجھے پہنا دی +

"دیکھو! ـــ ب ـــ ب ـــ بھول نہ جانا!"

"آہ" ـــ میں نے کہا ـــ "یہ عظیم الشان تہدیلی ہے۔ زندگی کے جھگڑے اگر آپکو مجھ سے غافل کر دیں تو آپ مجھے بیشک بھول جانا۔ اور میں آپکو تنہائیوں میں ـــ دل کی گہرائیوں کے اندر اندر کبھی کبھی یاد کر لیا کرونگا ـــ ـــ میں جانے کے لئے مڑا +

اُنہوں نے کہا "آہ! اسقدر جلد۔ ابھی تو آدھا منٹ ہی گذرا ہے!" ـــ میں نے کہا "ہاں" ـــ اُنکی آواز کانپ رہی تھی +

"تو ..... پھر ..... کب؟" .....

میں نے اسکا کوئی جواب نہ دیا۔ میں اُنسے کئی قدم چل آیا تھا میں نے ایسا محسوس کیا کہ فضا میں ایک لمحہ تھا اور جیسے کوئی تھرتھراتی ہوئی آواز میں سرگوشیاں کرتا ہو

"خ ..... خ ..... خدا حا ..... ف ..... ظ"

میں نے مڑکر دیکھا، اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے +

م۔ س۔ ش

کاہلی

(از قلم معجز رقم جناب شرف الدین احمد۔ بی اے۔ علیگ عظیم آبادی)

انسان میں اکثر عادتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بظاہر تو بہت ہی معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زمانہ سے دنیا انہیں بُرا سمجھتی آرہی ہے۔ لیکن اگر ان کو کافی غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بے شمار سامانِ مسرت پوشیدہ ہیں۔ اور لبا اوقات ایک وہ شخص جس میں اس قسم کی [illegible] عادت بھی پائی جاتی ہے۔ دوسروں کی نظروں میں کچھ عجیب چیز ہوجاتا ہے +

میں نے اکثر اس قسم کی عادتوں پر غور کیا ہے۔ اور اس مستقل غور و خوض کے بعد آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بوجوہ کاہلی ان سب سے زیادہ دلچسپ اور مسرت آمیز چیز کبھی جاسکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک کاہل کا وجود عملی دنیا میں محض بیکار بلکہ سوسائٹی کے لئے سخت مضر سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اپنے حیرت انگیز تخیل اور غیر معمولی بلند پروازی کے لحاظ سے ایک کاہل شخص عام انسانوں سے بہت زیادہ بہتر ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایک کاہل انسان کبھی تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے نہیں کہ اُس کی ذہنی صلاحیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اُس کو ان باتوں کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تو واقعہ ہے کہ اُس کے دماغ میں فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کو دیکھتا ہے۔ اس میں اسکو اتنی باریکیاں نظر آتی ہیں جن کو عام لوگوں کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں +

میں اس وقت کاہلانہ زندگی کی بے شمار مسرتوں پر کوئی تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہاں پر صرف ایک کاہل کے صبح سے شام تک کے معمولات کو مختصر الفاظ میں لکھے دیتا ہوں۔ اور چونکہ خدا کے فضل سے میں خود بھی اس صفت سے محروم نہیں ہوں اس لئے ان معمولات کا تعلق زیادہ تر میری ہی ذات سے ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر دنیا نے اس مسئلہ پر کچھ بھی غور کیا تو کوئی تعجب نہیں کہ لفظ "کاہلی" کے مفہوم میں جلد از جلد کوئی مستقل تبدیلی ہوجائے +

میرے صبح کے معمولات پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے۔ کہ آیا میری صبح ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر ہوتی ہے تو کس طرح؟ میرے اکثر دوست مجھ سے دس یا گیارہ بجے دن کو ملنے آتے ہیں اور اُس وقت بھی اُنہوں نے مجھے بظاہر سویا ہوا پایا ہے۔ پہلے تو ان لوگوں کو میری یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوتی تھی۔ پھر میں نے سمجھا دیا کہ مجھے اُٹھنے سے پہلے لحاف کے اندر آنکھیں بند کئے ہوئے دنیا کے بہت سے اہم مسائل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ہائے لحاف کے اندر کی دنیا بھی کیسی اچھی دنیا ہوتی ہے۔ وہاں کی فضا وہاں کی وسعت اور سب سے بڑھ کر وہاں اپنے وجود کا یقینی طور پر احساس، یہ باتیں ایسی ہیں جو عام لوگوں کی دنیا میں نہیں پائی جاتیں میں اکثر دنیا کے قیام مسلمانوں کی حالت۔ نمک بنانے کی ترکیب پر، میں غور کرتا ہوں۔ وہاں کا سکون خواب آور ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن کشا بھی ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہاں میں مشکل سے مشکل مسئلہ پر نہایت آسانی سے اظہار خیال کرلیتا ہوں اور کوئی معترض نہیں ہوتا۔ آپ جانتے ہیں کہ لحاف کے باہر کی دنیا میں قرار نہیں ہوتا۔ ابھی صبح ہے ابھی شام۔ ابھی رات۔ اس کے علاوہ ہر وقت یہ ڈر لگا ہوا ہے۔ کہ کہیں کوئی لغزش نہ ہوجائے۔ لیکن بات خدا کے فضل سے ہمارے لحاف کے اندر نہیں پائی جاتی۔ وہاں اگر آپ کامل دس گھنٹوں کے بعد بھی آنکھیں کھولیں گے تو بس یکساں ہی نقشہ نظر آئے گا۔ پھر وہاں انسان تمام دنیا کے عیوب سے خود بخود محفوظ رہتا ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر چالیس روز بجائے کسی مجرہ کے کسی لحاف میں چلہ کشی کی جائے تو مراد دنیا و حسد برآسکتی ہے۔ بہرکیف میں زیادہ سے زیادہ دس بجے کے بعد ہی لحاف سے برآمد ہوں مگر اُٹھنے کے ساتھ میں فوراً اُس جگہ نہیں چلا جاتا۔ جہاں عام لوگ جانے

کے بُری طرح عادی ہوتے ہیں۔ میں اُٹھ کر بیٹھتا ہوں۔ کچھ سوچتا ہوں۔ جمائی لیتا ہوں۔ اور بے ساختہ پھر لیٹ جاتا ہوں۔ اس وقت کی بھی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔ میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ آسمان مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں آڑ رہا ہوں اور میری آنکھیں دوسری دنیا کی چیزوں کا نظارہ کر رہی ہیں۔ یہ کیفیت کافی دیر تک قایم رہتی ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے۔ جب میں اپنے ارادہ سے نہیں بلکہ دوسروں کی کوشش سے اُٹھ جاتا ہوں۔ اب تھوڑی دیر تک اپنے دل کو سمجھانے کے بعد خیالات کی ایک دنیا لئے ہوئے اپنے مکان کے ایک بہت ضروری حصّہ کی طرف روانہ ہوتا ہوں۔ جس کا سنگ بنیاد میرے مکان کے دوسرے حصّوں کی تعمیر سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا۔ یہ جگہ بھی اپنے امن و سکون کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ یہاں کے بیٹھنے والوں کا تخیل یقینی عام لوگوں سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں اُس پر غور کرتے ہیں اور اُس کی حقیقت کا پتہ لگانے میں پورے انہماک سے کام لیتے ہیں مجھے خود اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ اپنے دورانِ نشست میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ میں نے کسی تنکے یا سگریٹ کے ٹکڑے کو دیکھا ہو اور فوراً میرے دماغ میں بمبل کے آشیانہ اور تمباکو کی تجارت کا خیال نہ آگیا ہو۔ غرض جب اس قسم کے بہتیرے مسائل دو تین گھنٹوں کے مختصر سے وقت میں حل ہو جاتے ہیں تو میں ایک کامیاب اسکالر کی طرح باہر آتا ہوں۔ اپنے پلنگ کے پاس آکر رکتا ہوں۔ اور اگر بھولتا نہیں تو شاید پھر لیٹ جاتا ہوں۔ اس کے بعد منہ دھونے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ لیکن میں اُسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ اس میں وقت بھی بہت برباد ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی ملکی فائدہ ہے نہ قومی کام۔ انسان وہ کرے جسمیں اپنے ساتھ دوسروں کا بھی بھلا ہو۔ لیکن پھر بھی اب ایسا نہیں ہے۔ کہ میں نے منہ کبھی دھویا ہی نہ ہو۔ اس فن سے واقف ضرور ہوں۔ اور کبھی کبھی اسکا اظہار بھی کر دیتا ہوں۔ میرے خیال میں منہ دھونے سے زیادہ ضروری کام کھانا کھانا ہے۔ لیکن بعض وقت دل چاہتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہوتا جو اپنے ہاتھ سے مجھے کھانا بھی کھلا دیتا۔ اس وقت کچھ عجیب کشمکش رہتی ہے۔ پیٹ کا تقاضا ہے کہ اپنی آگ بجھائیے۔ اور دل کہتا ہے ابھی جلدی کیا ہے۔ اُٹھتے ہیں نا۔ فطرت کی اس کشاکش کو دیکھ کر میں فوراً اُس نتیجے پر پہنچ جاتا ہوں کہ انسان دنیا میں ہر شخص کو خوش نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے خیالات سے میں کچھ ایسا متاثر ہوتا ہوں کہ ایک طرح کی بیخودی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور مجھے اُس وقت ہوش ہوتا ہے۔ جب کالج یا کچہری سے واپس آنے والے احباب اپنی تفریح کے لئے مجھ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ اُس وقت اُن لوگوں کی خاطر سے اُٹھ جانا پڑتا ہے۔ اور گھر والوں کے اصرار سے مجبور ہو کر کچھ کھانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد انگڑائی لینے میں بھی ایک خاص لطف ہے۔ اور اب تو یہ میری فطرت میں داخل ہے۔ مجھے زیادہ کھانے کی کبھی عادت ہی نہیں رہی۔ میں نے سُنا ہے کہ بہت سے لوگ علی الصباح آٹھ یا نو بجے ناشتہ کرتے ہیں۔ بارہ بجے صبح کو پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔ اور پھر چار بجے دوپہر کو میرے ساتھ ناشتہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور کمال تو یہ ہے۔ کہ نو بجے شام کو پھر کھانا کھاتے ہیں۔ بھئی یہ بھی کوئی بات ہے پیٹ نہ ہوا کہیں کا "اسٹور روم" ہوا۔ جب دیکھئے آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ لوگ دوپہر کو لمبی چلا اور پاخانے کے عمل میں ٹینس کھیلتے ہیں۔ یا کسی اور جگہ ٹہلنے چلے جاتے ہیں۔ اب میں خود محض قیلولہ کے خیال سے ذرا دیر کے لئے پھر لیٹ جاتا ہوں۔ اس وقت بھی بہت سے خیالات میرے دماغ میں آتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آیا واقعی یہ آفتاب مشرق سے نکلتا بھی ہے یا یہ محض پرانے لوگوں کا عقیدہ ہی عقیدہ ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی عمر میں آجتک نہ آفتاب کو کہیں سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور نہ کہیں کو ڈوبتے ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب کبھی بھی میں لحاف سے باہر آیا ہوں۔ تو میرے چاروں طرف یا تو آفتاب کی روشنی رہی ہے۔ یا لیمپ کی۔ ابھی میں اس مسئلہ پر کافی غور کرنے بھی نہیں پاتا ہوں کہ اپنے پلنگ کے چاروں طرف پھر اپنے ہی خواہوں کو شور کرتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ کوئی کہتا ہے "ارے بھئی رات ہو گئی کیا ارادہ ہے؟ اُٹھو گے بھی یا نہیں؟" میں دل ہی دل میں کہتا ہوں "کیا خوب! دن آیا ہی نہیں اور رات پہنچ گئی۔ مگر کیا کر سکتا ہوں۔ دُنیا ایک طرف ہے۔ اور میں ایک طرف۔ جب سب بیک زبان کہہ رہے ہیں کہ رات ہی ہے تو اچھا صاحب رات ہی سہی۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ اللہ نے رات صرف آرام کے لئے بنائی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں فوراً پھر لحاف کے اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ اس کارخیر میں ذری بھی غفلت یقینی کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے +

شرف الدین احمد

ایکٹرس

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد

ایک نامور ایکٹریس

ایک نوجوان عورت

منظر

نامور ایکٹریس کے مکان میں ملاقات کا کمرہ

وقت

شام کے پانچ بجے

ہدایات:-

[نوجوان عورت ایک کرسی کے کنارے پر اضطراب کے عالم میں بیٹھی ہوئی دیر سے مجھ انتظار ہے۔ اتنے میں نامور ایکٹریس اپنی خلوت گاہ سے نکل کر ملاقات کے کمرے میں داخل ہوتی ہے]

نامور ایکٹریس۔ کیا ارشاد ہے؟

نوجوان عورت (اپنے دونوں بازو پھیلا دیتی ہے۔ جیسے کوئی التجا کر رہا ہو) میرا خاوند مجھے واپس دیدو!

نامور ایکٹریس۔ تمہارا خاوند تمہیں واپس دیدوں!

نوجوان عورت۔ ہاں +

نامور ایکٹریس۔ (صرف خاموش پریشانی سے اُس کی طرف دیکھتی رہتی ہے)

نوجوان عورت۔ تم یہ سوچ رہی ہو کہ وہ کون ہے ..... وہ سفید رنگ کا آدمی ہے۔ قد نہ زیادہ لمبا نہیں چشمہ لگاتا ہے۔ وہ ایک وکیل ہے، تمہارے منیجر کا وکیل۔ اُس کا نام الفرڈ ہے +

نامور ایکٹریس۔ اوہ، میں اُسے جانتی ہوں..... ہاں تو۔

نوجوان عورت۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اُسے جانتی ہو.... میں تم سے التجا کرتی ہوں اُسے مجھے واپس دیدو!

[کچھ دیر تک خاموشی طاری رہتی ہے]

نامور ایکٹریس۔ تمہیں میری خاموشی کو گھبراہٹ پر محمول نہیں کرنا چاہئے ..... میں حیران ہوں۔ کیونکہ.... مجھے سمجھ نہیں آتی۔ اس صورت میں کہ تمہارا خاوند میرے پاس نہیں تو میں اُسے کس طرح تمہیں واپس دے سکتی ہوں +

نوجوان عورت۔ مگر تم نے ابھی ابھی تسلیم کیا تھا کہ تم اُسے جانتی ہو +

نامور ایکٹریس۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے اُسے تم سے چھین رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اُسے جانتی ہوں۔ اُس نے

میرے پچھلے اقرار نامے کا مسودہ تیار کیا تھا۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی ایک دو مرتبہ میں نے اُسے دیکھا ہے۔۔۔۔ اسٹیج کے باز ہیں وہ ایک شستہ کلام اور وجیہہ آدمی ہے۔۔۔۔۔ کیا تم نے یہ کہا تھا کہ وہ چشمہ بھی لگاتا ہے؟

نوجوان عورت - ہاں +

نامور ایکٹریس - میں نے اُسے کبھی چشمہ پہنے نہیں دیکھا +

نوجوان عورت - اُس نے چشمے اُتار دئے تھے۔ وہ تمہارے سامنے اپنے آپ کو بہترین صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ تم پر فریفتہ ہے جب میں پاس ہوتی ہوں تو وہ کبھی اپنا چشمہ نہیں اُتارتا۔ اُسے مجھ سے محبت نہیں۔۔۔۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ اُسے مجھے واپس دے دو!

نامور ایکٹریس - اگر میں استقدر بیوقوف نوجوان عورت نہ ہوتیں تو میں تم سے سخت ناراض ہوتی۔ تم کہ یہ خیال کس طرح سوچ سکیں کہ میں نے تمہارا خاوند تم سے چھین لیا ہے؟

نوجوان عورت - وہ تم کو پھول بھیجتا ہے۔۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔۔

نامور ایکٹریس - یہ غلط ہے +

نوجوان عورت - یہ بالکل درست ہے +

نامور ایکٹریس - یہ بالکل غلط ہے۔ اُس نے اپنی تمام عمر میں مجھے کبھی ایک پھول تک نہیں بھیجا۔ کیا اُس نے تمہیں بتایا تھا کہ اُس نے مجھے پھول بھیجے ہیں؟

نوجوان عورت - نہیں مجھے گلفروش کی دوکان سے معلوم ہوا۔ یہ پھول ہفتے میں تین بار تمہارے پاس ملاقات کے کمرے میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اُس کے حساب میں درج ہوتے ہیں +

نامور ایکٹریس - یہ جھوٹ ہے +

نوجوان عورت - کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟

نامور ایکٹریس - میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کوئی شخص تمہیں غلط دے رہا ہے +

نوجوان عورت (اپنا بٹوا ٹٹول کر اُس میں سے ایک خط نکالتی ہے) اس خط کے متعلق تمہارا کیا جواب ہے؟

نامور ایکٹریس - خط؟

نوجوان عورت - اُس نے یہ خط تمہیں لکھا تھا جس میں اُس نے یہ بیان کیا تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

نامور ایکٹریس - اُس نے یہ خط مجھے لکھا تھا؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو۔۔۔۔۔

نوجوان عورت - نہیں یہ خط میں تمہیں پڑھ کر سنا دوں گی (خط کھولتی ہے اور نہایت درد بھرے لہجہ میں پڑھنا شروع کر دیتی ہے) "میری پیاری! آج رات تھیٹر میں تم سے ملاقات نہ کر سکونگا۔ بہت ضروری کام پیش آگیا ہے۔ ایک ہزار مغدر توں اور دس ہزار بوسوں کا تمنائی۔ الفرڈ +

نامور ایکٹریس - اوہ!

نوجوان عورت - میں نے آج صبح یہ خط اُس کی میز پر پڑا پایا۔ غالباً وہ اسے کسی پیامبر کے ہاتھ تمہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ مگر بھول گیا۔ اور میں نے اسے کھول لیا (رونے لگتی ہے)

نامور ایکٹریس - تمہیں رونا نہیں چاہئے +

نوجوان عورت - روؤں کیوں نہ؟ تم میرا خاوند چرا لو اور میں روؤں نہ! (سسکیاں بھرتے ہوئے) اوہ میں جانتی ہوں۔ تمہارے نزدیک ایک سسکی وقعت کسقدر کم ہے۔ اور تمہارے لئے یہ کام کسقدر آسان ہے! ایک رات تم شاہزادی کا لباس زیب تن کرتی ہو۔ تو دوسری رات ایک ثانی دیوی کی طرح عریاں ہوتی ہو۔ تم اپنے ابروؤں کو سیاہ اور لبوں کو سرخ کر لیتی ہو۔ اپنی پلکوں کو موم لگاتی ہو۔ اور چہرے پر غازہ ملتی ہو۔ تمہارے پاس آرائش اور زیبائش کے وافر سامان اور تیز و تند رو تخیلیں ہیں۔ جن سے تم حسین دکھائی دینے لگتی ہو۔۔۔۔ تمثیل نگاروں کی عبارت سے ذہین اور ہوشمند معلوم ہوتی ہو۔۔۔۔ کوئی تعجب نہیں کہ ایک غریب سادہ لوح وکیل تمہارے دامِ الفت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مجھے اس ارزاں فراک میں میرے اپنے قدرتی لبوں اور ابروؤں کے ساتھ اور میرے سادہ اطوار کی موجودگی میں تمہارے مقابلے میں کس طرح کامیابی ہو سکتی ہے؟ مجھے عشوہ سازی، ناز و ادا اور مردوں کو فریفتہ کرنے کے ڈھنگ یاد نہیں۔ مجھے کسی شیکسپیئر کی خدمات حاصل نہیں جو میرے لئے دلاویز تقاریر لکھ سکے۔۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دراصل تم مجھ سے زیادہ احمق ہو۔ لیکن اگر مردوں کو فریفتہ کرنے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو میں تمہارے مقابلے میں بالکل ہیچ ہوں +

نامور ایکٹریس - یہ ایک نہایت دلچسپ معاملہ ہے +

نوجوان عورت - کونسا معاملہ؟

نامور ایکٹریس ۔ تمہارا +

نوجوان عورت ۔ میرا؟ تمہارا کیا مطلب ہے ؟

نامور ایکٹریس ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے کبھی تمہارے خاوند کی طرف سے کوئی خط یا پھول موصول نہیں ہوا ۔ مجھے بتاؤ کہ کیا کچھ عرصہ سے تم دونوں کے تعلقات کشیدہ تو نہیں رہے ؟

نوجوان عورت ۔ ہاں رہے تو ہیں +

نامور ایکٹریس ۔ تمہیں ایک دوسرے سے بہت الفت رہا کرتی تھی!

نوجوان عورت ۔ ہاں +

نامور ایکٹریس ۔ اور کچھ عرصہ سے تم ایک دوسرے سے بالکل لا پرواہی برت رہے ہو؟

نوجوان عورت ۔ ہاں +

نامور ایکٹریس ۔ خوب! بالکل عام واقعہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش کہ تمہیں معلوم ہوتا کہ ہم ایکٹریسوں کو کتنی دفعہ ایسے معاملات سے واسطہ پڑتا ہے ! اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ تمہارا خاوند تم میں جڑ پڑ رقابت پیدا کرنے کے لئے تم سے یہ چال چلتا رہا ہے ۔ تاکہ تم اُس میں از سرِ نو دلچسپی لینا شروع کر دو +

نوجوان عورت (حیرت زدہ ہو کر) کیا تمہارا واقعی یہی خیال ہے ؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ پہلے بھی تمہارے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے ہیں ؟

نامور ایکٹریس ۔ بیشمار دفعہ ۔ یہ ہر اُس ایکٹریس کے ساتھ پیش آتے ہیں جو ذرا خوبصورت اور کچھ کامیاب ہو ۔ یہ دنیا کی قدیم ترین تجاویز میں سے ہے ۔ اور ہم ایکٹریس اس معاملہ میں اسقدر معروف تختۂ مشق ہیں ! کوئی ایسا آدمی نہ ہو گا جس کا تھیٹر سے ذرہ بھر بھی تعلق ہو ۔ اور اُس نے کبھی نہ کبھی ہم سے اس معاملہ میں فائدہ نہ اُٹھایا ہو ۔ مصنفین و کلاء شاعر منظر ترتیب دینے والے ۔ سازندوں کے رہنما ، حتیٰ کہ نیچر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ بیوی یا محبوبہ کی اُلفت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُنہیں صرف اسقدر درکار ہوتا ہے کہ ہم میں سے کسی کے ساتھ عشق وضع کر لیتے ہیں ۔ بیوی ہمیشہ بہت آسانی سے اس پر یقین لے آتی ہے ۔ عموماً ہمیں اس کے متعلق کبھی بھی علم نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر یہ معاملہ ہمارے علم میں لایا بھی جائے تو ہم اُس کی چنداں پرواہ نہیں کرتے ۔ ہمیں کم از کم اس علم سے یک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ ہمارے طفیل کئی شادی شدہ جوڑے محبت اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ورنہ بصورت دیگر ان کا انجام عدالتوں میں طلاق کی صورت میں ہوتا ہے +

نوجوان عورت ۔ مگر کس طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس کا علم کس طرح ہو سکتا تھا ؟

نامور ایکٹریس (ایک چھوٹا سا شفقت آمیز قہقہہ لگاتی ہے) تمہیں اس معاملہ میں کسی قسم کا عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ درست ہے کہ تمہیں اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا ۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے تم خیال کرتی ہو کہ اسٹیج کی دنیا پر تمہارا خاوند تحویل و ترغیب کے ایک دائمی ماحول میں گھرا ہوا ہے جو ایسی حسین من موہنی عورتوں سے معمور ہے ۔ جنہیں دنیا میں کوئی پس و پیش نہیں ۔ اور جو اخلاق سے بالکل تہی مایہ ہیں تم ہر ایک ایکٹریس کو سُودوسری معمولی عورتوں سے زیادہ خطرناک تصور کرتی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان معاملات کو تمہارے خاوند سے جو کہ ایک نہایت ہی عیار وکیل ہے ۔ زیادہ کوئی نہیں سمجھتا ، اور اس طرح وہ تمہارے خوف اور رقابت کے جذبات سے فائدہ اُٹھا کر تمہاری اُس الفت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے تم نے اُسے محروم کر رکھا ہے ۔ وہ میرے نام ایک خط لکھتا ہے ۔ اور اُسے میز پر بھول آتا ہے ۔ کیا تمہارا یقین ہے کہ ایک قانون داں نادانستہ طور پر ایسی حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے ؟ وہ صبح کے وقت میرے لئے پھولوں کا حکم دیتا ہے ۔ اور غالباً جس گھڑی دفتر پہنچتا ہے ۔ تو اُس حکم منسوخ کر دیتا ہے ۔ ہاں مجھے یاد آ گیا ۔ کیا اُس کے پاس میرے بالوں کی کوئی کاکل تو نہیں ؟

نوجوان عورت ۔ ہاں اُس کے میز کے دراز میں تھی ۔ میں اپنے ہمراہ لے آئی ہوں +

نامور ایکٹریس ۔ خوب! وہ میرے بال بنانے والوں کو رشوت دیتے ہیں کہ میرے بال اُڑا لیں ۔ حیرت کا مقام ہے کہ میرے سر پر یہ تھوڑے سے بال بھی کس طرح رہ گئے ہیں !

نوجوان عورت (خوشی سے) تو اُس نے یہ اسی طریقے سے حاصل کئے تھے؟

نامور ایکٹریس ۔ اور تو کوئی طریقہ میرے خیال میں نہیں آ سکتا ۔ یہ تو بتاؤ کہ

کہیں اُس نے کوئی عاشقانہ خطوط تو ادھر اُدھر نہیں رکھے ہوئے تھے؟

نوجوان عورت (چونک کر) نہیں تو +

نامور ایکٹریس ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے اُسے کبھی کوئی عاشقانہ خط نہیں لکھا +

نوجوان عورت ۔ مگر تمہیں یہ خیال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نامور ایکٹریس ۔ اگر وہ میرے پاس آتا اور کھلے الفاظ میں کہتا "دیکھو پیارا، میرے لئے ایک زحمت گوارا کرو گی؟ میرے اور میری بیوی کے تعلقات کچھ ایسے خوشگوار نہیں۔ کیا تم مجھے ایک جذبات سے پُر عاشقانہ خط لکھ دو گی تاکہ میں اسے گھر میں کسی جگہ رکھ دوں۔ اور وہ اسے دیکھ پائے؟" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو میں یقیناً اُسے یہ خط لکھ دیتی۔ میں ایک ایسا خط لکھتی جو تمہیں دو ہفتہ تک سر ہانے پر سر رکھکر رُلانے کے لئے کافی ہوتا۔ میں نے ایک مشہور تمثیل نگار کے لئے دس ایسے خطوط لکھے تھے۔ مگر اُسے ان سے کچھ فائدہ حاصل نہوا اُس کی بیوی ایسی نیک خاتون تھی کہ اُس نے اُسے تمام کے تمام بغیر پڑھے واپس دیدیئے +

نوجوان عورت ۔ تم کسقدر ہوشیار ہو! اور کسقدر مہربان!

نامور ایکٹریس ۔ میں تھیٹر کی دوسری لڑکیوں سے نہ بھلی ہوں نہ بُری گو تم ہمیں اسقدر بُرا خیال کرتی ہو +

نوجوان عورت (پشیمانی کے لہجے میں) میں سخت حماقت میں مبتلا تھی۔

نامور ایکٹریس ۔ ہاں تمہاری آنکھوں میں جو آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے بیشک تم کسیقدر احمق معلوم ہوتی ہو۔ اور تمہارا چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہے۔ کہ تم نے آخر کار یہ معلوم کر لیا ہے ایک مختصر سا، خوشرو انسان جو چشمہ لگاتا ہے تمہیں سے محبت کرتا ہے، میری جان کوئی آدمی بھی اسقدر پرستش کا مستحق نہیں۔ یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے ہے نا؟

نوجوان عورت ۔ ہاں +

نامور ایکٹریس ۔ تاہم میں تمہیں ایک آخری نصیحت کرنا چاہتی ہوں۔ دوبارہ کبھی اس طرح اُس کی چال میں مت آنا +

نوجوان عورت ۔ کبھی نہیں۔ تم اس بات سے مطمئن رہو +

نامور ایکٹریس ۔ چاہے تمہیں اُس کی جیبوں سے کچھ مل جائے۔ کوئی پرواہ نہ کرو۔ خواہ وہ کوئی خطوط ہوں، رومال ہوں یا میری کوئی عکسی تصویر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو خطوط وہ لکھے یا جو پھول وہ بھیجے یا جو ملاقاتیں وہ مقرر کرے اُن کی کچھ پرواہ نہ کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوبارہ پھر اُسکی چال میں کبھی نہ آنا +

نوجوان عورت ۔ تم اس بات سے مطمئن رہو، اور تم میرے یہاں آنے کے متعلق اُس سے کوئی ذکر نہیں کرو گی، ہے نا؟

نامور ایکٹریس ۔ ایک لفظ نہیں، بلکہ اس کے برعکس میں اُس سے سخت ناراض ہوں، کہ اُس نے ایک ایسے معاملے میں میرا نام استعمال کرنے کے لئے براہ راست مجھ سے صاف طور پر اجازت کیوں حاصل نہیں کی ۔ ۔ ۔ ۔

نوجوان عورت ۔ تم بہت ہی بھلی عورت ہو، مجھے معلوم نہیں کہ میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں +

نامور ایکٹریس ۔ تمہیں نئے سرے سے پھر رونا شروع نہیں کر دینا چاہئے +

نوجوان عورت ۔ تم نے مجھے کسقدر مسرور کر دیا ہے!

(وہ نہایت سرعت کیساتھ نامور ایکٹریس کے بوسہ دیتی ہے اور اُسکے آنسوؤں سے آشکار رخسار بھیگ جاتا ہے۔ پھر وہ جلدی سے باہر نکلجاتی ہے۔ اُس کے پیچھے دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کچھ وقفہ کے لئے خاموشی رہتی ہے)

نامور ایکٹریس (اپنے خلوتگاہ کے دروازے کی طرف جاتی ہے اور آواز دیتی ہے) اچھا الفرڈ تم اب اندر آسکتے ہو، وہ چلی گئی ہے +

(مولنر)

یہ پردہ

اصلاح معاشرت:-

کاش میں حسین ہوتی!!

(محترمہ قدسیہ بیگم کے قلم سے)

یوں تو دنیا کی ہر شے تحیر خیز ہے۔ مگر حضرت انسان کی ستم ظریفیاں قابل بیان نہیں۔ اور خصوصاً جنس ذکور کی عقل و دانش پر تو رونا آتا ہے جبکو ہم پر دائمی حق حکمرانی حاصل ہے۔ جو اپنی عقل و فہم کے آگے دوسروں کو کم عقل اور ناداں سمجھتا ہے۔ اور مختلف طریقوں سے ہمارے جذبات کو پامال ہماری ترقی کو مسدود اور ہم کو چہار دیواری کے اندر بند کر کے اپنے زعم میں انصاف بھلائی اور حفاظت کرتا ہے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تم ہمیں پردے میں مقید رکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اس طرح سے ہمیں دنیا کی اور دنیا کو ہماری نظروں سے پوشیدہ رکھ کر ہمارے اخلاق درست ہو جائیں گے۔ تم خود کہاں کے پارسا اور بے داغ نفس ہو۔ ہم تو خیر بقول تمہارے اخلاقی پستی میں ہیں۔ مگر یہ تو کہو تمہارے پارکوں، تفرج گاہوں، اور سینماؤں میں گھومنے میں کون سے رموز پوشیدہ ہیں۔ ہماری آنکھیں تو فرط حیا سے جھکی بھی رہتی ہیں مگر تم کس دیدہ دلیری اور بے شرمی کے ساتھ ہمارے فرقہ کے افراد کو گھورتے ہو۔ اور کن کن ذرائع سے اُن سے ملتفت ہونا چاہتے ہو۔ اور اپنی بوالہوسی کی داد لینا چاہتے ہو۔ اگر ہمارے فرقے کے پانچ فیصدی افراد صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں تو تمہارے بھائی بند پچھتر فیصدی اس مرض میں گرفتار ہیں۔ اب خدا لگتی کہو کس کو زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے اور اخلاقی منزل ارتقا سے کس کا قدم پیچھے ہے؟ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتی ہوں۔ ہاں تو ان حضرات کی عقل و فہم کی داد نہیں دی جا سکتی۔ جتنا ہی یہ اپنی قابلیت پر مصر ہیں۔ اسیقدر ان کی بے مائگی نمایاں اور روشن ہوتی جاتی ہے۔ اور حقیقت سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ منجملہ اور خبطوں کے ایک خاص خبط اس جنس کو حسن پسندی ہے گویا حسن پرستی اس کے ضمیر میں داخل ہے۔ ہمیشہ وہ یہی چاہتے ہیں۔ کہ ان کا دوست ان کے عزیزان کے بیوی بچے سب کے سب حسین ہوں۔ خواہ میاں اللہ رکھے خود کو ٹلے کے رنگ سے تمیز نہ ہوتے ہوں۔ مگر خانہ آبادی کے لئے کسی ماہ پارہ ہی کو لائیں گے۔ گو آئندہ چل کر وہ ان کے لئے وبال جان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ان کی اس حماقت۔ بزعم خود بلند نظری اور لطیف المزاجی کی بدولت کتنی شریف عقیل اور فہیم مگر معیار حسن میں کمزور لڑکیاں ناہنجار، کج خلق اور ناخدا ترس شوہروں کے پلے پڑ کر اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہیں اور بہتیرے قابل اور شریف انسان صرف اس حسن پرستی کے خبط میں پڑ کر اپنی حالت تباہ و برباد کر لیتے ہیں۔ مگر اس جنس کے رجحان ذہنی کا عجب حال ہے۔ خود کھے گا کہ حسن ایک سریع الزوال شے ہے۔ نیز اس کی بے اعتباری روزانہ مشاہدہ کرے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ کہہ "اللہ جمیل و یحب الجمال" خلاق عالم کی بیرودی کا بہانہ ڈھونڈھیگا اور اپنے خبط کی خود ہی داد دیگا۔ بھلا کوئی ان عقل کے پتلوں سے پوچھے کہ اگر حوا کی بیٹیاں بھی اس نظریہ پر عمل کرنا شروع کر دیں تو یہ آدم کے سپوت کہاں رہینگے "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی" یہ سب جانتے ہوئے بھی اپنی روش سے ایک انچ بھی ہٹنا پسند نہیں کرتے "بریں عقل و دانش بباید گریست"

سینکڑوں مثالیں ایسی ملیں گی کہ ہمارے گروہ کی وہ ہستیاں جو اچھے اور نیک شوہروں کی اچھی شریک بن کر ان کی زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہیں۔ صرف اس حسن برائے نام کی کمی نے اس سے انہیں محروم کر دیا۔ دور کیوں جایئے میری خود بیتی ایک زندہ مثال ہے۔ جو اس مرض کی شکار ہوں +

میری تعلیم اگر زیادہ نہیں ہوئی تو خدا کے فضل سے کم بھی نہیں ہوئی یہ نہیں کہ میں بالکل بے گنی ہوں۔ میری اماں نے امور خانہ داری میں مجھے بچپن سے لگایا اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر کامل نہیں تو کسی بات میں ناقص بھی نہیں۔ سینے پرونے میں چونکہ مجھے بہت دلچسپی شروع سے تھی۔ اس لئے میں نے اس میں خاص مہارت حاصل کی۔ قصبہ میں دو ہی چار ایسے ہونگے جو اس ہنر میں میری مقابل ہونگی۔ اس تذکرے سے مجکو اپنی خودستائی

منظور نہیں۔ بلکہ آپ بیتی کے سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے جس کا ذکر ضروری تھا +

میری تمام مصیبتوں کے باعث بھی اُن ہی آدم کے سپوتوں میں سے ایک تھے۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب میری عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ میرے ایک قریبی عزیز جو وطن سے دور رہتے تھے عرصہ کے بعد وطن آئے۔ اور میری والدہ سے ملے۔ میں اوّل اوّل تو شرماتی رہی اور سامنے آنے میں پس وپیش کرتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ حجاب کم ہوگیا۔ اگرچہ اب بھی کھلی نہ تھی۔ مگر اُنہوں نے بہت جلد مجھے مانوس کرلیا۔ اُن کی علمی قابلیت اور پُر مذاق طبیعت نے بہت جلد مجھے اپنا گرویدہ کرلیا۔ وہ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ اور میرے کاموں کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ہمت دلاتے رہتے تھے۔ میری اماں کو بھی اُن سے بہت اُنس تھا۔ جس کی بڑی وجہ اُن کی اخلاقی اور ادبی حالت تھی۔ چونکہ اُن کی تعلیم ہنوز مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ واپس چلے گئے۔ چلتے وقت والدہ سے رخصت ہونے آئے۔ اماں نے مجھ سے کہا۔ اپنے ہاتھ کی کوئی چیز بطور یادگار ان کو دو۔ میں اس رمز کو اُس وقت نہ سمجھی۔ اور ایک نہایت نفیس کڑھا ہوا رومال اُنہیں پیش کیا۔ پہلے تو اُنہوں نے اُس کے لینے میں حیلے حوالے کئے۔ کہ میں اس قسم کے رومال رکھنے کا عادی نہیں۔ مگر اماں کے اور میرے اصرار پر انہوں نے اس کو قبول کرلیا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس ذرا سی چیز کا اُنہوں نے کسقدر شکریہ ادا کیا۔ اور اُن کی نیچی نظروں یہ بتلا رہی تھیں کہ بہت بڑے احسان سے دبے جا رہے ہیں +

بعد میں مجھے اپنی سہیلیوں سے معلوم ہوا کہ میرے خلاف ایک گہری سازش کی گئی تھی۔ میری والدہ نے دوسرے ذرائع سے ان کے والدین پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ مجھے بیاہ لے جائیں۔ اور وہ لوگ بھی راضی تھے مگر وہ حضرت خود اس معاملہ میں دیر کر رہے تھے۔ مجھے خارجاً یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ اُنہوں نے میرے اخلاق و عادات اور سگھڑپنے کی بہت تعریف کی۔ مگر ساتھ ہی اپنی تعلیم کا عذر کرکے الگ ہوگئے۔ اگرچہ یہ مسئلہ صرف منگنی کا تھا۔ مگر وہ اس تعلیمی عذر سے اس مسئلہ کو بالکل ٹال گئے +

مجھے اس سے بحث نہیں کہ اُنہوں نے کیوں یہ رشتہ منظور نہیں کیا۔ بلکہ کلام اسمیں ہے کہ جو وجہ اُنہوں نے بیان کی وہ کچھ اصلیت رکھتی ہے؟ مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ عذر قطعاً غلط تھا۔ اصل میں میرے حُسن کی کمی جو قدرت نے میرے حصّہ میں کم و دلیعت کیا تھا اس رشتے کی نامنظوری کا باعث ہوئی۔ اور وہ گومگو حالت میں تھے نہ تو وہ صاف جواب دینا چاہتے تھے۔ اور اپنے حُسن پرست دل کے خلاف کرنا چاہتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اُنہوں نے ایسا کیوں کیا۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ مردوں کے قول و فعل میں کسقدر تباین و تناقض ہوتا ہے۔ میں اُن حضرت کے اکثر مضامین دیکھے ہیں جن میں اُنہوں نے سوشل ریفارمر بننے کی کوشش کی ہے۔ اور جن میں سیرت کو ترجیح دی ہے۔ مگر جب خود وقت پڑا تو حقیقت کھل گئی۔ خیر مجھے اُن سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ کیونکہ مجھے اُن سے کچھ زیادہ اُنسیت نہ تھی +

وہ اس کے بعد بھی اکثر آتے رہے۔ اور ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ تحائف ضرور لاتے۔ اور بڑے اصرار سے ان کو قبول کراتے۔ اُن کی بات چیت خلوص اور ظرافت سے خالی نہ تھی۔ مگر اس شیشہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ میری ماں کو اگرچہ اُن سے شکایت ضرور تھی۔ مگر اس کا اظہار اُنہوں نے کبھی نہیں کیا۔ اور نہ اُنکی خوش مزاجی نے اس کا موقع دیا +

میں خوش خوش اپنے دن گذار رہی تھی۔ مگر خدا بھلا کرے میری خالہ کا اور اماں کا جنہوں نے اس خاموشی کو اُن جواب سمجھ کر اپنی اہانت سمجھی۔ اور رفع خفت کو لئے دوسری جگہ سلسلۂ جنبانی شروع کردی۔ اور آخر الامر ایک دور کے عزیز سے میری قسمت وابستہ کرنے پر تیار ہوگئیں۔ یہ صاحب امیر ضرور تھے۔ مگر پڑھے لکھے واجبی ہی تھے +

یہاں مجھے ہندوستان کی اس رسم پر رونا آتا ہے۔ جو لڑکی کو بے دست و پا بنا دیتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں پھینک دیتی ہے۔ مگر کہتی ہوں کہ وہ کونسا زمانہ ہوگا اور مادر ہند کی وہ کونسی خوش نصیب لڑکیاں ہونگی جنہیں شوہر کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔ میں تو اُن سارے دابل کے رائج کرنے والوں سے کہونگی کہ منجملہ اور دفعات کے ایک دفعہ ایسی رکھتے جس سے لڑکی کو شوہر کے انتخاب کا حق مل جاتا۔ یا کم سے کم اُن کی رضامندی حاصل کی جاتی +

میں اماں کے انتخاب پر زبردستی کا شکار ہوگئی۔ شادی ہوئی اور میں سسرال میں آئی۔ میری ساس پہلے ہی قضا کرچکی تھیں۔ البتہ نندیں اور جٹھانیاں موجود تھیں۔ جن کے ساتھ رہنے سے اور بات چیت سے یہ معلوم ہوا کہ اوّل الذکر کے ساتھ نباہنا بہت مشکل ہے۔ مگر میں اپنی ایسی ہی اور

تاثّرات

ہے طوفانی محبّت کا یہ بحرِ بیکراں تجھ سے
سرِ وحشت زدہ کو ہے خمارِ جاوداں تجھ سے

میں کیا اک گردِ آوارہ ہوں گویا تیرے محمل کی
تو لیلائے جہاں ہے زینتِ صد کارواں تجھ سے

مری ہر اک تمنّا کامیابِ راز ہوتی ہے
یہاں تجھ سے وہاں تجھ سے وہاں تجھ سے یہاں تجھ سے

تمہاری اک نظر پر منحصر ہے فیصلہ دل کا
حیاتِ جاوداں تجھ سے ہے مرگِ ناگہاں تجھ سے

مئے گلرنگ بھی ہے مُطربِ رنگیں نوا بھی ہے
مگر محفل کی سب رونق ہے اے پیرِ مغاں تجھ سے

طبیعت کی یہ سب جولانیاں مرہون ہیں تیری
مرے اشعار میں پیدا ہیں سو رنگینیاں تجھ سے

وگرنہ اس خراب آباد میں کیا خاک رکھی ہے
جوانی کی اُمنگیں ہیں اگر کچھ تو جواں تجھ سے

تلاش

ڈوبنے والے کو ہو جس طرح ساحل کی تلاش
رہروِ گمراہ کو آسودہ منزل کی تلاش

جانبِ خورشید اُڑنے کو ہوں ذرّے بیقرار
بحر کی امواج کو ہو ماہ کامل کی تلاش

آرزو جلنے کی پروانے کو سامانِ حیات
کربلا کے سرفروشوں کو ہو مقتل کی تلاش

میں بھی ہوں مثلِ غبارہ آوارۂ دشتِ جنوں
رامدن رہتی ہے لیلیٰ تیرے محمل کی تلاش

گلبانگِ عمل

کوئی ہشیار باقی رہ نہ جائے بزمِ امکاں میں
وہ سوز و ساز پیدا کر نوائے بربطِ جاں میں

تری ہیبت سے رستم کا بھی زہرہ آب ہوتا تھا
تری عظمت کا سکّہ چل رہا تھا بزمِ امکاں میں

نقوشِ عظمتِ رفتہ دلوں سے محو کیا ہونگے
کھنچا ہے نقشۂ ماضی ابھی تک چشمِ حیراں میں

پیامِ جاہ و سُن اور قدم رکھ راہِ مقصد میں
عروسِ کامیابی منتظر ہے تیری میداں میں

سبق ملتا ہے صلح و آشتی کا ہم کو مذہب سے
نزاعِ باہمی ہو کس لئے گبر و مسلماں میں

یقیناً دہر میں تو کامیاب و کامراں ہوگا
کئے جا کوششیں ہوں جسقدر بھی تیرے امکاں میں

بغیر از زحمت و کوشش کبھی راحت نہیں ملتی
کہ ہوتے ہیں گلوں کے ساتھ کانٹے بھی گلستاں میں

اگر ہے دل کو تیرے جستجوئے لیلیٰ مقصد
تو مثلِ قیسؔ کیوں آوارہ ہے کوہ و بیاباں میں

خدا کی شان اُستادانِ فن بھی مات ہیں اس سے
شمار آزاد کا ہوتا ہے گو طفلِ دبستاں میں

آزاد انصاری (مالیگاؤں)

انتخاب

پوچھنا کیا کتنی وسعت تیرے پیمانے میں ہے
سب اُلٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو اِن آنکھوں کے پیمانے میں ہے

غرق کردے تجکو اے ہمت تیری دنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہر مکتب کے پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا پی کر بہک جانے میں ہے

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ اس بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

منتشر کردے اسے بھی حسن بے پایاں کیساتھ
زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے

اُٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی پھر عرش پر
حشر ہے کعبے میں برپا شور بت خانے میں ہے

جگر

کب علانیہ یار نے مارا — نگہِ شرمسار نے مارا
دیکھتے دیکھتے مجھے سرِ بزم — جلوۂ حسنِ یار نے مارا
شکوہ اغماض کا نہیں مجھکو — غمزۂ چشمِ یار نے مارا
زلفِ صیاد کا جو پھیلا دام — دم نہ پھر کچھ شکار نے مارا
آرزو کو پھر اکے دنیا میں — گردشِ روزگار نے مارا

آرزو

جلوہ ایسا دکھا دیا کس نے — محوِ حیرت بنا دیا کس نے
آنکھ کس کے لئے ہے لالہ فروش — خونچکاں دل بنا دیا کس نے
حسن کو کس نے کر دیا خود بیں — عشق کو یوں بھلا دیا کس نے
بادۂ درد دل سے اے مضطر — مست ایسا بنا دیا کس نے

(علیگڈھ میگزین) مضطر

نکلا ہے تیری شمع تجلی کا گھر کہاں — پہنچی ہے رفتہ رفتہ ہماری نظر کہاں
کرتے جو قدر تیری وہ اہل نظر کہاں — پھرتی ہے ڈھونڈھتی ہوئی اے چشم تر کہاں
جوشِ جنوں کچھ اور ہے دل کی خلش کچھ اور — نوکِ مژہ کا لطف سرِ نیشتر کہاں
نازآفرینیاں تری یارب میں کیا کروں — بت بھی ہیں بے نیاز مگر اس قدر کہاں
ہر پھر کے یہ ہی گھر ہے کہ گذری ہے اک عمر — جائے تو دل سے سوزشِ داغِ جگر کہاں
ہاں رو مدام بزم عدو جھوٹ ہی سہی — یہ تو کہو کہ شب کو گئے تھے اُدھر کہاں
خنجر بکف وہ اور طلب بوسہ واہ واہ — پہنچی ہے جرأتِ لبِ سائل مگر کہاں
سر چڑھ رہا ہے خون کسی مست عشق کا — ورنہ وہ اور لغزشِ پا کا اثر کہاں

تم تو نقاب کھول کے بے فکر ہو گئے — چھپ کر بھلا بتاؤ تو جائے قمر کہاں
کیوں میری ہست و بود کی پڑتی ہے تم کو فکر — تم تو کہو کہ رہتے ہو شام و سحر کہاں

دیر و حرم میں جھکنے سے ارماں کو واسطہ
سچ ہے کہ در عشق کے قابل یہ سر کہاں

ارمان

(ارمغان)

دل میں ہوں تیرِ حلق خنجر رواں سے لیکن نہ لب پہ ضبطِ محبت نہاں رہے
گو خاک دشت میں تری گلی میں تباں ہے لیکن پڑے مزے سے ترے نیم جاں رہے
آنکھوں سے جبکہ اشک نکلا دمِ رواں ہے پھر کس طرح سے رازِ محبت نہاں رہے
بن خاک راہِ دوست فنا ہو کے عشق میں کر جادہ نام جس سے کہ نام و نشاں رہے
دوزخ میں اہلِ جرم میں زاہد بہشت میں اللہ اب شہیدِ محبت کہاں رہے
جب باغباں خلاف ہو صیاد تاک میں پھر کس طرح چمن میں مرا آشیاں رہے
ناراض ہو کے در سے اٹھا دیں جسے حضور جائے گدھر وہ کیا کرے آخر کہاں رہے
دل میں الم جگر میں خلش جان در قفس فرمائیے رہے تو مسرت کہاں رہے
اب آپ آئے جبکہ مرا دم نکل چکا فرمائیے حضور کہ اب تک کہاں رہے
گلشن ہی جس سے چھوٹ گیا گھر ہو گیا قفس پھر اس کو کیا بہار رہے یا خزاں رہے
کوکب سکھا رہا ہوں میں آداب عاشقی سر کو کہ وقف سجدۂ کوئے بتاں رہے
قلب تپاں پہ بس ہے نہ آنکھوں پہ اختیار کوکب میں کیا کروں کہ محبت نہاں رہے

کوکب

(ارمغان)

جز مرگ کسی اور کا مذکور نہیں ہے — صد شکر کہ قاتل مرا مشہور نہیں ہے
اک طالب دیدار کی دنیا میں کمی ہے — کیا دادئ ایمن نہیں یا طور نہیں ہے
دلچسپیٔ عشاق حسینوں پہ ہے موقوف — حسن بھی جہنم ہے اگر حور نہیں ہے
تھی قدر کبھی عشق و محبت کی بھی اے دل — اب حسن کی دنیا میں یہ دستور نہیں ہے
مانا کہ مری زندگی ہے آپکے بس میں — مر جانے پہ بھی کیا مجھے مقدور نہیں ہے
دل لیجئے دیں لیجئے او جان بھی لے لو — اب اسکے سوا اور تو مقدور نہیں ہے
کیا حشر ہوا حضرتِ منصور کا اے دل؟ — خونی کا اب دہر میں دستور نہیں ہے
تھوڑی سی جو جلتی ہے غنیمت سمجھ اس کو — یہ ہے رقم شرمِ انگور نہیں ہے

(الناظر) رقم

غزلیات باندازِ قدیم

رامپور کے دو شاعروں کا کلام

عزیز — ستمگر خوگرِ ضبط ایسے تجھ پر مرنے والے ہیں
توقیر — مری فریاد حالِ زار وہ کیا سننے والے ہیں
عزیز — بیاں میں کیا کروں روداد فرقت مختصر یہ ہے
توقیر — سناؤں حال غم کس کو نہ مونس ہے نہ ہمدم ہے
عزیز — کسی سے کیا کہوں حالت کسی کے سوز فرقت کی
توقیر — جنوں آوارہ گردی سے نشانی یہ نہ مٹ جائے
عزیز — پھر اُٹھا درد سینے میں پھر آئی شامِ غم سر پر
توقیر — بھٹکتے پھرتے ہیں ہر شے میں جلوا چھوڑ کر تیرا
عزیز — یقیں ہے مجرمِ الفت نے دیدی جان زنداں میں
توقیر — کبھی پہنچیں نہ اُن تک وہ مجھی بے کس کی ہیں آہیں
عزیز — مریضِ غم کی حالت پوچھتا کیا ہے جفا پرور
توقیر — فلک بھی اپنے جور و ظلم سے کس طرح باز آئے
عزیز — تمہیں جو دیکھتے ہیں اور پھر بے خود نہیں ہوتے
توقیر — شرابِ عشق کا چسکا کسی سے چھٹنے والا ہے؟
عزیز — جتائے دیتا ہوں میں غیر کو ہشیار کر دو تم
توقیر — تمہارے ظلم مطلب آشنا دشمن اُٹھائیں گے؟
عزیز — نکلنا دل کا اس دامِ بلا سے سخت مشکل ہے
توقیر — دبی جاتی ہے تربت آج میری بارِ احساں سے
عزیز — عزیز اُن کا تجاہل بھی خدا رکھے غنیمت ہے
توقیر — جو اپنا دل کسی کو تم نہ دے توقیر دے بیٹھے

کہ فرقت میں بھی چپ ہیں لب پر آہیں ہیں نہ نالے ہیں
کہ مجھ سے ناتواں کے بھی کوئی نالوں میں نالے ہیں
کہ دل میں درد ہے آنکھوں میں آنسو لب پہ نالے ہیں
شبِ فرقت ہے میں ہوں درد ہے اور لب پہ نالے ہیں
جگر میں داغ ہیں سینے میں شعلے دل میں چھالے ہیں
ثبوت اک رہ نوردی کا ہے تلووں میں جو چھالے ہیں
دل محزوں سے پھر صبر و تحمل جانے والے ہیں
الٰہی طور کی جانب یہ کیسے جانے والے ہیں
نہ اب شور سلاسل ہے نہ آہیں ہیں نہ نالے ہیں
اثر سے بے خبر ہیں جو مجھی مضطر کے نالے ہیں
وہی ہر وقت آہیں ہیں وہی ہر وقت نالے ہیں
سمجھتا ہے اثر سے بے خبر بے کس کے نالے ہیں
سرِ محشر انہیں دیکھو تو کتنے ضبط والے ہیں
مرے سے اس کے ناواقف مرے سمجھانے والے ہیں
کہ نالے ہجر میں اب دل سے لب تک آنے والے ہیں
ہمارا ہے یہ حصّہ ہم یہ چوٹیں کھانے والے ہیں
کسی کی زلف نے کچھ اس طرح کے پیچ ڈالے ہیں
یہ کس نے بعد مدّت قبر پر دو پھول ڈالے ہیں
کبھی تو پوچھ لیتے ہیں کہ لب پر کیوں یہ نالے ہیں
تو پھر یہ آنکھ کیوں تر ہے لبوں پر کیوں یہ نالے ہیں

(خاص)

نقد و نظر

مضامینِ فرحت

قارئین نیرنگِ خیال مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اسسٹنٹ ہوم سکرٹری حیدرآباد دکن کے مزاحیہ مضامین سے بخوبی واقف ہیں۔ لاریب اس دور میں آپ سے بہتر مزاحیہ نویس اور کوئی نہیں +

اس وقت ہمارے پیشِ نظر مضامینِ فرحت کا حصّہ دوئم ہے۔ جس میں چودہ مضامین ہیں۔ [حصّہ اوّل کئی یونیورسٹیوں میں بی۔ اے کا کورس مقرر ہو چکا ہے۔ غالباً اتنی جلد بہت کم کتابیں پایۂ استناد حاصل کر سکی ہیں] اس خوان پُر الوان میں کیا کچھ نہیں۔ زبان کے اعتبار سے ہر مضمون اُستادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دِلّی کی زبان ٹھیٹ محاورے میں ڈوبی ہوئی اور لطف یہ کہ بعض محاورہ بندوں کی طرح نمایش نہیں کی گئی۔ محاوٗرات جا و بیجا ٹھونسے نہیں گئے۔ جہاں جو لفظ جو فقرہ درکار ہے وہیں پر ہے۔ ہمارے بعض مزاحیہ نویس حضرات اگر ان مضامین کو سبقاً پڑھیں تو انکا معیار بہت بلند ہو سکتا ہے +

یوں ان مضامین کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ مضامین جن میں "پُرانی یادیں" محفوظ کی گئی ہیں۔ مغلیہ تہذیب کے وہ دھندلے نقوش جو بہادر شاہ مرحوم کے وقت ابھی زندہ تھے دوبارہ چمکائے گئے ہیں "دلی کا ایک مشاعرہ" جو حصّہ اوّل میں ہے اس قبیل سے ہے۔ اس حصّہ میں "بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر" ہے +

دوسری قسم کے مضامین مشاہیر کے سوانح حیات ہیں۔ مثلاً "حکیم آغا جان عیش دہلوی" والا مضمون ہے۔ اس میں شاعری کی تنقید کا عنصر زیادہ ہے اور حالات کم۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے حصّہ کے ڈپٹی نذیر احمد والے مضمون کا سا نہیں۔ مگر وہ مضمون تو اردو میں کلاسک کی حیثیت رکھتا ہے۔ روز روز ایسی چیزیں خود جناب فرحت بھی نہیں لکھ سکتے۔ اور پھر وہاں مصنّف کا ذاتی تجربہ کفیل حال تھا +

تیسری قسم کے مضامین "خوش مذاقی کے ساتھ اصلاح معاشرت کا پرچار" کرتے ہیں۔ "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر" "صاحب بہادر" اسی ڈھب کے ہیں۔ ان میں پرچار زور اگہرا رنگ لئے ہوئے۔ اور خوش مذاقی متانت کے زہراب میں بجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ "بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے۔ . . . ؟" زیادہ گھریلو چیز ہے۔ اور زندگی کے رہنے والے اصول کے متعلق ہے۔ نئی پرانی تہذیب کو ان سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے +

لیکن ہمارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ مزا ان مضامین کے پڑھنے سے آتا ہے۔ ہماری پسند کی چیزیں آپ کو ضرور پسند آئینگی۔ کیونکہ یہ خوان ہی ایسا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ آپ کو وہ چیز زیادہ پسند آئے جو ہم کو نسبتاً کم مرغوب ہیں۔ جن مضامین کو ہم نے دس بارہ بار پڑھا ہے آپ اُسے تین چار بار ہی پڑھیں ——— قیمت اس مجموعہ کی عہ معہ محصول ڈاک ہے۔ اور مصنّف سے مل سکتا ہے +

من کی بانسری

یہ صاف ستھری کتاب مولوی محمد امیر صاحب۔ بی اے۔ بی ٹی اورنگ آباد کی طبعزاد اور مترجم نظموں کا مجموعہ ہے جسے مطبع عمدہ آفریں حیدرآباد دکن نے ۱۳۴۸ھ میں شایع کیا ہے۔ صفحات ۸۳۔ قیمت عہ۔

جا بجا نظموں کے آخر میں مضمون کے مطابق پنسل کی تصاویر ہیں۔ جو نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ لیکن جوش یگ آبادی کے روح ادب والی فوٹو کی تصاویر ہے بہر صورت بہتر +

کتاب ظاہری صورت کی طرح معنوی حیثیت سے بھی قابل قدر ہے۔ صاف ستھرا کلام ہے۔ فطرت کی محبت، پاکیزہ جذبات عشق، غرض یہ چھوٹا سا مجموعہ ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب کے دیباچے کے باوجود امید افزا ہے۔ اور یہ کچھ چھوٹی سی بات نہیں۔ جس کتاب کا پیش نامہ اس صاحب ذوق کا تحریر کردہ ہے جو غالب کا منکر ہو۔ اس میں "شاعری" کا پایا جانا متعجب نہیں تو اور کیا ہے +

ترجموں میں براؤننگ کا ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ طبعزاد نظموں میں "بھٹکی ہوئی بیوہ" "بچہ" "طلوع آفتاب" اخذ و اقتباس سے پاک ہیں اور شاعر کے اپنے انداز نظر کو نمایاں کرنے والی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ حیدرآباد کے شعرا کے شایع شدہ کلام میں صف اوّل میں ہے۔

البتہ بحریں تنوع نہیں۔ بیشتر نظمیں مستفعلن فعولن: اور فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کا اعادہ ہیں:

آسمان - آتش جنگ	تارے اور شبنم - مطربہ - نغمہ
پھولوں کی بہار - جہانِ عزلت	فوس قزح - شاعر کی دنیا
تنہائی کی قیمت	برسات - نیند
پریم کا لہرا	نظارے
خط کا انتظار	تاج محل
رنج و ملال	حسن گجرات

کہیں کہیں کلام بالکل "نثری" ہوگیا ہے مثلاً "حج کو نظارہ" کا پہلا مصرعہ "علوم حاضرہ کی برکتوں کا یہ زمانہ ہے"۔۔۔ "تاج محل" میں "اے تاج! حسن تیرا ہر دل پہ جما رہا ہے" اکتا دینے والی ٹیپ ہے۔ اس کے بغیر نظم بہتر رہتی ہے۔

فلسفۂ موسیقی

مسلم ایکا ڈمی لکھنؤ کے مفید لکچروں کے سلسلے میں کا ایک لکچر ہے جسے حکیم عبدالقوی لکھنوی نے دیا اور جو انجمن پریس ۱۹۳۰ء میں شایع ہوا۔ اب کتابی صورت میں ہم کو اعجاز بک ایجنسی بارہ بنکی سے مل سکتا ہے +

اس لکچر میں شاعری اور موسیقی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ علم موسیقی کا فطرتِ انسانی پر اثر کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔ علوم و فنون کے ذریعہ قومی اصلاح کے تدابیر پر غور کی گئی ہے +

عرب کی شاعری

سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد سرور علی صاحب کی کتاب ہے۔ لیکن آپ نے صرف اسے مرتب کیا ہے۔ مصنف مولانا وحید الدین سلیم ہیں جن کا نام سرورق پر درج نہیں۔ قیمت فقط چار آنے ہے۔ اور کتب خانہ سبحانی چوک حیدرآباد دکن سے ملتی ہے۔ ہے تو چھوٹی سی کتاب مگر بے حد مفید۔ گویا عرب ذہنیت کا آئینہ پیش کر دیا ہے۔ عرب شاعری کے موضوعات۔ تشبیہات۔ مختلف مضامین۔ مشہور شعرا کے کلام کا نمونہ کیا کچھ نہیں۔ اسلامی روایات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے ضرور مطالعہ میں لائیں +

گلشن گفتار

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد نہایت مفید کتابیں شایع کر رہا ہے۔ یہ کتاب شعراء اردو کا قدیم ترین تذکرہ ہے جو خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کی تصنیف ہے۔ اور سید محمد ایم۔ اے نے نہایت محنت سے مرتب کیا ہے۔ جا بجا ہر شاعر کے ذکر کے ساتھ اور تذکروں کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔ قیمت فقط ۱۲ر +

م۔ د۔ ت

اخبار علمیہ

سر فلپ ہارٹوگ، صدر ہارٹوگ کمیٹی متعلقہ سائمن کمیشن نے دہلی میں یونیورسٹیوں کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی طلبہ کے پاس کتابیں بہت کم ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تیرہ سو طلبہ میں جنھوں نے اپنے اسامذہ سمیت سال بھر میں صرف ۴ ہزار کتابیں کتب خانہ سے نکلوائیں۔ یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہر ہندوستانی طلبہ زیادہ تر پروفیسر کے لکھوائے ہوئے نوٹوں پر گزارہ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پروفیسر صاحبان آزادی کے ساتھ لکچر نہیں دے سکتے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا خیال ہوتا ہے۔ کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا حرف حرف لکھا جاتا ہے۔ اگر طلبہ اپنے طور پر اپنے مضامین کا مطالعہ کریں اور پروفیسر صاحبان اپنے وسیع مطالعہ سے ان کی مدد کریں تو تعلیم بہت اچھی ہو +

سر ہارٹوگ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ طلبہ میں مطالعہ کی عادت پڑنی چاہئے۔ اور انہیں اپنی آمدنی کا ایک حصہ خرید کتب پر صرف کرنا چاہئے

اس سلسلہ میں وہ ایک کارآمد اور قابلِ عمل تجویز پیش کرتے ہیں جو یقیناً نہایت مفید ہے:۔

آپ فرماتے ہیں کہ انگلستان میں کتب فروشوں کا ایک کارخانہ ہے جو طلبہ کے ہاتھ اس شرط پر کتابیں فروخت کرتا ہے کہ جب وہ کتابیں ان کے کسی کام کی نہ رہیں تو ان کی کچھ قیمت واپس دے کر کتابیں لے لے۔ اس سہولت سے لندن کے طلبہ بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کے یونیورسٹی مراکز میں بھی عمل کیا جائے تو بہت اچھا ہو +

۱۹۲۶ء میں انگلینڈ و اسکاٹلینڈ میں ۱۲۹۱۲ کتابیں شایع ہوئیں۔ اس تعداد میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جو گورنمنٹ کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئیں۔ ان کل کتابوں میں ۳۲۰۷ جدید مطبوعات - ۳۸۰ ترجمے اور

آپس کی بات چیت

اس نمبر کی تصاویر

اس نمبر کی تصاویر میں سے ایک سہ رنگی ہے۔ اور وہ بھی ایڈمنڈ ڈیلوک مشہور عالم مصور کی۔ جس کی تصاویر کا یورپ میں ڈنکہ بج رہا ہے۔ یہ اُس کی مصوّر الف لیلہ کا ایک شاہکار ہے۔ جو سندھ باد جہازی کے افسانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ وہ منظر ہے جہاں سندھ باد جہازی نے اپنے ہمام سندھ باد کی دعوت کی ہے۔ ایک مغربی مصور نے کس خوبی سے مشرقی معاشرت، مشرقی ملبوسات اور مشرقی سازو سامان و آرائش وغیرہ کو پیش کیا ہے۔ اس کی داد دینے کو دل چاہتا ہے +

دوسری دو تصویریں جو آرٹ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام مطالعہ اور دوسری کا نام دو مغل شاہزادیاں ہے۔ دو مغل شہزادیوں والی تصویر سترہویں صدی کے مصور کا کمال ہے۔ اسکو بھی دیکھئے اور عمدہ حاشیہ والی مطالعہ کی تصویر پر بھی نظر ڈالئے۔ یہ گویا دو شہزادیوں والی تصویر کا جواب ہے۔ دونوں نے اپنا اپنا کمال دکھایا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں پرانی تصویر میں جو چہروں کے خطوط میں باریکی نہیں۔ لیکن عام حالت میں وہ بہتر ہیں +

مرقع الاخبار میں ہز ہائنس آغا خان کی وہ تصویر ہے جب آپ پبلک کے سلام کا جواب دے رہے ہیں + دو ہندوستانی ہوا باز طالب علموں کی تصویر ہے۔ مسٹر ای۔ جے ایلرل بی۔ ایس۔ سی اور مسٹر کے ایل پوری بی ایس سی کی ہے۔ یہ دونوں طالب علم سرکاری وظیفہ پر ہوابازی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تیسری تصویر قمرالدین احمد کی ہے جو خانبہادر شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹر گونڈہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ اُن تین ہندوستانیوں میں سے ہیں۔ جو بحری انجینئرنگ کی تعلیم سیکھنے کے لئے دو سو چالیس پونڈ سالانہ پر سات سال کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیجے گئے ہیں۔ قمرالدین احمد امتحان مقابلہ میں مئی کے مہینہ میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے تین سال تک بمبئی میں جہازرانی کی تعلیم حاصل کی اور اب ۱۱ر جون کو مجولا نامی جہاز پر سوار ہو کر انگلستان تشریف لیگئے ہیں۔

آپکی عمر صرف ۱۷ سال کی ہے +

مرقع الاخبار کی پانچویں تصویر ہمارا جیکانیر کی ہوجو گول میز کانفرنس میں شرکت کرینگے + چھٹی تصویر مسز عارف بے کی ہے۔ جو ترکی سفیر لندن کے سکریٹری کی زوجہ ہیں۔ اور ساتویں وزیر کی بیوی کی وساطت سے ملکہ مظفر کے حضور میں پیش ہوئی تھیں۔ انشاء اللہ ہمارا مرقع الاخبار ہمیشہ بہترین تصاویر پیش کرنیکا فخر حاصل کیا کریگا

حضرت ضعیف ہاشمی صاحب نائب مدیر ریاست لکھتے ہیں: "ایڈیٹر نمبر پہنچا۔ شکریہ۔ کامیاب ہے۔ خدا آپکی کوششوں کو چار چاند لگائے۔ اس نمبر کی تصاویر مجھے بہت پسند ہیں۔ یہ لیتھو کی ہیں یا بلاک بنوائے ہیں۔ اگر لیتھو کی تصاویر یا سفید رصاف ہوسکتی ہیں تو ہر مہینہ آٹھ دس ہونی چاہئیں۔ جو افسانہ اور مضامین کے متعلق ہوں + رسالہ کا سائز مستقل طور پر سالنامہ کا کر دینا نہایت عمدہ تجویز ہے۔ آپ رسالہ کے سرورق پر لکھدیں: "ایجاد ہمارا حصہ ہے۔ اور تقلید دوسروں کا"۔ یہ سائز نہایت کامیاب رہے گا" +

برادرم آپکا ارشاد سر آنکھوں پر۔ سرورق کے اندر آپ کا فقرہ درج کر دیا گیا ہے۔ یہ تصاویر لیتھو کی تھیں۔ انشاء اللہ اب اس قسم کی جو تصویر آپکا خط ہوگا ضرور چھپیگی

حضرت ناکارہ حیدرآبادی۔ آپنے خودکشی کے اکیس اور ۱۷ کو پڑھکر مجھے بی کاک لکھدیا۔ بھئی میں تو لی کاک کی خاک بھی نہیں +

مکرمی بہرام خاں اپنے ایک گرامی نامہ میں جو بعضوں پر مشتمل ہے لکھتے ہیں: "سنا ہے کہ آیندہ ماہ جنوری ۱۹۳۲ء میں جناب نے نیرنگ خیال کا اقبال نمبر شایع کرنیکا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اقدام عمل قابل ہزار آفریں ہے۔ اسکے متعلق مودبانہ التماس ہے کہ اقبال نمبر کو نہایت شاندار شایع کرنے کی سعی فرمائیں۔ کیونکہ ہندوستان بھر میں غالباً سوائے جناب کے کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو علامہ اقبال کے متعلق نہایت ہی شان و شوکت سے اپنے رسالے کا خاص نمبر شایع کر سکے۔ ہم شیدائیان اقبال کی مدت سے آرزو تھی کہ کوئی ماہوار رسالہ علامہ موصوف کے متعلق کوئی خاص نمبر شایع کرے۔ ہزار ہزار شکر ہو کہ ہم اقبال کے نیاز برداروں کی آرزو برآئی اور جناب نے خود بخود اقبال نمبر شایع کرنیکا ارادہ کر لیا"

اسکے بعد آپنے چند تجاویز پیش کی ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ نمبر بہت ضخیم ہو۔ بہرام صاحب کے خانے ہیں چونکا دیا ہو۔ بہرحال آج سے ہمارے ہاتھ میں اقبال نمبر اب دوسری صورت سے پیش نظر

ہوگیا اور اس نمبر کی تفصیل سے کمیں گے (ادارہ)

۱۸۷ جدید ایڈیشن کی کتابیں ہیں۔ باقی ۹۱۲۰۸ کتابوں میں ۳۷۰۶ ناول اور ۳۰۳ ۱۵ بچوں کے لئے۔ ۹۴۴ تاریخوں۔ سوانح عمری پر ہیں۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس دور مادیات میں ۸۱۵ کتابیں مذہب کے متعلق شایع ہوئیں۔ ۸۰۶ تعلیمی۔ ۳۷۶ نظم اور ڈراما۔ ۴۱۵ سیاسیات اور ۳۵۰ اقتصادیات کے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۸۶۰ کتابیں مختصر مضامین و مراسلات پر مشتمل ہیں۔ نیز ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے پر پانچ علم النجوم و سماجیات پر نو علم الحیوانات پر اُنیس۔ اور علم النفس پر بچیس کتابیں شایع ہوئیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستانی مطبوعات پر نظر ڈالی جائے۔ اور خصوصاً اُردو زبان کی کتابوں کو دیکھا جائے تو بجز افسوس کچھ حاصل نہیں ہوسکتا + (المعلم)

علامہ شبلی مرحوم کے مضامین کے دو مجموعے مقالات اور رسایل کے نام سے مدت ہوئی کہ چھپ چکے ہیں۔ مگر اب تک ان کے سینکڑوں مضامین متفرق اخبارات و رسائل میں منتشر ہیں۔ قدردانوں کا تقاضا تھا کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو بھی چُنکر کسی رشتہ میں منسلک کر دیا جائے۔ اب یہ کام شروع کر دیا گیا ہے اور بہت سے مضامین یکجا ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے پُرانے اخبارات و رسائل کے فائل اُلٹے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی صاحب ہم کو مدد دینا چاہیں تو ہم شکریہ کے ساتھ قبول کرینگے +

اندازہ ہے کہ یہ مضامین دس جلدوں میں سما سکیں گے۔ رسائل اور مقالات اور عالمگیر والے مضامین بھی اسی کے اندر ہونگے۔ جلدوں کی تقسیم عنوانات پر ہوگی۔ یعنی مذہبی ایک جلد، تعلیمی ایک جلد، سیاسی ایک جلد، وغیرہ۔ اس وقت تک اسکے حسب ذیل عنوانات قایم کئے گئے ہیں۔ مذہبی علمی، تعلیمی، تنقیدی، ادبی، سیاسی تاریخی، تمدنی، قومی، اور آخری جلد انکے خطبات اور تقریروں کی ہوگی

اڈیٹر معارف نے ۱۹۲۸ء میں "عرب و ہند کے تعلقات" پر جو خطبے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد میں دیئے تھے۔ وہ اب چار سو صفحوں کی ایک مبسوط و مفصل کتاب کی صورت میں اکیڈیمی مذکور کی طرف سے خوبصورت ٹائپ میں چھپکر اور مجلد ہوکر شایع ہوگئی ہے اور وہیں چار روپے میں ملیگی۔ امید ہے کہ یہ نیا مبحث اہل علم اور عام ناظرین بلکہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے مفید ہوگا + (معارف)

دوشیزہ

دوسرا اڈیشن چھپ گیا

علم نوعی پر بیمثل اور لاجواب کتاب

یہ کتاب سلسلۂ تربیت الانسان کا پہلا حصہ ہے۔ جو اپنی جگہ پورا اور مکمل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے ازدواجی اور سماجی تعلقات پر طبی اور سائنٹفک اصولوں کے مطابق تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ جرمن فرانسیسی امریکن اور انگلستان کے تمام ڈاکٹروں کی تحقیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد تمام کام کی اور ضروری باتیں انتخاب کر لیگئی ہیں۔ ہندوستان کے فارسی اُردو سنسکرت زبان کے کوک شاستروں کی لایعنی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام باتیں چھانٹ کر اور اس پر تمام تحقیقات جمع کر کے ایک کتابی صورت میں جمع کیا گیا ہے۔ زنا، حمل سے لیکر بچپن اور جوانی تک کی تمام حالتوں اور ضرورتوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب دلی والوں کی اُن کتابوں کی نقل یا اُن کی تقلید نہیں ہے۔ جو عریاتی اور جذباتی باتوں سے لبریز نظر آتی ہیں۔ بلکہ شروع سے لے کر اخیر تک تمام چیزیں اصول اور اخلاق کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کتاب کی برکت سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔ جوانی کو قایم رکھنے اور حسن و شباب کی جو ضروریات کو پورے طور پر بے نقاب کرنے کے ساتھ بہترین اور صحیح مجرب نسخہ جات اس پیرایہ میں پیش کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مستفید ہو سکے۔ ہر پڑھے لکھے گھر میں یہ کتاب موجود رہنی چاہئے۔ سائز کلاں۔ حجم ۲۲۵ صفحات۔ فوٹو بلاک کی چالیس تصاویر۔ سستی تصاویر ایکسٹرا۔ مجلد قیمت علاوہ محصول ہے۔ +

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ بارہ دخانہ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

(تعداد اشاعت ۵۲۰۰)

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی، ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اسلئے ہمیشہ اس میں اشتہار دو

جلد ۱۰ نمبر ۶

ایڈیٹر:- حکیم محمد یوسف حسن

قیمت فی پرچہ پانچ آنہ + ویلر بک سٹال پر ۶ر سالانہ چندہ مع محصولڈاک وخرچہ وی پی ہے، ممالک غیر سے ۸ر شلنگ

نیرنگِ خیال

"ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا"

فہرست مضامین

آپس کی بات چیت	از ایڈیٹر	۲
شذرات	از ایڈیٹر	۳
لالۂ کوہ	از حضرت حنیف ہاشمی	۵
استنبول کا ایک قدیم بچہ		۱۰
مترجمہ جناب صوفی محمد حسین صاحب بی اے انسپکٹر ڈاکخانجات		۱۵
مسرت	جناب عتیق اللہ خاں بی۔ اے۔ ملکہ	۱۸
محبت ایک بیماری ہے		۲۲
	از جناب عطاء الرحمٰن صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی	
خانہ جنگی (ڈراما)	از ناکارہ حیدرآبادی	۳۱
دیوانگی۔	جناب سروانجی خانصاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی	۳۵
چلہ کشی		
	از جناب میرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے۔ ایل ایل بی علیگ	۳۷
دو گداگر	از جناب مظفر قریشی دہلوی	۴۴
طوطے کی تعلیم،	جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔ بی۔ ایچ	۴۷
فلسفہ شباب۔	جناب مولانا سبطین احمد صاحب بدایونی	۵۰
غریب کا بچہ (نظم)	جناب سید کاظم صاحب نشتر لکھنوی	۵۱
"مجھے تم سے محبت ہے"۔	حضرت اکبر حیدری	۵۲
شعر۔	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی	
منظومات		
جذب عشق	محمد یعسوب حسن صاحب	
تجلی جمال	جناب طبیب بہاری	

دمہ کی انوکھی دوا

"کشتمال" کی ایک خوراک سے اتنا فائدہ ہوتا ہے جو دوسری دواؤں سے ایک ماہ میں بھی نہیں ہوسکتا۔ سخت سے سخت دورہ چند منٹوں میں کافور ہوجاتا ہے۔ نیا پرانا خشک وتر دمہ ایک ہی شیشی کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ پہلی خوراک سے خاطرخواہ فائدہ نہ ہو تو دوا واپس کرکے اس کی قیمت مع دو طرفہ محصول ہم سے لے لیجئے۔ تکمیل شرط کے واسطے دو خوراکیں مفت اور واپسی قیمت کا اقرار نامہ ہر پارسل میں بھیجا جاتا ہے (نوٹ) گردہ ومثانہ کے امراض اور سوزاک والوں کو نقصان کرتی ہے۔ قیمت فی شیشہ محصول ۱ر +

ملنے کا پتہ:- منیجر کشتمال فارمیسی ۱۰۴ وکٹوریہ پارک شہر بنارس

(۷۸۹)

آپس کی بات چیت

تعریف نیرنگ خیال کی تعریف و توصیف میں درجنوں خطوط ہر ماہ موصول ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم اُن خطوط کو شایع نہیں کرتے لیکن کبھی کبھی کوئی خط شایع کرنا ہی پڑتا ہے۔ اُس سے اپنی تعریف مدنظر نہیں ہوتی صرف ناظرین کے حسن ذوق کی داد دینا ہوتا ہے۔ لکھنؤ سے ایک کارڈ موصول ہوا ہے جس میں نیرنگ خیال کے ایک خریدار لکھتے ہیں:-

"جناب حکیم صاحب خدا آپ کا سایہ ہم سب پر تادیر دراز رکھے۔ آپ کو اگر علم ادارت کا ڈاکٹر کہا جائے تو صحیح ہوگا۔ آپ کو اس فن میں یدطولیٰ حطا ہوا ہے۔ سید جالب مرحوم کے بعد اب اڈیٹروں میں آپ کو سب سے بڑا درجہ ملنا چاہئے۔ کیونکہ استقدر کم عرصہ میں آپنے قریب قریب وہی بات حاصل کر لی ہے جو قدرت نے مرحوم کو عطا کی تھی۔ آپ کا ایڈیٹر نمبر بے مثل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ اپنی شان کا پہلا اور سب سے اچھا نمبر ہے۔ آپ کے سالناموں اور عید نمبروں کا کیا کہنا۔ معمولی نمبر بھی بچاسوں پرچوں کے خاص نمبر سے اچھے ہوتے ہیں۔ زیر نظر نمبر یعنی اگست کا پرچہ بہترین ہے۔ تصویریں بھی خوب۔ مضامین کا کیا کہنا۔ نیرنگ خیال نے شاہراہ ترقی میں جو درجہ حاصل کیا ہے۔ اس کو کسی انگریزی میگزین سے کسی حالت میں کم نہیں کہا جا سکتا۔ آپکو اس کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ برابر ترقی کرتا رہے۔ آمین"۔ محمد افضال گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ)

آپ کی اس عزت افزائی کا مشکور ہوں۔ اور ان تمام اصحاب کا بھی جنہوں نے ایڈیٹر نمبر اور نیرنگ خیال کے دور جدید کے متعلق ہمت افزا خطوط لکھے ہیں۔ اب میں انشاءاللہ سالنامہ اور اقبال نمبر کو نیرنگ خیال کی انتہائی ترقی پذیر صورت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کرونگا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ مجھے کامیاب کرے اور میرے معاونین کو میری اعانت پر متوجہ کرے +

مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو (دکن) مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کے نام نامی سے کون شخص واقف نہیں۔ آپ نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج میں جو کوششیں کی ہیں۔ وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان دنوں آپ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو زبان کے استاذ اوّل ہیں۔ آپ سے ایک مضمون نیرنگ خیال کے سالنامہ کے لئے طلب کیا تھا۔ جس کے جواب میں آپ نے ایک معذرت نامہ بھیجا اور فرمایا:-

"عنایت نامہ پہنچا۔ میں بہت نادم ہوں کہ تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں۔ خدا کے فضل سے آپ کو لکھنے والے ایسے اچھے اچھے مل گئے ہیں کہ اب مجھ جیسے کوتاہ قلم اور بے بضاعت لوگوں کی ضرورت نہیں۔ میں آپکی کامیابی سے خوش ہوں اور آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔ میرے ذمے اسقدر اور اتنے مختلف قسم کے کام ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ مجلہ عثمانیہ میری نگرانی میں شایع ہوتا ہے۔ جامعہ والوں کے متواتر اور مسلسل اصرار پر میں نے یہ چند بے معنی صفحے لکھے۔ وہ بھی کیونکر اور کہاں۔ سفر کی حالت میں چلتی ریل میں۔ اس سے آپ میری مصروفیت کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ آپ کے لئے نہ لکھتا۔ میں بہت افسوس اور ندامت کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اصرار نہ فرمائیں گے۔ کیونکہ اس سے مجھے تکلیف ہوگی"۔ نیازمند عبدالحق +

اس کا جواب بھی ملاحظہ ہو:-

مکرمی مخدومی جناب مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ العالی۔ آپ کا گرامی نامہ پہنچا۔ آپ نے نیرنگ خیال کی کامیابی پر مجھے مبارکباد دی ہے اور

میری کامیابی پر اظہار خوشنودی کیا ہے۔ اس کے لئے میرا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ یقین کیجئے کہ میری کامیابی کی انتہا آپ ہی جیسے بزرگوں کی مساعی کی ابتدا کی شرمندۂ احسان ہے۔ سچ پوچھئے تو اردو کی ترقی کا بیج آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے بویا گیا تھا۔ اب گلشن پر بہار کا موسم معلوم ہوتا ہے۔ اور انواع و اقسام کے پھل پھول اس کی رونق کو بڑھا رہے ہیں۔ اس گلشن ادب کی زینت نیرنگ خیال بھی ہے۔ لیکن وہ آپ کی توجہ سے مستغنی نہیں ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ نیرنگ خیال کو اچھے لکھنے والے مل گئے ہیں۔ لیکن یہ تو وہی بات ہوئی کہ اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی۔ یہ احساس کہ اب نیرنگ خیال کو آپ جیسے اہل قلم کی اعانت کی ضرورت نہیں رہی۔ میں تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ یہاں تو ہل من مزید کا نعرہ ورد زبان ہے +

مولانا آپ کی مصروفیتوں کا بخوبی علم ہے۔ اور جانتا تھا کہ آپ کے پاس ایک لمحہ بھی فالتو نہ ہوگا۔ لیکن آپ کے مضمون کے حصول کی خواہش پر یہ حقائق بھی قابو نہ پا سکے۔ اور میں خط لکھنے پر مجبور ہوگیا +

حیدرآباد کی تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ سلطان العلوم محبوب المسلمین حضرت میر عثمان علی خاں شاہ دکن کی علم پروری اور نظر انتخاب نے آپکے ذمے اردو زبان کی ایک لغت مرتب فرمانے کی خدمت تفویض کردی ہے۔ اور اس کے لئے تین سال تک اکیڈار روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی مقرر فرمادیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی اس خسروانہ نوازش کے لئے بہی خواہان اردو ہمیشہ ہمیشہ اعلیٰ حضرت کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں گے۔ خدا کرے کہ اردو زبان کی ایک جامع لغت کا کام آپ کے مبارک ہاتھوں سے صورت پذیر ہو + اب آپکی مصروفیتوں میں ایک "گرانبہا اور گرانقدر" اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یقین کیجئے کہ مضمون کی مانگ یا آپ کے مضمون کے لئے جو احساسات میرے دل میں ہیں وہ کبھی بھی کم نہ ہونگے۔ شاید میرا خوب دل کبھی آپکو اس جانب متوجہ کر ہی لے + احقر یوسف حسن

شذرات

دہلی میں حضرت اکبر حیدری کے "دولت کدہ" پر ارباب "علم و فن" کا اجتماع رہتا ہے۔ جن دنوں ہم دہلی میں تھے۔ ان دنوں لکھنؤ کے مشہور "ظریف ادب" حضرت شوکت تھانوی مع اپنے عزیز "ظریف نواز" حضرت نسیم انہونوی کے تشریف فرما ہوئے۔ "اکبر منزل" اس پر لطف یادگار صحبت کا مرکز تھی جہاں "انواع و اقسام" کے کھانوں کی لذت میں "زبان کے چٹخارے" بھی شامل تھے حضرت اکبر حیدری۔ حضرت شوکت تھانوی حضرت نسیم انہونوی۔ مولانا حنیف ہاشمی۔ حضرت عشرت رحمانی اور خاکسار ایک ہی دسترخوان پر "دست درازی" یا "زبان درازی" کرتے رہے۔ راجہ غلام احمد صاحب اس مجلس کے "اوکار و اواث" تھے۔ اللہ پاک انہیں چشم بد سے بچائے۔ دسترخوان پر وہ ہمہ تن "مشغول و منہمک" ہوتے ہیں۔ اور اپنا وقت فضول باتوں میں ضایع نہیں کرتے۔ اور جب طعام سے فارغ ہوتے ہیں تو چائے کی ایک درجن پیالیاں انہیں اس وافر طعام کے ہضم کے لئے درکار ہوتی ہیں جو اُن کے معدہ میں بھرا ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں کوئی دعوت راجہ غلام احمد صاحب کی شرکت کے بغیر دعوت ہی نہیں کہلا سکتی +

حضرت شوکت تھانوی کا یہ دورہ احباب کی ملاقات اور اپنے مضامین کے پہلے مجموعہ "موج تبسم" کے پراپگنڈے کے لئے تھا۔ حضرت نسیم انہونوی چونکہ موج تبسم کے پبلشر تھے۔ اس لئے وہ بھی ہمرکاب تھے۔ اس لئے اُن سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ ہم حیران ہیں کہ حضرت شوکت تھانوی صاحب کو موج تبسم کے پراپگنڈے کی کیا ضرورت پیش آئی! وہ کتاب تو ہر شخص خود بخود خرید لے گا۔ جس کتاب میں حضرت شوکت کے مضامین ہوں۔ اُسے کون نہیں خریدیگا۔ آپ لاہور محض اس لئے تشریف نہ لے گئے کہ میں دہلی میں تھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حضرت شوکت و نسیم صاحب اب لاہور تشریف لائیں +

مضامین نیرنگ خیال کے ستمبر نمبر میں مولانا حنیف ہاشمی صاحب کا مضمون لالہ کوہ قابل مطالعہ ہے۔ مولانا حنیف صاحب نیرنگ خیال کے لئے متعدد مضامین لکھ رہے ہیں۔ لالہ کوہ میں جذبات اس لطیف اور موثر پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے +

"استنبول قدیم کا بچہ" ایک تاریخی رومان ہے جو محترمی صوفی محمد حسین صاحب بی اے نے رسالہ ایشیا سے ترجمہ کیا ہے۔ اس قسم کے مضامین اپنے اور

خاص جذب وکشش رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مضمون ابھی تشنہ ہے اگر اس کا کچھ بقایا ہو تو صوفی صاحب امید ہے کہ وہ بھی بھیجدیں گے ۔ خان عتیق اللہ خاں صاحب بی اے کا "ادبی افسانہ" **مسرت** ہزار مسرتوں سے لبریز ہے ۔ جناب عطاء الرحیم صاحب ایم اے ایل ایل بی نے ایک فلسفیانہ مضمون میں بتلایا ہے کہ محبت بھی ایک بیماری ہے ۔ اور حضرت عشق جن بھوت کی طرح جس کے سر پر سوار ہوں اُس کا علاج "وصل حبیب" نہیں بلکہ ادویات کے ذریعہ سے ہونا چاہئے ۔ یہ مرض ہے نہ کہ تاثرات حسن ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے ۔ کیونکہ بدصورت لوگ بھی حسین معلوم ہونا، نظر کا دھوکا نہیں تو بیماری تو ضرور ہے ۔

حضرت ناکارہ حیدرآبادی کا ڈراما خانہ جنگی اس نمبر کی جان ہے ۔ نیرنگ خیال فن ڈرامہ کے احیا میں خاص کاوش سے کام لیتا ہے ۔ اگر اس کے قلمی معاونین اس پایہ کے ڈرامے بھی بھیجتے رہیں ۔ تو "ادب العالیہ" کی ترقی کی صدہا راہیں کھل سکتی ہیں ۔ جناب سردار نبی صاحب ایم اے بی ٹی نے "دیوانگی" پر اُسی نکتۂ نظر سے بحث کی ہے جس طرح سے گذشتہ نمبر میں جناب شرف الدین احمد نے کاہلی پر ڈالی تھی ۔ اس قسم کے مختصر مضامین اردو ادب میں قیمتی اضافہ سمجھے جائیں گے ۔

جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی کا مضمون چلّہ کشی اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہے ۔ مزاحیہ مضامین کی اس نوع کو ہم زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں کسی طویل ماحول کے بعد اختتامی نکتہ اپنے اندر پوری جذب مرکزیت پیدا کرسکے ۔ چلّہ کشی بھی اس قسم کی ایک کامیاب ترین کوشش ہے ۔ مرزا صاحب کا ایک مضمون سالنامہ کے لئے بھی موصول ہو چکا ہے ۔ سبحان اللہ وہ اسقدر دلچسپ ہے کہ سالنامہ کی شہرت کا باعث ہوگا ۔

دوگدا گر ۔ ایک انگارۂ تشخص ہے ۔ جو جناب عبد الباقی کی کامیاب کوشش کا نتیجہ ہے ۔

طوطے کی تعلیم ۔ آج نیرنگ خیال بڑے فخر ومباہات سے اعلان کرتا ہے کہ بنگال کے مشہور ادیب جناب ٹیگور کے مضامین کو اردو زبان میں شایع کرنے کا فخر صرف نیرنگ خیال کو حاصل ہوگا ۔ یوں تو ٹیگور کے مضامین کے تراجم کئی رسالوں میں شایع ہوتے ہیں ۔ لیکن اُن میں سے بیشتر اُس روح کو کھل ڈالنے کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں جسے ٹیگور کے مضامین کی جان کہنا چاہئے ۔ بنگالی سے مضمون انگریزی میں ترجمہ ہوتا ہے ۔ اور انگریزی سے پھر اردو میں ڈھالا جاتا ہے ۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ مضمون کی اصل روح کس طرح سے کچلی جاتی ہوگی ۔ لیکن اب نیرنگ خیال میں ٹیگور کے مضامین ۔ افسانوں ۔ اور ڈراموں ۔ غزلوں اور گیتوں کے تراجم اس شان سے شایع ہونگے کہ اُن کی حقیقی روح اُردو زبان میں بھی موجود ہے ۔ یہ کام جناب ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد صاحب سرانجام دینگے جو چار سال تک ٹیگور کے کالج شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں ۔ اور بنگالی زبان کے پورے ماہر ہیں ۔ آپنے بیشتر مضامین اور ان کی تشریح ٹیگور کی زبان سے سنی ہے ۔ اس لئے وہ صحیح طور پر بنگالی زبان سے ان مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں ۔ اس سلسلہ کی پہلی قسط "طوطے کی تعلیم" اس نمبر میں شایع ہو رہی ہے ۔ اسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل مترجم نے سلیس وسادہ زبان میں مضمون کے اصل مفہوم کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ۔ "طوطے کی تعلیم" ہندوستانیوں کی اُس تعلیم کی طرف اشارہ ہے جس کے سونے کے قفس (عالیشان عمارتوں) کے اندر بچے طوطے کی طرح کتابیں رٹتے ہیں اور پھر بھی بے علم اور ناکارہ رہتے ہیں ۔ ہم ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو توجہ دلا رہے ہیں کہ آپ سالنامہ کے لئے بھی کسی ایسے ڈرامے کا ترجمہ پیش کریں ۔ جس کا ترجمہ ابھی انگریزی میں بھی نہ ہوا ہو ۔

جذب عشق میرے حقیقی بھائی یعقوب حسن کی پہلی کوشش ہے ۔ اگرچہ اس میں مدرسہ سے باہر آنے کے رنگ کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے لیکن اگر انہوں نے کوشش جاری رکھی تو آہستہ آہستہ وہ میرے قوت بازو ثابت ہونگے ۔ **تجلی جمال** ۔ مولانا صدیق طبیب ۔ کا زمانہ ہے ۔ طبیب صاحب مستقل طور پر نیرنگ خیال وتازیانہ کے لئے عربی اخبارات ورسایل سے مضامین ترجمہ کر رہے ہیں ۔ اس سلسلہ میں وہ ایک قیمتی ذخیرہ فراہم کردیں گے جس سے ہم وقتاً فوقتاً ناظرین کی خدمت میں کچھ نہ کچھ پیش کرتے رہینگے ۔ **ریویو** ۔ افسوس ہے کہ اس ماہ ریویو شایع نہیں ہو سکے ہیں اس کا باعث یہ ہے کہ نیرنگ خیال کے نقد ونظر کے کالم جناب سید نجیب اشرف صاحب ایم اے نے اپنے ذمہ لئے ہیں ۔ اور ہم کتابیں اُنکی خدمت میں بھیج چکے ہیں ۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ سے کتابوں کے ریویو بھی شایع ہونگے ۔ جو صاحب نیرنگ خیال کے لئے کتابیں ریویو کے لئے بھیجیں اُنہیں ہمیشہ دو کتابیں بھیجنی چاہئیں ۔ **تصاویر** ۔ ایک تصویر شکسپیر کے مشہور ڈراما ہملیٹ (خون ناحق) کی منظر ہے ۔ صرف ایک تصویر میں پورے ڈرامہ کی روح نظر آجاتی ہے ۔ دوسری تصویر "ڈائنا دیادی" کی ہے ۔ جو چاند میں رہتی اور شکار کی بہت شایق ہے ۔ ڈائنا دیوی اپولو شاہ آفتاب کی بہن ہے ۔ اس تصویر کی عریانی کو چھپانے کے لئے ہمیں آسے کپڑوں میں چھپانا پڑا ۔ دونوں تصویریں دو رنگوں میں شایع کیگئی ہیں ۔ مرقع الاخبار میں بھی اس ماہ متعدد تصاویر ہیں ۔ چار تصویریں ہندوستان کے اُن متعدد رئیسوں کی ہیں جو گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کیلئے انگلستان تشریف لیجا رہے ہیں ۔ ایک تصویر جنوبی افریقہ سے موصول ہوئی ہے جو ہماری اسلامی بہن ہے ۔

لالہ کوہ

وہ رومیو جولیٹ کی مانند [illegible] نہ تھے۔ اسی لئے میں ان کا افسانہ بیان کرتا ہوں۔ وہ دو ایسے [illegible] رومیو جولیٹ تھے۔ لیکن ان کے افسانۂ عشق اور رومانس [illegible] انبساط سے ہمکنار تھا۔ اور شیکسپیئر کے رومیو اور جولیٹ کی داستان عشق و محبت، غم و الم کا مرقع تھی۔ وادیٔ کشمیر کے رومیو جولیٹ رشتۂ ازدواج میں بھی منسلک ہوئے تھے۔ انہوں نے مسرت کی زندگی بسر کی اور بچوں کی خوشی بھی دیکھی۔

لیکن میں افسانہ کی ابتدا مسرت سے نہیں انجام سے نہیں کرونگا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ وادیٔ کشمیر میں تو ہی کے کنارے، جہاں اب ایک مرمریں مندر ہے۔ ایک قلعہ تھا سنگابی۔ بڑے بڑے تراشیدہ پتھروں کا اور اس کے عین بالمقابل، دوسری گھاٹی پر ایک اور بستی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع میدان تھا۔ جہاں سبزہ اگتا۔ پھول کھلتے اور تمام وادی کو گلپوش بنا دیتے۔ یہاں راجہ لقب تھیلے آباد تھے سنگابی قلعہ تھا کہ ان ہم مسکن تھا اور اسی کے رہنے والے راجہ کہلاتے تھے۔ ان میں کسقدر چپقلش تھی۔ اور کتنی بار دست و گریبان ہو چکے تھے۔ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ راجون کو اپنی شریف النسبی اور تمول پر ناز تھا۔ اور ٹھاکر راہ گیروں پر تاخت مارتے تھے۔ راجہ انہیں ملعنہ سے کوہی لٹیرے کہتے تھے۔ اور وہ بھی خاص طور پر راہگیروں اور راہگیر تجار کو لوٹ لیتے تھے۔ لیکن ٹھاکر نہایت وجیہہ اور شکیل جری سپاہی تھے۔ راجہ بھی بہت شجاع تھے۔ لیکن شجاعت سے زیادہ ان میں عظمت و وقار کی ایک شان نخوت و تکبر پائی جاتی تھی۔ دونوں حریف ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ اور تنگ پہاڑی راستوں میں جب وہ ایک دوسرے سے دوچار ہوتے۔ اور مصلحت وقت سے خنجر آزمانہ ہو سکتے۔ تو ایک دوسرے کو حقارت اور غضب کی نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتے۔ ان کے لب خاموش ہوتے لیکن ان کی سرکش گردنیں اکڑ جاتیں +

ان قبیلوں کی صلح کا زمانہ تھا۔ اور کوہستان میں بہار کے دیوتا کا تہوار منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ابتدائے مارچ کے ایام تھے اور یہ تقریب پھولوں کی فراوانی کو ہمیشہ اپنے دامن میں لئے ہوتی تھی۔ کلیوں کی ڈھلان پر۔ درمیان کی وادی میں جہاں پیپل کے ایک عظیم الشان درخت کے سایہ میں ایک عمیق کنواں تھا۔ سرے کا فرش بچھا تھا۔ سرخ کنیر کے پھول ہر طرف کھلے تھے۔ فضا کو ہستانی پھولوں سے معطر تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا بہار کی نزاکت آفرینی نے اپنا دوپٹہ اتار کر دشت و جبل پر ڈال دیا ہے۔ چاروں طرف [illegible] کا جنگل تھا۔ جن کے لال لال پھولوں نے وادی میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ سبزہ زاروں کو ئیں کے چبوترے کے گرد کوہستانی چھوکریاں سروں پر پھولوں کے تاج رکھے رقص میں مصروف تھیں۔ سانگیوں سے طرب و انبساط کی تانیں بلند کی جا رہی تھیں۔ کام دیوتا تیر و کمان سنبھالے ہوا میں منڈلا رہا تھا۔ یہاں پہلی بار رتنو ٹھاکر نے رام راجہ کی حسین لڑکی کو دیکھا۔ اس کا نام کرشنا تھا۔ بال بھورے تھے اور وہ سرخ لباس میں ملبوس تھی۔ اسکا چمکدار ملبوس اس کے جذبات آفریں دوشیزہ جسم پر چست تھا۔ اور اس کی کھلی آستینیں فرشتوں کے پروں کی مانند لٹک رہی تھیں یا رقص میں پھڑ پھڑاتی تھیں۔ اس کی پیاری سنہری زلفیں بل کھاتے اس کے حسین شانوں پر پڑی تھیں۔ اور موتیوں کی لڑی جو پھولوں کے تاج کے نیچے اس کی پیشانی پر بندھی ہوئی تھی۔ انہیں مقید نہ رکھ سکتی تھی۔ جب وہ رقص کرتی تو ہوا کے مستانہ جھونکے ان سے اس طرح اٹکھیلیاں کرتے جس طرح کوہستانی نسیم گیسوں کی سنہری بالوں کو چھیڑتی ہوئی گذر جاتی ہے وہ بالکل ایک ایسا خوشہ معلوم ہوتی تھی جو فردوس سماوی کے تختہائے گل پر رقص کر رہا ہو۔ اور ڈھاک کے ایک درخت کے تنے سے سہارا لگائے رتنو کھڑا اسے دیکھ رہا تھا +

تمام ٹھاکروں کی مانند وہ بھی حسین تھا۔ وہ دراز قامت اور قوی الجثہ تھا۔ اس کا چہرہ گندمی رنگ کا تھا۔ بال بالکل سیاہ تھے۔ اور اپنے سرخ رنگ کے تنگ اور کوہستانی وضع کے پاجامے اور سیاہ پگڑی سے تمام ٹھاکروں کی طرح وہ نہایت دلفریب نظر آتا تھا۔ اور اوہر کام دیوتا کو جو فضا

رتنو مجبور ہو کر بھاگا۔ لیکن بھاگتے میں اُس کا کمربند کھل کر گر پڑا۔ راجوں نے جب کمربند اُٹھا کر دیکھا اور اُس میں ریشمی ڈوریوں کا زینہ پایا تو مفرور کا تعاقب کیا۔ اور ابھی رتنو ڈھلان پر سے پھسل کر پیپل کے اُس درخت کے پاس ہی پہنچا تھا۔ جو دریا کے کنارے گیندے اور کنیر کے پھولوں کے نزدیک بازو پھیلائے کھڑا تھا کہ انہوں نے آلیا۔ اور مُشکیں کس کر اپنی بستی میں لے آئے۔ یہاں رتنو نے اعتراف کیا کہ رنجکا پشتینی دشمن ہونے کی وجہ سے اُس نے ارادہ کیا تھا کہ ان کو لوٹے اور بستی میں آگ لگا جائے۔ کرشنا کے باپ کو یقین نہ آتا تھا۔ اس لئے اُس نے اس وقت ٹھاکر کو بُلا بھیجا اور اُس کے سامنے بھی رتنو نے اپنے اس خوفناک ارادے کا اعتراف کیا۔ راجوں نے اسی وقت پنچایت کو طلب کیا۔ اور اُس نے اعلان کر دیا کہ اس جرم کی سزا قتل ہے۔ اور صبح رتنو کو قتل کر دیا جائے۔ اب ٹھاکر دا خلت نہ کر سکتے تھے +

رتنو نے مایوسی کے عالم میں کرشنا کے باپ سے کہا "راجہ اس اس کا سزاوار ہوں ——— لیکن میری ایک درخواست ہے۔ مجھے اپنے ایوان کے پاس سے قتل گاہ لے جایا جانے دے۔ تاکہ میں اُس مقام پر کھڑا ہو کر جہاں میں نے اپنے دشمنوں کو زک پہنچانے کا منصوبہ کیا تھا۔ زندگی کے آخری لمحات میں راجوں سے عفو کی درخواست کروں" +

آہ یہ الفاظ تھے جو رتنو نے یاس کے عالم میں کہے۔ وہ حقیقتاً کرشنا کا حسین چہرہ ایک بار اور دیکھنے کی تمنا رکھتا تھا ———

جب صبح ہوئی نرسنگھے کی لرزہ خیز آواز پہاڑیوں میں گونج اُٹھی۔ وہ اعلان کر رہی تھی کہ آج ایک مجرم کو افعال شنیعہ کی پاداش میں قتل کیا جائیگا +

ناترا فیدہ اطوار کے کچھ لوگ رتنو کو پکڑے ہوئے بستی میں سے گذرے۔ آگے راجوں کا سُرخ جھنڈا تھا۔ نرسنگھے کی آواز صورِ قیامت کی طرح سُنائی دیتی اور پھر گھاٹیوں میں صدائے بازگشت اس کا مسخر اُڑاتی۔ سربراہ بستی کے لوگوں راہگیروں اور ٹھاکروں کا ہجوم کھڑا تھا۔ جن کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ ان کے بشرے سے اس عزم صمیم کا پتہ چلتا تھا جو اُن کے دلوں میں مخفی تھا۔ کہ قتل گاہ میں وہ خون کے دریا بہا دیں گے۔ راجوں نے بھی اپنے آلات حرب سنبھال لئے تھے۔ اور کرشنا کا باپ انہیں لیکر پہلے ہی سے قتل گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ رتنو راجہ کے دیوان کے بالمقابل ٹھہر گیا۔ اُس نے پکار کر کہا: "میرے قبیلے کے دشمنو! جن کو میں ڈاکوؤں کا وارث اور لٹیروں کا جانشین لوٹنا اور جن کی بستی کو نذرِ آتش کرنا چاہتا تھا۔ میں رتنو ٹھاکر اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اس سے پیشتر کہ میں دیوتا کے حضور میں پیش کیا جاؤں تم سے عفو کا طالب ہوں"+

راجوں کی عورتیں اور بچے دریچوں، دروازوں اور سنگی زینوں پر نمودار ہوئے۔ وہ متحیر تھے۔ اُن کے دل پگھل گئے اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ لیکن کرشنا غور توں اور بچوں کو گمنیوں سے ہٹائی۔ اپنی ماں، بھائیوں، بھاوجوں اور ہم جولیوں کو ایک طرف ڈھکیلتی۔ سرخ کرتا پہنے۔ پریشان بال لئے ہجوم کو چیرتی ہوئی اپنے محبوب کی طرف جھپٹی اور اپنی نیم عریاں باہیں جن کی آستین اسوقت بے کسی کے عالم میں لٹک رہی تھیں۔ اُس کے گلے میں ڈال دیں۔ اور حجاب نسوانیت اور شرم و حیا کو ایک طرف رکھ کر کہا:۔

"یہ جھوٹ ہے! وہ میری محبت میں جھوٹ کہتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے عشق ہے۔ ہم اُس دن سے محبت کرتے ہیں جب بہار کے دیوتا کا تہوار دریا کے کنارے منایا گیا تھا۔ اُس روز ہم نے ایک دوسرے کو گیندے اور کنیر کے پھولوں میں دیکھا تھا۔ وہ ٹھاکر ہے اور میں راجہ کی بیٹی ہوں۔ اگرچہ ہمارے قبیلے جانی دشمن ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ ڈاکو نہیں ہے۔ وہ آگ لگانے بھی نہیں آیا تھا۔ وہ محض اُس شے کو لینے آیا تھا جو پیشتر ہی سے اُس کی ہو چکی تھی۔ وہ صرف کرشنا کو لوٹنا چاہتا تھا۔ جسے اُس سے محبت ہے۔ محبت اور عشق ہے۔ میرے بھائیو۔ بہنوں اور میری ماں اگر رتنو قتل ہوگا تو کرشنا بھی زندہ نہ رہے گی ———"

عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ راجوں کی آنکھیں بھی نمناک تھیں کرشنا کا بڑا بھائی کنور آگے بڑھا۔ کرشنا اور رتنو کو جو ایک دوسرے کو بازوؤں میں تھامے کھڑے تھے۔ اور دونوں کے رخساروں پر محبت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ جدا کیا۔ اُس نے پکار کر کہا "کرشنا تو زندہ رہے گی!" کرشنا کے باپ کو بُلایا گیا۔ رتنو کی ماں اور کیسری بھی آئی۔ اور اس چٹان کے کنارے جہاں پرانے کمنڈروں کے پاس اب ایک سفید مندر ہے۔ دونوں مخالف قبیلوں میں ہمیشہ کے لئے صلح ہو گئی +

ایام طفلی میں میں نے اس وادی میں تیتریوں کا تعاقب کیا ہے۔ سُرخ کنیر اور گیندے کے پھولوں سے جھولیاں بھری ہیں۔ اور شام



Queen of the Moon. ملکہ مہتاب

کی سنہری دھند میں اس کھنڈر کو غائب ہوتے دیکھا ہے۔ جو اجوں کے ایوان کی آخری یادگار ہے۔ یہ بھی بٹ جائے گا۔ لیکن کوہستانی پھولوں کی دیوی کرشنا کا افسانۂ عشق میرے قارئین کے دل سے محو کرنے کے لئے صدیاں درکار ہیں +

(خاص) حنیف ہاشمی

طیّور آوارہ

ہر نوزائیدہ بچہ اس پیغام کا حامل بن کر آتا ہے۔ کہ خدا ابھی انسان کی طرف سے مایوس نہیں ہوا ہے +

"اے بھل! تو مجھ سے کسقدر دور ہے ؟"
"بھائی پھول! میں تو تمہارے عین دل میں چھپا بیٹھا ہوں!"

بادل آسمان کے ایک کونہ میں کھڑا ہوا تھا۔ کہ صبح نے طلوع ہو کر اس کے سر پر ایک تاج زرّیں پہنا دیا +

"سر فلک پہاڑ ان بچوں کی چیخوں کی مانند ہیں۔ جو ہاتھ اٹھا کر ستاروں کو پکڑنا چاہتے ہیں!"

جڑیں جو تہہ خاک ہوتی ہیں شاخوں کو ثمردار کرنے کا کوئی انعام طلب نہیں کرتیں +

"کون ہے جو میری خدمات اپنے ذمہ لے گا؟" ڈوبتے ہوئے سورج نے سوال کیا +
"حضور! میرے امکان میں جسقدر ہوگا۔ خدمت بجالاؤں گا!" مٹی کے دیئے نے انکساری سے جواب دیا +

قطرات باراں نے زمین کو چومتے ہوئے سرگوشی کی "ماتا! ہم تیرے وہ بھولے ہوئے بچے ہیں جو آسمان سے واپس آئے ہیں" +

جگنو نے ستاروں سے کہا "حکما کہتے ہیں کہ ایک دن تمہارا نور سلب ہو جائے گا" +
ستاروں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور دمکتے رہے

خدا منتظر رہتا ہے کہ انسان کے ہاتھوں سے اپنے ہی دیئے ہوئے پھولوں کو بطور ہدیہ قبول کرے +

(ٹیگور) (خاص) ظفر قریشی دہلوی

استنبول قدیم کا ایک بچّہ

(محررہ خدیجہ سلمہا اکرم)
(مترجمہ جناب صوفی محمد حسین صاحب بی اے انسپکٹر ڈاک خانجات)

قسطنطنیہ کے ایک کوچے میں ایک مستحکم چوبی عمارت استادہ ہے۔ جس کے کونے کونے میں میرے عہد طفلی کی یادگاریں اب تک پنہاں ہیں۔ اس وقت تصوّر میں میرے سامنے ایک بڑا کمرہ ہے جس کے ایک گوشے میں چینی کا نیلگوں آتشدان ہے۔ پیتلی انگیٹھی انار کے دانوں کی مانند سرخ انگاروں سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک پست ترکی نشستگاہ چند کرسیاں اور خوشرنگ غالیچوں کا انبار ہے +

دریچہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کھڑی ہے۔ خوشنما بال اُس کے رخساروں پر لہرا رہے ہیں۔ شیشے کے دباؤ کی وجہ سے اس کی ناک چپٹی ہوگئی ہے۔ اور اس میں سفیدی اور ٹھنڈک آگئی ہے۔ آنکھوں میں اُداسی کی جھلک ہے۔ یہ غمزدہ چھوٹی لڑکی میں ہی ہوں۔ اور اب جبکہ میں جوان ہوگئی ہوں۔ اس کے تصوّر سے مجھے تعجب معلوم ہوتا ہے، یہ چھوٹی لڑکی پیچھے مڑ کر پکار اُٹھتی ہے۔ دودی۔ دودی۔ میں پھر بہ فبار ی میں باہر جانا چاہتی ہوں۔ بوڑھی آیا (دودی) جو کہ فرش پر آتشدان کے پاس پاؤں پھیلا کر سو رہی تھی۔ جاگ اُٹھتی ہے۔ نرم سفید بالوں پر ایک سیاہ رومال لپٹا ہوا ہے "میری ننھی بچی" کھڑکی سے ادھر آجا۔ سرد ہوا تیری ہڈیوں میں سرایت کر جائے گی جس سے زیادہ تکلیف کا احتمال ہے" اچانک دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا اور لڑکی اندر داخل ہوئے۔ ان کا رنگ سردی سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کمرہ ان کی ہنسی سے گونج اُٹھا۔ وہ ایک بیت کے پتلے کے متعلق جس کی آنکھوں کو کوئلے سے سیاہ کر کے سر پر ترکی ٹوپی پہنائی گئی تھی۔ باتیں کر رہے تھے۔ اُنہوں نے آتے ہی چائے اور کھانے کے لئے شور مچایا۔ پیالیوں کی چھنکار کے ساتھ چاء کے آبلنے کی سوں سوں کی آواز آرہی تھی +

دروازہ پھر کھلا۔ اور ایک فربہ اندام عورت جس کے چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور جس کی آنکھوں میں شوخی اور مسرّت جھلک رہی تھی۔ اندر داخل ہوئی +

"واللہ۔ تم لوگ میرے بغیر ہی چاء پینے لگے ہو" اُس نے بلند آواز سے چلّا کر کہا +

"نہیں۔ فرہاوندوی!" بوڑھی عورت نے جواب دیا "ہم اپنی بیوی ہانوم آفندی کے انتظار میں ہیں"۔ ان دونوں عورتوں میں باہمی رقابت ہے۔ رومال والی بڑھیا میری ارمن دایہ ہے۔ جس نے میرے بہن بھائی کی پرداخت بھی کی ہے۔ فرہاوندوی ایک ترکی دایہ ہے جسے فیملی ڈاکٹر کی سفارش سے ننھے بچے کی نگہداشت کے لئے ملازم رکھا گیا ہے +

اس وقت باہر گلی میں پتھروں پر ایک گاڑی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اور دریچہ میں سے کوچبان کی آواز سنائی دی۔ اماں دروازہ پر کھڑی کپڑوں پر سے برف جھاڑ رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے نازک ہاتھوں سے ایک سیگرٹ تیار کیا۔ اور انگیٹھی کے پاس پاؤں گرم کرنے لگ گئی۔ ایک دفعہ پھر پیالیوں کی چھنکار سنی گئی۔ آہستہ آہستہ رات نے اپنے سیاہ پردہ میں ہم سب کو ڈھانپ لیا۔ اماں نے شمعیں روشن کرنے کے لئے حکم دیا۔ اُس کی آواز سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر طویل خاموشی کے بعد اُس نے تفکر آمیز لہجے میں کہا "وہ ابھی تک نہیں آئے۔ رات کسقدر سیاہ ہوگئی ہے۔ کاش یہ تاریکی نہ ہوتی۔ جوں جوں یہ بڑھ رہی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ تفکرات میرے دماغ پر مسلّط ہو رہے ہیں۔ خدا معلوم یہ دورِ استبداد کب ختم ہوگا۔ اور انسانوں کو آزادی سے گفتگو

کرنا اور اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوگا"+

وہ کمرے میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اور ہم بچے کونوں میں دبکے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ اس اضطراب آمیز خاموشی نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ کمرے میں دھند لاہٹ سی تھی۔ اچانک گھنٹی کی آواز آئی دی۔ اور ہم سب میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ابا سلطان عبدالحمید کے قصر یلدیز سے واپس آگئے تھے +

والد نے دیر سے گھر لوٹنے کے متعلق ایک طویل داستان سنائی جس کے صرف یہ چند کلمات میں نے بے توجہی سے سنے "اُسے قونیہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا ہے" جلاوطنی کا لفظ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ اُس کے کیا معنے ہیں۔ اور والد اس کے متعلق اداس کیوں ہیں +

"کیا جاسوس اب بھی تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟" اماں نے سوال کیا +

"ہاں وہ اب بھی میرے درپے ہیں" ابا جان نے غصہ بھری آواز میں جواب دیا۔ "خدا معلوم سلطان کیا چاہتا ہے۔ کیا بطور محلات کے سکرٹری کے میں ہر وقت اُس کی گرفت میں نہیں ہوں اور کیا میری آزادی محدود نہیں ہے۔ اُس نے میرے باپ نامک کمال کو جلاوطن کر کے مروا دیا۔ اور میں خاموش نہیں کر سکتا۔ کہ میں بھی اُسی باپ کا بیٹا ہوں" بچوں نے ان کو بے پرواہی سے سنا۔ میری عمر چار سال تھی۔ اور میں باتیں سمجھتی تھی۔ اُس رات جبکہ میں بستر پر سو رہی تھی مجھے بُری بُری شکلیں دکھائی دیتی رہیں۔ جن کے چہرے بدصورت، شکن آلود اور کھنچے ہوئے۔ بعد مجھے زرد خونی آنکھیں اور پریشان چہرے نظر آئے۔ جو لبوں کو سکیڑتے ہوئے چلا رہے۔ آہستہ آہستہ یہ شکلیں دھندلی پڑ گئیں۔ اور میرے سامنے میرے والد کی شکل آموجود ہوئی گھنے بال پیشانی پر سے پیچھے کو ہٹائے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں اداسی کی جھلک تھی اور لب بند تھے۔ اس کی اداس آنکھیں جن کو میں نے صرف تصویر میں دیکھا تھا میری طرف تک رہی تھیں۔ پیچھے سے اب بھی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اور گھر میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ خوف کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے صبح سحر کا انتظار تھا +

دوسری رات ابا جان خلاف معمول جلدی لوٹ آئے۔ اور جب مائیں ادھر اُدھر ٹل گئیں تو اماں سے کہنے لگے "آج کمال پاشا گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ اور نظر بندی کر دی گئی ہے۔ معلوم نہیں اس کا کیا سبب ہے۔ محل میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ میرے دوست مجھے بھی محتاط رہنے کے لئے کہہ رہے ہیں"+

"مگر آپ کو کیا خوف ہے۔ اگر آپ کمال پاشا کے دوست ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بھی مجرم ہیں" اماں اسی طرح سے سوال کئے جا رہی تھیں۔ اور والد خیالات میں محو کمرے میں پھر رہے تھے۔ اور سگرٹ کے کش لگا رہے تھے۔ بالآخر ابا جان نے خاموشی کو توڑا اور کہنے لگے "وہ چٹھی جس کا مسودہ میں نے غصہ کی دیوانگی میں بنایا تھا۔ جو میرے ہاتھ کا تحریر شدہ ہے اور میں اُسے کوتاہ اندیشی سے کمال پاشا کے ہاں ہی چھوڑ آیا تھا۔ اگر وہ کمال پاشا کے کاغذات سے مل گیا۔ تو ہم سب کی تباہی کے لئے کافی ہے"+

اس واقعہ کے سالہا سال بعد مجھے ان رنجیدہ حالات کا علم ہوا۔ اس کی تہ میں کمال پاشا کے ساتھ ابا جان کی دوستی تھی۔ ایک دفعہ جبکہ میں ابھی پیدا بھی نہ ہوئی تھی میرے والد اپنے سالے کے ہمراہ تفریح کے لئے کسی صحت افزا مقام پر گئے۔ واپسی پر جبکہ گاڑی کھیتوں میں سے گذر رہی تھی۔ گائیں اس کے شور سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ گاڑی بھی آہستہ ہوگئی۔ جو کہ برابر چلتی رہتی ہے۔ اور کبھی نہیں رُکتی۔ والد نے اپنے سالے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مگر کہ گائیں تہذیب سے مانوس نہیں ہیں اور ڈر کر بھاگ نکلتی ہیں"+

اسی کمرہ میں ایک نوجوان افسر نے یہ الفاظ سنے۔ اور ابا جان کے پاس آکر دریافت کیا "کیا آپ نامک کمال کے لڑکے ہیں؟" میرے باپ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس افسر نے اپنا نام کمال بتایا۔ جو غازی عثمان پاشا شیر پلونا کا جس نے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ زار کے لشکر کے مقابلہ میں پلونا کے قلعہ کو بچائے رکھا تھا۔ لڑکا تھا۔ یہ کمال ہمارا رشتہ دار نہیں تھا۔ اور درحقیقت ٹرکی میں نام کی مناسبت سے قرابت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں خاندانی ناموں کا کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔ اور ہزاروں کمال ہوں گے جن میں باہمی رشتہ داری کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اتفاقیہ ملاقات چند سالوں میں گہری دوستی کی حد تک

پہنچ گئی۔ کمال پاشا بن گیا اور فوجی مارشل کے درجہ تک ترقی کر گیا۔ سلطان نے اپنی دوسری لڑکی نعیمہ سے اس کی شادی کر دی۔ مگر اس نے ابا جان کو فراموش نہ کیا اور وقتاً فوقتاً محل میں بلاتا رہا +

کمال اکثر والد سے اپنی شکایات بیان کرتا جو باوجود ناخواستہ انکو سُننی پڑتی تھیں۔ اسے آزادی حاصل نہ تھی۔ وہ دنیا کی سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ مگر سلطان اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ آخر اس نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کر دی تاکہ بوشیدہ طور پر آزاد خیال فرانسیسیوں کے خیالات کا مطالعہ کرے۔ اس نے ایک عالی شان لائبریری بنائی جسے ابا جان نے بہت پسند کیا۔ کمال پاشا کے ہاں جانے کے لئے ایک دوسری کشش ان بڑے بڑے ماہران موسیقی کے گانے سننے کی تھی۔ جو اکثر قسطنطنیہ میں آتے رہتے تھے۔ اور کمال انہیں محل میں بلا لیتا تھا +

موسم سرما میں ایک دن ابا جان جب پاشا کی لائبریری میں داخل ہوئے تو پاشا کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ جس میں سے برف اندر آ رہی تھی۔ ابا جان نے متعجب ہو کر دریافت کیا تو پاشا نے کہا کہ "سخت دردسر کی وجہ سے مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے"۔ ابا جان نے جونہی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ تو اتفاقاً سامنے کے مکان کا ایک پردہ حرکت کرتا ہوا اپنی جگہ پر آ گیا۔ اور اس کے پیچھے انسان کا سایہ سرکتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ شہزادی خدیجہ سابق سلطان مراد کی لڑکی کا محل تھا۔ سلطان مراد کو عبدالحمید نے مخبوط الحواس ہونے کی بنا پر معزول کر کے قید میں ڈال دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد ابا جان کو معلوم ہوا کہ کمال پاشا محض سلطان کو تنگ کرنے کے لئے شہزادی خدیجہ سے راہ و رسم پیدا کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سلطان کو مراد اور اس کی اولاد سے سخت نفرت ہے۔ اس خبر کے سننے سے ابا جان رنجیدہ ہوئے۔ اور انہوں نے ارادہ کر لیا کہ کمال پاشا کو اس کے متعلق فہمائش کریں۔ اتفاقاً کمال پاشا نے بھی اسی روز ایک ضروری کام کے لئے ان کو بلا بھیجا۔ جونہی ابا جان اندر داخل ہوئے کمال پاشا پکار اٹھا "آہ۔ ظالم کمینہ وہ مجھ سے میرے باپ کا محل چھیننا چاہتا ہے۔ یہ محل قصر یلدیز کے مقابل تھا۔ جو عثمان پاشا کے مرنے کے بعد ابھی تک اس کے لڑکے کو وراثت میں ملا تھا۔ عبدالحمید جس نے یہ محل عثمان پاشا کو بطور انعام دیا تھا۔ اب اسے واپس خریدنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسکے محل کے نکل قریب تھا۔ اور اسے خوف رہتا تھا کہ متجسس لوگ چلتوں کے پیچھے بروقت دیکھ سکتے ہیں۔ اور سازشیں نشوونما پا کر گولہ باری کی صورت میں اہم پذیر ہو سکتی ہیں +

کمال پاشا اسے دق کرنے کے خیال سے انکاری تھا "میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے باپ نے اسے میرے لئے چھوڑا ہے" پاشا نے تندی سے کہا +

ابا جان اس سے بحث کرتے رہے۔ مگر بے سود۔ آخر کمال پاشا نے کہا "عبدالحمید کے ہیڈ سکرٹری کو ایک چٹھی لکھدو کہ میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ مگر ذرا تلخ مرچ لگا کر لکھنا تاکہ اس سفاک کو رنج پہنچے"۔ یہی چٹھی لکھنے کے لئے اس نے ابا جان کو بلایا تھا۔ کیونکہ وہ خود اس قابل نہ تھا کہ جسقدر پُرزور الفاظ وہ تحریر کرنا چاہتا تھا لکھ سکے۔ اس نے ابا جان کو کاغذ اور قلم دیا اور خود باہر نکل گیا۔ ابا جان نے ایک شائستہ خط جس کی طرز تحریر برمودبانہ تھی۔ تحریر کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کمال پاشا محل کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ وہ اس کے باپ کی یادگار ہے۔ جب پاشا نے وہ خط پڑھا تو وہ حقارت سے مسکرایا اور کہنے لگا۔ اس تحریر میں محل کے سکرٹری کا انداز نمایاں ہے۔ مگر مجھے ایسی تحریر مطلوب ہے کہ جو اس بوڑھے کے دل کو صدمہ پہنچائے۔ والد نے دوسرا مسودہ [illegible] انیز تھا۔ مگر پاشا نے پڑھ کر اسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور کہا "تم انسان نہیں ہو۔ اگر آج تمہارا باپ زندہ ہوتا۔ تو تم وہ فقرات کہ تحریر کس کو کہتے ہیں۔ اور اس پر بھی تم اپنے آپ کو ناں ان باتو جان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور انہوں نے تیس سمجھ تمہیں خط لکھ دیتا۔ مگر میں ڈرتا ہوں کہ تمہیں اس دکھا ہوگا"۔ ا تھے +

"مجھے کسی تحریر پر بھی دستخط کرنے میں تامل نہ" پاشا نے غضبناک ہو کر کہا "لکھو اور دیکھ لو"۔ یہ کہہ کر پاشا لیا۔ ابا جان ایک میز پر بیٹھ گئے۔ احتیاط کو خیرباد کہہ دیا۔ معقولیت جزم و احتیاط غصہ کی رو میں بہہ گئے۔ اور خوف و خطر کا خیال تک دل سے محو ہو گیا۔ غصہ کا چربہ کاغذ پر اتار کر رکھ دیا گیا۔ خوبصورت الفاظ اسقدر سخت اور تیک آمیز تھے کہ ہر ایک لفظ ایک تیز خنجر کی مانند تھا۔ کہ کمال پاشا جھک کر اسے پڑھ رہا تھا۔ "یہ لو اور اگر حوصلہ ہے تو اسے بھیجو" ابا جان نے کہا +

"میں اسے اسی لمحہ بھیجتا ہوں" پاشا نے جواب دیا۔ اور ایک گرسی

سرکار کر مسودہ کو نقل کرنا شروع کر دیا۔ مگر ابا جان بغیر اس کا انتظار کرنے کے کہ اصل مسودہ "تلف کر دیا گیا ہے یا نہیں چلے گئے +

یہی چٹھی تھی جس کا خیال اُن کو آج رات آرہا تھا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور وہ خوب جانتا کہ عبدالحمید اس بے عزتی کو ہرگز گوارا نہ کرے گا۔ وہ اس کی تحریر سے بخوبی واقف تھا۔ کیونکہ اُس نے والد کے لکھے ہوئے خطوط وغیرہ محل میں ملاحظہ کئے ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہ اسی وقت اُس کے سامنے پیش ہو۔ اس کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ جائیں گے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکڑ جائیں گی اور ایک اشارہ پاتے ہی پولیس والد کی گرفتاری کے لئے ہمارے مکان کی طرف دوڑ پڑیگی۔

مگر کئی راتیں گذر گئیں۔ اور ایک رات جب ہم سب شام کے کھانے کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے مجھ ہمارا ملازم خوفزدہ صورت بنائے ہوئے آیا۔ اور کہنے لگا "آفندی۔ دو افسر آپ سے فوراً ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ابا جان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اور ہمیں سختی سے وہیں ٹھہرنے کے لئے ہدایت کر کے خود دروازہ کی طرف چلے گئے۔

ہال میں دو افسر جن کے پاس ریوالور تھے اور لمبے چوغوں میں ملبوس تھے۔ موجود تھے۔ ان میں سے ایک والد کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "اکرم بے تمہیں فوراً محل میں حاضر ہونا ہے"+

والدہ نے ایک چیخ ماری۔ اور ہم سب ڈر کر روتے ہوئے اس سے چمٹ گئے۔ اگرچہ ہم کو اس کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ ابا جان نے متانت سے جواب دیا "میں کوٹ پہن لوں تو آپ کے پیچھے آتا ہوں"۔

دایہ مجھے کھینچکر کمرہ کی طرف لے گئی۔ آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ "دودی مجھے ڈر لگ رہا ہے ابا جان کو کہاں لے گئے ہیں"۔ "ننھی وہ ایک دوست سے ملنے گئے ہیں"۔ "نہیں" میں نے چلا کر کہا "افسر نہیں بلانے آئے تھے۔ وہ افسروں کے ساتھ کبھی دوستوں سے ملنے نہیں جایا کرتے۔ میں نے خود سُنا تھا کہ اُن کو محل میں طلب کیا گیا ہے"+

دایہ نے پھر کہا "مگر تم کو کس بات کا ڈر ہے۔ تمہارے ابا کو سلطان نے ایک ضروری چٹھی لکھوانے کے لئے طلب کیا ہے"۔ مگر ان بہانوں سے میرے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ خوف دل پر مسلط ہو چکا تھا۔ اور میں جلتی ہوئی زردبتی کے پاس بیٹھی ہوئی محسوس کر رہی تھی کہ میرا بدن کبھی گرم ہو جاتا تھا اور کبھی سرد +

ابا جان کو محل کے ایک بڑے کمرے میں لیجایا گیا تھا۔ وہاں دو اعلیٰ افسر راغب پاشا اور عاصم بے بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کو جج مقرر کیا گیا تھا۔ ابا جان کو انتظار تھا کہ ابھی وہ ہلاکت آفریں چٹھی ایک خبیث روح کی طرح ظاہر ہو کر اُسے مصیبت کے جال میں پھنسا دیگی۔ اسکے برعکس راغب پاشا نے آگے بڑھ کر اسے ایک تحریری فرد جرم دیا۔ یہ ایک لمبا کاغذ تھا۔ جس میں ایک مضحکہ انگیز الزام درج تھا۔ جو کہ کمال پاشا کے ساتھ ملکر شہزادی نعیمہ اور اُس کے ننھے بچے کو زہر دینے کی سازش کے متعلق تھا۔ شاہزادی کی ہلاکت کے بعد کمال پاشا کو شاہزادی خدیجہ کے ساتھ شادی کر کے یورپ بھاگ جانا تھا۔ اور والد کو بلور سکرٹری اُس کے ہمراہ جانا تھا۔ وہاں جا کر ان کا مقصد عبدالحمید کے خلاف جذبات کا برانگیختہ کرنا اور اسے معزول کر کے مراد کو تخت پر واپس لانا تھا +

ابا جان کے زرد رخساروں پر آہستہ آہستہ سرخی جھلکنے لگی۔ خوف کی بجائے اُن کی آنکھوں میں مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ اور گفتگو کی طاقت خود کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ چٹھی نہیں پکڑی گئی تھی۔ غالباً کمال پاشا نے اسے تلف کر دیا ہوگا۔ اس نے آہستگی اور متانت سے جواب دیا "عالی جاہ۔ مجھے سازش اور زہر وغیرہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں کمال پاشا کے چھوٹے لڑکے کو کمزوری کی وجہ سے انجکشن کا مشورہ دیا تھا۔ مگر انجکشن اور زہر خورانی میں بہت فرق ہے۔ تاہم انجکشن ڈاکٹر نے کیا تھا۔ نہ کہ میں نے۔ آپ خود اس کی تشخیص کرا کر دیکھ سکتے ہیں۔ کہ وہ ایک مکھی کو بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ رہا میرے فرار ہونے اور سلطان کے خلاف بغاوت پھیلانے کا الزام۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ میں اسقدر بے وقوف نہیں ہوں۔ ایک کمزور قلم کے ساتھ ہتھکڑی سکتا ہوں۔ صدیوں کی سوئی ہوئی قوم کو جگانا آسان کام نہیں"+

راغب پاشا نے کہا "اسے لفظ بہ لفظ لکھ دو"+

جب جوابات لکھے جا چکے اور ابا جان نے دستخط کر دیئے۔ تو جج اس تحریر کو سلطان کے پاس لے گئے۔ وہ دوسرے کمرے میں بیتابی سے انتظار کر رہا تھا۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد دونوں جج پاشا [illegible] سلطان معلوم کرتا ہے۔ کہ

مراد کو تخت پر بٹھانے میں تمہیں کیا فائدہ ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ حواس باختہ ہے۔ اور ایک مرتبہ اُس نے اپنے آپ کو چھت پر سے گرانے کی کوشش کی تھی۔ نیز سلطان نے تخت پر جبراً قبضہ نہیں کیا۔ بلکہ ایک دیوانہ کی جگہ پُر کرنے کے لئے اُسے تخت پر بٹھایا گیا ہے۔ آپ ایک دیوانہ کے حق میں کیوں کوشش کرنا چاہتے ہیں"۔

"مگر جناب عالی میں اس بات کے لئے کوشاں نہیں ہوں۔ اور میں نے کبھی اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کی۔ مجھے علم ہے کہ سلطان مراد کے حواس درست نہیں۔ اور کیا میری موجودہ پوزیشن اور عزت سلطان عبدالحمید کی رہین منت نہیں ہے"۔ راغب پاشا نے پھر کہا "جو کچھ تم نے کہا ہے اسے تحریر کر دو"۔ اس وقت ابا جان سمجھ گئے کہ یہ شخص درپردہ اُسے بچانا چاہتا ہے +

امید کا سہارا پا کر والد نے جواباً سب تحریر کر دیئے۔ اور جب حج دوبارہ واپس آئے تو راغب پاشا نے کہا "سلطان کو تمہارے جوابات سے خوشی ہوئی۔ مگر وہ یہ دریافت کرنا چاہتا ہے۔ کہ تم اکثر کمال پاشا کے پاس کیوں جاتے تھے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ سلطان پسند نہیں کرتے کہ اُن کے سکریٹری اس طرح میل جول رکھیں" +

ابا جان نے جواب دیا: "مجھے کمال پاشا خود بلایا کرتے تھے۔ خود شہزادی نعیمہ نے میری اہلیہ کو بُلا کر ہماری عزت افزائی کی تھی۔ شاہی دعوت بمنزلہ فرمان ہوا کرتا ہے۔ میں سلطان کے ذی قدر داماد کے حکم سے کس طرح سرتابی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے گانا سُننے کا شوق تھا۔ جسے میں بہت پسند کرتا ہوں" +

جوابات پھر لکھوائے گئے۔ اور عبدالحمید کے سُننے پیش کئے گئے۔ جج مسکراتے ہوئے باہر آئے۔ اور راغب پاشا نے کہا۔ سلطان آپ سے خوش ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ اُن کے ایک جاں نثار خادم ہیں۔ انہیں پہلے بھی شک نہیں تھا۔ مگر اس کے بعد اب تم زیادہ میل جول مت رکھو۔ یہ سلطان کا حکم ہے" +

ابا جان گلی میں تنہا کھڑے تھے۔ وہ اب آزاد تھے۔ اور ایک بڑے خطرے سے نجات پا چکے تھے۔ مگر آئندہ اُنہیں ضرور محتاط رہنا پڑیگا۔ کمال پاشا کو بروسہ کی طرف جلاوطن کیا گیا تھا۔ دو محافظ ہر وقت "اُن پر سنگین پہرہ رکھتے تھے۔ والد کا نام بھی جلاوطن کے ساتھ مرتسم کیا جا چکا تھا۔ اور سلطان اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ ابا جان نے دوسرے روز حاضری کھانے کے بعد اوورکوٹ اور ٹوپی پہنی۔ اور باہر نکل گئے۔ ہم سب بچے کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے۔ برف کے تودوں میں سے ہوتے ہوئے وہ ایک بڑے مکان کے دروازہ پر پہنچے جو ہمارے قریب ہی تھا۔ کھڑا ہو گیا +

"ابا جان راغب پاشا کے ہاں جا رہے ہیں" میری بہن نے میرے کان میں کہا۔ وہ راغب پاشا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے گئے تھے۔ چونکہ اُس نے گذشتہ شب اُن پر مہربانی کی تھی۔ اور مقدمہ کی کارروائی میں امداد کی تھی۔ معمولی سلام اور مزاج پُرسی کے بعد راغب پاشا کہنے لگا۔ "آہ اکرم کمال پاشا کس بلا کا لکھنے والا ہے۔ مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ مجھ اس خطرناک چٹھی کا جو اُس نے سلطان کو لکھی تھی مسودہ مل گیا تھا۔ یہ کمال کی تحریر تھی۔ مجھے اس سے درحقیقت حیرانی ہوئی" +

معاً والد صاحب کی آنکھوں کے سامنے کمال پاشا کے خط کا نقشہ کھنچ گیا۔ راغب پاشا کاغذات پر جھکا ہوا میز کے درازوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ ایک دراز میں سے ایک کاغذ جو بے پرواہی سے مروڑا ہوا تھا مل گیا۔ اُس نے جلدی ہی سے مطالعہ کیا اور فوراً تاڑ گیا کہ یہ خط کمال پاشا کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اُس نے پھرتی سے کاغذ کو مروڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ کسی نے اُسے دیکھ نہ لیا ہو" +

دراصل راغب پاشا نے ہی ابا جان کو بچایا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے والد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔ ابا جان نے دوڑ کر اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا جنہوں نے ایسی ہلاکت آفریں تحریر اس ہشیاری سے تلف کر دی تھی۔ دونو طرف خاموشی تھی۔ مگر چہروں سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک طرف تشکر آمیز سکوت۔ اور دوسری طرف سکون آمیز مسکراہٹ تھی۔ مگر سلطان نے فراموش نہ کیا۔ کچھ عرصہ مثلع صاف رہنے کے بعد آندھی کا طوفان اُمڈ آیا۔ آغاز گرما میں ایک شب ابا جان کا سالا (میرا ماموں) ہمارے ہاں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطان عبدالحمید بہت پریشان تھا۔ اُس کی لڑکی نعیمہ نے کئی بار اُس کے پاس آ کر اپنے خاوند کمال پاشا کی جلاوطنی کے متعلق فریاد کی تھی۔ اور ان الفاظ میں اظہار ناراضگی کیا تھا۔ "میرا خاوند تو ایک خمار زندان میں دن رات سخت تکلیف میں بسر کر رہا ہے۔ مگر اکرم بے جو اس ساری تکلیف کا باعث ہے۔ آپ کا

منظور نظر بنا ہوا ہے۔ اسے قسطنطنیہ سے باہر بھیجدو۔ میں اس کی موجودگی گوارا نہیں کرسکتی ہوں۔" بالآخر عبدالحمید نے اپنے وزیر اعظم کو سب حالات سُنائے اور دریافت کیا کہ کیا عورت بھی کبھی معقول دلائل سے قائل کی جاسکتی ہے۔ میری لڑکی کبھی نہیں مانے گی۔ میں اب کیا کرسکتا ہوں۔ اکرم کو یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ اسے نرمی سے رضامند کرو اور کسی دور مقام پر تعین کرکے بھیجدو۔ وزیر اعظم نے میرے ماموں کو بُلا کر تمام واقعات اُسے سمجھائے۔ اور کہا "کیا اکرم بے شتلیجہ میں جو قسطنطنیہ کے قریب ایک چھوٹا سا مقام ہے جانا پسند کرے گا۔ یہ ایک معمولی جگہ ہے۔ اور تنخواہ بھی کم ہے"۔

والد بالکل جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر ان شائستہ درخواستوں کی پشت پر عبدالحمید کا نہ ٹلنے والا حکم تھا۔ شاہزادی نعیمہ کے متعلق وہ رنجدہ کہانی اُس کے دماغ پر مسلط ہوچکی تھی۔ والد بخوبی جانتے تھے۔ کہ آخر انکو جانا ہوگا۔ اُن کا گناہ صرف اسقدر تھا۔ کہ ان کا کھلی پاشا سے تعلق تھا اور وہ ایک ایسے شخص کا لڑکا تھا جس سے سلطان خائف رہا کرتا تھا۔ مگر شتلیجہ جیسا مقام کسی صورت میں بھی پسندیدہ نہ تھا۔ اُنہوں نے دو ہفتے کی مہلت طلب کی تاکہ وہ غور کرسکیں +

اس کے بعد جو وقت گذرا وہ گھبراہٹ اور پریشانی کا تھا۔ گوشوں میں مشورے ہو رہے تھے۔ کبھی یکایک خاموشی چھاجاتی۔ اور پھر دبی آواز میں سلسلہ گفتگو شروع ہوجاتا تھا +

"میں اپنے گھر اور والدین کو کس طرح چھوڑ سکتی ہوں"۔ والدہ نے سر ہلاکر کہا۔ فرہاد تند دوی بند دروازہ کی مانند خاموش تھی۔ میری دایہ تین اور صابرتھی۔ مگر ہماری نئی گورنس خوش معلوم ہوتی تھی۔ یہ خوش طبع فربہ اندام پست قد عورت جو کہ گھر میں ایک پرندے کی مانند اِدھر سے اُدھر اُچھلتی کودتی پھرتی تھی۔ تھوڑے دن ہوئے ہمیں فرانسیسی زبان سکھانے کے لئے رکھی گئی تھی +

میڈم موسی عام طور پر خوش رہتی تھی۔ کبھی کہتی تھی عجب گھر ہے جسے دیکھو کانا پھوسی کر رہا ہے۔ معلوم نہیں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا +

میری دایہ نے جواب دیا "زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جو کچھ ہونا ہے ہوکر رہے گا۔ کیونکہ ہماری پیدائش سے پہلے ہماری تقدیر لکھی جاچکی ہے"۔

"دی میں نے سوال کیا وہ کون ہے جو اسے لکھتا ہے"؟

"اللہ لکھتا ہے۔ اور ہماری تقدیر کا نوشتہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی ہماری پیشانی میں ہوتا ہے۔ اور اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا"۔ اللہ اور تقدیر کے الفاظ سُنکر میں خاموش ہوگئی مجھے بتایا گیا تھا۔ کہ اللہ میرے ماں باپ سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جو سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ خواہ کوئی پلنگ پوش کے نیچے بھی چھپ جائے +

آخر تشویشناک ایام آگئے۔ ابا جان کے دوست قریب ہر شب اُن سے ملنے آتے تھے۔ اکثر اوقات وہ کھانے میں بھی شامل نہ ہوسکتے تھے۔ اور ہمیں تنہا ہی کھانا پڑتا تھا +

ایک رات ابا جان ہوا کی تیزی سے گھر میں داخل ہوئے۔ انکی آنکھوں میں چمک تھی۔ ہم اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ اور اس مسرت سے جو اُن کے رگ رگ میں پھوٹ رہی تھی متاثر ہو رہے تھے +

"ہم سب یروشلم جارہے ہیں"۔ وہ چلّا اُٹھے "میں وہاں کا گورنر بنایا گیا ہوں۔ اور ہمیں حتی الامکان جلدی جانا ہے"+

"یروشلم" اماں نے گھبرا کر دریافت کیا۔ گویا ہمیں قطب شمالی کو جانا تھا۔ "خدا ہماری مدد کرے شاید آئندہ ہمیں کیا پیش آئے گا میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں شتلیجہ بھیجیں گے"+

اس کے بعد ابا جان نے بیان کیا کہ کس طرح انہیں یہ قابل رشک جگہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اُن کو معلوم ہوگیا تھا کہ یہ جگہ محل کے سکرٹریوں کا واحد اجارہ بنی رہی ہے۔ پچھلے چاروں گورنر محلات کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ اُنہوں نے پہلے اپنے ایک دوست کو جو کہ صوبجات کا انسپکٹر تھا۔ تار دیا کہ وہ گورنر یروشلم کو کسی خالی جگہ پر تعینات کرنے یہ درخواست بے اثر نہ رہی۔ اور جب جگہ خالی ہوگئی۔ تو ابا جان نے ایک طویل درخواست یروشلم بھیجے جانے کے لئے سلطان کی خدمت میں بھیجدی ہیڈ سکرٹری نے درخواست سلطان کے سامنے پیش کی اور اُس نے فوراً منظوری دے دی +

باوجود اس کے کہ سلطان والد سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے بظاہر احسان جتانے کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ سکرٹری نے منظوری کے بعد ابا جان سے آکر کہا "سلطان نے آپ کو گورنر یروشلم مقرر کردیا ہے۔ اور آپ کی تقرری اسی لمحہ سے عمل میں آگئی ہے۔ سلطان نے

آپ کی خاطر تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ مگر آپ کو فوراً چلا جانا چاہئے۔" اس کے بعد جو دن گذرے۔ وہ ایک خواب پریشان کے مانند تھے۔ گھر کی پراگندہ حالت ہم بچوں کے لئے خوشی کا باعث تھی۔ دریوں اور غالیچوں کو لپیٹ کر ایک انبار لگا دیا گیا تھا۔ اور اس پر چڑھ کر کھیلنا ہمارے لئے ایک کھیل بن گیا تھا۔ بہت سا سامان ہم ساتھ لے جا رہے تھے۔ اور باقی سامان گاڑی میں لدوا کر نانا کے ہاں باسفورس بھجوانے کا ارادہ تھا۔ داربٹ باورچی جو کہ ایک کشادہ رو تاتاری تھا۔ دونوں نرسیں اور میڈم موسی ہمارے ہمراہ جا رہے تھے۔ میڈم موسی کیتھولک ہونے کی وجہ سے اس متبرک مقام کی زیارت کے خیال سے بہت خوش تھی۔ مگر اسحاق اور ماماؤں کو پیچھے چھوڑنا ضروری تھا۔ میرے بھائی کو بھی قسطنطنیہ ہی رہنا تھا۔ کیونکہ یروشلم میں کوئی سکول اس کے قابل نہ تھا۔ ابا جان نے بلغورئے گورنر کے ابھی تک وزیر اعظم اور دوسرے وزرا کو سلام نہیں کیا تھا۔ سلطان نے سخت ممانعت کر دی تھی کہ کوئی سکرٹری دفتر وزارت میں داخل ہو کے اپنے معمولی فرائض کی ادائگی میں سلطان کی ناراضگی لے لینا ایک معمولی بات تھی +

ایک صبح جبکہ ابا جان محل میں کام میں مصروف تھے ہیڈ سکرٹری نے آ کر کہا "وزیر اس وقت محل میں ہیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ انہیں ان سے ملنے کی فکر ہے۔ اب آؤ اور سلام کر لو" +

والدہ کھڑے ہو گئے۔ اور ساتھ کے چھوٹے کمرے میں جا کر فراک کوٹ پہنا۔ اور اندر داخل ہوئے۔ اور تمام وزرا کے کوٹ کے دامن کو بوسہ دیا۔ وزیر اعظم خوش اخلاقی سے پیش آیا اور کچھ وقت ان سے باتیں کرتا رہا۔ جب واپس جانے کے لئے ابا جان اٹھے تو پھر ایک بار سب کو جھک کر سلام کیا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف پیٹھ کئے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ ایسے اعلیٰ افسروں کی طرف سے پیٹھ موڑ کر جانا خلاف ادب تھا۔ ابا جان نے دیکھا کہ وزیر مکی ہاتھ سے اشارہ کر رہا ہے۔ مگر اس کا مطلب نہ سمجھ کر برابر چلتے گئے۔ بالآخر وزیر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دوڑ کر والد کو روک لیا۔ دراصل ابا جان سیدھے دیکھتے ہوئے آتشدان کی طرف جا رہے تھے "پیشتر اس کے کہ میں نے اپنے منصب کا چارج لیا ہے۔ آپنے مہربانی کا ہاتھ میری طرف بڑھایا ہے۔ میں جناب کا مشکور ہوں" ابا جان نے دوبارہ سلام کیا۔ اور بغیر کسی تکلیف کے دروازہ تک پہنچ گئے +

ہم ایک ایک کر کے سب رشتہ داروں سے ملنے کے لئے گئے۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے۔ سفر کے متعلق گفتگو ہوتی تھی اور سب یہی دعا دیتے تھے "جاؤ سلامتی اور خوشی سے جاؤ۔ خدا تمہارا نگہبان ہو" بالآخر روانگی کا دن آ گیا۔ بندرپر ہمارے دوست اور عزیز موجود تھے۔ اور اسقدر ہجوم تھا کہ میں گھبرا گئی +

ہمارے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہمیں بار بار چومتے تھے۔ چار بڑی کشتیاں ہمیں جہاز تک لے گئیں جو کہ سمندر میں کھڑا تھا۔ انجن کی آخری سیٹی کی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ اس کی گونج کو میں نے دیر تک محسوس کیا۔ جس سے میرا دل دہل گیا۔ "جاؤ ہنستے ہوئے جاؤ خدا تمہارا نگہبان ہو" +

جلد ہی کشتیاں سطح سمندر پر سیاہ نقطوں کی مانند دکھائی دینے لگیں۔ جہاز نے حرکت کی اور میں نے سمندر کو سفید جھاگ سے ڈھپے ہوئے دیکھا۔ گویا کسی نے سمندر کے بلبلوں کے پیپے انڈیل دیئے تھے۔ ملاح ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ اماں جنگلے سے سہارا لگائے ہوئے چلا رہی تھی +

یہ ایک شاندار دن تھا۔ سورج ہمیں الوداع کہنے کے لئے نکلا ہوا تھا۔ حرم سرا کے دریچوں میں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اور تمام پرانے محلات ہماری طرف خاموشی سے تک رہے تھے +

ان کی پشت پر سینٹ صوفیا کی عمارت ایک لنگر انداز جہاز کی طرح کھڑی تھی اور اس کے پیچھے سلطان احمد کی خوبصورت عمارت مع اپنے مینارہ کے نظر آ رہی تھی۔ باسفورس سبز پہاڑیوں اور محلات کے بیچ میں سے چلکوٹ رہی تھی۔ اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر قصر یلدیز عبدالحمید کا محل تھا +

ممکن ہے سلطان کھڑکی میں سے دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہونگی۔ اور اس کے چہرے پر اطمینان کا تبسم ہوگا۔ محل میں درختوں کے جھنڈ تھے۔ اور صاف روشن دن میں وہ ایک سیاہ نقطے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ یہ ظلم و استبداد کا سایہ تھا جو ہماری زندگیوں پر محیط تھا۔ اور جس نے ہمیں گھر سے نکالا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ تاکہ اس کی مضبوط گرفت سے نجات حاصل کر سکیں۔ ہماری آئندہ زندگی اسی طرح بسر ہوگی۔ اور ہم یونہی پھرتے رہیں گے۔ ہماری زندگی اس شکستہ تختے کی مانند ہوگی۔ جسے ایک زوال پذیر سلطنت کا طوفان ادھر ادھر لڑھکاتا رہے۔ ہم نے نصف شب کے وقت جافا میں جو یروشلم کا شہر ہے۔ لنگر ڈالا۔

اور دوسرے روز ریل پر سوار ہوئے۔ جب گاڑی یروشلم جا کر ٹھہری۔ پلیٹ پر ایک ہجوم تھا۔ سپاہی۔ اہلکار۔ بیرونی ممالک کا سفیر ملاؤں کا وفد اور عمائدین شہر جو ریشمی عباؤں اور لاجوردی لبادوں میں ملبوس تھے سب موجود تھے۔ دور سے یہ سب ہم کو تک رہے تھے۔ ہم جلدی انکے پاس پہنچ گئے۔ گو ہم سفر کی کوفت کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے۔ مگر ہمیں خواہش تھی کہ سب کچھ آج ہی دیکھ لیں +

ہم کو گورنمنٹ ہاؤس میں لیجایا گیا۔ اور جب ہم تنگ کوچوں میں سے گذر رہے تھے۔ میں اس طرح غور سے دیکھ رہی تھی گویا میری آنکھیں باہر نکل پڑیں گی +

مکان آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جو کہ بظاہر ہمیں آسائش پہنچانے کے لئے جمع تھے۔ مگر درحقیقت تماشا دیکھنے کے لئے آگئے تھے۔ چاء کی پیالیوں کی جھنکار اور آوازوں کے شور وغل کے درمیان گرجوں کے گھنٹوں کی آواز ہمارے کانوں میں آرہی تھی۔ گویا یروشلم ہمیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ سیر و سیاحت کا شوق میرے روئیں روئیں میں سما رہا تھا۔ شہر شہر پھرنا اور دنیا کے عجائبات کا مشاہدہ کرنا۔ اسی طرح ہمارے آباؤ اجداد اولیٰ خانہ بدوش ترک کبھی پھرا کرتے تھے۔ غروب آفتاب کے وقت وہ خیمے گاڑ دیتے تھے۔ دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے اسی طرح ہمیشہ ایشیا کے وسیع میدانوں میں نقل وحرکت جاری رکھتے تھے +

یروشلم کے متعلق حالات کا تذکرہ میں دوسرے مہینہ میں کرونگی۔ یہ میری سیاحت کی پہلی منزل تھی۔ اور وقائع نگاری کے شاہراہ میں میرا پہلا قدم +

(خاص)

(البشیر)

دوشیزہ

دوسرا اڈیشن چھپ گیا

علم نوعی پر بمثل اور لاجواب کتاب

یہ کتاب سلسلہ تربیت الانسان کا پہلا حصہ ہے جو اپنی جگہ پورا اور مکمل ہے۔ اسمیں عورت اور مرد کے ازدواجی اور سماجی تعلقات پر طبی اور سائنٹفک اصولوں کے مطابق تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ جرمن فرانسیسی امریکن اور انگلستان کے تمام ڈاکٹروں کی تحقیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد تمام کام کی اور ضروری باتیں انتخاب کرلی گئی ہیں۔ ہندوستان کے فارسی اردو اور سنسکرت زبان کے کوک شاستروں کی لایعنی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام باتیں چھانٹ کر اور اس پر تمام تحقیقات جمع کرکے ایک کتابی صورت میں جمع کیا گیا ہے۔ زنانہ حل سے لیکر بچپن اور جوانی تک کی تمام حالتوں اور ضرورتوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب دلی والوں کی اُن کتابوں کی نقل یا اُن کی تقلید نہیں ہے۔ جو عریانی اور جذباتی باتوں سے لبریز نظر آتی ہیں۔ بلکہ شروع سے لے کر اخیر تک تمام چیزیں اصول اور اخلاق کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کتاب کی برکت سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔ جوانی کو قایم رکھنے اور حسن وشباب کی جو ضروریات کو پورے طور پر بے نقاب کرنے کے ساتھ بہترین اور صحیح مجرب نسخہ جات اس پیرایہ میں پیش کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مستفید ہوسکے۔ ہر پڑھے لکھے گھر میں یہ کتاب موجود رہنی چاہئے۔ سائز کلاں حجم ۲۲۵ صفحات۔ فوٹو بلاک کی چالیس تصاویر۔ دستی تصاویر ایک سو مجلد قیمت علاوہ محصول ۳ روپے

ملنے کا پتہ: مینیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ بارود خانہ۔ لاہور

مُسرّت

بلغیریا کے ایک مشہور افسانہ کا ترجمہ

(از جناب عتیق اللہ خاں بی۔ اے۔ مکہ)

وہ دُبلا پتلا تھا۔ خوبرو تھا۔ نوجوان تھا۔ پھر بھی وہ مسرور نہ تھا آرزوئیں ——— بیقرار آرزوئیں ہر جگہ ہمیشہ سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ شب و روز اُس کا پھڑکتا ہوا دل آرزوؤں کی آہنی گرفت میں ہوتا اور اُس کی حسرت نصیب نظر نامعلوم دنیا کے نامعلوم حصّوں میں محوِ جستجو ہوتی تھی +

آخر اُس کا گوہرِ مقصود کیا تھا؟

کچھ ..... سب کچھ +

بلبل گلاب کی کلی پر قربان ہوتی ہوئی سوز بھرے نغمے گاتی تھی اور نسیمِ صبح کی مانند ہلکا اور پاک ترنم دور تک پہاڑوں کے نشیب و فراز میں گونجتا سنائی دیتا تھا۔ اس کے علاوہ تمام عالم پر خاموشی مسلط تھی۔ ہر سننے والا دم بخود تھا۔ نیلگوں آسمان بیسیں ستارے۔ اور ماہ کامل وجیہ کی حالت میں یہ راگنی سُن رہے تھے۔ نغمہ کے سوز و گداز اور کیف کیوجہ سے ان پر غشی سی طاری تھی +

چند لمحوں کے بعد بلبل جب اپنا راگ تھوڑے وقفہ کے لئے بند کردیتی تو جذبات اور تمناؤں سے لبریز ایک آہ عالم میں آجانے کیطرح پھیل جاتی تھی +

'آہ'! زمین کے سینہ سے صدا آئی۔ اور یہ آہ درختوں میں۔ گھاس میں، چاند میں۔ تاروں میں حلول کر گئی۔ اور ایک غیر معلوم سی صدائے باز گشت دور پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچکر فنا ہوگئی +

ہر چیز نے خیند کی بیہوشی میں آہ بھری اور اس آہ میں تمنائے محبت مضمر تھی +

بلبل اپنا نغمہ گاتی رہی۔ چاند کی سفیدی مائل کرنیں گل و بلبل سے ہمکنار ہو رہی تھیں جھلملاتے ہوئے ستارے اس نغمۂ محبت کو سنتے تھے۔ اور ایک ہلکی اور لطیف مُسکراہٹ سے گانے والے کا دل بڑھا رہے تھے۔ "گائے جا۔ اے مطربۂ خوش گلو! گائے جا"

بلبل اپنی دلکش تانوں میں تمنائے محبت کو پاکر وارفتہ ہوگئی۔ گلاب کی کلی کو اپنے دل کے نزدیک کھینچ لیا۔ اور اُسے بھینچ بھینچکر کہنے لگی دوشگفتہ ہوجا پیاری۔ صرف ایک دفعہ مجھے اپنی مست خوشبو سونگھ لینے دے۔ آہ! اپنی نازک گلابی پنکھڑیوں میں میرا سر چھپالو"

رات گئے تک بلبل منّت سماجت۔ نالہ و فریاد کرتی رہی۔ پھر اُس کی تانیں مدھم ہوتی گئیں۔ اُس کی بھرائی ہوئی آواز میں خوں گشتہ آرزوئیں چھلک رہی تھیں۔ آخر منفیہ خاموش ہوگئی اُس کے سینہ سے گہری آہ نکلی۔ اور یاس و نا امیدی اس آہ سے نکل کر دیر تک گلاب کی جھاڑیوں میں رہی کی +

بلبل کا نغمہ ختم ہوگیا۔ مگر نوجوان بہت عرصہ رات کی بے خوابی کا بوجھ اُٹھائے خیالات میں گم وہاں کھڑا رہا +

اس پر طرّہ یہ کہ آرزو کا جگر دوز نیزہ اُس کے پہلو میں گہرا اُتر گیا +

سرو گھاس پر گھنے درختوں کی چھاؤں میں وہ شب و روز چت پڑا رہتا تھا۔ اُس کی نظر کا مرکز آسمان تھا +

نسیم کسی نامعلوم مقام سے آکر چپکے سے درختوں کی شاخوں اور پتوں میں گھس جاتی تھی اور ہمدردانہ مسکراہٹ سے گھاس میں خفیف سی جنبش پیدا کردیتی تھی +

دلربا نادرخت اور مضمحل شاخیں خاموش کھڑی تھیں۔ ان سے سستی ٹپک رہی تھی۔ وہ گہری نیند میں مستغرق تھے۔ اور اُن کی ابدی خوابوں

ہیں لاکھوں راز پنہاں تھے +

نرم رو ہوا بھی ان کے آرام میں خلل انداز ہوتے ہوئے ڈرتی تھی۔ وہ بھی ان کے پتّوں سے کھیلتی ہوئی آہستگی سے گذر جاتی +

وہ مردوں سے شرط بدکر کیوں سو رہے تھے ؟

شاید نوجوان کو ان کی جادو بھری نیند میں اس کا گوہر مقصود مل جائے۔

وہ پہاڑی ندی کے زیر و بم کو سنتا تھا +

ندی فراز کوہ سے جہاں ہمیشہ برف کی موٹی تہہ جمی رہتی تھی اچھلتی ہوئی۔ گاتی ہوئی پتھروں سے ٹکراتی ہوئی اور پہاڑوں کے سینوں کو کاٹتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کی جھاگ والی موجوں کی پُر زور ٹکر سے چٹانیں دیوانہ وار ایک دوسرے پر گر رہی تھیں +

مگر ندی جا کہاں رہی تھی اُسے معلوم نہ تھا +

سینکڑوں صدیوں سے یہ پہاڑوں سے سر ٹپکتی ہوئی بہہ رہی ہے شاید یہ کسی دریا یا سمندر میں فنا ہو جائیگی یا کہیں تپتی ہوئی ریت میں جذب ہو جائے گی۔ ندی کو اپنی قسمت کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا +

اس کی گرج اور اس کے جھاگ ؟ کیا یہ نامعلوم آرزو کے خلاف اظہار غیض و غضب نہ تھا +

نوجوان آرزو کا گراں بوجھ برداشت نہ کر سکا۔ یہ اُس کی بساط سے زیادہ تھا +

اس لئے وہ سفید دنیا میں 'مسرت' کی جستجو میں چل کھڑا ہوا +

وہ ہزارہا گاؤں سے گذرا۔ ایک دفعہ اُسے ایک کسان دن بھر کی محنت شاقہ سے تھکا ماندہ خواب نوشیں کے مزے لیتا نظر آیا۔ غضب کی تاریکی غریبانہ جھونپڑیوں کو گھیرے ہوئے تھی۔ سکوت اسقدر تھا کہ کتوں کا بھونکنا بھی سنائی نہ دیتا تھا +

"'مسرت' کہاں ہو تم ؟" نوجوان چلایا +

جواب ندارد +

وہ جھونپڑی کے دروازہ تک پہنچا۔ اُس کا دل مستقبل کے خیالات سے دھڑک رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر ایک دبی ہوئی گہری اور یاس انگیز آہ سنائی دی +

یقیناً پچھلے پہر نفرت انگیز جھونپڑی کی تاریکی میں 'مسرت' معدوم تھی۔ نوجوان غمگین ہو کر چلا گیا +

وہ دریا۔ جھیلوں۔ وادیوں سے گذرتا ہوا پہاڑ کی سر فلک چوٹی پر چڑھ گیا +

وہاں گڈریا اپنا ریوڑ چرا رہا تھا۔ صبح کے وقت ہری ہری گھاس پر شبنم کے قطرے گوہر آبدار کی طرح چمک رہے تھے۔ سردی سے بچنے کے لئے بھیڑیں سورج کی زرّیں شعاعوں میں پھر رہی تھیں۔ ان کی گھونگریالی اون میں سرد ہوا کے جھونکے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے +

جوان گڈریا ایک مرمریں چٹان پر بالسری لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔ سورج کی کرنوں کے پہلے بوسے کی طرح اس کا راگ مدھم اور نازک تھا۔ اور کسی دوشیزہ کی سیاہ آنکھوں کی مانند خواب آلود تھا۔ راگ اس کی نَے سے پہاڑ کی دھند کی طرح یکجا ہو کر نکلتا۔ اور آہستہ آہستہ لہلہاتے گھاس پر، سرسبز جنگلوں پر اور برف پوش چوٹیوں پر چھا جاتا +

ریوڑ اس راگ کو سن رہا تھا +

"مجھے بتا دو۔ خدارا مجھے بتا دو۔ تم کس چیز کے متعلق گا رہے ہو؟"

"کس چیز کے متعلق ؟ ہو کیا کسی خاص چیز کے متعلق گاتی ہے۔ موسیقی کے لغیر میں جی نہیں سکتا۔ اس لئے میں گاتا ہوں۔ میرے راگ کا موضوع وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں موجود نہیں۔ کیا یہ امر قابل افسوس ہے ؟"

"کیا تم مسرت سے واقف ہو ؟"

"'مسرت' ؟ میں اس سے کبھی دوچار نہیں ہوا۔ یہاں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں میں ہوں یا میری بھیڑیں۔ ہاں تھوڑی سی دھند اور برف بھی ہے۔ 'مسرت' اس جنگل کا باشندہ ہیں یہاں کے بسنے والوں کو میں جانتا ہوں —— ہر ایک کو ..... لوگ کہتے ہیں کہ سینکڑوں کوس دور اُس طرف ..... کیا آپ دیکھ رہے ہیں ..... ایک خوبصورت شہر ہے۔ شاید 'مسرت' اُس کی مکین ہو ..... میں نہیں جانتا ..... میں وہاں کبھی نہیں گیا .....؟"

نوجوان کی آرزوئیں اور بھی تیز ہو گئیں۔ اور پہاڑوں سے اُتر کر وہ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ شہر واقعی عجیب و غریب تھا۔ ایسا شہر اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ عالیشان عمارتیں۔ تجارتی ایوان۔ محلات۔ فراخ گلی کوچے سینما۔ تھیٹر۔ باغات۔ سب کے سب چوندھیا دینے والی روشنی میں کشتیوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہاں دولت تھی۔ شان و شوکت تھی۔ عظمت تھی

عیش و عشرت سب کچھ تھا +

وہ ایک سڑک سے گذر کر دوسری سڑک پر پہنچ گیا۔ اُس نے سرسبز پارک کے کنارے ایک ننھا گداگر لڑکا کھڑا دیکھا جو سردی سے کانپ رہا تھا اور غمگین و دردناک لہجہ میں بھیک مانگ رہا تھا +

نوجوان بڑھتا چلا گیا۔ . . . . . .

وہ تھیٹر کی کھڑکی میں جھانکنے کے لئے ٹھہر گیا۔ ایک نوجوان مطربہ جو حسن و موسیقی کی دیوی سمجھی جاتی تھی۔ سٹیج پر تھی۔ سامعین نے تالیوں اور شور و غل کا ایک لامتناہی تار باندھ دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی شیریں ادا سے تعظیم کے لئے جھکی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ 'مسرت' اُس کی مسکراہٹ میں نمایاں ہے +

کچھ دیر بعد وہ اپنے ڈریسنگ روم میں گھس گئی اور تھکن سے چور رنج و غم کے باعث رونے لگی +

نوجوان عظیم الشان شہر سے رخصت ہو گیا اور ایک مرتبہ بھی پیچھے پھر کر نہ دیکھا۔ ننھے گداگر کی سسکیوں اور ہر دلعزیز دیوی کے مایوس کن گریہ نے اسے شہر سے کوسوں دور بھگا دیا +

بہت عرصہ تک وہ دنیا میں سرگردان رہا۔ بالآخر وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر پھسلنی چٹانوں میں رک گیا۔ جہاں ایک فرشتہ خصلت بزرگ غار میں محو عبادت تھا ——— دولت کے ایوانوں سے دور۔ عشرت کے کاشانوں سے دور۔ . . . . مگر خدا کے نزدیک . . . . . .

"اے ولی اللہ! کیا تم مسرت کی جائے رہائش سے واقف ہو؟" اُس نے آہستہ سے فقیر کے سامنے جا کر کہا +

فقیر خدا سے لو لگائے مگن تھا۔ بہت دیر کے بعد اُس نے اپنا برف سا سفید سر مراقبے سے اُٹھا کر اپنی دھندلی نظر نوجوان کی آنکھوں میں گاڑ دی۔ اور اس کے روکھے سوکھے چہرہ پر مسکراہٹ نمایاں ہو گئی +

کیا وہ اپنی ضائع شدہ جوانی کی بابت سوچ رہا تھا +

"'مسرت'؟ تمہارے لئے؟" فقیر نے پوچھا۔ اس کے لب و لہجہ میں 'شک' تھرا رہا تھا +

اور وہ خیالات کی رو میں بہہ گیا +

پھر اُس نے سر اٹھا کر کرخت لہجہ میں کہا "یہ فضول! سب بے ہودہ! 'مسرت' کوئی چیز نہیں۔ یہ اک خواب ہے خواب۔ محض دھوکہ ہے"

نوجوان نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "آہ! پھر مجھے زندگی کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کیوں اتنی تکالیف برداشت کیں؟ درشت دردی سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ . . . . ."

فقیر کا دل موم ہو گیا۔ 'اُسے 'مسرت' کے خواب دیکھنے والے نوجوان پر رحم آ گیا +

"مت رو۔ یہ راہ وہ رستہ جس کی تمہیں تلاش ہے۔ جاؤ۔ ابھی تم جوان ہو۔ کوئی آجنک واپس تو آیا نہیں۔ ہاں تم اگر سلامت واپس آجاؤ تو 'مسرت' کو اپنے ساتھ دنیا میں کھینچ لاؤ گے" +

نوجوان اس رستہ پر ہو لیا۔ باوجود اتنے لمبے سفر کے اسے تھکان کا احساس نہ تھا۔ اس کی روح کی انتہاہ گہرائیوں میں اُمید بھی آرزو کے ساتھ ساتھ نشو و نما پانے کے لئے پیدا ہو گئی تھی +

وہ دشوار گذار راستوں سے ہوتا ہوا بلندی پر چڑھ گیا۔ . . . . . .

اس کے سامنے پہاڑوں کی سفید چوٹیاں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں چمک رہی تھیں۔ ان بلندیوں پر کریہہ منظر اور ہیبتناک قوت منڈلا رہی تھی۔ کسی شے سے بھی زندگی یا جوانی کے آثار ہویدا نہ تھے۔ ہر چیز تباہی کے خطرہ سے خاموش اور سہمی ہوئی معلوم ہوتی تھی +

نوجوان کی راہ میں ایک گہرا نالہ پڑتا تھا۔ وہ دم بخود حیران اور سراسیمہ چند قدم سمٹ کے خاصلہ پر ٹھہر گیا +

شاید پہاڑ چوٹی سے تہ تک جمائی لے رہا تھا۔ کنارے ہزاروں فٹ اونچے عموداً کھڑے تھے۔ نالہ کچھ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ طاقت سے کود کر اس پار چلے جانا ناممکن تھا +

خوفناک سیاہ گہرائیوں سے دھند اُٹھ رہی تھی۔ زمین دوز موجوں کا شور توپوں کی گرج سے کہیں زیادہ بڑھ کر تھا۔ ہر طرف فضا میں خوف و دہشت تولی تھا +

دور نیچے تاریکی کے سیاہ لبادے میں عناصر کی مہیب اور ہیبتناک جنگ جاری تھی +

مگر نوجوان ان علامات قہر سے خوفزدہ نہیں ہوا۔ . . . . . .

نالے کے دوسرے کنارے سفید چٹان پر جنگل کی ایک پری کمنی ٹیکے محو تماشا تھی۔ شفق کی سرخی میں اس کے سنہرے بال چمک رہے تھے، اس کی سفید و شفاف جلد کے نیچے مرمریں جسم میں سرخ خون دوڑ رہا

کرتا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی پر اسرار دلربا نیم باز آنکھوں میں شرارت کی سی چمک تھی +

نوجوان حیرت سے وہیں جگہ جم گیا۔ اور التجا کے طور پر اپنی باہیں پھیلا دیں۔ اسے ایک ہی لمحہ میں احساس ہو گیا کہ بہل کیوں گاتی ہے۔ پہاڑی ندی کہاں جاتی ہے۔ درختوں میں کیوں رازدارانہ خاموشی ہے۔ گڈریئے کے سیال نغمے کہاں فنا ہوتے ہیں ؟

اس کی آنکھیں 'دنیاوی مسرت' پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دو زانو ہو کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رحم کی درخواست کرنے لگا +

'مسرت' کے پیچھے 'موت' کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اُس نے 'مسرت' اور نوجوان کے درمیان تیز تلوار کو نالے پر پھیلا دیا۔ سورج کی آخری مدھم شعاعوں میں تلوار جگمگا رہی تھی۔ اور اُس کی چمک نالے کے اوپر ننھے سے تھرکتے ہوئے بادل کے ٹکڑے تک پہنچ رہی تھی +

مسرت اپنی نرگسی آنکھوں سے نوجوان کو مخمور بنا رہی تھی۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بُلا رہی تھی +

موت تلوار کو مضبوط تھامے ہوئے ہنسی۔ تلوار کی چمک میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا +

"بیوقوف۔ کہاں جا رہے ہو تم ؟"

نوجوان نے جو 'مسرت' کی تلاش سے چور چور تھا۔ اور اب اُس کے حسن سے مسحور تھا۔ آنکھوں سے نالے کی چوڑائی کا اندازہ لگایا اور چھلانگ لگا دی ..... 'مسرت' کی آغوش میں نہیں۔ بلکہ 'موت' کی تلوار پر +

اُس دن سے لوگ اس نالے کو 'دریائے مسرت' کہتے ہیں +

اے۔ یو۔ خان

تصنیفات مُلّا رموزی

شادی اور صبح لطافت

ملا رموزی کی تقریب شادی پر انکی خود نوشتہ کتاب جسمیں تقریب شادی پر نہایت عالمانہ اور محققانہ طریق سے تفصیلاً لکھا گیا ہے۔ خود ملا رموزی کی تقریب اور پھر خود ان ہی کے قلم سے ان واقعات کا لکھا ہوا نیز جسقدر بھی فصیح اور لطیف ہو سکتا ہے۔ وہ اس کتاب کے مطالعہ ہی سے ظاہر ہوگا۔ قیمت ۴ عہ

ادب اردو میں فصاحت نگاری اور لطیف تر تحریر کا بہار آفریں نمونہ۔ جو اخلاق، تمدن اور سیاسیات پر مشتمل ہے۔

قیمت دو روپے (عہ)

نکات رموزی۔ حصہ اوّل۔ ایک روپیہ ... عہ

نکات رموزی۔ حصہ دوم۔ ایک روپیہ آٹھ آنے عہ

رعایت :۔ شادی اور صبح لطافت کے خریدار نسخہ لینے کی بجائے للعہ محصولہ اک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ

ایم۔ اے۔ رفیقی

یکی دروازہ۔ کوچہ چاہ۔ لاہور

محبّت ایک بیماری ہے

ایک فرانسیسی مصنّف کے خیالات

(از جناب محمّد عطاء الرحیم صاحب ایم اے - ایل - ایل - بی)

لکھائے ساحت محبّت کو ایک بیماری تصوّر کیا کرتے تھے۔ مگر فی زمانہ اُن کے اس نظریہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ مگر فرانس کے ایک مشہور طبیب جن کا نام ڈاکٹر پال ویڈونیل ہے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جسمیں انہوں نے ثابت کیا ہے۔ کہ محبت در اصل ایک دماغی بیماری کا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف شروع ہی میں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ "یہ وبا عملک نہیں ہوتی۔ اور اکثر حالتوں میں مرض محبت کا دورہ تین ماہ سے لے کر ایک برس تک رہتا ہے۔ اس کے بعد مریض آپ سے آپ اچھا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مگر بعض حالتوں میں یہ دورہ نہایت ہی سخت پڑتا ہے۔ اور دورہ ختم ہونے پر بھی مریض نہ صرف احمق بلکہ دوسری بیماریوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے"

مرض کی تاریخ چند ابتدائی باتوں کے بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس مرض کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ یونان و روم کے دور تہذیب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے "عہد قدیم میں شعرا نے نسوانی حسن اور مردانہ شجاعت کا تذکرہ نہایت ہی مبالغہ کے ساتھ کیا۔ مگر اس عہد کے لوگوں نے ان کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور ان کے جھوٹ سے اثر پذیر نہ ہوئے۔ لیکن عہد وسطیٰ سے ان تذکروں کو لوگوں نے زیادہ اہمیت دینا شروع کیا۔ عورتوں نے مردوں کی شجاعت اور دوسری مردانہ خوبیوں کے بارہ میں جو کچھ نظموں میں پڑھا اس کو حرف بحرف سچ جانا۔ اسی طرح مردوں نے نسوانی حسن و نزاکت پر جو کچھ شعرا نے اپنی مبالغہ آمیز نظموں میں لکھا اُس پر یقین کر لیا فی زمانہ ناول اور ناٹک لکھنے والوں نے اور سینما کی تصویروں نے اس خیال کو بہت زیادہ ترقی دیدی"۔

علامات اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے نہایت ہی محنت سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ کہ "وبائے محبت کے علامات پلیگ سے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اکثر یہ وبا موسم بہار میں پھیلتی ہے۔ کسی سال اس وبا کا زور زیادہ ہوتا ہے۔ اور کسی سال کم۔ مثلاً ۱۸۳۰ء میں یہ وبا برّ اعظم یورپ میں نہایت خوفناک طریقہ سے پھیلی۔ اور ہزاروں آدمی اس کے شکار ہوئے۔ چیچک کی طرح مرض محبت بھی میعادی بیماری ہے۔ ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی ہے۔ کہ اس بیماری کی صحیح طور پر معلوم ہو سکے۔ مگر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ تندرستی اور صحت کی مختلف حالتوں میں اس بیماری کا دورہ مختلف وقت تک رہتا ہے۔ یہ مرض جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے۔ ویسے ہی دماغ کی قوت اور اک کم ہوتی جاتی ہے۔ اس امر کی صاف دلیل یہ ہے کہ بہت دفعہ ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ مردوں کی محبوب عورتیں بہت ہی بدصورت ہوتی ہیں۔ جب کوئی آدمی اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے یہ بات ناممکن ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے محبوب سے الگ رہے۔ اس وقت مریض کی بہت ہی قابل رحم حالت ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ محبوب سے ہر ملاقات مرض میں تخفیف کے بجائے اس میں اضافہ کر دیتی ہے۔ محبت کی محو بالکل مدک۔ چانڈو یا افیون کی لت کی طرح ہوتی ہے۔ ان چیزوں کا عادی جان بوجھ کر زہر کو کھاتا ہے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہر نئی خوراک خون میں زہر کو بڑھا رہی ہے۔ اور اس بُری عادت کو اور پختگی پہنچا رہی ہے۔ چونکہ محبت کے ساتھ ہجر کی تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے اس مرض سے انسان کے حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ اور انسان اس برقی موجود کی طرح ہو جاتا ہے۔ جس کی برقی قوت بالکل سلب ہو چکی

ہو۔ آنکھوں کی چمک کم ہوجاتی ہے۔ جسم کے رنگ کی شگفتگی اور تازگی جاتی رہتی ہے۔ اور جسم کا تمام نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ انسان زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے اور اکثر خودکشی کا خیال اُس کے ذہن میں آیا کرتا ہے۔ جوان لڑکیاں اس مرض میں مبتلا ہوکر شاخ سے منقطع شدہ پھول کی طرح سوکھتی چلی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ مرض دیوانگی میں تبدیل ہوجاتا ہے +

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ "محبت کا اثر عورتوں اور مردوں پر یکساں نہیں ہوتا" اس دعوے کے ثبوت میں وہ مسٹر رے مشہور فرانسیسی مصنف کی رائے نقل کرتے ہیں۔ "عشق میں مبتلا مرد احمق معلوم ہوتا ہے۔ عورت پر اس کا اثر برعکس ہوتا ہے" ڈاکٹر صاحب موصوف محبت کی تعریف یوں کرتے ہیں "محبت یا عشق ایک ایسی دماغی بیماری کا نام ہے جو مریض کی قوت ارادی کو اپنا غلام کردیتی ہے۔ اور اس کو تخیل کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنادیتی ہے" +

مرض کے اسباب

"اس بیماری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چند کیمیائی ذرات دماغ میں جمع ہوجاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے محبوب اصل سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور محبوب سے متعلق ہر چیز کو بھی مریض اصل سے کہیں زیادہ خوبصورت تصور کرتا ہے۔ مردوں میں یہ بیماری آنکھوں کے ذریعہ سرایت کرتی ہے۔ اور عورت کا حسن مریض کو کئی درجہ زاید معلوم ہوتا ہے۔ نسوانی بے نیازی اور انداز مریض کے اس دھوکہ میں بہت زیادہ اضافہ کردیتے ہیں۔ نیم عریاں لباس کے مقابلہ میں سلیقہ حسن اور پراسرار طریقہ پر جسم کو پوری طرح چھپانے والا لباس مرد کی نگاہ میں عورت کو زیادہ خوبصورت بنادیتا ہے۔ مرد کا دماغ ناک کے ذریعہ بھی مسحور کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی وہ بنیادی اصول ہے۔ کہ جس پر تمام دنیا کے عطر کے کارخانوں کا دارومدار ہے" لکھنؤ کے عطر کے کارخانوں کے مالک اس سٹیٹ کو نوٹ کرلیں +

"آنکھوں کے ذریعہ عورتیں اس بیماری میں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ اکثر بدصورت مردوں پر عورتیں دل و جان سے فریفتہ نظر آتی ہیں۔ ٹھارہویں صدی عیسوی میں فرانس کا مشہور وزیر اعظم مذہب عشق کا بہترین پیغمبر مانا گیا ہے۔ لیکن وہ قصیر القامت اور نحیف الجثہ آدمی تھا۔ اور دنیا کے اکثر مرد جو اپنے زمانہ میں جنس لطیف کی دنیا میں خدائی کر چکے ہیں۔ حسن ظاہری کی دولت سے محروم تھے۔ اب تک عورتوں کے مسحور کرنے میں خوشبو کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مگر پرانے زمانہ کے طب کے طریقے آجکل بالکل بیکار ہوگئے ہیں۔ اس لئے کہ خوشبو کی طرح حسن کی دوائیں بازار میں بکنے لگی ہیں۔ اور یورپ اور امریکہ میں عورتیں اکثر اُن کو استعمال کرتی ہیں بعض مردانہ آوازیں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ اُس کو سن کر عورتیں از خود رفتہ ہوجاتی ہیں۔ بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ٹیلیفون میں کام کرنے والی لڑکیاں بہت زیادہ احمق ہوتی ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی آواز بیچاری لڑکیوں کو اسقدر از خود رفتہ کردیتی ہے کہ وہ ٹیلیفون کا نمبر کہیں کا کہیں ملا دیتی ہیں" +

جیوب رقابت

بہرحال "اس مرض کے لئے آجتک نہ تو کوئی نسخہ تجویز ہوا۔ نہ کوئی گولی بنائی گئی۔ اور نہ کوئی ٹیکہ اس کے انسداد کا نکلا" مگر ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں۔ کہ "اس قسم کا علاج ناممکن نہیں۔ بلکہ دائرہ امکان میں ہے" ثبوت میں نوبل نے ڈاکٹر فلوری کی مثال پیش کی ہے۔ ڈاکٹر فلوری نے رقابت کی گولیاں دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ برعکس اور لوگوں کے ڈاکٹر فلوری نے جذبہ رقابت کو ایک بیماری تجویز کیا۔ اور اس کا علاج دریافت کرنے میں مدت تک مصروف رہے۔ کچھ عرصہ محنت کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ جذبہ رقابت کا دورہ شب میں گیارہ اور بارہ کے درمیان پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ آپ نے خلوے مسہدہ تجویز فرمائی۔ اس کے بعد ڈاکٹر فلوری نے شب کے مختلف انواع کے کھانوں پر تجربہ کیا اور بالآخر آپ ایسی گولیاں بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ جو غذا کے مفرح اثرات کو زائل کردیتی ہیں۔ انسان السلاح اس مضر سے محفوظ ہوکر آرام کی نیند سوتا ہے +

نیک صلاح

اخیر میں ڈاکٹر ویوونیل فرماتے ہیں "آدمی خود اپنی غلطی سے عشق کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ بیماری اچانک اور ناگہاں ملتے ہی نہیں ہوتی۔ اکثر لوگوں پر اسکا رفتہ رفتہ اثر ہوتا ہے" ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے "اگر ایک مرد اور عورت ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہوں تو انکو شادی نہیں کرنی چاہئے۔ اسلئے کہ وہ ایک دوسرے کو اصلیت سے بالکل ہٹ کر اپنے تخیل کے مطابق سمجھتے ہیں۔ اور تھوڑے دن بعد جب واقعات اپنی کامل عریانی میں ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں تو دونوں سخت برافروختہ اور خفا ہوتے ہیں اور دونوں سمجھتے ہیں کہ ہمکو دھوکا اور فریب دیا گیا" خاص (ترجمہ از فرانسیسی)

"خانہ جنگی!"

(ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈراما)

("ناکارہ" حیدر آبادی کے قلم سے)

الفار ڈراما

مرزا شجاعت (ایک انسان) } خدیجہ بانو (مرزا صاحب کی المیہ مخترعہ)
ایم حلیم (ان کا بھتیجا) } بلقیس (اُنکی دخترِ نیک اختر)
کریمن (ماما)

(مرزا شجاعت کے مکان کا ایک آراستہ پیراستہ کمرہ۔ بیچ میں ایک میز اور اطراف ایک آرام کرسی اور چند کرسیاں ہیں۔ میز پر ایک گھنٹی ہے۔ ایک طرف کونے میں ایک الماری پر گھڑی رکھی ہے۔ صبح کا وقت ہے دس بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ بائیں جانب سے حلیم داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک خوبرو جوان ہے۔ کسرتی جسم ہے۔ جلدی جلدی ہیٹ وغیرہ درست کرنے کے بعد وہ دائیں جانب سے باہر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے اور چاروں طرف غائر نظر ڈالتا ہے۔ پھر گھنٹی بجاتے ہوئے آرام کرسی کا رُخ کرتا ہے۔ اور اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتا ہے)

حلیم۔ "جنگ عظیم کے ہولناک نتائج و عواقب! ہوں! سمجھ میں نہیں آتا یہ لوگ جنگ سے اتنے متنفر کیوں ہیں اور اس کو ایک ہوّا ——

(مرزا صاحب کی نورِ چشمی حسین و جمیل بلقیس داخل ہوتی ہے)

بلقیس۔ بھائی حلیم۔ کیا آپ ہی نے گھنٹی بجائی؟

حلیم۔ بہن بلقیس۔ ہاں۔ میں نے ہی گھنٹی بجائی۔ کیا اس گھر کے مالک کے معزز بھتیجے کو ناشتہ تک نہ دیا جائے گا؟

بلقیس۔ حسبِ معمول ناشتہ ٹھیک آٹھ بجے کھایا جا چکا۔ اور اس وقت آپ کے کمرہ سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی +

حلیم۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اُٹھنے کے بعد بھی مجھے ناشتہ نہ دیا جائے۔ سنو چار پراٹھے ایک انڈا۔ تھوڑی سی بالائی۔ ایک کپ کافی —— چائے نہیں +

بلقیس۔ خوب! کریمن آپ کا یہ آرڈر سنے گی۔ تو نہ معلوم کیا کہے گی +

حلیم۔ (کھڑا ہو کر) یہ کریمن کون بلا ہے؟

بلقیس۔ ہماری نئی ماما ہے۔ وہ ایسے غیر معمولی آرڈر سُنکر خفا ہونے کی عادی ہے

حلیم۔ تمہارے خیال میں یہ صدائے احتجاج بلند کرے گی؟

بلقیس۔ میرے ناقص خیال میں ہاں۔ مگر نہیں کہہ سکتی کہ اس کی صدائے احتجاج کون سا پیرایہ اختیار کریگی +

حلیم۔ نہیں کہہ سکتی ہو تو مت کہو۔ بہرحال مجھے اتنا تو یقین ہے کہ آس کی باتوں سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے نہیں ہو جائیں گے (مسکراکر) فوج میں ہم لوگ ایسی باتیں روزانہ سُنا کرتے تھے۔ اگر میں اب تمہارے سامنے ان باتوں کو دہراؤں۔ تو مجھے یقین ہے کہ مارے غیرت کے تم زمین میں گڑ جاؤ گی۔ اچھا بلقیس۔ اب تم جاؤ اور میرے ناشتہ کا انتظام کرو +

بلقیس حتی المقدور کوشش کرتی ہوں لیکن کامیابی خدا اور اس کے بعد کریمن کے ہاتھ ہے۔ آپا میاں کا ناشتہ کے متعلق اب بھی ویسا ہی سخت حکم ہے جیسا کہ آپ کے جانے سے پہلے تھا۔ یعنی ناشتہ ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو جانا چاہئے +

حلیم ۔ اگر ایسا ہے تو میں یہ کہتا ہوں کہ جنگ پر جانے سے پیشتر مجھ سے کئی احمقانہ افعال سرزد ہو گئے تھے۔ ان کو اب یاد کرنے سے فائدہ؟ گئی گذری باتوں کو اب دُھرانا اچھا نہیں۔ یہ دیکھو دس بجے تو کیا ہوا۔ کریمن سے بعد بندگی عرض کرنا کہ میاں حلیم کا آرڈر ہے چار پراٹھے۔ ایک انڈا۔ تھوڑی سی بالائی ایک کپ کافی ـــــ چائے نہیں!

بلقیس ۔ خیر خدا مالک ہے۔ لیکن نہیں معلوم وہ کیا ـــــ (چلی جاتی ہے)

(نیّر شجاعت یعنی خدیجہ بانو داخل ہوتی ہیں۔ حلیہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے)

خدیجہ ۔ حلیم! یہاں بیٹھے ہو تم؟ طبیعت کیسی ہے؟ رات کو نیند آئی گھر میں مچھر اور کھٹمل کثرت سے ہیں ـــــ

حلیم ۔ مگر میں وہ سویا وہ سویا کہ نو کی خبر لایا +

خدیجہ ۔ میں تو ہمیشہ سے یہ سمجھتی تھی کہ فوج میں سویرے اُٹھنا لازمی ہے

حلیم ۔ ہاں لازمی ہے۔ لیکن فوج سے برخاست ہونے کے بعد دیر سے اُٹھنے میں کون امر مانع ہے؟

خدیجہ ۔ خوب! میں نہیں سمجھی تھی کہ ایک دو نہیں، پورے چار سال کی عادت تم ایک دن میں ایک دم سے ترک کر دے سکو گے +

حلیم ۔ یہ چار سال ہر صبح جب میں بستر سے اُٹھا کرتا تو کہتا "دیا الٰہی۔ حلیم! صبر کرو۔ یہ سختی اور محنت عارضی ہے۔ آرام و آسایش کا زمانہ جلد آنے والا ہے!"

خدیجہ ۔ مجھے یہ خوف تھا کہ تم اپنی چار سالہ فوجی زندگی کے بعد نرم و گرم بستر پر آرام سے سو نہ سکو گے۔ میں جانتی تھی آرام کی سخت ضرورت ہے تمہیں، تمہارے چچا میاں نے بھی یہ محسوس کیا ہوگا +

حلیم ۔ ہاں۔ چچی جان۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے لیکن (ہچکچاتے ہوئے) چچا میں ـ اور ـــ میں ـ میں ـــــ

خدیجہ ۔ ہاں ہاں۔ پیارے حلیم ان کی طبیعت سے بخوبی واقف ہوں میں گر مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں چاہتے ہیں +

حلیم ۔ ہوں! میں بچپن سے ان سے ڈرتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں اب بھی اُن کی وہی حالت ہے۔ کم از کم کل رات کو تو وہ ـــــ خیر جانے دیجئے۔ یہی کیا کم ہے کہ صبح میں ناشتہ وہی ٹھیک آٹھ بجے ہوتا ہے۔ مجھے تعداد اتنی پسندیدہ بالکل پسند نہیں۔ کیونکہ میری انتڑیاں نو بجے سے قبل ہوا اللہ پڑھ رہی ہیں +

خدیجہ ۔ ناشتہ نہیں کیا تم نے ابتک؟! حلیم! حلیم! مجھ سے پہلے ہی کیوں نہیں کہا کہ بھوکا ہوں میں۔ عجیب بے پروا بندے ہو تم! بیٹا یاد رکھو۔ وقت پر کھانا کھانے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے یہی کہا کرتے ہیں۔ اچھا میں اب ـــــ

(بلقیس داخل ہوتی ہے)

بلقیس ۔ اماں جان۔ کریمن آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے +

(آنکھوں ہی آنکھوں میں حلیم سے کہتی ہے "دیکھی آپ نے!")

خدیجہ ۔ تم چلو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ بیٹا حلیم۔ جا کے دیکھ آتی ہوں اس کمبخت نے کونسا نیا قصہ کھڑا کیا ہے +

حلیم ۔ بلقیس آرا بیگم۔ مہربانی فرما کر اس چڑیں سے کہدو کہ بیگم صاحبہ اسے یہاں یاد فرما رہی ہیں +

(بلقیس یوں کھڑی رہتی ہے گویا سوچ رہی ہے جاؤں یا نہ جاؤں)

سنتی ہو؟ تم خود جاتی ہو یا میں زحمت گوارا فرماؤں؟ (بلقیس جاتی ہے)

خدیجہ ۔ (پریشان ہو کر) حلیم! یہ کیا کیا تم نے؟ تم کو نہیں معلوم وہ کتنی منہ پھٹ ہے۔ ابتو وہ شور مچائے گی کہ ـــــ

حلیم ۔ الحمد للہ! میں بھی تو دیکھوں کون کیا بناتا ہے۔ یا کہتی ہے۔ میں اس سے نمٹ لونگا +

خدیجہ ۔ (دروازہ کا رخ کرتے ہوئے) نہیں۔ نہیں۔ میرا جانا ہی بہتر ہے۔ میں اس کو ـــــ

حلیم ۔ (اپنی چچی کو روکتے ہوئے) نہیں نہیں آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ آپ سے متعلق نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ ماما کی بچی آپ سے نہیں مجھ سے ہمکلام ہونا چاہتی ہے +

خدیجہ ۔ تم سے!

حلیم ۔ جی ہاں۔ مجھ ناچیز سے۔ شاید آپکو نہیں معلوم۔ پانچ

پاس میں نے ایک بے وقت آرڈر بھیجا تھا +

خدیجہ - حلیم! مجھ سے کیوں نہیں کہا تم نے؟ میں خود تمہارا ناشتہ تیار کرلاتی - نہیں معلوم اب کریمن ——

(باہر ایک نہایت غصیلی آواز سنائی دیتی ہے - اور ایک لمحہ بعد ایک موٹی تازی عورت آتی ہے)

کریمن - دیکھئے بیگم صاحبہ - یہ سب کام مجھ سے نہ ہوسکیگا - میں بھی تو ایک عورت ذات ہوں - کام کی بھی کوئی حد ہے - بازار سے سودا سلف لاؤں میں - پکاؤں میں - ہانڈیاں دھوؤں میں ہی - برتن مانجھوں میں ہی - جھاڑو دوں میں ہی - یہ کروں میں، وہ کروں میں - آخر کیا کیا کروں؟ آخر عورت ہوں یا —— اوئی کیا کہتے ہیں؟ اچھا سلام ہے —— مسین ہوں مسین؟ کام کی یہی حالت رہی تو میں دو دن میں سوکھ کے کانٹا ہوجاؤنگی - کیا آپ نے مجھے بلایا تھا؟

خدیجہ - (گھبراکر) ہاں -- ہاں - میں —— میں اسلئے —— شاید تم —— تم ——

حلیم - (متانت سے) بی کریمن! میں نے تمہیں یاد فرمایا تھا - مجھے ناشتہ چاہئے - کیا بلقیس بیگم نے تم سے نہیں کہا؟

کریمن - میاں ناشتہ تو آٹھ بجے ہوا کرتا ہے یہاں - میں جب سے اس گھر میں ہوں برابر یہی ہوتا ہے - اور خدا نے چاہا تو آئندہ بھی ایسا ہی ہوا کریگا - ہاں اگر مجھے دوسرا حکم ملے تو ——

حلیم - تو تم کو ابھی ابھی دوسرا حکم دیا گیا تھا - وہ کیا؟ چار پراٹھے ایک انڈا - تھوڑی سی بالائی - ایک کپ کافی —— چائے نہیں +

کریمن - حکم! میں یہ پوچھتی ہوں - اس گھر میں مجھے کون حکم دیتا ہے؟

حلیم - موجودہ حالت میں میں +

کریمن - میں حالت والت نہیں جانتی - بیگم صاحبہ - میں آپ کو ایک مہینہ کا نوٹس دیتی ہوں +

حلیم - (جلدی سے تاکہ خدیجہ کچھ کہنے نہ پائے) بہت اچھا - لیکن تمہاری بجائے چچی جان تمہیں نوٹس دیں تو بہتر ہوگا - اس وقت تم کو یہاں سے اپنا بوریا بدھنا اٹھانا پڑیگا - ٹھہرو ابھی ابھی تصفیہ ہوا جاتا ہے -

(میز سے کاغذ قلم اٹھاتا ہے اور خدیجہ سے پوچھتا ہے)

اس نامعقول کی کیا تنخواہ ہے؟

خدیجہ - پندرہ روپے ماہانہ (حلیم کاغذ پر کچھ لکھتا ہے)

حلیم - آپ اس کو بہت دیتی ہیں - (کریمن کو چٹھی دیتے ہوئے) یہ لو - چلو چھٹی ہوئی +

کریمن - اوئی یہ کیا؟

حلیم - نوٹس کی بجائے تمہاری تنخواہ کا حساب - اب تم یہاں سے اپنا منہ کالا کرسکتی ہو - چلو جاؤ +

کریمن - یہ جانے آنے کا ذکر کس نگوڑی نے کیا تھا؟

حلیم - میں سمجھا تھا کہ تم نے ہی کیا تھا - سبحان اللہ! بی کریمن - تم بھی ایک چیز ہو!

کریمن - بات صرف ناشتہ کی ہے تو خیر - مگر میاں ذرا دیکھ سنبھل کے بات کیجئے +

حلیم - چلو فوراً باورچی خانہ کا رستہ لو - اس دانتا کلکل میں میرے پیٹ کی جو حالت ہوئی ہے - اور ہو رہی ہے - وہ میں ہی جانتا ہوں - اور سنتی جاؤ - چار پراٹھے - ایک انڈا - تھوڑی سی بالائی - ایک کپ کافی —— چائے نہیں!

کریمن - میں —— میں —— اچھا آپ ——

(زبان یاری نہیں دیتی اور کریمن کمرے سے غائب ہوجاتی ہے)

حلیم - (حیرت سے) خوب! بڑی زبان دراز اور منہ پھٹ ہے یہ - کیوں چچی جان؟ لاحول ولا! اس سے بھی کوئی بھلا آدمی ڈر جائے گا؟

خدیجہ - حلیم کمال کردیا تو نے - اس سے بہت ڈرتی ہوں میں +

حلیم - آخر فوجی ہوں - اتنا بھی نہ کیا تو فوجی کہاں رہا؟ جنگ عظیم میں لڑنے کے بعد اگر اس ماما کا مقابلہ نہ کیا تو میرا جینا کس کام کا؟ خیر - باورچیخانہ جاتا ہوں میں - ذرا دیکھ تو لوں - وہاں کیا ہو رہا ہے - بھوک سے بُرا حال ہوگیا ہے میرا - اب ٹھہرا نہیں جاتا (چلا جاتا ہے)

(خدیجہ کمرے میں ادھر ادھر کی چیزوں کو قرینہ سے رکھتی ہے اتنے میں مرزا شجاعت داخل ہوتے ہیں - درشت مزاج آدمی معلوم دیتے ہیں - آواز بھی کرخت ہے)

شجاعت - حلیم کہاں ہے؟ ابھی اُٹھا کہ نہیں؟

خدیجہ - ہاں ناشتہ کرنے گیا ہے +

شجاعت (اپنی گھڑی دیکھ کر) دس بجے ناشتہ؟ (کھٹ سے گھڑی بند

کرکے جیب میں رکھتے ہوئے) دس بجے۔ سنتی ہو؟ اب دس بجے ہیں۔

خدیجہ۔ جی ہاں سنا۔ اب دس بجے ہیں +

شجاعت۔ پھر کچھ نہیں کہتی ہو؟

خدیجہ۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ اس طویل جنگ کے بعد تھک گیا ہے +

شجاعت۔ تو اس کے معنی یہ تھوڑی ہیں کہ وقت کی پابندی نہ کی جائے میرا خیال ہے کہ اس نے فوج میں پابندیٔ وقت کا سبق سیکھا تھا

خدیجہ۔ ہاں سیکھا تو ہوگا۔ مگر اس نے مجھ سے کہا "میں اب وہ سبق بھول گیا ہوں چچی جان" +

شجاعت۔ اس صورت میں فوراً سے پیشتر اس کو یہ سبق سیکھ لینا چاہئے ہے۔ دفتر نہ جاکر میں اب تک گھر میں کس لئے ہوں؟ صرف اس کاہل لونڈے سے بات چیت کرنے کے لئے۔ اور (گھڑی نکالکر) بس بج گئے ہیں اور ابتک اس کا پتہ نہیں۔ گویا ایک دن بیکار جا رہا ہے میرا۔

خدیجہ۔ بات چیت! یہ تو بتاؤ کس چیز کے متعلق؟

شجاعت۔ کس چیز کے متعلق؟ شادی بیاہ کے متعلق۔ اس کے مستقبل کے متعلق میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جلد سے جلد اس کے لئے کوئی لڑکی ڈھونڈوں +

خدیجہ۔ تو کیا تم بلقیس ——

شجاعت۔ دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو تم؟ کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں بلقیس کو ایک اکھڑ فوجی کے حوالے کر دونگا؟ نہیں نہیں۔ میرے خیالات کچھ اور ہیں۔ جیسا میں کہوں جلیم کو ویسا ہی کرنا ہوگا۔ نہیں اس کو یہاں سے اپنی گاڑی بڑھانا ہوگا۔ مگر مجھے یقین ہے وہ میری خواہش کے موافق کریگا +

خدیجہ۔ لیکن تم پہلے کہتے تھے کہ جلیم کو اپنا داماد بناؤنگا اور ——

شجاعت۔ ہاں یہی میرا پہلے خیال تھا۔ لیکن اس کو اب بدلنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ ہاں اور سنتی ہو۔ بلقیس کو کبھی جلیم کے پاس تنہا نہ جانے دینا۔ یہ سپاہی بچے بڑے بے ہودے ہوتے ہیں۔ ان سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہئے +

خدیجہ۔ اوئی! تم بھی بڑے وہمی ہو جی۔ کیسے بُرے بُرے خیالات ہیں جی تمہارے دل میں! اور پھر کس کے متعلق؟ جلیم جیسے شریف لڑکے کے متعلق!

شجاعت۔ خیر۔ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا خیال رکھو۔ اور بیگم یہ دیکھو۔

خدیجہ۔ دیکھتی دکھاتی کچھ نہیں ہوں۔ مجھے تو تمہاری ان باتوں پر اتنا غصہ آرہا ہے کہ —— کیا کہوں۔ گویا تمہارے نزدیک ایک بہادر سپاہی بننا شرافت کے خلاف ہے۔ جی! وہ جو ابھی ابھی ہمارے لئے جنگ لڑا ہے۔ تو وہ کچھ بھی نہیں۔ اپنی جان خطرے میں ——

شجاعت۔ پھر وہی بکواس! کتنی دفعہ کہوں میں ان فضول باتوں کے سخت خلاف ہوں۔ بس میں ایک دفعہ کہہ چکا۔ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے۔ اور جلیم لاکھ سر مارے۔ مگر میں بلقیس اس کو ہرگز ہرگز نہ دونگا۔ رہا اس کا ماننا نہ ماننا۔ سو اس کو مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسکی ناڑی دیکھ لونگا +

خدیجہ۔ جی! جلیم کے چار سال یونہی بیکار نہیں گئے ہونگے۔ اب بچہ نہیں رہا وہ کہ جو کچھ کہا جائے آنکھ بند کرکے اس پر عمل کرے۔ فوج سے وہ کچھ نہ کچھ ضرور سیکھ کر آیا ہوگا +

شجاعت۔ ہاں کیوں نہیں۔ دنیا بھر کی بُری باتیں سیکھ گیا ہوگا۔ مثلاً پستول چلانا۔ بم بنانا وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان سے یہاں کام چلیگا۔ یہ میدان جنگ نہیں +

خدیجہ۔ میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت کچھ بدل گیا ہے +

شجاعت۔ کم از کم رات کو تو میں نے کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی +

خدیجہ۔ تو آج محسوس کر لوگے۔ کہیں سے جاکے پوچھو کس قسم کا آدمی ہوگیا ہے +

شجاعت۔ اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ بس اتنا کہتا ہوں میں کہ جب تک مسیح علیہ السلام میرے ہاتھ میں ہیں۔ اس وقت تک اس کو میرے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔ خیر (گھڑی نکال کر) افوہ! ساڑھے دس ہوگئے۔ اب میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ اس نالائق سے کہدو میں اب جا رہا ہوں +

[خدیجہ دروازہ کھولتی ہے اور جلیم سے جو دوسرے کمرے میں ہے بات کرتی ہے]

خدیجہ۔ جلیم! دفتر جانے سے پہلے وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ابھی کچھ دیر ہے؟

جلیم۔ (بازو والے کمرے سے) کیا چچا میاں کو جلدی ہے؟

شجاعت۔ (مختصر طور پر) ہاں +

خدیجہ۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں جلدی ہے +

حلیم۔ کیا وہ یہاں آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرسکتے؟ میرے ناشتہ میں اس سے خلل نہ ہوگا +

شجاعت۔ نہیں +

خدیجہ۔ وہ کہتے ہیں تم یہاں آجاؤ تو بہتر ہے +

حلیم۔ ہوں! ناشتہ کرنے کے بعد سوچ کے کہونگا +

خدیجہ (شجاعت سے) وہ ابھی آیا چاہتا ہے۔ لو۔ اس کرسی پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اور یہ اخبار پڑھو۔ تھوڑی دیر میں حلیم آتا ہے۔

(وہ شجاعت کو میز کے سامنے والی کرسی پر بٹھاتی ہے)

شجاعت۔ صبح کا وقت آرام سے بیٹھنے کا نہیں۔ بہت بری عادت ہے یہ۔ ابھی ابھی میں اونگھ گیا تھا۔ اس طرح میں اپنے قیمتی وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا +

خدیجہ۔ تمہاری آنکھوں میں ابھی نیند کا خمار باقی ہے۔ رات کو نیند نہیں آئی شاید اس کے علاوہ حلیم کے قصے سننے میں آج ایک بج گیا تھا +

شجاعت۔ ہاں۔ ہاں۔ (جمائی لیتے ہیں) اپنا منہ کھولتا ہے پھر جلدی سے بند کر لیتا ہے) استغفر اللہ! تمہیں آج بہت کام کاج کرنا ہے سنتی ہو۔ کوئی فرق نہ آئے +

خدیجہ۔ اچھا۔ میں اب جاتی ہوں۔ مگر دیکھو حلیم سے سختی سے پیش نہ آنا +

شجاعت۔ ہاں ہاں۔ بیگم۔ اسکا اطمینان رکھو تم۔ میں انصاف سے کام لونگا (خمار آلودہ آنکھوں سے) مگر بلقیس کی طرف ——

خدیجہ۔ (بگڑکر) اوئی! یہ بلقیس بلقیس کی رٹ کیوں لگا لے جاتے ہو؟ آج ایسے کیوں ہوگئے ہو تم؟ آخر بلقیس کو خود اپنا خیال ہوگا۔ اچھے بدگمان ——

(چلی جاتی ہے۔ مرزا شجاعت اونگھنا شروع کرتے ہیں۔ دفعتاً وہ چونک پڑتے ہیں اور اخبار کو صفحہ الٹ کر نیند کو بھگانے کی غرض سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ پھر اونگھنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد بہت جلد وہ خراٹے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں)

حلیم۔ (داخل ہوتے ہوئے) چچا میاں مجھے اس کا سخت افسوس ہے کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ مگر کیا کروں؟ آخر ناشتہ کھانے میں تھوڑا وقت صرف ہو ہی جاتا ہے معافی مانگتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر ہوگئی +

شجاعت (گھڑی نکالکر) خوب! تھوڑی دیر! دو گھنٹے کی دیر! پانچ دس منٹ نہیں۔ کامل دو گھنٹے کی دیر +

حلیم۔ خیر یونہی سہی چچا میاں۔ دو گھنٹے کی دیر ہی سہی۔ یا یوں کہئے کل کے ناشتہ کے لئے دو گھنٹے کی جلدی ہے نا؟ فرمائیے کیا بات چیت کرنے والے ہیں آپ؟

(مرزا صاحب کے مقابل کرسی پر بیٹھکر سگریٹ سلگاتا ہے)

شجاعت۔ تم سگریٹ پیتے ہو؟

حلیم۔ (ہکا بکا ہوکر) میں کیا؟

شجاعت۔ تم سگریٹ پیتے ہو؟

حلیم۔ میرے خدا! کیا سمجھتے ہیں آپ۔ ہم لوگوں نے فوج میں کیا کیا؟

شجاعت۔ سگریٹ دھتک کر مکان کو دھواں دھار کرنے سے پہلے کم از کم اپنی چچی سے اجازت لے لی ہوتی!

(حلیم حیران ہوکر دروازہ تک جاتا ہے اور پھیکر کہتا ہے)

حلیم۔ چچی جان!..... چچی جان!..... سگریٹ پی سکتا ہوں میں؟ کوئی ہرج تو نہیں؟ گھر جل جانے کا اندیشہ ہو تو فرمائیے +

خدیجہ (باہر سے) نہیں۔ نہیں۔ بیٹا۔ کوئی ہرج نہیں +

حلیم۔ (واپس آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے) نہیں نہیں۔ بیٹا۔ کوئی ہرج نہیں!

شجاعت۔ حلیم! مجھکو معلوم ہونا چاہئے کہ جب تک تو میرے گھر میں ہے۔ میں مجھ سے پابندی اوقات کے علاوہ بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی امید رکھتا ہوں۔ یہاں شوخی۔ بے ادبی اور گستاخی سے کام نہیں چلے گا +

حلیم۔ واہ چچا میاں واہ! آجتک کوئی سمجھدار شخص اپنے ہونے والے خسر سے شوخی بے ادبی اور گستاخی سے پیش نہیں آیا۔ اور ——

شجاعت۔ ہیں! کیا کہا؟ ہونے والا خسر! پھر بول پھر بول! تیرا اس سے کیا مطلب ہے؟

حلیم۔ مطلب؟ مطلب یہ کہ میں عنقریب آپکا داماد بننے والا ہوں +

شجاعت (طنزاً) جی! مجھے یہ سنکر نہایت مسرت ہوئی! اگر ایسا کہدینے سے کوئی کسی کا داماد نہیں بن جاتا۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیسے میرے داماد بنتے ہو +

حلیم۔ میں بھی تو دیکھوں آپ مجھ کو اپنی فرزندی میں کیسے نہیں لیتے ہیں آپ شاید بھول گئے کہ غازی ہوں ہیں۔ غازی! اگر آپ نے میرے کیرکٹر کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ تو آپ اس میں ایک ایسا زبردست پہلو پائیں گے۔ جس سے جنگ کے وقت میرے ساتھ والے سپاہیوں پر ہمیشہ دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ جب ایک وقت کوئی بات کہدیتا ہوں۔ بس اس کو کرکے ہی چھوڑتا ہوں۔ چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ آپ ــــ

شجاعت۔ لیکن مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ ــــ

حلیم۔ جناب! خاموش رہئے۔ پہلے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اُسکو سُن لیجئے۔ بعد میں آپ کو زبان ہلانے کا موقع دیا جائے گا۔ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں میں آپ سے۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ کس بلا کا ہوں ہیں۔ ایک رات ــــ آہ بڑی ڈراونی رات تھی۔ اور آپ کے بالوں کی طرح سیاہ (مرزا صاحب اپنے بالوں کو محسوس کرنے لگے) ہمارے لوگ دشمن سے تھوڑے فاصلہ پر مقیم تھے۔ ہمارے افسر نے پوچھا۔ ہے کوئی تم میں سے جو اس وقت جاکر دشمن کی خبر لاسکے کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہے۔ فوج میں ہٹے کٹے مسٹنڈے تھے تو بہت سے۔ لیکن کوئی آگے نہ آیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ نامردے کہیں کے۔ میں آگے بڑھا اور کہا میں حاضر ہوں۔ افسر نے مجھے ہدایات دیں اور میں روانہ ہوگیا۔ گرتے پڑتے۔ چھپتے چھپاتے آخر دشمن کے کیمپ کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں جاکر کیا دیکھتا ہوں۔ کہ دشمن شبخون مارنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ فوراً میں پلٹا اور یہ خبر پہنچانے کے لئے دوڑنے لگا۔ ایک دفعہ ایک سپاہی نے شبہہ پاکر چلا کر کہا بھی کہ "ہوگوزدیہ!" مگر میں دبک گیا اور جب اس کا اطمینان ہوگیا کہ کوئی نہیں ہے۔ میں اُٹھا اور پھر لگا دم بنانے۔ اپنی قیامگاہ پہنچکر ــــ

شجاعت (متاثر ہوکر کھانستے ہوئے) ہاں ہاں۔ بیشک ایسے واقعات اکثر ہوتے ہی رہتے ہیں میدان جنگ میں۔ آخر تو میرا ہی بھتیجا ہے نا! شاباش، بہادر چچا کے بہادر بھتیجے شاباش۔ مگر اب کام کی باتیں کرو۔

حلیم۔ ہاں صرف میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اگر آپ کو میرے واقعات جو مجھے جنگ میں پیش آئے سناؤں تو آپ ــــ

شجاعت۔ ارے کمبخت! تو اس جنگ کا پیچھا چھوڑ۔ اس کا نام سنتے ہی میرا دم نکلنے لگتا ہے۔ اور تجھ جیسے لونڈے جو کسی زمانے میں ہمارے سامنے ننگے پھرتے تھے۔ بس یہ سمجھ گئے ہیں کہ جنگ لڑکے کیا آئے ہیں ایک بڑا ہی ــــ

حلیم۔ چچا میاں۔ آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ اچھا جانے دیجئے اس جنگ کو! میں اب کبھی آپ کے سامنے جنگ کا نام نہ لونگا۔ جب آپ جنگ کا نام سنکر بدحواس ہوئے جاتے ہیں اور آپ کا دم اُلجھنے لگتا ہے۔ تو میں خواہ مخواہ آپ کے سامنے جنگ جنگ کی رٹ لگاکر آپ کو اور زیادہ پریشان کیوں کروں۔ واقعی جنگ بڑی بُری چیز ہے۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے گذشتہ جنگ میں کتنے آدمی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ کتنی عورتیں بیوہ کتنے بچے یتیم ہوئے۔ کیا کیا ستم ہوئے۔ اللہ اکبر کیا ہلاکت خیز جنگ تھی۔ زبان قاصر ہے۔ اس جنگ کے مظالم کے بیان سے۔ یہ جنگ ــــ خیر جانے دیجئے اس سے تو آپ کا دم الجھ رہا ہوگا۔ کچھ کام کی باتیں کیجئے۔ جو کچھ آپ کہیں اس پر میں عمل کرنے کے لئے تیار ہوں +

شجاعت۔ شاباش بیٹا شاباش! تو میرا کہا مانیگا نا؟ مجھے تجھ سے ایسی ہی توقع تھی۔ تو کو معاملے ہوگیا +

حلیم۔ مگر یہ کہاں طے ہوا کہ آپ مجھے بلقیس کا سرتاج بنانے والے ہیں یا نہیں؟

شجاعت۔ ایلے نامعقول! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے تجھ سے کہ میں ــــ میں کبھی بلقیس تجھ کو نہ دونگا +

حلیم۔ اچھا سوچ کر تین دفعہ +

شجاعت۔ بس بس۔ اگر تو نے مجھ سے مذاق کیا تو یاد رکھ اچھا نہ ہوگا۔ ہاں ــــ میں ــــ

حلیم۔ ہاں ہاں کہئے۔ "میں اپنی اصلیت پر اُتر آؤنگا" کہئے کہئے یہی جی آپ کا مطلب تھا نا؟

شجاعت۔ ابے مسخرے! دیکھ میرا خون کھولنے لگا ہے۔ اب کے تو نے پھر مذاق کیا تو میں برس پڑونگا +

حلیم۔ تو بسم اللہ کیجئے! میں حاضر ہوں۔ چچا میاں۔ پھر ایک دفعہ کہتا ہوں راضی ہو جائیں۔ آپ کو مجھ جیسا داماد کہیں نہیں ملیگا۔ دیکھئے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ آپ کیا جانیں مجھے بلقیس سے عشق ہے؟

شجاعت۔ عشق! قہ قہ قہ! عشق! بوالہوسی کہہ۔ بوالہوسی۔ ابے بیوقوف عشق بھی کوئی چیز ہے؟ بوالہوسی کا نام تجھ جیسے بے معاش لونڈوں نے عشق رکھ لیا ہے۔ کہتا ہے بلقیس سے عشق ہے مجھے! خوب! میں تجھ سے کہتا ہوں۔ اور آخری بار کہتا ہوں۔ کہ چار سال بیشتر ممکن تھا میں تیری شادی بلقیس سے کر دیتا لیکن اب ہرگز ہرگز نہیں کرونگا۔ تو نے اپنے چار سال خراب کئے اور اب ——

حلیم۔ اگر میں نے اپنے چار سال خراب کئے تو وہ سرے لوگوں نے بھی اپنے چار سال خراب کئے۔ دیکھئے جناب میں کوئی اسکول کا لڑکا نہیں رہا اب جو آپ کی باتوں میں آجاؤں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میری چار سالہ فوجی زندگی سے مجھ میں کوئی فرق نہیں آیا؟

شجاعت۔ آیا کیوں نہیں؟ تو اب حد درجہ بدتمیز بے ادب گستاخ ہو گیا ہے +

حلیم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نوک جھونک پر تلے ہوئے ہیں۔ میں آخری دفعہ آپ سے یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں۔ کہ بلقیس میری ہو کر رہے گی +

شجاعت۔ اور میں آخری دفعہ تم سے یہ کہدینا کافی سے زیادہ سمجھتا ہوں کہ میں ایک ناخلف نامعقول بھتیجے سے —— (میز کو متواتر مکے رسید کرتا جاتا ہے)

حلیم۔ خوب یاد آیا۔ آپ کے میز بجانے سے مجھے اور ایک بات یاد آگئی ہے۔ ایک افسر تھا۔ غریب جنگ میں شہید ہو گیا۔ اچھا آدمی تھا۔ مگر جھٹ خفا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ لڑ کتا۔ گرجتا۔ چیختا۔ چلاتا کہ سارا گھر سر پر اٹھا لیتا۔ آپ کو معلوم ہے میں دنداں شکن جواب دینے میں خاصی مہارت رکھتا ہوں۔ ایک روز میں نے کسی بات میں جواب دیئے۔ وہ خوب بگڑا۔ لال پیلا ہو کر لگا خطبہ پڑھنے اور ساتھ ساتھ لگا میز ٹھوکنے۔ میں خاموش تن کر اُسکے سامنے کھڑا اس کا خطبہ سنا کیا۔ میں ایسے خطبے سُن کر بہت خوش ہوتا ہوں —— ہاں تو میرا کہنے سے یہ مطلب ہے کہ آپ کا بگڑنا تو اس لفٹنٹ سے زیادہ موثر نہیں +

شجاعت۔ (قدرے سراسیمہ ہو کر) آہ! ہاں۔ ہاں۔ بیشک۔ ٹھیک ہاں۔ درست۔ لیکن (مسکرا کر) خوش قسمتی سے میرے پاس اثر ڈالنے کی ایک زبردست چیز ہے۔ اس دنیا میں "جُوتے" کا اقتدار بہت ہے۔ میں اس اقتدار کو تیرے خلاف کام میں لانا چاہتا ہوں +

حلیم۔ تو۔ تو —— ہاں اس وقت تو بڑی مشکل ہے +

شجاعت (خوش ہو کر) مشکل ہے کیوں؟ اب اب راستی پر آئے بیٹا تم!

حلیم۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں +

(مرزا صاحب ہنستے ہوئے اخبار اُٹھا کر یوں پڑھنے لگتے ہیں گویا ملاقات ختم ہو گئی)

حلیم۔ (خود سے باتیں کرتے ہوئے) نہ میں اس پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ——

(جیب سے ایک ریوالور نکال کر کھیلنے لگتا ہے)

شجاعت۔ (حیران و پریشان ہو کر اس کو دیکھتے ہوئے) کمبخت یہ کیا کر رہا ہے؟

حلیم۔ اپنی جنگ کی یادگار سے دل بہلا رہا ہوں۔ چچا میاں آپ کو یہ سُن کر بے حد مسرت ہوگی کہ میں نے اس سے جنگ میں دشمن کے بیس آدمیوں کو ٹھنڈا کیا ہے۔ سنتے ہو۔ بیس آدمی اس کی نذر ہو گئے ہیں۔ بیس آدمی +

شجاعت۔ اماں اس کو رکھ دو۔ ورنہ دوستوں کے اور آدمی اس کی نذر ہو جائیں گے +

حلیم۔ کس کو معلوم ہے؟ (وہ آہستہ آہستہ اُٹھاتا ہے اور مرزا صاحب پر نشانہ لیتا ہے) چچا جان بُرا نہ مانیں تو اچھا تماشا رہے۔ کبھی مجھ کو دھوکا نہیں دیا

شجاعت (برہم ہو کر) جناب اس کو ہاتھ سے رکھ دیجئے۔ فوج کی یہ چالاکیاں یہاں کام نہیں آئیں۔ ایسا ریوالور جس کے اندر گولی نہ ہو۔ کسی پر تانا نہیں چاہئے۔ ایسے ہی تو قتل کی وارداتیں ہو جایا کرتی ہیں +

حلیم۔ آپ غلطی پر ہیں۔ اس ریوالور میں ایک چھوڑ دو گولیاں موجود ہیں +

شجاعت۔ (بیحد غضبناک ہوکر کیونکہ وہ یکایک خوفزدہ ہوگئے ہیں) جناب آپ اس کو ہٹاتے ہیں کہ نہیں ؟

[حلیم اس کو ہٹا لیتا ہے اور بغور دیکھتا ہے]

ابے تجھے کیا ہوگیا ہے ؟ پاگل تو نہیں ہوگیا تو ؟

حلیم۔ بلقیس کے عشق میں پاگل ہوگیا ہوں (نرمی سے) چچا میاں۔ میں خیال کرتا تھا کہ آپ جیسے بہادر شخص کو اس ریوالور سے بہت دلچسپی ہوگی۔ آہ! میں نے اس کی مدد سے بیس آدمیوں کا کام تمام کیا تھا۔

شجاعت۔ اب اور دوسروں کا کام تمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور جتنا جلد ہو سکے اسکو یہاں سے دور کرنا چاہئے +

حلیم۔ میرے پیارے چچا! کیا آپ کو کبھی یہ خیال گذرا کہ اس وقت سینکڑوں آدمیوں کے پاس ریوالور ہیں۔ اور وہ اس کو چلانا جانتے ہیں۔ لیکن اس کا انہیں موقع نہیں ملتا ؟

شجاعت۔ مجھ کو ایسے خیالات کبھی نہیں گذرتے (کرسی سے اُٹھتے ہوئے) میں نہیں جانتا اس پاگل پن سے کیا مطلب ہے۔ مگر یہ یاد رکھئے کل صبح میں آپ سے ناشتہ پر ٹھیک آٹھ بجے حاضر رہنے کی توقع رکھتا ہوں۔ مہربانی فرما کر وقت کی پابندی کیجئے (دروازہ کیطرف جاتا ہے)

حلیم۔ (نرمی سے) چچا میاں۔ مگر یہ ——

شجاعت۔ اگر مگر کے لئے مجھے فرصت نہیں۔ آپ پھر کبھی ——

حلیم۔ (فوجی آواز میں کڑک کر) ہالٹ! اٹن شن! جب ایک افسر سے بات کرو تو تم سیدھے کھڑے ہو جاؤ!

[مرزا صاحب فوراً گھوم کر تن کر کھڑے ہو جاتے ہیں]

ٹھیک۔ چاہتے ہو تو یہاں بیٹھ سکتے ہو +

[ریوالور سے روبرو کی کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے]

شجاعت۔ (ڈرتے ڈرتے کرسی کا رُخ کرتا ہے) اس مذاق کے کیا معنے ہیں؟

حلیم۔ مذاق و ذاق نہیں بالکل سنجیدہ کام ہے۔ (ریوالور مرزا صاحب کی طرف دکھا کر) تشریف رکھئے +

شجاعت (بیٹھتے ہوئے) دھمکیاں ہیں ؟

حلیم۔ جی نہیں۔ ترغیب +

شجاعت۔ ریوالور کی نوک پر؟ اپنے کام زور بازو سے کرتے ہو تم ؟ لاحول ولا! یہی تو وہ چیز تھی جس کے انسداد کے لئے ہم نے جنگ کی تھی۔

حلیم۔ "ہم" نے جنگ کی تھی! "ہم"! "ہم"! چچا واللہ آپ بھی مذاق کی حد کر دیتے ہیں +

شجاعت۔ چاہتے ہو تو "تم" کہہ لو۔ کسی کا اس میں جاتا کیا ہے ؟ گو وہ لوگ جو جنگ میں شریک نہ تھے ——

حلیم۔ بس بس۔ آپ شیخی مت گھٹا رہئے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم نے جنگ کس لئے کی۔ ہم نے اپنی قوت کو ایک دوسری قوت کے توڑنے کے لئے استعمال کیا۔ اور اس وقت بھی میں یہی کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی ابھی آپ کہہ رہے تھے میں مسیح علیہ السّلام کی قوت کو کام میں لاؤنگا۔ اور میں اس قوت کے خلاف اس کی قوت کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ (ریوالور سے نشانہ لیتا ہے)

شجاعت۔ کیا —— کیا —— تو اپنے مشفق و مہربان چچا کو مار ڈالیگا؟

حلیم۔ کیوں نہیں؟ کیا میں دوسروں کے مشفق و مہربان چچاؤں کو جنگ میں مار نہیں چکا ہوں ؟

شجاعت۔ مگر وہ تیرے دشمن تھے۔ اور اب تو اپنے دوستوں میں ہے۔ تیرا ضمیر کبھی تجھے اس جرم کے ارتکاب کی اجازت نہیں دے گا۔ کیوں ہے نا؟

حلیم۔ مگر خیال تو کیجئے۔ چار سال میدان جنگ میں رہنے کے بعد کسی شخص کے خیالات انسانی زندگی کی تقدیس کے متعلق وہی نہیں رہتے جو پہلے تھے۔ ہے کہ نہیں ؟

شجاعت۔ مگر تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ابتک جج اور جیوری کے خیالات وہی ہیں۔ جو پہلے تھے +

حلیم۔ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن ریوالور اکثر اتفاقاً چل جاتے ہیں۔ آپ ہی نے تو تھوڑی دیر پیشتر یہ کہا تھا۔ اور انشاء اللہ عنقریب ہونے والی واردات محض اتفاقیہ ہوگی۔ اخبارات میں آئے گا "مقتول کا بھتیجا جو معلوم ہوتا تھا کہ ——"

شجاعت۔ شاید تو خیال کرتا ہوگا کہ اپنے پیارے بھتیجا کو اس طرح ریوالور دکھا کے دھمکیاں دینا شجاعت کا کام ہے۔ مگر اس کو پرلے درجہ کی بزدلی سمجھتا ہوں۔ کیا تو نے فوج میں یہ نہیں دیکھا ہے ؟

حلیم۔ اور نہیں تو کیا؟ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ کوئی سپاہی جنگ میں اتنی

دیر کرے کہ اس کا دشمن موقع پاکر اس کے تمام آلات حرب چھین لے واقعی آپ بڑے خوش قسمت ہیں جو اب تک بچے رہے۔ مجھے تو چاہئے تھا کہ آپ پر ایک دم سے چھ سات بم پھینکتا (جیب میں سے ایک بم نکالکر) اس وقت تو میرے پاس صرف یہی بچ رہا ہے +

شجاعت - (صفا خوفزدہ ہوکر) چل! اس کو اندر رکھ۔ ارے نامعقول یہ تو کیا کر رہا ہے +

حلیم - (ریوالور میز پر رکھتا ہے اور بم اُٹھا لیتا ہے) اس کو استعمال کرنے کا طریقہ آپ کو معلوم ہے؟ پہلے اس کو اس طرح پکڑتے ہیں۔ اور پھر ——— مگر شاید آپ کو ایسی چیزوں سے دلچسپی نہیں +

شجاعت (کرسی کو بازو سے گھسیٹتے ہوئے) ابے اس کو اندر رکھتا ہے کہ نہیں؟ خدا نخواستہ کچھ ہوگیا تو ؟

حلیم - (بم میز پر رکھ کر اور ریوالور اُٹھا کر) چچا شجاعت! کیا آپ کو کبھی یہ خیال گذرا کہ یہاں ہزاروں آدمی بم پھینکنا جانتے ہیں۔ اور پھینکنا بھی۔ لیکن ان کو ———

شجاعت - نہیں نہیں مجھے ایسا خیال کبھی نہیں گذرا۔ توبہ! میں تو خواب میں بھی ایسے خیالات دل میں لانے کا روادار نہیں +

حلیم - (للچائی ہوئی نظر سے بم کی طرف دیکھ کر) بیشک یہ فوجی اصول کے خلاف ہے۔ لیکن کام ٹھیک طور پر کرنے کے لئے آپ یہ بم لے سکتے ہیں۔ (ایک دم سے مرزا صاحب کے سامنے پیش کرتا ہے)

شجاعت - (ڈر کر پیچھے ہٹتے ہوئے) کبھی نہیں کبھی نہیں۔ ابے آلو کے پٹھے ایک دم سے پھٹ گیا تو ؟

حلیم - (بم جیب میں رکھ کر) نہیں وہ نہیں پھٹیگا۔ وہ ناقص ہے۔ بالکل ناقص۔ (کڑک کر) تو اب کام کی باتیں کیجئے +

شجاعت - کیا چاہتے ہو تم؟ کہتے کیوں نہیں؟ میں کیا کروں ؟

حلیم - بات اصل یہ ہے۔ کہ اس وقت آپ کو اپنے ہاتھ سر سے بلند کئے ہوئے کھڑا ہونا چاہئے تھا۔ تاہم چچا ہونے کی حیثیت سے میں رعایت سے کام لونگا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری منگنی کے موافق کریں اور بلقیس کو ——— آپ جانتے ہیں میرا کیا مطلب ہے۔ مجھے کہتے ہوئے شرم دامنگیر ہوتی ہے!

شجاعت - اور میں انکار کروں تو مجھے مارڈالے گا ؟

حلیم - ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ ہاں ہم اس سین کو کلی دھرائیں گے۔ غالباً آج آپ کو اس میں مزہ نہیں آیا۔ ہے کہ نہیں ؟ اس میں اور بہت سی باتیں ہیں۔ جو چھوٹ گئی ہیں۔ ہم اسی طرح اس سین کا ریہرسل ہر روز کرتے رہیں گے۔ کسی روز آپ نامعقولوں کی طرح پیش آئے تو بس سمجھ لیجئے اُس روز آپ کا خاتمہ بالخیر ہوجائے گا۔ شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ خیر کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ مگر اس دنیا میں کسی بات کا یقین نہیں۔ چچا میاں خوف بڑی بُری چیز ہے۔ بعض اوقات ادھیڑ آدمیوں کی اس خوف کی وجہ سے روح پرواز کر جاتی ہے +

شجاعت - ہشت! میں ایسی باتوں سے ڈرنے والا تھوڑی ہوں!

حلیم - آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ آپ ایسی باتوں سے ڈرنے والے تھوڑی ہیں۔ واقعی میں نے بڑی غلطی کی (ریوالور سے نشانہ لیتے ہوئے) تو مجھے آخر مجبور کرنا ہی پڑا۔ مجبوری انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔ ایک ——— دو ———

شجاعت (گھٹنوں کے بل جھک کر ہاتھ جوڑ دیتا ہے اور گلوگیر آواز میں کہتا ہے) حلیم! میرے پیارے حلیم! رحم کر! رحم کر! دیکھ وہ بیوہ ہو جائینگی۔ تجھے تیری شرائط منظور ہیں۔ اچھا بلقیس کی شادی تجھ سے ہی کرونگا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ پیارے حلیم! مجھے مت مار! بلقیس کی خاطر میری جان بخشی کر!

حلیم - (اس کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے) جناب ایسے کام کرنے کا طریقہ آپ کہاں آرام سے تشریف رکھئے۔ میں چچی جان کو بلا لاتا ہوں۔ میرے آنے تک آپ اپنی طبیعت کو سنبھال لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے قلب کی حرکت یک لخت بند ہوجائے۔ میں ابھی آتا ہوں (جاتا ہے)

[مرزا شجاعت نیند سے چونک پڑتے ہیں اور وحشت زدہ ہوکر چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہیں۔ ران میں چٹکی لیتے ہیں۔ سر کھجاتے ہیں۔ گھڑی دیکھتے ہیں۔ اور پھر کمرہ کے در و دیوار پر وحشت سے نظر کرتے ہیں۔ چہرے سے پسینہ جو غیر معمولی مقدار میں آرہا ہے۔ پونچھتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے۔

... حلیم کچھ چباتے ہوئے داخل ہوتا ہے]

حلیم۔ چچامیاں۔ سنا آپ نے مجھے یاد کیا؟

شجاعت۔ (اور زیادہ حیران و پریشان ہوکر) ہاں۔ ہاں۔ درست ہے بیٹا ہاں ٹھیک۔ بے شک میں نے تمہیں یاد کیا۔ کیا کر رہے تھے تم؟

حلیم۔ (متعجب ہوکر) ناشتہ کھا رہا تھا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہوئی؟

شجاعت۔ ٹھیک ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ درست ہے۔ اس میں کیا شک ہے؟ بالکل درست +

[کھسیانی ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں]

حلیم۔ کیا بات ہے چچا شجاعت؟ آپ کے دشمنوں کا مزاج ناساز معلوم ہوتا ہے +

شجاعت۔ میں۔ میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کرسی پر اخبار پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ غیر معمولی بات تھی بالکل غیر معمولی +

حلیم۔ سویرے اٹھنے کا سبب ہے یہ۔ ناشتہ کے بعد نیند آنے لگتی ہے +

شجاعت۔ حلیم۔ میں تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ (اپنے بازو کی کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

حلیم۔ (مرزا صاحب کے سامنے کی کرسی گھسیٹتے ہوئے) آپ اس پر بیٹھئے میں یہاں آرام سے ہوں +

شجاعت (جلدی سے) نہیں نہیں۔ تم یہاں آؤ (وہ آرام کرسی حلیم کو دیتے ہیں اور خود بازو والی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) اس پر بیٹھ جاؤ مجھے ڈر ہے کہیں پھر میں سو نہ جاؤں۔ قہ قہ قہ!

حلیم۔ بہت اچھا +

[ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے۔ مرزا صاحب کانپنے لگتے ہیں اور اس کی طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حلیم پان کی ڈبیہ جیب سے نکالتا ہے اور پیش کرتا ہے۔ مرزا صاحب ایک گہری سانس لے کر ایک پان لیتے ہیں]

شجاعت۔ تو حلیم اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

حلیم۔ اپنی وردی جلانا، ریوالور بیچنا اور ——

شجاعت۔ (ریوالور بیچنا؟ ایں؟

حلیم۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں۔ مجھے اب اس کی کوئی ضرورت ہے؟ (حیرت سے مرزا کا منہ تکنے لگتا ہے)

شجاعت نہیں۔ نہیں۔ آہ! نہیں —— نہیں نہیں —— کوئی ضرورت نہیں تم ٹھیک کہتے ہو (کھسیانی ہنسی ہنسکر) تم اب گھر واپس آگئے ہو۔ یہاں ریوالوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ ایں؟

حلیم۔ (مرزا صاحب کو گھورتے ہوئے) جی نہیں۔ کم از کم میں نہیں سمجھتا +

شجاعت (جلدی سے) بالکل ٹھیک کہتے ہو تم۔ اس کے بعد تمہاری شادی کا سوال ہے +

حلیم۔ (جمائی لیتے ہوئے) ہاں۔ ہاں۔ میں نے اب تک اس کے متعلق کچھ نہیں سوچا +

شجاعت۔ بلقیس سے شادی کرنا چاہتے ہو تم۔ ہے کہ نہیں؟ (تجسس نگاہوں سے اس کو گھورتے ہیں)

حلیم۔ (علامت استفہام ہوکر) بلقیس سے؟!

[سر کھجاتا ہے اور حیرانی سے خیال کرتا ہے کہ یہ بیہودہ خیال اس کے دماغ میں بس کیا]

شجاعت کیوں؟ کیا تم اسے دل و جان سے نہیں چاہتے ہو؟ مانا تمہارے چار سال میدان جنگ میں گذرے۔ لیکن اس سے کیا ہوا؟ اگر تم نے اپنے چار سال خراب کئے تو دوسروں نے بھی خراب کئے ہیں (وہ مبہم طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ یہ دلیل پہلے بھی بن چکا ہے)

حلیم۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں بلقیس کو چاہتا ہوں؟ خوب! آج تک تو یہ خیال میرے دل میں نہیں آیا۔ میں اس کو اپنی بہن سمجھتا ہوں میں اس سے شادی کروں! چچا میاں آپ بھی عجیب عجیب باتیں سوچتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے لئے بیوی کسی غیر گھرانے سے لانا چاہتا ہوں اور یہ چچی اور آپکی مرضی پر منحصر ہے +

شجاعت۔ سچ کہتا ہے۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ تو بلقیس کے پیچھے ہاتھ دھوکر اور پنجے جھاڑ کر پڑا ہے۔ خیر میں تیرے لئے ایک حور سی بیوی ڈھونڈ لاؤنگا۔ یا یوں کہو وہ ڈھونڈ لائینگی +

حلیم۔ شکریہ چچا شجاعت شکریہ۔ ایک دفعہ جب جنگ سے نجات مل چکی ہو تو سب کام ٹھیک ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم جنگ کیا چیز ہے؟ خوف کس کو کہتے ہیں —— ہاں چچا میاں۔ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ خوفزدہ ——

سچ مچ خوفزدہ ہونا کیا چیز ہے؟

شجاعت۔ (پریشان ہوکر) میں ۔۔ میں ۔۔ میں ۔۔ شاید۔ (کھانستا ہے)

حلیم۔ نہیں۔ نہیں۔ آپ نہیں جانتے موت کا خوف کیا چیز ہے! اب وہ زمانہ گزر چکا ہے +

شجاعت (اُٹھ کر) اچھا۔ اب ہم تمہیں اپنے دفتر لے چلیں گے اور وہاں ہمارے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے تمہارا تعارف کرایا جائیگا اچھا آدمی ہے۔ لیکن سپاہیوں کے ذرا خلاف۔ لیکن وہ سنکر بہت خوش ہوگا کہ تم میرے بھتیجے ہو۔ چلو آؤ۔ میرے ساتھ +

حلیم۔ (مسکرا کر) اگر وہ مجھ سے ملکر خوش نہ ہوا تو ——— بہتر ہوگا اگر میں اپنا ریوالور ساتھ لے چلوں +

شجاعت (قہقہہ بلند کے ساتھ) ریوالور! قہ قہ قہ! خوب مذاق کیا تم نے؟ ہا ہا ہا! بڑا سنجیدہ مذاق رہا۔ کیوں؟ مگر صرف مذاق! ہا ہا ہا! ہی ہی ہی!! خوب! صاحب بڑے شوخ مزاج ہو اور خوش مذاق ہوگئے تم! قہ قہ قہ ہا!!!

[حلیم ہا ہر جاتا ہے۔ مرزا صاحب اُس کے پیچھے پیچھے دروازے تک جاتے ہیں۔ اور پھر مڑکر حیرت سے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا یا واقعہ؟ وہ آج تک یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے]

پردہ

(خاص) **"ناکارہ" حیدرآبادی**

طائر کا نغمہ

آسمان اپنا نور ہم میں بھرتا ہے۔ اور ہم اُسے اپنے نغموں سے معمور کر دیتے ہیں +

جب ہوا مستانہ وار ہمارے بازوؤں کو دعوت پرواز دیتی ہے تو ہم فضا کو اپنے سروں سے مرتعش کر دیتے ہیں +

اے **شعلۂ دشت!** تیری شمع ہائے گل شعلہ زن ہیں۔ تو نے ہمارے نغموں کو بلند کر دیا ہے ———— اُن لبوں سے جو جذبات شباب سے سرخ ہیں +

بہار کی پرنم ہوا میں آم کے ننھے ننھے پھول نامعلوم کو اپنا پیغام سناتے رہتے ہیں۔ اور نوزائیدہ اوراق شجر دن بھر خواب دیکھتے رہتے ہیں +

اے **سرس!** تو نے اپنے "دام تعطر" کو بسیط کرکے ہمارے دلوں کو مقید کر لیا ہے۔ تاکہ ہر ایک میں سے نغمے پھوٹ پڑیں!"

محبت کی ٹیس

اے دنیا! میں نے تجھ میں سے ایک پھول توڑا! اور اُسے اپنے قلب سے لگا لیا ———— مگر اُسکا کانٹا چبھ گیا۔ جب دن کی روشنی رفتہ رفتہ مدہم ہوکر تاریکی چھا گئی۔ تو میں نے دیکھا کہ پھول تو سرجھا گیا تھا ———— مگر درد کی کسک ابتک باقی تھی +

اے دنیا! تجھ میں بہت سے نئے نئے نکہت بار پھول پیدا ہونگے۔ اور تو ان پہ فخر کرے گی +

مگر میرے لئے گلچینی کا زمانہ ختم ہوگیا ——— میرا گلاب میرے پاس نہیں ہے ——— تاریک رات کیلئے صرف دل کی کسک اور محبت کی ٹیس ہے!"

(ٹیگور) **ظفر قریشی دہلوی**

(خاص)

دیوانگی

(از جناب سردار نبی خاں ایم اے۔ بی۔ ٹی)

دیوانوں کو لوگ تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ اکثر ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی صحیح العقل اور سیانا انسان بھی ایک آدھ بات ایسی کر گذرے۔ جو دوسروں کے مزاج کے خلاف ہو۔ تو اس کو بھی تحقیراً دیوانہ کہہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ نہیں جانتے۔ کہ دیوانگی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جس پر یہ بلا کبھی نہ کبھی (گو ایک لمحہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو) مسلط نہ ہوتی ہو۔ اگر آپ کو اس میں کلام ہو تو تحقیق کر لیجئے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا +

دیوانگی بھی حقیقت میں ایک نفسی کیفیت ہے۔ اور ہر نفسی کیفیت کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان پہلے اپنے افعال و اقوال کا جائزہ لے۔ یا دوسروں کے حرکات نفسی کا اس طرح مشاہدہ کرے۔ کہ ہر پیکر حیات کی حرکات اور ان کے موجبات خود بخود اس پر ظاہر ہو جائیں اگر آپ دیوانگی کو سمجھنا یا اس کے وجود کا اثبات چاہتے ہیں۔ تو آپ کو بھی انہی دو مذکورہ طریقوں پر عمل کرنا پڑیگا +

پیشتر ازیں کہ دوسروں کے حالات پر غور کیا جائے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم خود آپ کے حالات زندگی کا بالاختصار تجزیہ کریں جس سے ہمارے دعوے کا ایک ثبوت مل جائے۔ ہم مانتے ہیں کہ آپ متین اور رشتہ انسان واقع ہوئے ہیں۔ آیئے اور ہمارے ساتھ مل کر اپنے چند حسرکات نفسی کا مطالعہ کیجئے۔ اور فرمایئے۔ کہ کس طرح آپ اپنی دیوانگی سے انکار کرتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے ہم آپ کی زندگی کے ایک دن سے چند واقعات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ فرض کیجئے آج اتوار کا دن ہے ملازمت کے جھمیلوں سے کم از کم آج کے لئے آپ آزاد ہیں۔ آپ نے صبح اٹھ کر نماز وغیرہ اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر بچوں کو جگانا شروع کر دیا ہے۔ تاکہ بچے اٹھ کر آپ کے شریک صحبت ہوں۔ اور اس فرصت میں آپ کی دلگی کا موجب ہوں۔ آپ کا ایک بچہ رونی صورت بنائے منہ بسور کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کو اس کی یہ حرکت ناگوار خاطر گذرتی ہے۔ لیکن محبت پدری تقاضا یہ ہے۔ کہ آپ اُسے چپ کرائیں مگر ننھے میاں ہیں کہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ ہزار جتن کے بعد بھی ناکامی ہوتی ہے۔ آخر آپ بچے کو اٹھا کر جلدی جلدی ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن بچہ ہے۔ کہ اس پر بھی روئے چلا جاتا ہے۔ اب آپ نے ایک اور حیلہ سوچا۔ اور اچھلنا شروع کر دیا۔ اور پھر ہوا میں اچھالنا لگے لگتے ہیں۔ بچہ فی الفور ہنسنے لگتا ہے۔ اور خوش ہو جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں۔ کہ آپ نے بچے کو تو چپ کرا لیا۔ لیکن ذرا خدا لگتی کہئے۔ اور فرمایئے۔ کہ کیا آپ کی یہ حرکات مخبرہ دیوانگی نہیں اس سے جب نجات ہوئی اور بچے اپنے اپنے کسیل میں لگ گئے۔ آپکو غسل کا خیال آیا۔ نوکر کو حکم ہوا کہ غسل کا انتظام کریں۔ اس کے نکلتے ہی آپ نے جونہی غسل خانہ میں قدم رکھا۔ آپ پر ایک نئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ وہاں نہ کوئی سننے والا ہے۔ اور نہ کوئی ایسا فرد موجود ہے۔ جو آپ کی داد دے سکے۔ لیکن آپ ہیں کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر برابر گاتے چلے جا رہے ہیں۔ اور راگ پر راگ الاپا جا رہا ہے۔ اب آپ ہی فرمایئے۔ کہ کیا یہ فرزانگی ہے۔ اور اگر فرزانگی نہیں۔ تو یقیناً دیوانگی ہے۔ نہانے سے فراغت ہو لی۔ تو آپ کپڑے بدلنے لگتے ہیں۔ آئینہ کے مقابل کھڑا ہونے سے آپ کا مقصد تو یہ تھا کہ آپ اپنے ان عضدوں کو جو آنکھ سے اوجھل ہیں دیکھ سکیں اور دیکھکر آنہیں آراستہ کر سکیں۔ مگر ایک لمحہ کے لئے آپ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کبھی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں۔ اور کبھی گردن گھما دھر

ہلاتے ہوئے مختلف حالتوں میں کھڑے ہو کر منہ بھی چڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اپنی ان حرکات کی داد "خندہ زیر لب" سے دیتے جاتے ہیں۔

اب فرمائیے یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر جب بچے قیلولے کے لئے لیٹتے ہیں۔ تو آپ اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی بیگم صاحبہ سے ہنسی مذاق شروع کر دیتے ہیں۔ مگر بیگم صاحبہ ہیں کہ کسی مضمون کی دُھن میں محو ہیں۔ اور چاہتی ہیں۔ کہ ایک لمحہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ ان کو آپ سے چھٹکارا ملے۔ اور دل سے دعا کرتی ہیں کہ آپ کسی بہانے باہر تشریف لے جائیں۔ اس وقت آپکی حالت قابل رحم ہے۔ چہرے سے عاجزی اور مغلوبیت کے نشان ہویدا ہیں۔ اور سچ کہا جائے۔ تو آپ عاجزی کا بت بلجاجت کا مجسمہ اور بے بسی کا نمونہ بنے کھڑے ہیں۔ اس وقت آپ کی متانت۔ آپ کی ثقاہت آپ کی عقلمندی۔ آپ کی دانشمندی۔ آپ کی فہم و فراست۔ آپکی خودداری سب کی سب یکقلم جواب دے جاتی ہیں۔ اور آپ کھیانے بنے اپنا سا منہ لئے کھڑے ہیں۔ جب آپ کی یہ حالت ہے۔ تو بتائیے کہ آپ دیوانہ ہوئے یا نہیں +

یہاں تک تو ہم نے دیوانگی کو ایک تاریخی منظر کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ آیئے اب ذرا ایک فلسفی کے نقطۂ نگاہ سے بھی اسکا مطالعہ کریں اور دیکھیں۔ کہ دیوانگی کیا چیز ہے +

یہ تو ابتدا میں ہی بتایا جا چکا ہے۔ کہ دیوانگی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور آپ کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے اس کی تصدیق بھی ہو چکی۔ لیکن دیوانگی ایک نفسی کیفیت ہے۔ اور اگر تمام نفسی کیفیات کا تجزیہ کیا جائے تو آپ دیکھیں گے۔ کہ بعض بعض حالات کے اندر بیرونی روح خاص خاص واقعات، حالات یا چیزوں سے متاثر ہو کر بلا ارادہ کسی ایک خاص قسم کے فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ جیسے انسان جب کسی چیز کو اندھیرے میں دیکھتا ہے۔ تو بلا ارادہ اُس کے دل میں ایک قسم کا خوف مسلط ہو جاتا ہے۔ اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا اسیطرح ایک بوڈا رکتا جب جنگل میں کسی خاص قسم کی بو پاتا ہے۔ تو اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ غرض اسی طرح کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ کہ قدرت نے چند جذبات نفس انسانی میں مخفی کر رکھے ہیں۔ جو خود بخود موقع بموقع ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان حسیات قلبی کو تین قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے +

اوّل۔ وہ جو صرف ایک ذات کے متعلق ہوں۔ جیسے خوف وغیرہ +

دوم۔ وہ جو دوسروں سے تعلق تو رکھتے ہوں۔ لیکن عمومیت سے خالی ہوں۔ جیسے مہر مادری شفقتِ پدری وغیرہ +

سوم۔ وہ جو بالمجاز ایک جماعت سے متعلق ہوں۔ مثلاً حب وطن اور انس وغیرہ +

یہ باتیں بنفسہٖ کچھ بُری نہیں۔ بلکہ قیام حیات کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ لیکن جب وہ اسقدر بڑھ جائیں کہ حد اعتدال کو توڑ چھوڑیں۔ دوسری ضروری باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ تو لوگ اس کو دیوانگی سے تعبیر کریں گے۔ مثلاً ایک شخص شیر سے اسقدر خوف کھانے لگتا ہے۔ کہ محض شیر کا نام لینے سے وہ لرزہ براندام ہو جائے۔ تو لوگ اُس کو دیوانہ کہیں گے۔ اسی طرح سے ایک شخص اپنے بچوں کی محبت کو جو درحقیقت بچوں کی پرورش کا ایک خاص ذریعہ تھی۔ اسقدر بڑھا لیتا ہے کہ وہ اُن کی خاطر دوسروں کے بچوں کو مارنے یا ایسے اور گناہ کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ تو وہ بھی دیوانہ کہلائے گا +

دیوانگی کی تقسیم ایک اور حیثیت سے بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر وہ ایک شخص تک ہی محدود ہے۔ تو وہ انفرادی دیوانگی کہلائیگی۔ لیکن اگر ایک جماعت سے علاقہ رکھتی ہے۔ تو اس کو اجتماعی دیوانگی کہیں گے۔ اجتماعی دیوانگی بھی انفرادی دیوانگی کی طرح پیدا ہوتی ہے اور اُس کے موجبات و محرکات بھی بالکل وہی ہیں گو وہ آخر میں قومی خصائص تصور ہونے لگتے ہیں +

(خاص)

سردار

چلّہ کشی

از جناب میرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

ہم تحصیلی اسکول میں اردو مڈل میں پڑھتے تھے اور ہمارے والد صاحب تمنّا تھی کہ کسی طرح ہم جلد مڈل پاس کر کے پٹواری ہو جائیں اور ہماری شادی کر دی جائے۔ مگر ہماری قسمت بھی عجیب تھی۔ دو سال سے برابر فیل ہو ہوتا لوگ ہمکو کوڑھ مغز کہتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہمارے دماغ میں بھس بھرا ہے اور کوئی کہتا تھا گوبر بھرا ہے اور ہم الو ہیں۔ مگر ذرا انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ہماری کچھ خطا نہ تھی۔ اگر ہم سبق یاد کریں اور پھر بھی بھول جائیں۔ تو ہم الو کیونکر ہوئے +

ہمارے اسکول کے ہیڈ مدرس منشی رام سہائے کایستھ تھے۔ اور نہایت ہی خطرناک آدمی تھے۔ ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہمارے والد صاحب نے ہمیں اُن کے سپرد کیا تو یہ لفظ کہے تھے کہ "منشی جی اس لڑکے کی ہڈی پسلی ہماری اور گوشت اور چمڑا تمہارا مگر یہ لڑکا لائق نکلے"۔ ظاہر ہے کہ ان خطرناک منشی جی کو ہمیں مارنے کوٹنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ جب اُن کے حق میں گوشت اور پوست کا اس طرح ہبہ نامہ کر دیا جائے +

ہر سال ہمارے فیل ہونے پر منشی جی ہم کو کوٹ کوٹ کر درست کرتے تھے۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت ہمارے فیل ہونے سے ہمارے اوپر یہ نازل تھی کہ ہماری شادی محض اسی وجہ سے رُکی ہوئی تھی۔ کہ ہم فیل ہو جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ ہماری نالائقی مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہم کو اندیشہ تھا کہ کہیں خطرناک صورت اختیار کرلے +

ہمیں سب سے زیادہ ڈر اس کا تھا کہ ہماری منگیتر اور محبوبہ کی اسی گڑبڑ اور نالائقی کے چکر میں کہیں دوسری جگہ شادی نہ ہو جائے۔ کیونکہ ہم کو پھر ایسی لڑکی ملنا ناممکن تھی۔ یہ لڑکی ہمارے گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کی لڑکی تھی۔ جو ہمارے پڑوسی تھے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہمارے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھی۔ اور دونوں کے دل ملے ہوئے تھے۔ جب ہم خیال کرتے تھے کہ اس فیل ہونے کی وجہ سے ہماری منگیتر چھن جائے گی تو ہمارا مارے فکر کے بُرا حال ہوتا تھا +

(۱)

امتحان میں ہم تیسری مرتبہ شریک ہوئے تھے۔ آپ خود اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے پاس ہونے کا کہاں تک یقین تھا۔ کہ امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں پیٹتے پیٹتے منشی جی نے ہمارا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اور پھر ہم سے پختہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تو کہیں فیل ہو گیا تو تجھے قتل کر دونگا۔ ڈر کے مارے ہمارا خون یہ حال تھا کہ ہم خود کہتے تھے کہ اگر زندگی ہے تو پاس ہی ہوں گے۔ قصہ مختصر منشی جی کو اور ہمارے والد صاحب کو ہمارے پاس ہونے کی بہت کچھ امید تھی +

امتحان کے نتیجے کا دن آیا۔ تو ہمارے دل میں ایک عجیب امنگ اور گدگدی تھی۔ ہم محوِ خیال تھے۔ اور خود اپنے کو دولھا بنا ہوا دیکھتے تھے۔ اور کبھی یہ سوچتے تھے کہ جب ہمارے والد صاحب کے ملنے والے ہمیں مبارکباد دیکر ہماری قابلیت کی تعریف کریں گے۔ تو مارے شرم کے ہم کیا جواب دیں گے۔ غرض خیال ہم کو کہیں سے کہیں لئے جا رہا تھا +

خدا خدا کر کے گزٹ ہاتھ میں آیا اور ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کو کھولا۔ ہمارے اسکول کا نام ہماری نظر کے سامنے تھا۔ اور ہم تیزی سے اپنا نام کامیاب طلبہ کی فہرست میں تلاش کر رہے تھے۔ ہمارے والد صاحب قبلہ ہمارے کاندھے پر کھڑے تھے۔ اور چونکہ ان کو ہماری کامیابی کی پوری توقع تھی۔ لہٰذا اُن کی باچھیں ابھی سے کھلی ہوئی تھیں +

ہم نے دل میں کہا "ہائے" ہمارا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ ہم نے جلدی سے آنکھوں کو ملا اور خوب غور سے اپنے

ام کو پھر دیکھا۔ مگر وہاں بھلا کہاں۔ بدن میں رعشہ سا آ گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ اور گرتے گرتے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ ہمارے والد صاحب نے غضبناک ہو کر کہا "ارے! کیا تو پھر فیل ہو گیا؟" ہم بھلا اس کا کیا جواب دیتے۔ چپ رہے۔ مگر ہمارے والد صاحب قبلہ پھٹ پڑے۔ مارے غصہ کے اُن کا بُرا حال ہو گیا۔ اور اُنہوں نے جوتا لے کر جو ہماری مرمت کرنا شروع کی تو ہمیں بچھا بچھا اور لٹا لٹا دیا اور اس کے بعد ہمیں بیلوں کے چارہ کی کوٹھری میں بند کر دیا۔ ہم کوٹھری میں بے آب دانہ پڑے رہے اور دن بھر آنے جانے والے ہمارے اوپر تبرا بھیجا کئے۔ رات گئے ہماری اماں جان نے ہمیں اس قید خانہ سے رہا کیا۔ جب جا کر کہیں کھانا ملا +

آٹھ دس دن تک ہمارے اوپر چاروں طرف سے لعنت و پھٹکار برسا کی۔ حالانکہ ہم کو ایسی فضول باتوں کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔ مگر منشی رام سہائے کا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ کیا کہیں گے منشی جی سے ہمارے والد اور چچا بھی ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ اُن کے بھی اُستاد رہ چکے تھے اور بہت مارا تھا +

ہم دل میں سوچ رہے تھے۔ کہ منشی جی کی بلا اُس گئی۔ اور وہ اب نہیں آئیں گے۔ کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ صبح آٹھ بجے ہونگے اور ہم باہر بیٹھے منہ دھو رہے تھے۔ ایکدم سے ایک یکہ آ کر رُکا۔ ہم نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور ملک الموت کو دیکھ کر گویا ہمارے دیوتا کوچ کر گئے۔ منشی رام سہائے جی سے اس کے کہ اپنا بستر اور لوٹا یکہ پر سے اُتارتے۔ یا ہمارے والد کے سلام کا جواب دیتے۔ بس چیل کی طرح ہمارے اوپر جھپٹے "منشی جی" روتے ہوئے ہمارے منہ سے نکلا اور ہم ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مگر بھلا وہاں رحم کہاں منشی جی نے ایک لکڑی سے ہماری مرمت شروع کی "پھر فیل ہو گا" "پھر فیل ہو گا" کی صدا پر ہم ڈنڈے جا رہے تھے اور تڑپے تڑپے پھرتے تھے۔ مگر منشی جی مارنا نہ بند کرتے تھے۔ جب ہمارا پٹتے پٹتے بُرا حال ہو گیا۔ تو منشی جی نے ہاتھ روکا۔ اور لکڑی لئے سیدھے ہمارے والد صاحب کی طرف ان کو "اُلو اور گدھا" کہتے ہوئے اس طرح بڑھے کہ ہمیں اس مصیبت کے وقت میں بھی ایک خوشی اور اُمید کی جھلک نظر آنے لگی۔ مگر اُن کے ساتھ اُنہوں نے رعایت کی اور اُن کو مارا نہیں۔ مگر کہنے کے معاملہ میں کوئی بات نہ اُٹھا رکھی۔ قصہ مختصر ہمارے والد صاحب کو انہوں نے پیٹتے پیٹتے چھوڑا۔ اور دراصل وہ بال بال بچے۔ کیونکہ منشی جی ہمارے فیل ہونے کا سارا الزام اُنہیں کے سر تھوپ رہے تھے۔ والد صاحب کے بعد اماں جان کا نمبر آیا۔ اور ان کو بھی منشی جی نے خوب بُرا بھلا کہا +

دو تین روز منشی جی ہماری چھاتی پر کودوں دلا کئے۔ اور اس دوران قیام میں کبھی جانتا اور کبھی تھپڑ اور کبھی جوتا ہمارے اوپر پڑتا رہا۔ جب منشی جی کی واپسی کے لئے یکہ آیا تب جا کر ہماری جان میں جان آئی۔ چلتے وقت ہم نے اپنے ظالم اُستاد کے قدم چومے۔ اور وہ روانہ ہوئے۔ یہ حضرت واصل غجیب آدمی تھے۔ نتیجہ شائع ہونے کے بعد تمام طالب علموں کے ہاں کا دورہ کر کے فیل ہونے والوں کا یہی حال کرتے تھے۔ غرض صرف ہمیں مارنے کے لئے آئے تھے +

(۲)

ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہم کیا تدبیر کریں جو پاس ہوں۔ اب چوتھی مرتبہ امتحان کی تیاری کرنا تھی۔ وہی مضامین اور وہی سب کتابیں۔ رہ رہ کر سوچتے تھے کہ آخر ہم کیا تدبیر کریں جو پاس ہوں +

ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم اس خلجان میں پڑے ہوئے اپنی قسمت پر رو رہے تھے۔ کہ ہمارے گھر کی اور پڑوس کی تمام عورتیں کسی دوسری جگہ ایک موت میں گئیں۔ ہم چھت پر چڑھ گئے اور اپنی دیوار پر چڑھ کر دوسرے مکان کی چھت پر آہستہ سے کود گئے۔ چپکے چپکے رینگتے ہوئے سامنے کی دیوار کے پاس پہنچے۔ اُسے پار کر کے اپنی سسرال کی چھت پر پہنچے۔ جھکے جھکے چھجہ کے پاس پہنچ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک لڑکی برآمدہ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ ہم محو دیدار تھے۔ کیونکہ یہی ہماری ہنگیتر یا منسوبہ بیوی تھی۔ ہم نے آہستہ سے سیٹی بجا کر اُس کو اپنی طرف مخاطب کیا۔ اُس نے ہم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور دور کر دروازہ کی کنڈی لگا دی۔ ہم جھٹ سے نیچے اُتر آئے۔ اور بے اختیاری کے عالم میں اُس کے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر رونے لگے۔ سب سے پہلے تو اُس نے ہمارے پٹنے پر اظہار غم کیا اور پھر ہمدردی کی۔ اور پھر اس کے بعد ہماری ہمت بڑھائی۔ اور اطمینان دلایا کہ ابکی مرتبہ ضرور پاس ہو جاؤ گے۔ ہم نے کہا کہ اب ہمت بس کی بات نہیں جو ہم اس مہم کو فتح کر سکیں۔ یا اس بارگراں کا ذمہ لے سکیں۔

بڑی بڑی تدبیریں سوچیں مگر امتحان سے کوئی مفر کی صورت نہ نظر آئی۔ مگر کسی نے کہا ہے ع۔ دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ دو دماغ ڑیں اور کوئی تدبیر نہ نکلے یہ ناممکن ہے۔ سوچتے سوچتے یکایک ہماری منسوبہ

کو خیال آیا اور اس نے وہ تجویز پیش کی کہ ہم مارے خوشی کے اچھل پڑے یہ واقعہ تھا کہ شہر کے بڑے شاہ صاحب نے اس کی ماں کو ایک ایسا وظیفہ بتایا تھا کہ وہ ہارا ہوا مقدمہ جیت گئی تھیں۔ ہم نے شاہ صاحب کا پورا نام و پتہ معلوم کیا۔ اور دل میں ٹھان لی کہ ضرور ان شاہ صاحب سے رجوع کریں گے۔ اس کا اور ہمارا دونوں کا خیال تھا کہ شاہ صاحب کے محض ایک وظیفہ میں یہ امتحان کی مشکل حل ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد ہم خوش خوش رخصت ہوئے۔ کامیابی کی امید دل میں ایک اُمنگ پیدا کر رہی تھی +

(۳)

شاہ صاحب نے سب سے پہلے تو ہمیں مرید کیا اور اس بکھیڑے میں ہمارے پانچ روپے خرچ ہوئے۔ جو ہمیں چلتے وقت ہماری منگیتر نے دیئے تھے۔ کیونکہ وہ رئیس کی بیٹی تھی۔ اور ہمارے پاس کوڑی نہ تھی۔ جب ہم نے شاہ صاحب سے اپنی مشکل بیان کی تو انہوں نے مسکرا کر کہا کہ ابھی کیا جلدی ہے جب امتحان قریب آ گئے تو ہمارے پاس آنا۔

سال بھر ہمارا بڑی طرح گذرا۔ بشمی جی بات بات پر ہمیں مارتے تھے اور ہدی پسلی ایک کئے دیتے تھے۔ چونکہ شاہ صاحب کے پاس ہم جب کبھی بھی جاتے۔ اپنی کامیابی کا اور بھی پختہ یقین ہو جاتا۔ لہذا قدرتاً پڑھنے کی طرف کم توجہ ہوتی اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اور بھی پٹتے۔ اس سال ہم ضرورت سے زیادہ پٹ رہے تھے۔ حتیٰ کہ تنگ آ کر ہمیں شاہ صاحب سے پٹنے کے بچنے کا ایک تعویذ لینا پڑا۔ اس تعویذ نے ہمیں اور بھی پڑھنے سے باز رکھا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اتنا پٹنے لگے کہ ہم سمجھے کہ تعویذ شاہ صاحب نے کہیں غلطی سے اُلٹا تو نہیں دیدیا۔ چنانچہ ہم نے تعویذ کھول کر الگ کیا۔ اور ذرا پڑھنے کی طرف توجہ کی تب جا کر کہیں مار پڑنا کم ہوئی۔ در اصل ہم پٹتے وقت دل میں کہا کرتے کہ خیر اب آئندہ سال تو ہم پاس ہی ہو جائیں گے۔

جب ہمارے امتحان کے دو مہینے رہ گئے تو ہم شاہ صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ تم چالیس روز کا جلالی چلہ کھینچو۔ پوری تفصیل چلہ کی ہمیں تلقین کی گئی۔ یہ چلہ ایک تنہا مکان میں کھینچا جانے کو تھا۔ اور اس کے لئے ہمیں بیس روپے کی ضرورت ہوئی۔ جو ہم نے اپنی منگیتر سے

(۴)

ہم گھر سے ایک دم سے ایسے غائب ہوئے کہ گاؤں بھر ہی سوائے ہماری منگیتر کے کسی کو پتہ تک نہ چلا۔ کہ آخر ہم ہوئے کیا۔ ہم نے شہر میں جا کر سر گھٹایا۔ ایک مکان چھوٹا سا سنسان سی گلی میں کرایہ پر لیا۔ اور چالیس دن کی خوراک کے لئے جو پیسو اکر ساتھ لئے۔ ایندھن بھی کافی رکھ لیا۔ چالیس دن تک ہم سوائے جو کی روٹی کے کچھ نہ کھا سکتے تھے۔ ایک بھشتی کو ہم نے لگا لیا۔ اور اس سے طے کر لیا کہ وہ تیسرے دن پانی بھر جایا کرے۔ اور جمعہ کے جمعہ نائی بلا لایا کرے۔ کیونکہ سر گھٹانا اس میں سخت ضروری تھا۔ ہم چلہ شروع کرنے سے قبل شاہ صاحب سے ایک مرتبہ اور ملے اور انہوں نے ہمیں سب ترکیبیں دوبارہ تلقین کرنے کے بعد کچھ جنات کا بھی حال سنایا +

ہم بسم اللہ کر کے مکان میں داخل ہوئے اور اپنے ہمراہ بھشتی کو تالا اور کنجی دی کہ مکان میں باہر سے تالا ڈال دے۔ تاکہ کسی کو شبہ تک نہ ہو اور لوگ بھی سمجھیں کہ مکان خالی ہے۔ اندر پہنچکر ہم نے زمین صاف کی۔ اور اس کو لیپا پوتا۔ پھر صاف چونے سے تین حصار بنائے۔ یعنی تین کنڈیاں یا حلقے جن کو کہ اصطلاح میں حصار کہتے ہیں۔ ایک سب سے بڑا۔ اور اس کے اندر ایک اس سے چھوٹا۔ اور اس کے اندر ایک سب سے چھوٹا اس طرح بنایا (◎) جو سب سے چھوٹا تھا اس کے اندر ہم نہا دھو کر کے سر جھکا بیٹھ گئے۔ اور "یا ہادھو" کا جلالی وظیفہ شروع کر دیا +

ہمارا وظیفہ بڑے مزے میں جاری تھا۔ تین دن کی روٹی ہم ایک روز پکا لیتے۔ دن اور رات ہمارا وظیفہ میں گزرتا۔ جب نیند آتی تو حصار کے اندر ہی سو جاتے۔ ہر وقت باوضو رہتے۔ سوائے ضروریات متعورہ اور ضرورت کے حصار سے باہر نہ نکلتے تھے۔ بھشتی آتا اور چپ چاپ پانی بھر کر چلا جاتا اور نائی بھی اسی طرح سر مونڈ کر چلا جاتا۔ بات چیت کی سخت ممانعت تھی۔ اور ہم اشاروں ہی سے کام لیتے تھے۔ دنوں کے شمار کے لئے روزانہ اٹھ کر دیوار پر کوئلہ کا ایک نشان بنا دیتے تھے +

جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے۔ ہمارا قلب روشن اور منور ہوتا جاتا تھا۔ دو تین دن شروع شروع میں رات کو تو ہمیں کچھ ڈر بھی لگا کیونکہ چاروں

طرف ستانے کا عالم ہوتا تھا۔ اور ہم تن تنہا کڑوے تیل کے چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی میں اپنا جلالی وظیفہ پڑھتے ہوتے تھے۔ لیکن اب ڈر مطلق نہ لگتا تھا۔ بلکہ رات کا سناٹا دل کو اور قوت روحانی پہنچاتا معلوم ہوتا تھا +

ابھی تک ہم کو جنات وغیرہ سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ لیکن ہم ان کے لئے بھی تیار تھے۔ ایک روز ایک چھپکلی اس گستاخی سے ہمارے بالکل قریب آئی کہ ہمیں کچھ شبہ سا ہوا۔ چونکہ شاہ صاحب نے ہم سے کہہ دیا تھا کہ جنات جانوروں کی شکل میں بھی ممکن ہے کہ آئیں لہٰذا ہم نے جونہی ایک عمل پڑھکر اس کی طرف دم کیا تو اس چھپکلی کو بھاگتے ہی بنا +

(۵)

ناظرین کو معلوم ہی ہے کہ ہم گھر سے اس طرح غائب ہوئے تھے کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ہمارے غائب ہو جانے پر ہمارے والد صاحب اور چچا اور منشی جی نے بہت کچھ ڈھونڈا۔ مگر نہ پایا۔ منشی جی کا خیال تھا کہ جب امتحان کے دو مہینہ رہ جائیں گے۔ تو ہمارے اوپر خاص محنت اور توجہ کی جائیگی۔ ان حضرت کی توجہ اور محنت سے خدا ہر طالب علم کو بچائے۔ کیونکہ ان کی توجہ کے معنی تھے کہ لڑکے کو گھر پر رکھ کر دن رات مار مار کر ایسا پڑھاتے تھے کہ اس کو دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی تھی۔ اب کی مرتبہ یہ نوبت ہمارے ساتھ بھی آنے والی تھی۔ ہماری والدہ کا ہفتہ بھر کے بعد ہی برا حال ہو گیا۔ اور انہیں یقین کامل ہو گیا کہ منشی جی کی سخت گیری سے تنگ آکر ہم نے موت کو بلیک کہہ ڈالا۔ لہٰذا انہوں نے وہ واویلا مچائی کہ گھر سر پر اٹھا لیا۔ منشی جی کو ہماری اماں جان کی واویلا کی تو خاک بھی پرواہ نہ ہوئی ہوگی۔ ان کو تو محض یہ فکر تھی کہ ہم کسی طرح ہاتھ آجائیں تو امتحان قریب ہے۔ ذرا مرمت اور پڑھائی سخت کی جائے۔ مگر ہم ایسے گوشہ نشین ہوئے تھے کہ پولیس میں رپٹ لکھانے کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا +

ہم سے شاہ جی نے کہا تھا کہ ممکن ہے تمکو دوران چلہ کشی میں جنات ستائیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جنات دن کو بھی آسکتے ہیں۔ اور رات کو بھی۔ کبھی تو جانوروں کی شکل میں آتے ہیں اور کبھی دوستوں یا عزیزوں کا بھیس بدل کر آتے ہیں۔ اور طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن مقصد ان کا یہ ہوتا ہے۔ کہ وظیفہ خراب کر دیں۔ کبھی تو وہ دھمکیاں دیتے ہیں۔ اور کبھی ڈراتے ہیں۔ مگر نقصان کسی طرح بھی اس وقت تک نہیں پہنچا سکتے جبتک کہ حصار کھینچے ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جنات کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جو زیادہ خبیث ہوتے ہیں اور بری بری ڈراؤنی شکلیں بناتے ہیں وہ تو تین حصاروں میں سے ایک کے اندر نہیں آسکتے۔ آنا تو درکنا۔ اگر کہیں لکیر پر پیر بھی پڑ جائے تو جل کر راکھ ہو جائیں۔ دوسری قسم جنات کی وہ ہے۔ جو پہلے اور دوسرے حصار کے اندر آسکتے ہیں۔ مگر تیسرے حصار میں نہیں آسکتے۔ لیکن تیسری قسم جنات کی وہ ہے جو عزیزوں اور دوستوں کی شکل میں آتے ہیں۔ اور گو سب نہیں لیکن بعض۔ چونکہ ان میں سے خود عامل اور چلہ کش ہوتے ہیں۔ لہٰذا تیسرے حصار میں بھی بسا اوقات قدم رکھ دیتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں شاہ صاحب نے ہمیں ایک علیحدہ عمل بتایا تھا کہ جب ایسا ہو تو جلدی سے تیسرے حصار کے اندر اپنے اردگرد ایک چوتھا حصار انگلی ہی سے کھینچکر عمل پڑھ کر جنات کی طرف پھونک دینا۔ اور وہ دفع ہو جائیں گے +

(۶)

ہمارا وظیفہ اب قریب الختم تھا۔ اور مہینہ بھر سے زاید ہو چکا تھا۔ سوائے اس جن کے جو ہمارے پاس چھپکلی کی شکل میں آیا تھا۔ اور کوئی جن یا بھوت نہیں آیا +

جمعہ کا متبرک دن تھا۔ اور ہم نے اٹھ کر دیوار پر انتالیسویں لکیر کھینچی کل چالیسواں دن چلہ کے ختم کا اور دعا کا تھا۔ کہ چلہ سے فارغ ہو کر جو دعا بھی ہم مانگیں گے۔ وہ قبول ہوگی۔ علاوہ پاس ہونے کی دعا کے اب ہم یہ سوچ رہے تھے۔ کہ کیوں نہ کوئی دوسری دعا بھی اس میں شامل کر لیں۔ مگر پھر خیال آیا کہ شاہ صاحب نے کہا تھا۔ کہ محض ایک دعا کے لئے چلہ کھینچا جاتا ہے۔ اور گو کہ کئی دعائیں ایک ساتھ ملا لینے میں مضائقہ نہیں۔ مگر اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ دعا صرف ایک ہی قبول ہوتی ہے۔ بہت پس و پیش کے بعد ہم نے یہ طے کر لیا کہ ہم دو دعائیں مانگیں گے۔ ایک تو پاس ہونے کی اور دوسری اپنی منگیتر سے نکاح کی۔ خواہ کوئی بھی قبول ہو بات ایک ہی تھی

غرض ہم نے اس جمعہ کے دن سر گھٹایا اور نہا سے دھوئے اور خوش خوش اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔ اب گویا سارے بدن کی سوئیاں نکل گئی تھیں اور صرف پلکوں کی باقی رہ گئی تھیں +

جلال کا وقت تھا۔ یعنی دن چڑھ رہا تھا۔ اور در اصل تمام جلالی وظیفوں میں اسی مخصوص وقت میں نزول جلال باری ہوتا ہے۔ اور وظیفہ بھی زوروں پر ہوتا ہے۔ غرض یہی جلال کا وقت تھا کہ دوپہر کا وقت قریب پہنچا۔ ہم اپنے وظیفہ میں ایسے محو تھے کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ اس سناٹے کے عالم میں ایک دم سے ہمارے کانوں میں آواز آئی۔ "کیوں بے یہ کیا ڈھکوسلہ" ہم نے چھت کی طرف دیکھا۔ اور کچھ نہ پایا تو ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ جن آ گئے۔ ہم نے دل میں کہا پھر آواز آئی۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ منشی رام سہائے سامنے مکان کی دیوار پر کھڑے ہیں۔ ہم جان گئے کہ جن آ گئے۔ اور ہم نے اپنی تسبیح کو ذرا تیزی سے گھمانا شروع کیا۔ اور بجائے جواب دینے کے ہم دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ والد صاحب بھی دیوار پر آموجود ہوئے ہم برابر وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ مگر دل میں ہم ضرور ہنسے۔ کہ یہ جنات ہمیں الو بناتے ہیں۔ بھلا ہمارا کر ہی کیا سکتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یہ جنات تیسری قسم کے ہیں جو عجب نہیں کہ ہمارے حصار میں گھس آئیں۔ منشی رام سہائے ضعیف آدمی تھے۔ اور جب انہوں نے دو تین اور ڈانٹیں دیں اور ہم نے کچھ نہ سنا۔ تو وہ دیوار پر چل کر پاخانے کے پاس پہنچے اور وہاں سے اترنے لگے۔ ہم نے دل میں کہا کہ منشی رام سہائے کا بھیس تو مشکل اس جن نے لاجواب بدلا ہے۔ کہ آواز تک ہو بہو ملا دی ہے۔ مگر اس نے یہ نہ سوچا کہ بھلا ایک ضعیف آدمی کیونکر اس طرح دیواروں پر تیزی سے چل سکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ دونوں جنات جو منشی رام سہائے اور ہمارے والد کا بھیس بدلے ہوئے تھے۔ پاخانہ میں سے اتر کر ہمارے قریب آ کھڑے ہوئے۔ مگر ہم اسی طرح برابر وظیفہ میں مشغول تھے۔ ہم بڑے غور سے منشی رام سہائے کی شکل والے جن کو دیکھ رہے تھے۔ جو کوئی شرارت کا پہلو نکالنے کی تیاری کرتے ہوئے دوسرے جن کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ مگر ہم دل میں کہہ رہے تھے۔ کہ حضرت ہم آپ کے لئے تیار ہیں +

ہمارے دیکھتے دیکھتے منشی جی کی شکل والے جن نے ایک دم سے ہنسنا بند کیا۔ اور زور سے ڈپٹ کر کہا۔ "نالائق" اور یہ کہکر "ابے باجی" کہتے ہوئے حصار میں قدم رکھ دیا چشم زدن میں دوسرے حصار کو پار کر کے تیسرے میں پیر رکھا ہی تھا۔ ہم جان گئے کہ یہ قطعی تیسری قسم کا چلکش جن ہے۔ اور چھوٹے حصار میں گھس آئے گا۔ ہم نے پھرتی سے انگلی سے خاص چوتھا حصار بنایا۔ اور عمل شریف پڑھ کر اس گستاخ جن کی طرف جو منہ بڑھا کر پھونکا تو ہمارے بائیں گال پر اس زور سے کوئی ۸۰ فیگر جا پڑا کہ ہمارا منہ پھر گیا۔ ہم کچھ سوچنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ ہمارا کان اس خطرناک جن کے ہاتھ میں تھا۔ اور ہماری مانہ گھٹی کھو پڑی پر منشی رام سہائے کی جوتہ بج رہا تھا۔ تڑاتڑ! تڑاتڑ! دو تین جوتوں تک تو ہم یہی سمجھے کہ یہ جن ہے اور ہم نے وظیفہ تک بند کیا۔ مگر جوتہ اس زور سے پڑ رہا تھا کہ فوراً ہی حقیقت آشکارا ہو گئی۔ یعنی یہ کہ بڑی بری طرح منشی رام سہائے ہماری تواضع کر رہے تھے۔ اور برابر یہ کہہ رہے تھے۔ کہ "تو نے مجھکو بدنام کیا۔ تو امتحان کے زمانہ میں بھاگ آیا۔ یہ سب تیرے نالائق باپ کی خطا ہے" "آج تجھ کو زندہ نہ چھوڑونگا" "آخر یہ تو کیسا رٹا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ قصہ مختصر منشی رام سہائے نے تھوڑی ہی دیر میں ہمارا وہ حال کر دیا۔ کہ بیان سے باہر۔ جب انہوں نے خوب جی بھر کر پیٹ لیا۔ اور ہمیں مارتے مارتے پیٹتے پیٹتے پٹڑا کر دیا تب جا کر کہیں چھوڑا۔ ہم کھڑے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ اور اکا دکا چانٹا پڑ ہی جاتا تھا۔ اور سوالوں کا جواب دے رہے تھے +

ہمیں بھشتی کا نام اور پتہ بتانا پڑا۔ جس کے پاس کنجی تھی۔ دروازہ پر یکہ والا موجود تھا۔ جو کواڑ کی دراز میں سے جشن تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بھشتی کے پاس سے کنجی لایا۔ اور ہم یکہ پر بیٹھ کر اپنے گھاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ جب مار کاٹ دیکھ کر ہوا تو ہم کو ذرا فرصت ملی کہ اپنی تیرہ بختی کے اوپر غور کریں۔ یہ تو منشی جی کو بتا ہی چکے تھے کہ یہ وظیفہ امتحان پاس کرنے کے لئے تھا۔ اب ہم اپنے دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ ہم سے بھی زیادہ بدقسمت بھلا کون ہوگا کہ جب صرف ایک روز رہ گیا۔ منشی جی نے آکر سسٹم ڈھایا۔ چلہ ہمارا شکست ہو چکا تھا۔ اور اب ہم کو ڈر تھا تو یہ کہ کہیں ہمارا جلالی وظیفہ نامکمل رہ جانے کی وجہ سے ہمارے اوپر علاوہ اس مار کے جو پڑ چکی تھی۔ اور کوئی مصیبت نہ لائے۔ کیونکہ ہم سے شاہ صاحب نے کہا تھا۔ کہ وظیفہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ تو اکثر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور پھر طرح طرح کی مصیبت لاتا ہے +

ہم گھر پر پہنچے۔ تو ہماری والدہ صاحبہ نے ہمیں گلے سے لگایا اور خوب روئیں۔ انہوں نے سب قصہ سنکر کہا کہ تو نے مجھ سے کیوں نہ کہا۔ میں تیرے لئے اس سے بڑھ کر وظیفہ کسی سیانے سے پڑھوا دیتی +

مگر منشی جی کا یہ حال تھا کہ دانت پیس پیس کر ہمارے اوپر دوڑتے تھے۔ اور مارتے تھے۔ اب امتحان کے صرف تین دن رہ گئے تھے۔ اور ان تین دنوں میں منشی جی نے ہمارے اوپر وہ ظلم توڑے کہ ہمیں قطعی یقین ہو گیا کہ فیروز یا الضرور یہ جلالی وظیفہ لوٹ پڑا۔ اور ہماری خیر نہیں۔ غرض جو کچھ بھی اس قلیل عرصہ میں ممکن تھا منشی جی نے کیا اور ہم سے امتحان دلوایا۔ نتیجہ شائع ہوا۔ ایک ہم صرف ایک ہی مضمون ریاضی میں فیل ہوتے تھے۔ مگر اب کی مرتبہ ہم مساحت کے علیحدہ پرچہ میں بھی فیل ہو گئے +

منشی رام سہائے کا یکہ وقت پر پہنچا۔ اور انہوں نے حسب دستور مارتے مارتے ہمیں بے جان کر دیا۔ پھر اس کے بعد خود بھی بیٹھ کر رونے لگے۔ ہمارے والد صاحب نے جب اپنے شفیق باپ کو روتے ہوئے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں خون ہی تو اتر آیا۔ "آج تجھے مار ڈالوں گا" یہ کہہ کر وہ ہمارے اوپر پل پڑے۔ اور مارتے مارتے بیہوش کر دیا۔ ہمیں ہوش آیا تو ہماری دادی اور والدہ صاحبہ تیمارداری کر رہی تھیں۔ اور منشی جی اور والد صاحب کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں +

دوسرے ہی روز سے ہمیں گھی شکر ملنے لگا۔ اور ہم نے اور بھی فیل بچائے۔ جھوٹ موٹ کمزور بنے رہے۔ غرض کئی روز ہم گھر سے باہر نہ نکلے۔ کیونکہ وہ یک اجل یعنی منشی جی موجود تھے +

جب ہم تندرست ہو گئے تو باہر بلائے گئے اور منشی جی نے ہم سے کہا کہ "تو نے جو پیلا کھینچا تھا وہ تو غلط نکلا۔ اب میرا بتایا ہوا چلہ کھینچ"۔ ہم سمجھے کہ واقعی کوئی چلہ ہوگا۔ چنانچہ ہم راضی ہو گئے۔ منشی جی نے ہم سے کہا کہ "میرا چلہ بڑا کٹھن ہے۔ عمدہ کھانا۔ عمدہ کپڑے۔ تمام شوق بند ہو جائیں گے۔ مگر پاس تو قطعی ہو جائے گا"۔ منشی جی نے ہماری پیٹھ ٹھونکی اور کہا۔ کہ کل سے چلہ شروع ہے +

دوسرے روز سے منشی جی نے اپنا کٹھن چلہ شروع کرا دیا۔ صبح سے شام تک انہوں نے ہمیں کوٹ کوٹ کر پڑھایا۔ اور کھانے کو صرف اُبلی ہوئی دال دلوائی۔ یہی ان کا چلہ تھا۔ معلوم ہوا کہ منشی جی اس وقت تک ہمیں رہنے جبتک کہ گرہنوں کی تعطیل ختم ہو کر اسکول نہ کھلیگا۔ غرض ہم ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ دن رات منشی جی ہمیں باہر نہ رکھتے اور مار مار کر پڑھاتے۔ اور پھر ظلم یہ کہ کھانے کو بہت بُرا دلواتے۔ ہم چھٹی کو ترس گئے۔ کیوں کہ منشی جی ہمیں کسی وقت بھی نہ چھوڑتے تھے۔ رات کو بھی چارپائی سے چارپائی ملا کر سوتے اور لیٹے لیٹے زبانی سوالات سے تنگ کرتے۔ اور جواب نہ ملنے پر فوراً پھڑی رسید کرتے۔ بار بار وہ یہی کہتے کہ "میرے وظیفہ کی شرط ہی یہ ہے" +

جب اسکول کھلا۔ تو ہمیں معلوم ہوا کہ اب نئی مصیبت آنے والی ہے۔ یعنی ہم بجائے گھر پڑھنے کے منشی جی کے گھر پر رکھے جائیں گے۔ ہمارا دم ہی تو نکل گیا۔ قصہ مختصر ہم منشی جی کے گھر پہنچے۔ جہاں بڑی خدمت سے ہمارے اوپر دن رات مار پڑتی اور پڑھائے جاتے +

مصیبت پر مصیبت تھی۔ سوائے دال کے کچھ کھانا نہ ملتا تھا۔ کیونکہ چارکشی میں یہ منع تھا۔ اگر ہمارے گھر سے کوئی عمدہ چیز آتی۔ تو والد صاحب آلو گوبھی بنا لے جاتے۔ اور وہ چیز بھی کوڑا دی جاتی۔ مگر ہمیں نہ دیجاتی۔ کیونکہ منشی جی کہتے تھے کہ "اگر کوئی چیز بھی تو نے کھالی تو وظیفہ بگڑ جائے گا"۔

گھر پر ہم روزے نہ رکھتے تھے۔ مگر یہاں منشی جی نے مار مار کر ہمیں زبردستی سب روزے رکھائے۔ خدا خدا کر کے عید کے روز ہمیں گھر جانے کی اجازت ملی۔ ہماری شامت جو آئی تو ہماری اماں جان نے ہمیں عید پر بجائے ایک روز کے دو روز کے لئے روک لیا۔ ہم جانتے تھے کہ ظالم سے سابقہ ہے۔ اور ہم راضی نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب ہمارے والد صاحب نے کہا کہ ہم منشی جی کو خط لکھدیں گے۔ تم ڈرو نہیں۔ تو ہم بھی مان گئے ہمارا رُکنا بس کرستم ہی تو ہو گیا۔ حالانکہ ہمارے پاس والد صاحب کا سفارشی خط موجود تھا۔ مگر تو یہ کیجئے۔ خط دکھانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ ہم "خط۔ خط" کہتے ہی رہ گئے اور ادھیڑ کر ڈال دیئے گئے۔ خوب مارے جانے کے بعد منشی جی نے خط پڑھا۔ اوّل تو ہمارے والد صاحب کو خوب بُرا بھلا کہا۔ اور پھر ہمارے اوپر یہ کہہ کر پل پڑے کہ "سفارشیں لایا ہے"۔ اور جتنا مارا تھا اس سے دُگنا مارا۔ ہم دراصل اپنی زندگی سے عاری تھے۔ اور کبھی کے بھاگ کر اپنی جان دے چکے ہوتے۔ اگر کہیں ہماری شادی کا سوال بیچ میں نہ ہوتا دراصل ہماری محبوبہ کا خیال ہی تھا۔ جو ہم یہ کڑی منزلیں ثابت قدمی سے جھیل رہے تھے۔ ورنہ ہم سچ کہتے ہیں کہ اگر کہیں مجنوں کا بھی منشی جی کے مدرسہ میں نام لکھا دیا جاتا تو وہ بھی لیلیٰ کو بھول جاتا +

منشی جی نے ریاضی کی ایک ایک کتاب ہمیں دس دس مرتبہ پوری کی پوری حل کرا دی تھی۔ مگر پھر بھی چین نہ لیتے تھے۔ یہی حال اور مضامین کا

بھی کا تھا کہ بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں مرتبہ یاد کرا کر دہرا چکے تھے۔ مگر اس ظالم کی سیری نہ ہوتی تھی۔ اور وہ برابر آسی مستقل مزاجی سے بار بار پڑھاتے تھے کہ جیسے آج ہی پڑھانا شروع کیا ہے۔ قصہ مختصر ہم سال بھر کی سخت پڑھائی اور پٹائی سے دُبلے ہو گئے +

(۷)

ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس چلّہ کشی کا نتیجہ کیا ہوا۔ امتحان ہوا اور ہم صرف اوّل نمبر آئے بلکہ سارے صوبہ میں اوّل رہے۔ ہمارے پاس ہونے کی خوشی میں منشی جی آئے اور ایک سخت چانٹا مار کر کہا۔ کہ اگر ایک مرتبہ بھی تو فیل ہو جاتا تو تجھے مار ڈالتا اور خود بھی مر جاتا۔ غرض خوب ہمارے پاس ہونے کی خوشیاں کی گئیں اور خوب مٹھائی تقسیم ہوئی۔ اور منشی جی کی خدمت میں جوڑا اور روپے پیش کے گئے +

ہماری اس شاندار فتح کا تمام گاؤں میں ڈنکا بج گیا۔ اور ہر شخص ہماری یاوری کا قائل ہو گیا۔ اور خصوصاً ہمارے خسر صاحب۔ جلد تر ہماری شادی کی گئی۔ اور منشی جی نے بھی شرکت کی۔ ہم نے ورا صل شادی کے دن اطمینان کی سانس لی۔ جب منشی جی نے ہمیں گلے سے لگا کر وعدہ پختہ کیا کہ اب تجھے کبھی نہیں ماروں گا +

ہم نے بعد شادی کے اپنی بیوی سے سخت شکایت کی کہ تو نے اور تیرے شاہ صاحب نے ہمیں ایسی صلاح دی کہ پورا سال ہمارا پٹتے گذرا +

کچھ بھی ہو ہماری صلاح ہے کہ اگر کوئی صاحب جلالی پڑھیں تو خدا کیواسطے جنات اگر آئیں تو کم از کم عمل پڑھکر بھونکتے وقت اپنا منہ ذرا فاصلہ ہی پر رکھیں ورنہ اس زور سے چانٹا پڑنیکا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا اثر قیامت تک باقی رہے گا +

عظیم بیگ

خاص

مَیں اَور تُم

تم تیز رفتار اٹھکھیلیاں کرنے والی ندی کی طرح ہو۔ جب چلتی ہو تو قدم قدم پر رقص موسیقی اور خندہ پھوٹ پھوٹ پڑتا ہے +

مَیں ساحل کی طرح خود دار ہوں ——— نہایت بنا کھڑا رہتا ہوں۔ اور تمہاری طرف تکتا رہتا ہوں.....

مَیں ایک بہت بڑے طوفان باد کی طرح ہوں۔ جو اچانک تندی کے ساتھ دفعتاً اُٹھتا ہے۔ اور جوش و خروش کی حالت میں دنیا کو محیط کر لیتا ہے۔ پھر اچانک خود ہی فرو ہو جاتا ہے۔ میں بھی جذبات و احساسات کا ایک بگولہ ہوں۔ کچھ دیر شور مچانے کے بعد فنا ہو جاؤں گا" +

لیکن ———

تم ایک برق ہو ——— تیز اور نازک ——— دل کی گہری تاریکی کو پھاڑ دیتی ہو۔ اور ایک منوّر خطہ پیدا کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہو!

(ٹیگور)

(خاص)

ظفر قریشی دہلوی

دوگدا گر

برار کا قدیم شہر امراؤتی نگیوں۔ خانقاہوں اور چنڈوخانوں سے پٹا پڑا ہے۔ جن کے دروازے فقر اور تصوف کی آمد و رفت کے لئے دن رات پاٹوں پاٹ کھلے رہتے ہیں۔ بازار ہو یا اسٹیشن۔ آپ ہر جگہ قدم درویش رد بلا کے لئے موجود پائیں گے۔ اسٹیشن سے گیارہ بجے پسنجر ٹرین روانہ ہونے لگی۔ تو مسکین شاہ کی مسجد کے قریب والے مستان شاہ الا اللہ کہتے ہوئے میرے ہی ڈبہ میں آدھمکے۔ ان کے ساتھ ایک اور شاہ صاحب تھے۔ جن کی زبان سے بات بات پر "ہاں مرشد" "سچ ہے مرشد" حالت نیم حسی میں جاری تھا۔ دونوں کا کچھ عجیب انداز یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ باغ و بہار۔ والی درویشی کی مجسم جلد سفری مطالعہ کے لئے مہیا ہے۔ مستان شاہ کو اس سے پہلے بھی کئی بار قیام امراؤتی میں جبکہ میں ایڈورڈ کالج کے دارالاقامت میں رہتا تھا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ بھی مجھے جانتے ضرور تھے۔ مگر اس وقت کچھ ایسی دُھن میں تھے۔ کہ میری موجودگی بالکل محسوس نہ کر سکے۔ سوار ہوئے تو گاڑی کی حرکت کر چکی تھی۔ چھوٹی لائن پر چلنے والا کھٹارا۔ چول چول ڈھیلی۔ اپنے قرش بنچ پر اپنا عصا ٹکا دیا۔ اور سامنے کے بنچ پر الا اللہ کہہ کر بیٹھ ہی تھے۔ کہ ڈنڈا لڑھک کر میرے پیروں پر آ رہا۔ "ارے" کہہ کر دیکھا اور معذرت کے لہجہ میں کہنے لگے۔ "یہاں آپ ہیں۔ معاف کرنا یعنی کہ میں نے دیکھا نہ تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں"؟

"اکولہ" میں نے کہا "آپ کا کہاں کا قصد ہے"؟

مرشد بولے "جہاں مولا لیجائے" لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد "یعنی کہ بدینرہ پر ہی اُتر جاؤں گا۔ یہ شاہ صاحب یقین شاہ ولی کی درگاہ کے مجاور ہیں۔ یعنی کہ وہیں رہتے ہیں۔ بس وہیں کا میرا بھی قصد ہے"۔

مستان شاہ دراز قامت۔ نحیف الجثہ۔ گھٹے سر اور خشخشی داڑھی والے آدمی تھے۔ ساری پوشاک ایک لمبے کرتے پر ختم تھی۔ جو ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ پیر میں دہلی کا جوتا کیچڑ سے لت پت۔ معمول سے زیادہ لمبی اور پتلی انگلیاں جن کی گرفت میں عصا اصل سے زیادہ دبیز نظر آتا تھا۔ پتلی گردن کے گدو موٹے موٹے دانوں کی تسبیح کسی مشین کے دھرے کی رگڑ کو کم کرنے والے چمڑوں کی شان پیدا کر رہی تھی۔ گال بالکل پچکے ہوئے۔ منہ میں سوائے چند داڑھوں کے کل دانت مفقود الخبر۔ جب سے سوار ہوئے برابر پان چبا رہے تھے۔ پیک کی کافی مقدار منہ میں جمع ہو چکی تو سامنے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا بیٹھے۔ گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔ اور دھیما مینہ برس رہا تھا۔ کھڑکی میں سے باہر کا دلفریب منظر آتا تھا۔ پہاڑیاں سبز میدان میں پرواز نظر تک ہر طرف سبزہ لہلہاتا ہوا۔ گڑھے پانی سے لبریز پٹری کے قریب کے درخت گاڑی کی حرکت کی وجہ سے مخالف سمت میں تیزی سے حرکت کرتے ہوئے گذر جاتے اور دور افتادہ۔ کے قریب درخت ان کی ظاہرا تیز حرکت کے مقابلے میں گاڑی کے چلنے کے رُخ حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ اور ان نظری دھوکوں کے مجموعی اثر سے تمام منظر گول گھومتا معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی سے باہر کا نظارہ گویا اقبال کے اس مصرع کی تفسیر کر رہا تھا ؎

ہست در گوشۂ ویرانہ رقص

اور گاڑی کے اندر دونوں درویشوں کی حالت اس دوسرے مصرع کی ؎

میکند دیوانہ با دیوانہ رقص

مستان شاہ نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر تھوکا۔ پھر جھٹ اندر سر کر کے کہنے لگے "سبحان اللہ! کیا سخاوت ہے اُس معبود کی یعنی کہ مینہ سے پتی پتی کا شکم سیر ہو رہا ہے"۔

دوسرے شاہ صاحب بولے "مرشد! بھلا انسان اسقدر سبزہ کبھی اُگا سکتا ہے"؟

مسکین شاہ "ہیں اجی لاحول ولا قوۃ! توبہ کرو یعنی کہ اگر ہزار ہا پیسے پانی لڑھکا جائے۔ تو بھی اس کا عشر عشیر نہ پیدا ہو سکے۔ وہی مالک سب کا

پورا کرتا ہے۔ مگر شاہ صاحب دنیا کا بھی عجیب حال ہے۔ یعنی کہ کسی رنگ آدمی کا پورا ہی نہیں ہوتا۔ اب اپنے پڑوس والے شاہ دولا ہی کو دیکھ لو کیا کم ملتا ہے۔ یعنی کہ تعویذ گنڈے والے ٹیڑھی پر جمے ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی جمعراتہ کا چراغ نہیں چھوڑتے۔ موقع بے موقع رباجی کو بھی نکال جاتے ہیں۔ رانی کہ بھیک مانگنے دوسرے شہروں کو جاتے ہیں۔ دوسرے شاہ صاحب جن کا سر پیک کی وجہ سے سامنے کو جھکا جا رہا تھا۔ اس طرح ہلے جیسے کوئی چونکتا ہے "ہاں مرشد! پھر نشہ نہیں۔ پانی نہیں ہیں تو بھنگ۔ گانجہ۔ افیون سبھی تو چاہئے اللہ کی یاد میں" اس پر مستین شاہ کہنے لگے "وہ مولا اور دے۔ ہمیں کیا۔ وہی مثل ہوئی یعنی کہ داتا دے اور بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔ دنیا میں پھنسو دنیا ہی ملتی ہے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ یعنی کہ کہتے ہیں کہ دنیا چاہو تو دنیا اور دین چاہو تو دین۔ اور دیکھنے میں بھی یہی بات ٹھیک ہے۔ یعنی کہ واقعہ ہے"+

اب تو دنیا بھر کے فلسفیانہ اور تاریخی صفائین پر مخصوص درویشانہ انداز میں بحث ہونے لگی۔ تاریخ و سیر، نوادر و حکایات و قصص سب کی شامت آئی۔ وہ اوٹ پٹانگ ہانکنا شروع کی کہ بندہ کا دماغ تصوف کے درجہ حیرت پر پہنچ گیا۔ درمیان میں اکثر کبھی ایک سائیں مجھے تصدیق طلب لہجہ میں مخاطب کرتے۔ اور کبھی دوسرے۔ بس عافیت اسی میں نظر آئی کہ آمنا و صدقنا سے خریدے ہوئے اخبار کو ذریعۂ نجات بنا لوں۔ جھٹ اُسے کھول کر ایک گوشہ میں سرک گیا۔ پڑھا تو کیا خاک۔ لیکن اُردو اخبار نکالنے کے لئے جو مصالحہ جمع کیا جا رہا تھا۔ اُسے خوب ہی سُنا۔ ایمان کی تو یہ [redacted] سراسر چٹکیاں اور گدگدیاں تھی۔ جسمیں یعنی کہ کی لایعنی تکرار کوں اور گھونسوں کا مزا دیتی تھی۔ مستان شاہ نے اپنے گول بٹول کھولتے ہوئے سر کو لرزاں نشست کی پشت پر ٹکا دیا۔ تنکا سی گردن میں اخروٹ کے مانند لگا ہوا سر مکوس پنڈولم کی طرح حرکت میں تھا۔ شاید مرشد خود بھی اس بے خودانہ جنبش میں ہل ہل کر مدد دے رہے تھے۔ جو وجد حال سے دسقدر مشابہ تھی +

جن لوگوں کی گفتگو میں بے تکا تکیہ کلام گھسا ہوتا ہے۔ اکثر انہیں اپنی خارجی حالت کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ وہ ایسے نمایاں عیب اپنی بول چال سے نہیں ہٹا سکتے۔ مرشد کے ذہن اقدس سے پیک کا زائد حصہ ہجرت کر کے کسی نو آبادی کی تلاش میں تھوڑی تک بہہ آیا تھا۔ یہ مرشد جسقدر نشست کے پچھلے رُخ پر مائل تھے۔ اُسیقدر دوسرے شاہ صاحب آگے جھکے ہوئے سر بجیب مراقب تھے۔ سوائے "ہاں مرشد صحیح ہے مرشد" کے بہت کم بولتے تھے۔ اس عالم کیف و وجد میں عجیب و غریب گفتگو کا خزانہ دم یعنی کہ کی ضربوں سے ہانکا جا رہا تھا۔ گاڑی [illegible] جا رہی تھی مستان شاہ بولے "یہ شیطانی چرخہ یعنی کہ دھوئیں کی گاڑی اور کیا کام لیتا ہے فرنگی نے اس سے یعنی کہ ہزاروں کوس پار کے ہیں چلے جاؤ ڈوسرے۔ مرشد "سچ ہے"+

مستان شاہ "اور شیطان کو کیا کم سمجھا ہے۔ یعنی کہ کل فرشتوں کا استاد تھا۔ یعنی کہ بابا آدم سے بھی پہلے وقتوں کی بات ہے۔ ایک بڑا ہی لمبا یعنی کہ خوب اونچا جھولا پڑا تھا۔ اور اس میں بیٹھکر یعنی کہ جھولتا بھی تھا اور کل فرشتوں کو سبق بھی پڑھاتا تھا دوسرے شاہ صاحب۔ اونگھتا بھی تھا مرشد"+

مستان شاہ بے خودانہ انداز سے "کیوں نہیں۔ یہی تو گاتا تھا۔ یعنی کہ

چھوٹی بڑی سوئیاں رہی جانی کا مورا کاڑھنا

ہنسی بھی محرکات کی موجودگی میں نیند کی طرح ایک ہی حالت اور ایک ہی ماحول میں بیٹھے رہنے سے کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ذرا ہلئے جُلے ہوا کھائیے تو فوراً ہی افاقہ محسوس ہوتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے بھی نشست سے اُٹھ کر کھڑکی کے منہ نکال جھانکنا شروع کیا۔ مناظر قدرت کی سنجیدگی ذرہ بھر متاثر نہ ہوئی تھی۔ میں نے بھی سنجیدہ منہ بنا کر سر اندر کر لیا۔ اتنی دیر میں شاہ صاحب نہ معلوم کیا کیا کہ گئے تھے۔ بس اخیر کا یہ جملہ سنائی دے رہا تھا کہ اُن سوئیوں میں بھی بڑے بڑے بھید ہیں یعنی کہ دنیا جہان کا کارخانہ چل رہا ہے" ڈوسرے مرشد نے نہ معلوم کہاں سے ایک فقرہ مستعار لے کر تھوڑی دیر کے لئے ریل بہوں کی گڑگڑاہٹ کو شکست فاش دے دی +

مستان شاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "مگر آدمی اس نے تو شیطان کی جھولی بھی چھین لی۔ یعنی کہ یہ چراغ جلا نا کس سے سیکھا۔ پہلے اندھیرے میں رات گذارتے تھے۔ یعنی آگ کی روشنی میں ضروری کام کاج کرتے تھے۔ ایک آدمی جنگل میں گھڑا لئے جا رہا تھا۔ مینہ برسنے لگا یعنی کہ کپڑے بھیگنے کی باری آئی۔ تو سب کپڑے اُتار گٹھڑی

میں چھپا دیئے۔ پھر مینہ بند ہوا تو کپڑے پہن راستہ لگا۔ آگے ملا شیطان حیرت سے دیکھنے لگا یعنی کہ جنگل سے چلا آتا ہے اور کپڑے بالکل سوکھے۔ اب وہ پوچھتا ہے یعنی کہ مینہ میں سوکھے رہنے کی حکمت اور یہ بتاتا نہیں۔ جب شیطان نے پہلے چراغ جلانے کی ترکیب بتا دی تو آدمی نے جھٹ کہہ دیا یعنی کہ وہی گھڑے کا قصہ +

دوسرے سائیں "تھا آخر شیطان شیطان ہی۔ اور آدمی پھر بھی آدمی اونچا ہی رہا" مستان شاہ چمک کر بولے "ہاں یعنی کہ عقل میں بھی اور اس زمانہ میں قد میں بھی عوج بن عنق کا سر تو آسمان سے لگتا تھا۔ یعنی کہ سمندر کی تہ سے مچھلی پکڑتا اور سورج کے سامنے رکھ کر بھون کھاتا موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں گذرا ہے یعنی کہ اس کی ان سے لڑائی بھی ہوئی تھی۔ اللہ غنی! کیا قد ہوگا یعنی کہ موسیٰ علیہ السلام بہ خود ساٹھ گز کا قد اور ساٹھ ہی گز اچھلے۔ جب جا کر کہیں اس بچے نے کی کنعان میں عصا مارا یعنی کہ ہلاک کر ڈالا۔ اسی کے متعلق حدیث شریف میں ایک شعر بھی آیا ہے۔ مولوی صاحب نے بچپن میں بتایا تھا یعنی کہ

پیا کیا وہ اس نے بشر عوج بن عنق — کہ جس کی رکابی تھا پاسے بنا رودنیل کا

یہ رودنیل بڑی ندی ہے۔ یعنی کہ سندھ سے کشمیر کو جاتے ہوئے ملتی ہے یہ اس جوان پر بنا ہوا ہے دنیا میں مشہور ہے۔ یعنی کہ اس کی ٹوٹی ہڈی کا

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دونوں مرشد استغراق میں تھے۔ گاڑی سرسبز میدان سے گذر رہی تھی۔ آسمان پر گھنگور گھٹا چھائی ہوئی۔ بلکہ مینہ برستا ہوا لائن کے دونوں جانب جھاڑیوں میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے جن پر مینہ کے قطرے اکٹھے ہو کر نیچے ڈھلکتے تھے عجیب پرکیف منظر تھا۔ پان کی پیک نے مرشد کا سر کھڑکی سے باہر نکلوایا۔ مسحور کن منظر نے توجہ جذب کر لی۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر آہ سرد بھر کر کہنے لگے ؎

"رگ رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی
یعنی کہ اب میرا جی چاہتا ہے کچھ اور راگ لانے کو" ؎
کالی بلا میں میں پھنس گئی .....
گردن کو جنبش دیکر کہا سر کر +

دوسرے بولے "ہائیں مرشد! قالو بلیٰ فرمایئے قالو بلیٰ"

"ارے بھئی ہم بھی جانتے ہیں یعنی کہ درویشی کا تمام پس آنکھ کھول۔ پیری مریدی میں پرورش پائی۔ یعنی کہ الست بربکم اور قالو بلیٰ کی بخشش میں عمر کٹ گئی۔ مگر قالو بلیٰ اور شعروں میں ٹھیک ہے۔ یہاں نہیں یعنی کہ

پھنسا آدمی بلا میں ہے [illegible] کالی
اتنے میں گاڑی رکی تو مکین شاہ مجذوب پوچھنے لگے "میاں کون اسٹیشن ہے؟" "نیرہ"
"ہیں بھئی یعنی کہ بدنیرہ آ گیا"

دونوں فقیروں نے اپنی بقچیاں لیں اور الا اللہ کہہ کر اتر گئے۔ گاڑی نے تبدیل ہوئی پٹخ لے سیٹی دی۔ دھوئیں کے بقچے کے بقچے مرطوب کرہ ہوا میں آہستہ آہستہ تنتا ہونے لگے۔ اور گاڑی روانہ ہوئی۔ انجن کی صدا دھک دھک ہوتی ہے۔ مگر اس وقت یعنی کہ مفہوم ہوتی تھی۔ میں مطالعہ اخبار میں مصروف ہوا۔ اخباری فقرے یعنی کہ [illegible] شدہ معلوم ہوتے تھے +

(اکولہ) (خاص) عبدالباقی

"خزاں کے ابتدائی ایام میں آسمان پر بادل نہیں ہوتے۔ دریا مہیب ہوتا ہے۔ کنارہ کے عریاں درختوں کی جڑوں کو اپنے پانی سے ہمیشہ غسل دیتا رہتا ہے۔ لمبی پگڈنڈی ——— جو گویا گاؤں کی پیاسی زبان ہے ——— دور تک ہوتی ہوئی بالآخر دریا سے جا ملتی ہے +

میں اپنے ارد گرد محو روانی دریا اور خاموشی و سکوت آسمان کو دیکھتا ہوں۔ تو میرا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور یہ محسوس کرنے لگتا ہوں کہ دنیا میں مسرت اس طرح منتشر کر دی گئی ہے جیسے کسی بچہ کے چہرہ پر معصوم مسکراہٹ!"

(ٹیگور) (خاص) ظفر قریشی دہلوی

طوطے کی تعلیم

(از جناب ڈاکٹر ضیاالدین احمد۔ ایم۔ بی۔ ایچ)

(۱)

ایک تھا طوطا! لیکن بہت جاہل۔ دن بھر گایا کرتا' اور شاستر کبھی نہ پڑھتا۔ بس اڑتا کودتا اور کسی قانون قاعدہ سے واقف نہ تھا +

راجہ صاحب نے کہا۔ "ایسا پرندہ کس کام کا' البتہ جنگل کے پھل کھا کر شاہی مارکیٹ کے پھل بازار میں کم آنے کا باعث ضرور ہوتا ہے" وزیر سے بلا کر فرمایا "اس پرندے کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے +

(۲)

تعلیم کی ذمہ داری کا عام بوجھ راجہ صاحب کے بھتیجے پر آ کر پڑا + پنڈتوں نے بیٹھ کر بہت غور و خوض کیا۔ سوال یہ تھا کہ اس پرندہ کی جہالت کا سبب ہے تو کیا؟ قرار پایا کہ پرندہ چونکہ تھوڑا سا گھانس پھونس لے کر گھونسلا بنا لیتا ہے۔ اس میں زیادہ کی گنجایش ممکن نہیں سب سے پہلے اس کے لئے ایک نہایت عمدہ سا قفس تیار کرا لینا چاہئے +

راج پنڈت انعام و اکرام لے کر خوشی خوشی واپس ہوئے +

(۳)

سنار بیٹھا سونے کا قفس تیار کرنے۔ اور قفس جو تیار ہوا تو ایسا خوب کہ دور دور سے ملکوں ملکوں کے تماشائی زیارت کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔ کسی نے کہا "تعلیم کی تو انتہا ہو گئی"۔ کوئی بولا "تعلیم بالفرض نہ بھی ہو۔ قفس تو ہوا۔ واہ رے پرندے تیری قسمت!"

سنار نے تھیلی بھر بخششیں پائیں اور خوشی خوشی اسی دن اپنے وطن روانہ ہوا +

پنڈت جی بیٹھے پرندہ کو تعلیم دینے۔ ناس کی چٹکی لے کر آپ نے کہا "بھائی تھوڑی سی کتابوں کا تو کام نہیں"۔ راجہ صاحب کے بھتیجے نے "سیونت کتابیں" لکھنے والوں کو طلب کیا اور اپنے کام کے دھنی آنہوں نے کتابوں کی نقلوں کی نقلیں تیار کر کے ایک انبار سا لگا دیا جو دیکھنے والے اختیار کہتا "آفریں علم کی انتہا کہاں ہے؟" غرضکہ کاپی نویسوں کی جماعت نے بیلوں بوجھ انعام پایا اور گھروں کو سدھارے۔ ان کے روزگار میں کسی قسم کی کشمکش باقی نہ رہی +

قفس بے بہا تھا' اور راجہ صاحب کے بھتیجے کی خبرگیری کی انتہا نہ تھی۔ مرمت۔ قوسہ رائی سے۔ جھاڑ پونچھ جاری ہے۔ پالش کی صفائی دیکھ کر کسی نے کہا "ترقی ہو رہی ہے"۔ کارندے کام پر بڑھائے گئے۔ اور پرند پر نظر رکھنے کے لئے ان سے بھی زیادہ متعین کئے گئے۔ ماہ بماہ تھیاں بھر بھر تنخواہیں لے کر ان لوگوں نے صندوق بھر لئے۔ یہ سب اور ان کے رشتہ دار' چچیرے' ممیرے اور پھپھیرے سب بالاخانو میں مسندیں لگا کر بیٹھ گئے!

(۴)

دنیا کی ضرورتیں بہت ہیں۔ لیکن یہ نکتہ چیں بد ہیں ضرورت سے کہیں زیادہ ہیں۔ وہ کہنے لگے "پنجرے کی ترقی ہوئی' ہم مانتے ہیں لیکن پنجرے میں پرندہ کی بھی کوئی خبر لیتا ہے؟"

یہ بات راجہ صاحب کے کان تک پہنچی۔ بھتیجے سے بلا کر کہا۔ "بھتیجے یہ کیا افواہ ہے"۔ بھتیجے نے کہا "مہاراج! اگر آپ اصل حقیقت سے آگاہ ہونا پسند کرتے ہیں۔ تو پوچھئے سنار سے' پنڈت اور کتاب نویسوں سے بلا بھیجئے' انہیں جو مرمت کرتے ہیں پنجرے کی' اور پھر انہیں جو مرمت کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان نکتہ چینوں کو چونکہ کھانے کو ملتا نہیں ناچار جب کہیں گے تو بڑا کہیں گے"۔ جواب سنکر راجہ صاحب پر حقیقت منکشف ہوئی اور اسی وقت بھتیجے کے گلے میں سونے کا کنٹھا ڈالا گیا +

(۵)

لیکن تعلیم کس حیرت انگیز رفتار پر جاری ہے، خود جاکر دیکھنے کا خیال راجہ صاحب کے دل میں پیدا ہوا۔ ایک دن وزیر، مصاحب اور اپنے دوستوں کو لے کر درس گاہ میں آپہنچے۔ جونہی آپ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا بسنگھ پھکنا شروع ہوا۔ ڈھول بجنے لگے۔ طبلہ، دھامہ، جھانجھ مردنگ، ساز سارنگی، ایک ہنگامہ تھا کہ برپا ہوگیا +

پنڈتوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر اور اوپر سے چوٹی کو ہلا ہلا کر منتر پڑھنا شروع کئے۔ منتری، مزدور، سنار، کتاب فروش، بھائی، بھتیجا، بھانجا، چچا، نانا، دادا، بہنوئی سبھی مچے ہوئے تھے +

مہاراج نے کہا "خوب جنگامہ تو کم نہیں" +

بھتیجے نے کہا "حضور یہ فقط ہنگامہ ہی نہیں اس کے نیچے کچھ معنی بھی کم ہیں" +

راجہ صاحب خوش خوش ڈیوڑھی سے باہر آئے اور ہاتھی پر ابھی چڑھنے ہی کو تھے کہ کوئی نکتہ چیں کسی جھاڑی میں چھپا چھپا پکار کر بولا۔ "مہاراج پرندہ کو بھی معائنہ فرمایا" راجہ صاحب چونک پڑے "اُفو" لو بھئی میں طوطے ہی کو دیکھنا بھول گیا تھا۔ یاد ہی نہ رہا۔ واپس آکر پنڈت جی سے کہا "پرندے کو تعلیم کیوں کر دی جاتی ہے۔ میں اس کا طریقہ ذرا دیکھنا چاہتا ہوں" +

طریقہ تعلیم دیکھا گیا اور دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ طوطے کا تعلیمی اسٹاف اسقدر بڑا تھا کہ بیچارہ پرندہ اس ہجوم میں دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اسے دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ راجہ صاحب پر کھل گیا کہ نظام کار میں کوئی نقص نہیں +

(پنجرے میں پانی نہیں، دانہ نہیں، کتابوں کے ورق چاروں طرف پلنگوں کے پلندے پڑے ہیں۔ ورق ورق قلم کی نوک سے اس کی چونچ میں ٹھونسا جاتا ہے۔ حلق بند ہے۔ چونچ بند ہے۔ چونچ کا شگاف تک کھلا نہیں۔ دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں)

اس واقعہ ہاتھی پر چڑھتے وقت گوشمالی کرنے والوں سے خطاب فرمایا "ان نکتہ چینوں کی گوشمالی ذرا اچھی طرح سے کی جائے" +

(۶)

طوطا دن بدن نہایت شریفانہ طور پر ادھ موا ہوا جاتا تھا۔ منتظمین کو یقین تھا کہ حالت امید افزا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنی فطرت سے مجبور، پرندہ صبح کے وقت روشنی کی طرف دیکھتا ہے۔ اور خلاف تہذیب پَر پھڑپھڑاتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اپنی چونچ سے پنجرہ کی تیلیوں سلاخوں کا کاٹنے کی کوشش کرتا ہے +

کوتوال بہادر نے کہا "ارے، یہ بے ادبی"

جھٹ ڑی اور آگ لئے ہوئے دوڑا آیا، اور دھونکنی پھونکنا شروع کیا۔ لوہے کی زنجیر جلا کر پرندہ کے پاؤں میں ڈال دی گئی۔ پر بھی کاٹ دیئے گئے +

راجہ صاحب کے سامنے غصہ سے سر جھٹک کر کہا "یہ کہنا کہ اس ملک کے پرندوں میں نقل کا مادہ کم ہے صحیح نہیں، شکر نہیں، احسان شناسی نہیں" +

تب پنڈتوں نے ایک ہاتھ میں قلم لے کر اور دوسرے میں برچھی کچھ ایسی حرکت کی جسے کہتے ہیں "تعلیم" +

لوہار کا کام بڑھا، اس کی بیوی کے گلے میں سونے کی مالا چڑھی۔ اور کوتوال بہادر کی ہوشیاری دیکھ کر اسے دستار عطا فرمائی +

(۷)

طوطا مرگیا، اور کسی کو خبر تک نہ تھی۔ آوارہ نکتہ چینوں نے ایک جہان سر پر اٹھا لیا۔ "مرگیا۔ مرگیا طوطا مرگیا" راجہ صاحب نے اپنے بھتیجے سے بلا کر پوچھا "بھتیجے یہ کیا افواہ ہے؟"

بھتیجے نے کہا "مہاراج! پرندہ کی تعلیم پوری ہوچکی ہے"

راجہ صاحب نے پوچھا "کیا وہ اب بھی کودتا ہے؟"

"ارے رام"

"اڑتا ہے؟"

"نانا"

"گاتا ہے؟"

"جی نہیں" +

"جب دانہ پانی نہ ملے تو چلاتا ہے؟"

"کبھی نہیں"

راجہ صاحب نے کہا "پرندے کو میرے پاس لاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں" +

طوطا حاضر کیا گیا۔ کوتوال گھوڑسوار پیادے ساتھ آئے۔ راجہ صاحب نے پرندے کو ہاتھ میں لے کر بایا۔ نہ وہ چوں کرتا ہے نہ چاں۔ لیکن اسکے پیٹ میں کتابوں کے ورق کھس کھس کرتے ہیں +

باہر — طوطے کی اس آخری سرد آہ نے بہار کے جھونکوں کو اور نئی نئی پھوٹی ہوئی کلیوں، پتیوں اور شاخوں بھرے جنگل کی پُر کیف فضا کو ایک درد بھری حیرت میں ڈال دیا +

(ٹیگور) (خاص)

محمد ضیاالدین احمد

تصانیف جناب قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی

طوائف کی پُراسرار زندگی کے فریب سے خبردار کرنے والے نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب اخلاقی ناول

شاہد رعنا یہ ایک مہ پارہ کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ جس میں اس نے اپنی تمام عیاریوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ طوائف کی عشوہ طرازیوں اور عریانیوں کا صحیح مرقع ہے۔ حسین طوائف کے حسین جال کا راز طشت از بام کر دیا گیا ہے۔ قیمت عہ ر

سزائے عیش نہایت دلچسپ ناول ہے۔ اس میں عیاش طبع نوجوان کی نہایت درد انگیز کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف نے اس ناول میں قابلانہ طور سے حسن و عشق پر بحث کی ہے۔ ناول کے پیرایہ میں حسن و عشق کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور ایک طوائف کا ٹائم ٹیبل درج کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۰ر

انجام عیش اس ناول میں پاکیزہ زندگی اور مروجہ بدکاری اور آوارگی کی زندگی کے مختلف پہلو ایسی تحقیق و تدقیق کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ کہ نوجوانوں کو اس سے بہتر سبق آموز کتاب ملنی دشوار ہے۔ کیونکہ پبلک کو اب تک ان امور کو علمی اور سائنٹفک طور پر تحقیق کرنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ جن کے معلوم کرنے سے جوانوں کی زندگیاں خطرات سے بچ سکتی ہیں۔ اور ایک سوشل اصلاح ہو سکتی ہے۔ قیمت ۱۱ر

خمار عیش ایک طوائف کی جوانی سے ادھیڑ عمر تک کے زمانہ کی حالت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترقی و تنزل کی مختلف حالتیں اور ان حالتوں کے ساتھ اس میں جو تغیرات ہوئے اُن کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ معیشت کی فضا میں رہنے کے باوجود فطری نیکی کیونکر اپنا اثر کرتی ہے۔ اور شیطان کیونکر اس پر غالب آجاتا ہے؟

قیمت ۱۲ر

سعید اس میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان اور ایک پاترکے جذبات دلی کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ حسن و عشق کے معاملات پر نہایت لطیف بحث کی گئی ہے اور انجام اخلاقی فلاح پر کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

سعادت ایک تعلیم یافتہ۔ سلیقہ مند۔ خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناچ رنگ حسن و عشق، معاملات فراق ہر ایک کا دلچسپ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ عاشق و معشوق کی پُرلطف خط و کتابت ہے۔ انجام کار دونوں کو راہ راست نصیب ہوتی ہے +

قیمت ۸ر +

محصول ڈاک ہر حالت میں ذمہ خریدار +

نوجوانوں کو گناہوں سے بچانے کیلئے یہ کتابیں پڑھا دیجئے۔ ملنے کا پتہ

نیرنگ خیال بک ڈپو بارود خانہ لاہور

فلسفۂ شباب

(از جناب مولانا سبطین احمد صاحب بدایونی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی)

نقرئی اک موج کل آئی سر دریا نظر — برق گویا رقص میں تھی چادر سیماب پر
دم بدم پہلو بدلتی بل بہ بل کھاتی ہوئی — زخم خوردہ سانپ کے مانند لہراتی ہوئی
منتشر تھے جوشش مستی سے اجزائے حیات — توڑ کر مینا اڑی جاتی تھی صہبائے حیات
قطرے قطرے میں بھرا تھا اضطرار زندگی — ڈھونڈتی پھرتی تھی وہ میں قرار زندگی
پھرتے پھرتے اک طرف کو جوش میں کترا گئی — سینۂ دریا سے ہٹ کر سوئے ساحل آگئی
تشنہ لب ساحل نے جس دم لے لیا آغوش میں — پھر کہاں تھا وہ تلاطم فتنہ سر جوش میں
شوق کے پہلو میں آکر برق مضطر سو گئی
وہ تڑپ رہتی تو کیونکر موج ہی گم ہو گئی

یوں ہی تم بھی تھیں کبھی اک موج رقصان شباب — دوڑتا تھا جسم کی رگ رگ میں طوفان شباب
ارغوانی حسن میں دوشیزگی کی گرمیاں — شیشۂ احمر میں بھر دی تھیں تڑپتی بجلیاں
اک نوائے مست تھی سینہ کے اندر مرتعش — ساز کے ٹکڑے کئے دیتی تھی نغموں کی تپش
مجھ سے ملتے ہی مگر باقی نہ تھا وہ سوز و ساز — اڑ گئی مینا سے بو بن کر مئے مینا گداز
اب شرر پارے نہیں ہیں خون کے ذرّوں میں نہاں — اب رگوں میں آتش سیال کی گردش کہاں
برق اب خرمن پہ گرنے کے لئے مضطر نہیں — حسن اب زینت ہے گھر کی فتنۂ محشر نہیں
کھو چکی اپنا متاع بیقراری زندگی
سو رہی ہے میرے پہلو میں تمہاری زندگی

(خاص) (سبطین احمد)

غریب کا بچّہ!

(از نغماتِ درد ادیب العصر جناب سیّد کاظم صاحب نشتر لکھنوی)

خاک پر بیٹھی ہے اک فاقوں کی ماری مہ جبیں
ہوش رفتہ، دل شکستہ، غم سے خستہ، دل حزیں

ایک طفلِ نازنیں آغوش میں ہے بیقرار
رو رہا ہے بھوک سے بیتاب ہو کے بار بار

جسم لاغر بے لہو، منکا ڈھلا چہرہ نڈھال
آنکھ میں حلقے پڑے، سوکھے ہوئے لب زرد گال

پیار سے ماں کے کبھی وہ گل جو خنداں ہوگیا
نصف ہونٹوں تک تبسم آ کے پنہاں ہوگیا

غمزدہ کہتی تھی "میرے پاس پائی بھی نہیں
جھگڑ کپڑوں کی ملی اب تک سلائی بھی نہیں"

کیا کروں؟ کیونکر بھروں تیرا شکم اے نازنیں
دودھ کیسا میری آنکھوں میں تو آنسو تک نہیں

اے خدا میرے یہ کن اعمال کی تعزیر ہے
میں تری عاصی سہی، بچّہ تو بے تقصیر ہے

آ گیا باہر سے شوہر غم کا مارا بدحواس
دیکھ کے بچّہ کی صورت بن گیا تصویرِ یاس

باپ کی میٹھی صدا جب آئی اُس کے کان میں
غش سے آنکھیں کھولدیں معصوم نے اک آن میں

بھوک کے صدمہ سے تھا بھولا ہوا کلکاریاں
باپ نے چٹکی بجا کے دیں اُسے چمکاریاں

آئی معصومی کی طرفہ شان دکھلا کے ہنسی
رُک گئی آدھی لبِ نازک پہ آ کے ہنسی

غمزدہ بی بی مصیبت پھر عیاں کرنے لگی
داستانِ درد شوہر سے بیاں کرنے لگی

"بھوک سے بیتاب جب از حد ہوا میرا پسر
میں چلی بچّہ کو لے کے صاحبِ خانہ کے گھر

رحم سے مل جائے شاید کوئی ٹکڑہ نان کا
دیدے اس بچّہ کو صدقہ اپنے دسترخوان کا

ایک بھک منگی بنی میں آئی در کے سامنے
لے کے اس بچّہ کو پہنچی اُس کے گھر کے سامنے

ساتھ اس ناپاک کے تھا ایک سگ گلگشت میں
دے رہا تھا پوریاں کتے کو سیمیں طشت میں

پھول سے رخسار تھے بچّہ کے مرجھائے ہوئے
طفل دوڑا ننھے ننھے ہاتھ پھیلائے ہوئے

دیکھتے ہی اُس کی صورت ہوگیا غصّہ سے لال
کر لیا دربند اُس نے میری قسمت کی مثال

یاس سے پھر وہ مری صورت کو تکتا رہ گیا
بھوک سے یوں ہی مرا بچّہ بلکتا رہ گیا

(خاص)

نشتر

"مجھے تم سے محبّت ہے"

"مجھے تم سے محبّت ہے" بہت سادہ سا جملہ تھا یہ وہ الفاظ ہیں جنمیں نہ جدّت تھی نہ نُدرت تھی
میں حسن و عشق کے قصّوں میں اکثر انکو سنتا تھا مری نظروں میں انکی کوئی عزت تھی نہ وقعت تھی
نہ مجھ پر تھا اثر ان کا نہ یہ اتنے موثّر تھے
یہ وہ الفاظ ہیں جو ہر کس و ناکس کے لب پر تھے

مگر تم نے حجاب آگیں ادا سے سرنگوں ہوکر لبِ لعلیں کو جنبش دی اور اس فقرے کو دُہرایا
تمہاری سادگی تھی اور یہ پیغامِ جاں پرور مرے دل نے سُنا اور سُن کے مجھ پر یہ ستم ڈھایا
رگ و پے میں مرے ظالم نے لاکھوں بجلیاں بھر دیں
سکون و ضبط کی سب کوششیں یوں رائگاں کر دیں

میں اب سمجھا ہوں کچھ مفہوم اس سادہ عبارت کا میں اب سمجھا ہوں ان الفاظ میں کیا راز پنہاں ہے
محبّت نے سکھایا فلسفہ مجھ کو محبّت کا محبّت درد ہے میرا محبّت میرا درماں ہے
محبّت میری دنیا ہے۔ محبّت میری دولت ہے
مجھے تم سے محبّت ہے مجھے تم سے محبّت ہے

(اکبر منزل دہلی) اکبر حیدری

غزل

(از جناب نظیر احمد صاحب ظفر گجرات)

سہنے پڑے ہیں عشق میں رنج و محن مجھے
کر دیں وداع شوق سے ارباب تن مجھے

آیا نہ راست زیست میں بھی پیرہن مجھے
احباب دفن کر دیں یونہی بے کفن مجھے

لٹتا رہا جمال کے جلووں میں عمر بھر
دیتی رہی فریب تری انجمن مجھے

عرض وفا کا خوب ملا اجر عشق میں
سننے پڑے جواب بہت دلشکن مجھے

صیاد فصل گل میں قفس کو نفس ذکہ
آواز دے رہی ہے بہار چمن مجھے

طاری نہ کیوں ہوں دل پہ میرے ناامرادیاں
تم نے کبھی کیا ہی نہیں خندہ زن مجھے

ناموس قوم کیلئے دیتا ہوں جان میں
اب سب کہا کریں گے شہید وطن مجھے

بیٹھا تھا حد حسن پہ دل کو لئے ہوئے
زخمی بنا گیا کوئی ناوک فگن مجھے

ناکامئ حیات کی بگڑی سی شکل ہوں
بننا پڑا ہے عشق میں ننگ وطن مجھے

طوفان رنگ و بو کی حقیقت سمجھ چکا
پھر کیوں بلا رہی ہے نشاط چمن مجھے

میری حیات و زیست کا مرکز ہے یہ ظفر
محبوب کس لئے نہ ہو خاک وطن مجھے

ظفر

(خاص)

غزل

(از جناب شان شاطر غزنوی۔ امرتسر)

ادھر سے تو ذوق رنگ و بو کے جہاں کو لالہ زار کر دے
خزاں میں رنگ حیات بھر کر بہشت نادیدہ بہار کر دے

وفا کی دنیا میں این و آں کی تمیز کفر و وفا ہوا دیں!
کسی کا ہو جا کسی پہ مر جا کسی پہ خود کو نثار کر دے

بہار پھر اپنے رنگ و بو پر چمن میں اترا رہی ہے شاید
بڑا مزہ ہو وہ زلف مشکیں کو اب جو عنبر فشار کر دے

طلسم الفت کے معجزے پر تم طرفگی کی حد ہوئی ہے
کسی کو بے اختیار کر دے کسی کو غفلت شعار کر دے

ترے عدم اور وجود میں ہے بس اک ایک نفس کا فاصلہ
نظر کی حدوں کو تو بڑھا دے حقیقتیں آشکار کر دے

یہ حسن بے اعتنا کا شکوہ ہوا تو ہیں جذب الفت
تو اس نظر سے بھی کام لے کچھ جو حسن کو بیقرار کر دے

ملال مرگ دوام شاطر بقا کے رمز آشنا کو کیوں ہو
کچھ اس طرح جی کہ تیرا مرنا قضا کو بھی شرمسار کر دے

شاطر

(خاص)

غزل

از فخر المتاخرین حضرت ناطق جیلانی

تلاش گم گشتہ محبت سنا ہے مدنظر ہوئی ہے
یہاں تو کب کی خبر بھی آلی وہاں اب آکر خبر ہوئی ہے

فسردہ کیونکر نہ ہوتی جاتی کہ ان تلوں تیل ہی نہیں تھا
ہماری آنکھوں تک آتے آتے سمٹ کے دنیا صفر ہوئی ہے

جو تم سزا دو تو کوئی کافر ہی بیگنا ہی بتائے اپنی
خطا تو مجھ سے کوئی بظاہر نہیں ہوئی ہے مگر ہوئی ہے

مصیبت زندگی ہمیشہ خیال راحت سے آدمی کو
ہماری بستی بذوق مستی خمار ہستی کا گھر ہوئی ہے

بدل کے غصہ میں تم نے کروٹ جہان کا انقلاب دیکھا
پلٹ کے دنیائے عیش میری ابھی ادھر سے ادھر ہوئی ہے

کہاں ہے آئینہ دار حیرت اب ان سے آنکھیں ملا کے دیکھے
نگاہ خود بیں سے آئینہ ہے کہ محو ذوق نظر ہوئی ہے

لباس تمکیں کو رکھ دیا ہے حجاب نے چاک چاک کر کے
جسے وہ سمجھے ہیں پردہ داری وہی یہاں پڑہ در ہوئی ہے

کوئی تعجب نہیں جو واعظ اسی کو محشر سمجھ رہا ہو
ہمارے روز سیاہ کی بھی بری گھڑی میں سحر ہوئی ہے

شکایت عیب کیجئے کیا کہ عیب تو عیب تھے ہی ناطق
مرے ہنر پر بھی یہ سنا ہے کہ کچھ عیوب و ہنر ہوئی ہے

ناطق

(خاص)

جذبِ عشق

دو مسافروں کی گفتگو

[جنگل کا کنارا۔ رات کا وقت۔ آگ جل رہی ہے]

پہلا۔ وہ دیکھو سامنے نشیب ہے۔ اور اُس سے پرے سمندر۔ اگر کہو تو چلیں؟

دوسرا۔ (انگڑائی لیتے ہوئے) کل چلیں گے جنگل کی بھینی بھینی خوشبو استعدادِ دلکش ہے کہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا +

پہلا۔ تمہاری مرضی۔ (راز ہو جاتا ہے۔ لیکن سر اُٹھائے رکھتا ہے) یہ تو بتاؤ وہ تمہیں جنگل کے کنارے کون ملا تھا؟

دوسرا۔ نگین سا جس کی آنکھوں میں انوکھی چمک جھلک رہی تھی!

پہلا۔ ہاں! وہی۔ میں جلا آیا تھا۔ اور وہ تمہارے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا

دوسرا۔ محبت کا مریض تھا۔ عشق مجسم +

پہلا۔ بس یہی کچھ! میں نے ایسے بہت دیکھے ہیں +

دوسرا۔ لیکن وہ ایک مخصوص ہستی تھی۔ مجھے کئی عاشقوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن میں نے اُسے ان سے مختلف پایا ہے +

پہلا۔ اس نے تم کو کیا کہا؟

دوسرا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ اسے انجام کا راستہ نہیں ملتا۔ جونہی سر اُٹھا کر وہ آزادی اور مسرت پر نگاہ ڈالتا ہے۔ وہ پھر بھٹک جاتا ہے

پہلا۔ کیا عشق ایسا ہی خوفناک جذبہ ہے؟

دوسرا۔ وہ کہتا تھا کہ اوروں کے لئے شاید عشق میں مسرت ہو۔ لیکن اس کے لئے درد ہے۔ اور پیاسی تمنائیں! اُس نے مجھے بتایا کہ جو آرزو ہمیشہ پیاسی رہتی ہے۔ وہ ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی مانند ہے +

پہلا۔ میں نے یہ الفاظ اکثر سُنے ہیں۔ عاشق لوگ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں +

دوسرا۔ لیکن ایسے لوگ صرف چند ہی ہوں گے جو عشق میں ایک عارضی درد سے زیادہ تکلیف محسوس کرتے ہوں۔ وہ تو کہتا تھا کہ درد اس کے جگر میں بستا ہے +

پہلا۔ (سیدھا بیٹھ کر) کیا اس کے درد کا کوئی درماں نہیں! عورت کی محبت بھی!!؟

دوسرا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اطمینانِ قلب کے لئے لوگوں کو کس چیز کی ضرورت ہے لیکن وہ خود ناکام تمنّا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ وہ تیز آندھی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ بادل نہیں۔ وہ آسمان کی دیدگوارا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ستارہ نہیں اُسے یہ ارضی محبت بھی اچھی نہیں لگتی۔ وہ پھول نہیں ہر ایک چیز شربتِ وصل سے متمتع ہوتی ہے لیکن نہ معلوم وہ کس کے تکلیف دہ انتظار میں تنہا رہتا ہے +

پہلا۔ تو کیا میں نے آجتک کسی سے محبت نہیں کی؟ حالانکہ میں اپنے آپکو عاشق سمجھتا رہا ہوں +

دوسرا۔ یہ بھی عشق ہے۔ گو ساز الگ الگ ہیں لیکن موسیقی ہر ایک سے پیدا ہوتی ہے +

پہلا۔ (آگ پر اور لکڑی ڈالتے ہوئے) میرا راستہ غیر یقینی ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہوں ہر شے سے محبت کر کے خوش ہوتا ہوں۔ گو حقیقت سے دور ہوں۔ میرے لئے زمین ہے اور آزادی کسی کا پابند سلاسل نہیں (اوپر دیکھتا ہے) ستارے غائب ہیں۔ غریب عاشق آسمان کی دید سے بھی محروم ہے +

[ایک عورت داخل ہوتی ہے۔ ذرا جھجکتی ہے اور پھر آگے بڑھتی ہے]

سلسلہ ہر کامل سمجھا جاتا ہے۔ ہماری مراد مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے سابق نائب مدیر رسالہ معارف سے ہے
بزرگوار کے اس حصہ کی ترتیب دیتے رہے۔ اور اب نیرنگ خیال میں اُن کتابوں پر ریویو لکھیں گے جو دفتر میں ریویو کے لئے موصول ہوتی
یو نیورسٹی تلخیص و تبصرہ کا کام بھی کھولنے والے ہیں۔ کئی بار شروع کر کے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے طفیل نباہ نہ سکے تھے۔ اس طرح
وں میں ایک گرانقدر اضافہ ہو جائے گا +

نیرنگ ڈراما "حقایق" کے عنوان سے خاکسار ایڈیٹر نے مرتب کیا ہے۔ اس ڈراما کو بغور پڑھنے سے عورت کی صحیح فطرت کا مطالعہ
نے چھوٹا اور مرد کے لئے بہشت کی تخلیق کر سکتی ہے یا دوزخ کی بھٹی گرم کر سکتی ہے۔ لیکن کتنے مرد ہیں جو عورت کی نظرت سے ناواقفیت
کے طو دوزخ کی جلتی ہوئی اور نہ بجھنے والی آگ سلگا لیتے ہیں۔ اس ڈراما کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس طرح سے اس آگ کو ہوا
دیتے ہیں۔ کا خاکہ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ عورت مرد سے کیا چاہتی ہے؟ اس کا جواب بھی فلسفیانہ رنگ لیکن واقعات کی روشنی میں
اسی ڈرامہ حقایق میں ملے گا +

منظومات میں حضرت سجاد حیدر صاحب یلدرم کی نظم ثروت آرا ہے۔ جو مرحومہ کی یاد میں پاکیزہ جذبات سے مملو ہے۔ یہ نظم نسوانی رسالہ تہذیب میں
بھی شایع ہو گئی ہے۔ لیکن یا نے ایک خط کے ذریعہ سے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے یہ نظم صرف نیرنگ خیال کو بھیجی تھی۔ انہیں معلوم نہیں کہ کس
طرح سے اُن کی مرضی و منشا ت کا یہ نظم تہذیب میں شایع ہو گئی۔ حضرت تپش کی غزل واقعی لاجواب ہے۔ جناب مضطر کا کلام پہلی ہی دفعہ موصول ہوا ہے
لیکن جاذب توجہ ہے +

نیرنگ خیال کے آیندہ نمبر کے اس نمبر سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔ بالخصوص علی گڑھ سے "ڈربن" تک کی دوسری قسط بھی جنوبی افریقہ کی تازہ ڈاک
میں موصول ہو گئی ہے۔ اس مضمون کے ساتھ چند تصاویر بھی شایع ہو گئی +

اس نمبر میں جو تصاویر شایع ہو رہی ہیں اُن میں سے ایک رنگین ہے جس میں انگلستان کی تین معزز خواتین ایک جلسہ طرب میں بیٹھی ہیں۔ ایک
تصویر حضرت سام مرحوم کی ہے۔ جس کے متعلق ہم علیحدہ تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔ ہر قطع تصویر میں کئی تصویریں ہیں جن میں سے ایک تصویر خصوصیت سے
قابل توجہ ہے۔ یہ تصویر سید نجم الدین احمد جعفری صاحب بار ایٹ لا پبلسٹی آفیسر یو پی کی ہے۔ آپ یو پی کے سول سروس کے ایک نہایت قابل و محنتی
ممبر ہیں۔ جو تلمز اور تصنیف و تالیف سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ اور علم الاقتصاد کی انتہائی ڈگری لندن یونیورسٹی سے حاصل کر چکے ہیں۔ امید ہے کہ
آپکی ذات سے اردو علم ادب کو گرانقدر تقویت حاصل ہو گی + آپ کا فوٹو زیادہ روشن نہیں تھا اسلئے تصویر بھی زیادہ روشن نہیں چھپ سکی۔

حضرت سام مرحوم

نیرنگ خیال کے مشہور مضمون نگار حضرت سام بی۔ اے کے نام نامی سے آپ آشنا ہیں۔ اس فرضی نام کے تحت میں آپنے
متعدد مزاحیہ مضامین نیرنگ خیال کے صفحات پر ملاحظہ کئے ہو نگے۔ افسوس کہ سام صاحب ۱۳ اگست ۱۹۳۸ء کو اس عالم فانی
کے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون +

حضرت سام بی اے کا اصلی نام سید احمد محمد دمی تھا۔ آپ قبلہ احمد بابا محمدومی کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۳ فروری ۱۹۰۶ء ہے گویا
آپ نے چوبیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس عنفوان شباب میں ایک اچھے ادیب کا بزم ادب سے رخصت ہو جانا ملک کے لئے بہت بڑا نقصان ہے
جس قدر توقعات دنیائے ادب کو آپ سے تھیں اب وہ نقش برآب ہیں +

حضرت سام نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار مرحوم سے حاصل کی جو عربی فارسی اردو اور دینیات کے بہت بڑے عالم تھے۔ سام صاحب نے انٹرنس کا

امتحان اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ اور ایف اے کا امتحان اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کر کے یونیورسٹی کا وظیفہ حاصل کیا۔ مگر آپ نے اپنے کالج ہی میں جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں آپ نے بی اے کا امتحان اعلیٰ نمبروں پر پاس کیا۔ سال ۱۹۲۶ء کے اختتام پر آپ کے والد نے آپ کو سلسلۂ تعلیم سے علیحدہ کر دیا۔ جون ۱۹۲۶ء میں والد کی وفات کے صدمہ سے آپ بھی صاحبِ فراش ہو گئے۔ اور ڈیڑھ سال تک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مگر اس عرصہ میں بھی دوبارہ ایم اے میں داخل ہو کر اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہے +

سام مرحوم مختصر ناولوں کے تراجم کا بہت شوق رکھتے تھے۔ مگر ان میں سے آپ نے کبھی کوئی شایع نہیں کرایا۔ کالج میگزین کے علاوہ فردوس۔ ٹائمز آف انڈیا میں آپکے مضامین شایع ہوتے رہے جو آپکے مخصوص انداز اور دلکش طرزِ ادا کی وجہ سے بہت ہی مقبول ہوئے۔ آپ شہرت حاصل کر لی تھی جو کہنہ مشق ادیبوں کے حصّہ میں آتی ہے۔ آپکی وفات سے یقیناً ادبی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے +

مضمون نویسی کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ "مضمون نویسی میں مجھے کوئی خاص دقت محسوس نہیں ہوتی سیر کے دوران میں مضمون اور گھر پر آ کر اسے لکھ دیتا ہوں۔ ایک نظرِ ثانی کے بعد رسالہ میں ترسیل و تطبیع کے بالکل تیار ہو جاتا ہے"

مرحوم نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ احباب کے حلقہ میں اس درجہ ہر دلعزیز تھے کہ جہاں بیٹھ جاتے وہاں دوستوں کا مجمع ہو جاتا تھا۔ آپ نہایت شریف الطبع متحمل مزاج، ہمدرد اور نیک سیرت انسان تھے۔ شاید انہی خوبیوں کی وجہ سے قدرت نے انہیں اس آلائشوں سے پاک دنیا سے اٹھا لیا۔ آپکی وفات سے مرحوم کے عزیز و اقارب اور آپ کے تمام احباب کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہے۔ ہم اپنے ادبائے محمدنے اپنا ایک ہونہار ہمعصر اور مخدومی فیملی نے ایک نوجوان فرزند کھو دیا جس کا زخم برسوں تک تازہ رہے گا۔ اللہ پاک مرحوم کو میں جگہ دے اور ان کے عزیز و اقارب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے +

آپکی تصویر ناظرین نیرنگ خیال کے ملاحظہ کیلئے شایع کی جا رہی ہے۔ افسوس کہ ہم آپکی حیات میں انہیں آپ سے روشناس نہ کرا سکے اور نہ ہی سام کی اصلیت کو بے نقاب کر سکے۔

ایڈیٹر

بعدِ مرگ

یہاں میں اپنے اردگرد وہ وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تیرے خواب میں بھی نہیں آ سکتیں +

میرے پیارے دوست! انسان مر جاتا ہے۔ لیکن یاد رکھ وہ تنہا نہیں مرتا۔ بلکہ وہ سب دنیوی چیزیں جن کی وہ اپنی زندگی میں قدر کرتا ہے اور جن پر وہ اپنے عزیز ترین سرمائے کی بارش کرتا رہتا ہے۔ اُسکے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہیں۔ اور اگر دفن نہیں ہو جاتیں تو ان کے اس ہیئت میں تغیر و تبدل کا ہونا تو ایک امر یقینی ہو جاتا ہے +

بے شک یہی ایک ایسی چیز ہے جو نہیں مر سکتی۔ لیکن کیا کیا رفتہ رفتہ اُسس کی اس پہلی بات میں فرق نہیں آ جاتا!؟

(ورڈسورتھ۔ مارگیرٹ)

اخوت عمرپوری

سات دن کی بادشاہت[1]

علاء الدین خلجی کے عہد کا ایک خونیں اور عبرتناک واقعہ

اور

ہندوستان میں علوی خلافت قایم کرنے کی ناکام کوشش

(از جناب سید حسن برنی۔ بی۔ اے۔ ال ال بی (علیگ) ایڈوکیٹ بلند شہر)

سات دن کی بادشاہت کا واقعہ جو علاء الدین خلجی کے عہد میں پیش آیا تاریخ ہند کی ایک عبرتناک اور خونیں حکایت ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں نے اُس بدنصیب بادشاہ کا نام بھی سنا ہوگا جس نے دہلی میں صرف ایک ہفتہ بادشاہت کی تھی +

وہ ایک علوی سید تھا۔ جسے لوگ "نبیرہ (نواسہ) شاہ نجف" کے نام سے پکارتے تھے۔ اُس کی ماں سلطان شمس الدین التمش کی اولاد میں تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اِس دوہرے نسبی امتیاز کی وجہ سے اہل دہلی اُسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن وہ ایک معمولی شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اور کبھی اُس کے خواب و خیال میں بھی سلطنت کا خیال نہیں آیا تھا +

اُس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ اور بغیر اپنے ارادہ اور خواہش کے اُسے سات دن کے لئے بادشاہ بننا پڑا +

علاء الدین خلجی رنتھنبور کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اور تمام لشکر محاصرہ میں مشغول تھا۔ دہلی خالی تھی۔ اور وہاں کوتوال نے جس کا نام ترمدی تھا اپنے جور و تعدی سے لوگوں کو پریشان کر رہا تھا۔ ادھر محاصرہ طول کھینچتا جا رہا تھا اور خلق اللہ تنگ آ رہی تھی۔ ایسی حالت میں دہلی کے ایک منچلے شخص کو نئی بادشاہت قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا +

اس شخص کا نام حاجی تھا۔ وہ دہلی کے ایک قدیم کوتوال ملک الامرا فخرالدین کا غلام تھا۔ ایک زمانہ میں ملک الامرا اور اس کا خاندان سلطنت میں بڑا اثر و اقتدار رکھتے تھے۔ لیکن علاء الدین کے عہد میں یہ زبردست خاندان معزول ہو چکا تھا +

حاجی کا آقا بلبن کے زمانہ میں دہلی کا نہایت نیکنام اور ہر دلعزیز کوتوال رہ چکا تھا۔ جو اپنی سیر چشمی اور فیاضی کے لئے شہرۂ آفاق تھا۔ مورخ ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ اُس کے یہاں بارہ ہزار حافظ نوکر رہتے اور بارہ گھنٹے قرآن خوانی کرتے رہتے تھے۔ اُس کا معمول تھا کہ ہر روز نئے کپڑے بدلتا۔ اور جو کپڑے ایک مرتبہ پہن لیتا اُنہیں دوبارہ ہاتھ نہ لگاتا۔ بلکہ خیرات کر دیتا تھا۔ اسی طرح جس بستر اور چارپائی پر ایک مرتبہ آرام کر لیتا اُنہیں بھی دوبارہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یتیموں اور نادار لڑکیوں کی شادیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ہر سال ایک ہزار غریب لڑکیوں کا جہیز اُسکے ہاتھوں سرانجام پاتا تھا۔ جب کبھی کوئی کاتب قرآن مجید کا کوئی نسخہ اُس کے سامنے لیجا کر پیش کرتا۔ وہ اُسے ہدیہ دے کر لے لیتا اور کر دیتا۔ اس طرح اُس نے بیشمار کلام مجید لوگوں کو وفات پائی تو جامع مسجد کے بڑے در کے سا

---

[1] اس تاریخی واقعہ کا ماخذ ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" ہے۔ (دیکھو صفحہ ۲۸۲ – ۲۸۳)

معلوم ہوتا ہے کہ حاجی نے اپنے آقا کی ہر دلعزیزی سے، جو ابتک اہل دہلی کے دل سے محو نہیں ہوئے تھے۔ کام لیا اور انہیں نیا بادشاہ بنانے کے لئے اُٹھا +

علاء الدین جو اپنے آپ کو سکندر ثانی لکھتا تھا۔ بڑے دبدبہ کا بادشاہ تھا۔ لوگ اُس کے نام سے تھراتے تھے۔ حاجی بھی معلوم ہوتا ہے بلا کا شخص تھا جس نے لوگوں کو اُس کے خلاف آمادہ کر لیا +

رمضان کا مہینہ تھا۔ اور گرمی نہایت شدت سے پڑ رہی تھی کہ نئی بادشاہت قایم کرنے کا یہ منصوبہ شروع ہوا +

حاجی نے اس منصوبہ کی شروعات ایک عجیب حیلے کے ساتھ کیں وہ اپنی بغل میں ایک لپٹا ہوا کاغذ دبا ہوا لیکر ترمدی کے یہاں پہنچا، اور ظاہر کیا کہ شاہی فرمان آیا ہے۔ اسے لے کر آیا ہوں۔ ترمدی آرام کر رہا تھا۔ سُنتے ہی بلا کسی پس پیش کے جوتا پہن باہر نکل آیا۔ حاجی نے اپنے ساتھ کچھ آدمی لگا رکھے تھے۔ وہ ننگی تلواریں لے کر دوڑ پڑے اور ترمدی کو وہیں قتل کر ڈالا۔ حاجی نے لوگوں سے کہا کہ میرے پاس یہ فرمان شاہی آیا ہوا ہے۔ جس میں ترمدی کے قتل کرنے کا حکم ہے +

اس کے بعد حاجی نے دہلی کے تمام دروازوں پر اپنا پہرہ بٹھا دیا۔ اور شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا +

دہلی میں ایک دوسرا نیا حصار تھا۔ جسے جلال الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ وہاں ایک کوتوال رہتا تھا۔ حاجی نے اُسے بھی فرمان کے بہانے سے بلانا چاہا۔ لیکن وہ اپنے حصار کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہا +

اس طرف دہلی میں حاجی کو شکِ لعل پر بھی جو علاء الدین کا شاہی محل تھا۔ اور جسے بلبن نے تعمیر کرایا تھا قابض ہو گیا۔ شاہی خزانے کھول دیئے اور زر ریزی شروع کر دی۔ اسلحہ خانوں سے لوگوں میں ہتھیار بانٹنے اور بارگاہ سے گھوڑے دینے لگا۔ الغرض لوگ حوق حوق اُس کے ساتھ ہو لئے +

حاجی نے خود پادشاہی اختیار نہیں کی۔ بلکہ اس کے لئے "نصیب شاہ نجف" کو انتخاب کیا۔ وہ ہر چند پس و پیش کرتا رہا۔ لیکن زبردستی اُسے تخت پر لا بٹھایا۔ اور اُس کے نام سے عوام و خواص سے بیعت لینی شروع کر دی +

تین چار دن تو بے خل و غش نئی پادشاہت کے کاروبار چلتے رہے لیکن قسمت نے بہت جلد پلٹا کھایا۔ اور علاء الدین کے کچھ فوجی عہدہ دار اپنی فوجیں لئے دہلی پہنچ گئے۔ اور ملک حمید الدین امیر کوہ کی سرکردگی میں حاجی کے خلاف آمادۂ پیکار ہو گئے۔ کئی دن تک دہلی میں فریقین میں جنگ جاری رہی

حاجی بھی شمشیر بکف میدان میں نکل آیا اور امیر کوہ سے دست بدست کی نوبت پہنچی۔ لڑتے لڑتے دونوں مبارز گھوڑوں سے اُتر کر زمین پر زور آزمائی میں مصروف ہو گئے۔ امیر کوہ نے حاجی کو مغلوب کر کے نیچے گرا دیا اور اُس کے سینہ پر سوار ہو کر اُس کا سر تن سے جدا کر دیا +

حاجی کے طرفداروں نے امیر کوہ پر وار کئے۔ اور وہ بھی زخمی ہوا۔ لیکن اپنی جان بچا لے گیا +

حاجی کے مارے جاتے ہی علاء الدین کے ہوا خواہ کوشک لعل میں جا گھسے۔ اور اس مسکین اور بے خبر علوی کا سر تن سے جدا کر ڈالا۔ اور اُسے نیزہ پر چڑھا کر شہر میں گشت کیا +

کچھ دن بعد بادشاہ کا بھائی الغ خاں دہلی میں پہنچ گیا۔ اور جن لوگوں نے اس نئی پادشاہت قایم کرنے میں حصّہ لیا تھا۔ انہیں بے دریغ تہ تیغ کیا۔ اسی سلسلہ میں ملک الامرا کا خاندان بھی ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گیا۔

یہ ہیں اُس ہفت روزہ بادشاہت کے عبرتناک واقعات جو دہلی میں عہد علائی میں قایم ہوئی تھی +

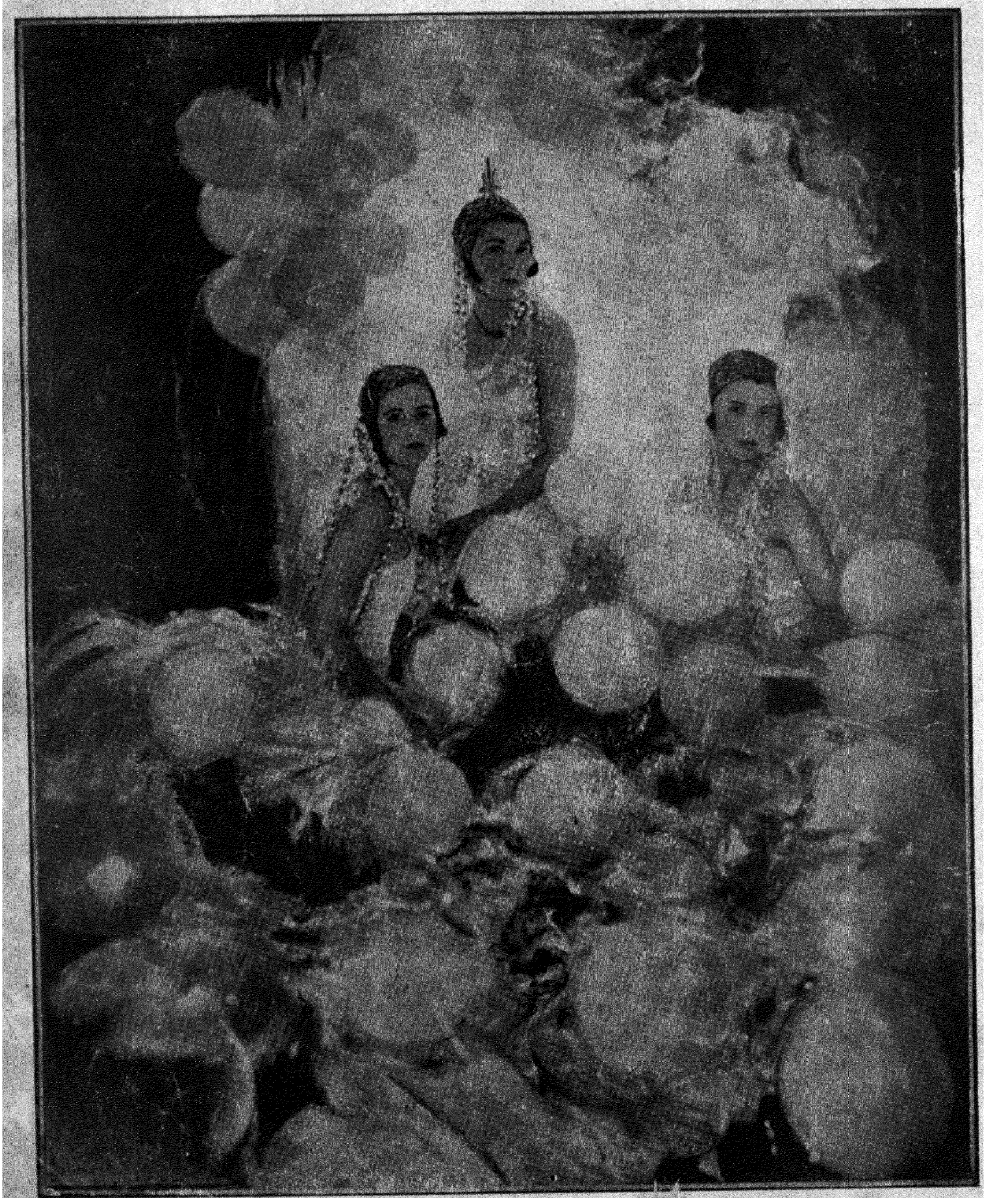
(خاص)

سید حسن برنی

آزیانہ اور مشہور و مقبول ماہوار رسالہ نیرنگ خیال (جو ہزارہا کی تعداد میں چھپتا ہے)

نافروغ تجارت کا بہترین ذریعہ ہے +

منیجر



تین عکسی اکٹھے خواتین ایک جاسہ رقص میں

کے تمام خزانے مستور ہیں۔ اسے پڑھ! تو بھی زمین پر اسقدر ہی مقتدر اور باشرف ہوگا جسقدر کہ آسمان پر زحل ہے +

[فرشتے چلے جاتے ہیں]

فاسٹس۔ آہ۔ میں کسقدر فریب میں مبتلا ہوں۔ اب وقت ہے کہ میں ارواح کو ہر وہ چیز لانے کا حکم دوں۔ جس کی مجھے تمنا ہے۔ تمام شکوک کو دور کردوں۔ اور بے جگری سے ان مہموں پر کمربستہ ہو جاؤں جو میرے خیال میں آئیں۔ میں ارواح کو حکم دونگا کہ وہ زرخالص کے لئے ہندوستان جائیں مشرق کے دُر ہائے شاہوار کے لئے سمندروں اور دریاؤں کو چھان ماریں۔ اور ثمر ہائے دلکش اور فواکہات انگبیں کے لئے جو شاہوں کی شان کے شایاں ہوں۔ نئی دنیا کے باغات کی ڈالی ڈالی تلاشی لیں۔ میں انہیں کہونگا کہ وہ عجیب وغریب حکمت کے معمّے اور غیر ممالک کے بادشاہوں کے اسرار میرے سامنے بیان کریں۔ میں انہیں کہونگا کہ تمام جرمنی کے گرد پیتل کی ایک بلند فصیل تیار کریں اور تیز رفتار پیارے وُنبرگ کے گرد حلقہ بنا تا ہوا گذرے۔ میں انہیں حکم دونگا کہ وہ عمومی درسگاہوں میں اسقدر دیبا وحریر تقسیم کریں کہ طلبا انہیں بافراغت زیب تن کرسکیں۔ میں سیاہیوں پر ان خزائن کے دروازے کھول دونگا جو ارواح مجھے لاکر دیں گی۔ اور پارما کے شہزادے کا تعاقب کرکے اپنے ملک سے نکال دونگا اور تمام صوبوں پر حکومت کرونگا۔ آتش جنگ بھڑکانے کے لئے میری جنگجو طبیعت ان آتشین جہازوں سے زیادہ خوفناک آلات تیار کریگی جن کا مظاہرہ انٹورپ کے پُل کے قریب کیا گیا تھا +

[فاسٹس اپنے دو دوستوں سے مشورہ کرتا ہے۔ جو اُسے بتاتے ہیں کہ شیطان یا اُس کے سپلا میفسٹوفلس کو کس طرح طلب کیا جاسکتا ہے۔ فاسٹس ایک ویرانے کنج میں جاتا ہے اور سحر پڑھتا ہے میفسٹوفلس نمودار ہوتا ہے]

فاسٹس۔ تیری صورت نہایت مکروہ ہے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ جاکر تبدیل کر آ ——— جا اور ایک مسیحی زاہد کے لباس میں آ شیطان کے لئے یہ صورت نہایت موزوں ہے +

(میفسٹوفلس جاتا ہے)

میں دیکھتا ہوں میرے الفاظ میں اثر ہے۔ کون ہے۔ جو اس آسمانی علم کا ماہر ہونا نہیں چاہتا۔ میفسٹوفلس کسقدر اطاعت گذار اور فرمانبردار ہے۔ اس میں علم کسقدر ہے۔ یہ جادو اور علم کی طاقت ہے۔ نہیں۔ بلکہ فاسٹس اب سارا جہان عالم کا بھی سرتاج ہوگا +

[میفسٹوفلس ایک مسیحی زاہد کے لباس میں داخل ہوتا ہے]

میفسٹوفلس۔ فاسٹس کیا حکم ہے مجھے؟

فاسٹس۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو ہر وقت ایک خادم کی طرح میرے ساتھ رہ۔ میرے احکام کی تعمیل کر۔ اگر میں کہوں چاند کو اُس کے کرّہ سے گرادے یا سمندر کو کہ کہ وہ تمام روئے زمین پر چھا جائے تو یہ بھی کر +

میفسٹوفلس۔ میں شیطان اعظم کا خادم ہوں۔ اور اُس کی اجازت کے بغیر تیرا خادم نہیں ہوسکتا۔ میں صرف اس کے احکام کی ہی تعمیل کرسکتا ہوں

فاسٹس۔ کیا اُس نے تجھے میرے پاس آنے کا حکم نہیں دیا؟

میفسٹوفلس۔ نہیں میں اپنی مرضی سے آیا ہوں!

فاسٹس۔ کیا میرے سحر پڑھنے نے تجھے یہاں آنے پر مجبور نہیں کیا؟ جواب دے!

میفسٹوفلس۔ یہ صحیح ہے لیکن محض ایک اتفاق تھا۔ جب ہم کسی کو خدا، اُس کی کتابوں اور نجات دہندہ مسیح پر لعنت بھیجتے سنتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے پاس جاتے ہیں۔ محض اس امید پر کہ ہم اس کی روح کو حاصل کرسکیں۔ ہم کبھی کسی کے پاس نہیں جاتے۔ جب تک کہ وہ الفاظ زبان سے نہ نکالے جس سے اُس کی روح کے تباہ ہونے کا احتمال ہو ——— میں تجھے بتائے دیتا ہوں کہ شیطانی قوت کی اعانت حاصل کرنے کا بہترین راستہ تثلیث پر لعنت کرنا اور جہنم کے شہزادے کی درگاہ میں التجائے نیاز پیش کرنا ہے +

فاسٹس۔ فاسٹس نے ایسا کیا تو ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ عظیم ترین لعنت جب کی ہے۔ جس کے لئے فاسٹس نے اپنے تئیں وقف کردیا ہے۔ قہر و غضب کے الفاظ اسے خائف نہیں کرسکتے۔ کیونکہ وہ بہشت کو دوزخ پر ترجیح نہیں دیتا۔ اس کی روح قدیم فلسفیوں کی ارواح کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑ! مجھے بتا تیرا آقا شیطان کیسا ہے؟

میفسٹوفلس۔ وہ دنیا کا بادشاہ اور تمام "ارواح" کا سرافسر ہے +

فاسٹس۔ کیا لوسیفر کبھی فرشتہ نہیں تھا؟

میفسٹوفلس - ہاں وہ فرشتہ تھا۔ اور خدا کا مقبول ترین فرشتہ!
فاسٹس۔ تو پھر وہ شیاطین کا بادشاہ کس طرح بن گیا؟
میفسٹوفلس - اکراہ و استکبار سے۔ خدا نے اُسے بہشت سے نکالدیا +
فاسٹس۔ اور تو لوسفیر کے ساتھ کیوں رہتا ہے؟
میفسٹوفلس - وہ بدقسمت روحیں جنہوں نے خدائے قدوس کے خلاف شیطان کے ساتھ مل کر سازش کی تھی اس کے ساتھ ہی آسمان سے بدر کردی گئی تھیں۔ اور یہ ارواح بھی جن میں سے ایک میں ہوں ہمیشہ کے لئے مقہور و مردود ہیں +
فاسٹس - تو پھر تو جہنم میں کیوں نہیں؟
میفسٹوفلس - میں جہنم میں ہی تو ہوں۔ میں جہنم سے باہر نہیں۔ کیا تو خیال کرتا ہے کہ میں جو خدا کے نور کو بے نقاب مظاہرہ کر چکا ہوں۔ ایک بار آسمان کی ابدی مسرتوں کا لطف اُٹھا چکا ہوں۔ اب اُن سے محروم ہو کر جہنم کے عذاب میں مبتلا نہیں؟ فاسٹس یہ باتیں نہ پوچھ۔ انہیں سُن کر میری روح کانپنے لگتی ہے +
فاسٹس - کیا عظیم میفسٹوفلس فردوس کی مسرتوں سے محروم ہونے پر اسقدر متاسف ہے۔ تو مجھ سے مردانہ مبر و تحمل سیکھ۔ ان مسرتوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ جو اب تیری قسمت میں نہیں! جا لوسفیر کو جا کر اس امر کی خبر دے۔ کہ فاسٹس نے مجنونانہ خیالات سے ابدی موت کو طلب کر لیا ہے۔ اور اب وہ اپنی روح تیرے سپرد کرتا ہے۔ تاکہ تو اسے چوبیس ماہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی اجازت دے۔ اُسے کہدے کہ میں چاہتا ہوں تو میرے ساتھ ایک خادم کی طرح رہے۔ جو چیز میں چاہوں میرے حضور میں پیش کرے۔ جو میں پوچھوں اُس کا جواب دے۔ میرے دشمنوں کو قتل کرے اور میرے دوستوں کی مدد کرے ـــــ اور ہمیشہ میرے احکام کی تعمیل کرتا رہے ـــــ جا عظیم لوسفیر کے پاس جا ـــــ اور آدھی رات کے قریب میرے مطالعے کے کمرے میں آکر اپنے آقا کے فیصلہ سے آگاہ کر +
میفسٹوفلس - میں جاتا ہوں +

[جاتا ہے]

فاسٹس - اگر میرے پاس ستاروں کی سی فراواں روحیں ہوتیں تو میں میفسٹوفلس کی نذر کر دیتا۔ اس کی مدد سے میں دنیا کا عظیم ترین شہنشاہ ہوتا۔ میں ہوا میں متحرک پل بنواتا تاکہ میری سپاہ سمندروں کو عبور کرتی۔ میں افریقہ کی پہاڑیوں کو پیس سے ملا کر ایک وسیع براعظم بنا دیتا۔ اور یہ دونوں میرے باجگذار ملک ہوتے۔ شہنشاہ میری اجازت سے حکومت کرتے! اب چونکہ جو کچھ میں چاہتا تھا حاصل کر چکا ہوں۔ میں جبتک میفسٹوفلس واپس نہ آئے تصورات اور تخیلات میں وقت کاٹونگا +

[میفسٹوفلس آتا ہے اور فاسٹس کو لوسفیر کے ارادے سے آگاہ کرتا ہے]

میفسٹوفلس - میں ہر وقت فاسٹس کی خدمت میں حاضر رہونگا۔ اور وہ میری خدمات اپنی روح سے خریدے گا +
فاسٹس - ہیں وہ پہلے ہی تیری نذر کر چکا ہوں +
میفسٹوفلس - لیکن فاسٹس روح تجھے دستور کے مطابق پیش کرنی ہوگی تجھے اپنے خون سے معاہدہ لکھنا ہوگا۔ کیونکہ لوسفیر یہ ضمانت طلب کرتا ہے۔ اگر تجھے اس سے انکار ہے۔ تو میں پھر جہنم کو واپس چلا جاتا ہوں +
فاسٹس - میفسٹوفلس ٹھہر۔ مجھے بتا تو۔ میری روح سے تیرے آقا کو کیا فائدہ ہوگا؟
میفسٹوفلس - وہ اپنی مملکت کو وسیع کرے گا +
فاسٹس - کیا محض اس لئے وہ ہم کو گمراہ کر دیتا ہے؟
میفسٹوفلس - مجھے یہ بتا ـــــ کیا تو اپنی روح یہ چاہتا ہے؟

[وہ معاہدہ جس کی رو سے فاسٹس اقرار کرتا ہے کہ چوبیس ماہ کے بعد وہ اپنی روح شیطان کے سپرد کر دیگا خون سے لکھنا ہوتا ہے۔ فاسٹس اپنے بازو میں خنجر چبھو لیتا ہے۔ خون جم جاتا ہے اور بہتا نہیں]

میفسٹوفلس - میرے خون کے منجمد ہونے کے کیا معنے؟ کیا اس کی مراد یہ ہے کہ میں معاہدہ نہ لکھوں؟ "فاسٹس اپنی روح تیرے سپرد کرتا ہے" پھر جم جاتا ہے۔ یہ انجماد کیوں ہے؟ کیا روح میری نہیں ہے؟ پھر کیوں نہ لکھوں "فاسٹس اپنی روح تیرے سپرد کرتا ہے"

[میفسٹوفلس دہکتے ہوئے انگارہ کی انگیٹھی لیکر آتا ہے]

میفسٹوفلس۔ میں آگ لے آیا ہوں۔ آ معاہدہ لکھ +

فاسٹس۔ اب خون پگھلنا شروع ہوگیا ہے۔ میں فوراً معاہدہ لکھے دیتا ہوں +

[میفسٹوفلس فاسٹس کی درخواست پر اس کے لئے ایک زہرہ وش محبوبہ لاتا ہے لیکن دراصل ایک شیطان ہی عورت کی صورت میں ہوتا ہے]

میفسٹوفلس۔ فاسٹس بتا تو تجھے اپنی محبوبہ پسند ہے؟

فاسٹس۔ لعنت ہو اس پر!

میفسٹوفلس۔ خاموش فاسٹس! ازدواجی تعلقات محض رسمی کھلونا ہیں۔ اگر تجھے میرا کچھ احترام ہے تو اس کا خیال نہ کر۔ ہر وہ عورت جس پر تیری آنکھ پڑتی ہے اور جس کو تیرا دل چاہتا ہے تو لے سکتا ہے۔ وہ تیرے حضور میں پیش کر دی جائے گی۔ خواہ وہ کسقدر پاکباز کسقدر ہی عقلمند کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ اسقدر ہی خوبصورت ہو جسقدر کہ لوسیفر بہشت سے نکالے جانے سے پیشتر تھا۔ یہ کتاب لے اور اسے اچھی طرح غور و فکر سے پڑھ +

[کتاب دیتا ہے]

اگر تو یہ سطور پڑھے گا تو تجھے زر و مال حاصل ہوگا۔ اور اگر زمین پر یہ دائرے بنائے گا تو آندھیاں اٹھینگی۔ طوفان آئیں گے۔ بادل گرجیں گے۔ اور بجلیاں کڑکیں گی +

فاسٹس شکریہ! میفسٹوفلس۔ لیکن میں ایسی کتاب چاہتا ہوں جس کے پڑھنے سے جب میں چاہوں ارواح طلب کر سکوں +

میفسٹوفلس۔ تمام سحر یہ لکھے ہوئے ہیں +

[کتاب کے اوراق الٹتا ہے]

فاسٹس۔ ایسی کتاب بھی ہے جس میں میں آسمان کی تمام مخلوق سیاروں اور ستاروں کو دیکھ سکوں۔ اور ان کی حرکات اور تراکیب سے آشنا ہو جاؤں +

میفسٹوفلس۔ یہ بھی اس کتاب میں موجود ہیں +

[اوراق الٹتا ہے]

فاسٹس۔ مجھے ایسی کتاب چاہئے جس میں تمام جڑی بوٹیوں اور اشجار کی خاصیتیں اور اثرات دریافت کر سکوں +

میفسٹوفلس۔ یہ بھی اس کتاب میں موجود ہے +

[فاسٹس عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ خواہشات نفسانی کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن اکثر اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات پیدا ہوتے ہیں]

فاسٹس۔ جب میں آسمانوں پر نظر کرتا ہوں اور ان کا جلال دیکھتا ہوں تو اے میفسٹوفلس تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کیونکہ تو نے مجھے اس مسرت سے محروم کر دیا ہے +

میفسٹوفلس۔ کیا تیرا خیال ہے کہ آسمان اسقدر شاندار اور عظیم ہیں جسقدر کہ تو ہے۔ یا وہ عظمت میں کسی انسان کا مقابلہ کر سکتے ہیں

فاسٹس۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

میفسٹوفلس۔ اس لئے کہ وہ انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ انسان ان کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ اس لئے انسان کا مرتبہ ان سے کہیں بلند ہے +

فاسٹس۔ اگر وہ انسان کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تو وہ میرے لئے بھی بنائے گئے ہیں۔ میں جادو کو ترک کرتا ہوں اور تائب ہوتا ہوں +

[نیکی اور بدی کے دو فرشتے داخل ہوتے ہیں]

نیکی کا فرشتہ۔ فاسٹس توبہ کر۔ خدا تجھ پر رحم کرے گا +

بدی کا فرشتہ۔ تو "ارضی روح" ہے خدا تجھ پر رحم نہیں کر سکتا +

فاسٹس۔ یہ کون کہتا ہے۔ میں ارضی روح ہوں۔ میں چاہے شیطان ہوں خدا پھر بھی معاف کر دے گا +

بدی کا فرشتہ۔ لیکن فاسٹس کبھی تائب نہ ہوگا +

[فرشتے جاتے ہیں]

فاسٹس۔ میرا دل پتھر ہو چکا ہے۔ میں توبہ نہیں کر سکتا۔ اب میں نجات، ایمان یا خدا کا نام نہیں لے سکتا۔ لیکن میرے دل میں خوفناک صدائیں سنائی دیتی ہیں کہ فاسٹس تو مقہور و مردود ہے۔ میرے سامنے مختلف اسلحہ تلواریں، تیر و تفنگ، زہر میں بجھے ہوئے بھالے پڑے ہیں کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں اور اگر مسرت و انبساط میری روح کی گہرائیوں میں نہ اتر گئے ہوتے تو میں کبھی کا اس کا خاتمہ کر دیتا۔ کیا ہومر نے مجھے اسکندر کے افسانے گا کر نہیں سنائے؟ کیا اس نے یونان کے نغموں سے میرے ایوان کو معمور نہیں کر دیا۔ کیا میرے

قصر کے روبرو دیوار سے دلکش ترانوں کی آوازیں نہیں آتیں؟ اور کیا میفسٹوفلس ان کے ساتھ ہم آہنگی سے نہیں گاتا؟ تو پھر میں اپنے تئیں کیوں ہلاک کروں؟ مایوسی اور ناکامی کے جذبات دل میں لیکر کیوں جان دوں؟ میں نے عزم مصمم کر لیا ہے میں ہرگز توبہ نہیں کرونگا +

آہ میفسٹوفلس آؤ تاکہ ہم علم سیارگان پر بحث کریں۔ مجھے بتا کہ اس گردنور کے بعد جسے ہم رات کے وقت آسمان پر دوخشاں دیکھتے ہیں۔ اور یہ چاند میں۔ کیا تمام اجرام فلکی مرکز ارض کی مانند صرف ایک کرہ ہیں +

میفسٹوفلس - اجرام فلکی کی مثال بالکل عناصر کی سی ہے۔ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہے۔ اور تمام ایک مرکز کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ عطارد، زحل، زہرہ، مشتری۔ فرضی نام نہیں ہیں بلکہ جو سما میں سیارے ہیں +

[اپنے غیر محدود علم وفضل کی وجہ سے فاسٹس متکبر و مغرور ہو جاتا ہے وہ ایک ایسا لباس پہنکر جس سے وہ لوگوں کو نظر نہیں آتا پائے روم کے ایوان ضیافت میں جاتا ہے۔ سامان ضیافت طشت اور پیالے منتشر کر دیتا ہے۔ تمام محفل پر شعلے پھینکتا ہے۔ اور زاہدوں کو مارتا ہے ہی شہنشاہ کو اپنی طاقت و قوت کا یقین دلانے کے لئے وہ اسکندر اعظم کی روح کو طلب کرتا ہے +

وہ چند جلکا کی درخواست پر ہیلن آف ٹرائے کو بھی بلاتا ہے لیکن خود اس کے حسن جہاں سوز کا والہ و شیدا ہو جاتا ہے۔ اور اُسے دنیا میں واپس بلانے کا مطالبہ کرتا ہے +

آخرکار اس کا انجام نزدیک آجاتا ہے۔ آخری لمحات احباب کی صحبت میں گذارتا ہے۔ اس کی روح اسے اس کے افعال پر ملامت کرتی ہے۔ لیکن اس کے دوست اس کو تسلی تشفی دیتے ہیں پھر اسے تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں جاکر اس کے لئے دعا مانگتے ہیں]

فاسٹس - آہ۔ میرے لئے دعا کرو۔ دعا کرو میرے لئے۔ لیکن اگر تم میرے کرے میں کچھ شور و غل سنو تو مت آؤ۔ اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے نجات نہیں دلا سکتی ایک حکیم۔ تو بھی دعا مانگ اور ہم بھی دعا مانگتے ہیں۔ خدا تجھ پر رحم کرے +

فاسٹس - الوداع! حضرات الوداع۔ اگر میں صبح تک زندہ رہا تو آپکی خدمت میں حاضر ہونگا۔ اور اگر میں نہ آؤں تو سمجھ لیجئے فاسٹس جہنم میں گیا +

سب - الوداع۔ فاسٹس +

[سب حکیم چلے جاتے ہیں۔ گھنٹہ گیارہ بجاتا ہے]

فاسٹس - آہ۔ فاسٹس اب تیری زندگی کا صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔ اسکے بعد تو ہمیشہ کے لئے مردود ہوگا۔ اے آسمان کے گردش کرتے ہوئے اجرام فلکی۔ ٹھہر جاؤ۔ تاکہ وقت بھی ساکت ہو جائے۔ اور ابھی آدھی رات نہ ہو۔ اے فطرت کی حسین دلہیل آنکھو تم پھر بلند ہو جاؤ اور ایک ابدی روز کو طلوع کرو ——— آہ یا یہ لمحہ ایک سال، ایک ماہ، ایک ہفتہ یا صرف ایک روز کے برابر ہو جائے تاکہ فاسٹس توبہ کر کے اپنی روح کو بچا سکے +

ستارے اب بھی رقصاں ہیں۔ وقت بھاگا جا رہا ہے۔ ابھی گھنٹہ بجیگا شیطان آئے گا۔ اور فاسٹس کی روح ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی میں خدا کی آغوش میں پناہ چاہونگا۔ یہ کون ہے جو مجھے نیچے کی جانب کھینچ رہا ہے +

آہ! آہ وہ آسمان پر مسیح کا مقدس خون بہہ رہا ہے۔ اس کا صرف ایک قطرہ میری روح کو نجات دے سکتا ہے ——— آہ میرے مسیح! اے شیطان مجھ پر رحم۔ میرا دل پاش پاش نہ کر۔ میں اس کا نام لونگا۔ اب وہ کہاں ہے؟ وہ جا چکا ہے! آہ خدا کا بازو پھیلا ہوا ہے! اُس کی پرشکن پیشانی جھکی ہوئی ہے۔ اے پہاڑو اے گھاٹیو! آؤ۔ آؤ مجھ پر گر پڑو۔ مجھے دفن کر دو۔ مجھے خدا کے تباہ کن غضب سے بچا لو۔ نہیں میں اندھا دھند زمین میں سما جاؤنگا۔ اے زمین اپنا منہ چاک کر! آہ زمین بھی مجھے امان نہ دیگی۔ اے ستارو! جو میری پیدائش کے وقت بھی آسمان پر تھے۔ اور جن کے اثر نے میرے انجام کو موت اور ننگ سے ہمکنار کر دیا ہے۔ مجھے ایک دھند کی مانند اپنے آغوش میں کھینچ لو۔ مجھے بادلوں میں چھپا دو۔ تاکہ جب تم پھر مجھے نیچے کی جانب پھینکو تو میرے اعضا ہی زمین پر گریں اور میری روح آسمانی مملکتوں میں چلی جائے +

[گھنٹہ ساڑھے گیارہ بجاتا ہے]

نصف گھنٹہ بھی گذر گیا۔ نصف باقی ہے۔ وہ بھی گذر جائے گا۔ اے خدا ——— اگر تو میری روح پر رحم نہیں کرتا تو اپنے اکلوتے بیٹے کے صدقے جس نے اپنا خون میری خاطر بہایا۔ میرے اس مسلسل درد و آلام کا خاتمہ کر دے۔ فاسٹس ہزاروں سال جہنم میں رہے۔ لاکھوں سال آگ میں جلے۔ لیکن آخر کو اس کو نجات ہو جائے۔ آہ۔ مردود ارواح کا کچھ بھی انجام نہیں۔ فاسٹس کاش تو ایک غیر فانی روح مخلوق ہوتا۔ تو یہ لافانی مخلوق کیوں ہے؟ کاش فیثاغورث کا نظریہ صحیح ہو! میری روح مجھ سے جدا ہو جائے اور میں کوئی وحشی حیوان بن جاؤں

حیوان خوش ہیں کیونکہ جب وہ مرتے ہیں ان کی روح عناصر میں جذب ہو جاتی ہے
لیکن میری روح جہنم کے عذاب میں مبتلا رہے گی۔ آہ۔ لعنت ہو اُس
ماں پر جس نے مجھے جنا۔ اور ملعون و مقہور ہو وہ باپ جس کی پشت سے میں
پیدا ہوا۔ میں۔ فاسٹس اپنے تئیں ملعون ٹھہرا۔ شیطان پر لعنت بھیج جس نے
تجھے آسمانی مسرتوں سے محروم کر دیا ہے +

[گھنٹہ بارہ بجاتا ہے]

آہ۔ گھنٹہ بج رہا ہے۔ اے جسم اب ہوا میں تحلیل ہو جا۔ ورنہ شیطان
تجھے جہنم میں لے جائے گا +

[بادل کی گرج کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور بجلی چمکتی ہے]

اے روح قطروں میں تبدیل ہو کر سمندر میں مل جا۔ تاکہ تیری بازگشت
ناممکن ہو جائے +

[شیاطین داخل ہوتے ہیں]

اے میرے خدا مجھ پر اسقدر غضبناک نہ ہو۔ مجھ کو اور سانپوں! مجھے دم لے
لینے دو۔ خوفناک جہنم منہ نہ پسار۔ شیطان ٹھہر جا۔ میں اپنی کتابیں جلا دوں۔
اوہ مفسٹوفلس!

[شیاطین فاسٹس کو لے کر جاتے ہیں]

(خاص) حنیف ہاشمی

بیش بہا موتی

(۱) زندہ دلی تمام زندگی کے راستوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ رچٹر
(۲) مشکلات بیدار کرنے کے لئے ہیں نہ کہ افسردہ۔ چیننگ
(۳) دن کی صبح اور زندگی کی صبح قریب قریب یکساں ہوتی ہے۔ ڈکنس
(۴) نیک نامی مرد اور عورت کے لئے اُن کی روح کا زیور ہے۔ شکسپیر
(۵) جوان کے واسطے یہ دنیا عمل کی جگہ ہے نہ کہ سونے اور اونگھنے کیلئے۔ ڈکنس
(۶) کیا تم زندگی کو چاہتے ہو۔ تو پھر وقت مت ضایع کرو۔ چونکہ زندگی اسی چیز سے بنی ہوئی ہے۔ فرنکلن
(۷) خالص خزانہ جو وفاتِ فانی دے سکتا ہے وہ ایک بے داغ نام ہے۔ شکسپیر
۸ بیوقوف ہمیشہ وقت اور فاصلے کو مختصر کرنا چاہتا ہے۔ ایک عاقل ان دونوں کو طول دیتا ہے۔ رسکن
(۹) ہماری محبت ہماری زندگی ہے۔ ہم اسی سے جیتے ہیں۔ وہ ہماری زندگی کی حرارت کو قایم رکھتی ہے۔ چیننگ
(۱۰) میں نے اسے تاروں کے جگمگانے میں پایا۔ میں نے اسے کھیتوں کی گلکاری میں دیکھا۔ ٹینی سن
(۱۱) ایک غلطی جوانسان کو پشیمان کرتی ہے۔ وہ اس ایک اچھے کام سے زیادہ مفید ہے۔ جو اسے مغرور کر دیتا ہے + ولسن

محفوظ حسین ایم اے۔ اجمیر

سرحدی ڈاکو

(از جناب لطیف الرحمٰن صاحب۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

[وزیرستان کے ریذیڈنٹ نے خاصدار ولی جان کو سرحدی قبائل کے اُن دیدہ دلیر افراد کا سراغ لگانے کے لئے مامور کیا ہے جو اکثر خفیہ خفیہ سرحدی افواج کے مختلف گروہوں پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ یہ نڈر حملہ آور عام طور پر اپنے جسموں اور چہروں کو سفید چادروں میں چھپائے رکھتے ہیں۔ تاکہ اُن کی شناخت نہ ہو سکے۔ اس "برقعہ پوشی" کی وجہ سے سرحد کے افسر آجتک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ یہ لوگ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں +

کپتان افسر کریم ایم۔ بی۔ ای۔ کئی مرتبہ ان لوگوں کی گوشمالی کے لئے اور اپنی فوج کو ان کے زبردست حملوں سے محفوظ رکھنے کیلئے بے سود کوشش کر چکا ہے۔ اور چند دنوں سے اُس نے فوج کے آدمیوں کیلئے قسم کی رخصت قطعی بند کر دی ہے]

(۱)

مسٹر کیچم سرحدی خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ اپنی کوٹھی کے سامنے موٹر سے اُترا اور خاصدار ولی جان کے ہمراہ گول کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی اکلوتی بیٹی میری اپنی کرسی سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُس نے آگے بڑھ کر جوش مسرت سے اپنے دونوں ہاتھ باپ کی گردن میں ڈال دیئے۔ باپ اور بیٹی کچھ دیر اسی طرح ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر باتیں کرتے رہے۔ اور ولی جان ذرا فاصلے سے جوان میری کے حسین چہرے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ میری کشیدہ قامت تھی۔ اس کا سڈول جسم تناسب اور خوبصورتی کا مجسمہ تھا۔ اُس کے ارغوانی ہونٹوں کی ساخت۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں کی مستانہ دلکشی۔ اور اس کے لمبے بالوں کی پُر پیچ اُلجھنوں میں کچھ ایسی بات تھی جس سے ولی جان کچھ عرصہ کے لئے حیرانی کے عالم میں تصویر بنا کھڑا رہا۔ اور جب تھوڑی سی دیر کے بعد میری نے اُسے مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اچھے ہیں؟" تو اُس نے محسوس کیا کہ عمر بھر میں اُس نے اتنی دلکش آواز کبھی نہیں سُنی +

کچھ دیر کے بعد وہ تینوں کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھکر چائے نوشی میں مشغول ہو گئے۔ اور چائے نوشی کے دوران میں اُن کی گفتگو زیادہ تر سرحد کے سفید برقعہ پوشوں کے متعلق ہی رہی۔ میری اس گفتگو کو نہایت غور سے سنتی رہی۔ اور جب ولی جان نے ان لٹیروں کو قابو کرنے کے لئے اپنی تجویز مسٹر کیچم کے سامنے پیش کی تو باپ کے علاوہ بیٹی نے بھی اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ اور اپنے نوجوان مہمان کی قابلیت کی خوب داد دی۔ یہ تجویز ایک نہایت سادہ تجویز تھی۔ ایک لمبی مگر دلچسپ بحث کے بعد ان تینوں کو کامل یقین ہو گیا کہ اس میں ولی جان کو ضرور کامیابی حاصل ہو گی۔ بالآخر ولی کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے مسٹر کیچم کو مخاطب کر کے رازدارانہ انداز میں کہا "یہ یاد رکھئے کہ اس سارے معاملہ کی کامیابی کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ تمام علاقے میں یہ خبر اچھی طرح مشہور ہو جائے کہ اگلے ہفتے بہت سے قیمتی سامان کے علاوہ پرانی شراب کا ایک بڑا پیپا ریذیڈنٹ صاحب کے ہاں بھیجا جائے گا۔ اگر آپ اس بات کو پوری طرح مشتہر کرا دیں تو باقی تمام انتظام میں خود کر لونگا"

مسٹر کیچم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ولی جان اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے۔ تو گورنمنٹ کی طرف سے تمہیں بہت کچھ انعام اکرام ملے گا اور میرے متعلق تو تمہیں پہلے ہی علم ہے میں تمہارے جیسے آدمیوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔ میں اس بات کی پُرزور سفارش کرونگا کہ تمہیں فوراً نائک بنا دیا جائے +

اُس کے بعد ولی جان نے رخصت مانگی اور مسٹر کیچم کو سلام کرنے کے بعد جب وہ میری کی طرف مڑا تو اُس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ولی کے

ہاتھ میں دیدیا۔ ولی نے رواج کے خلاف کچھ زیادہ دیر تک اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اُسے دبانے میں بھی ضرورت سے ذرا زیادہ زور لگایا +

(۲)

سرکاری سامان لاریوں میں لدا ہوا جارُو اور سنسان وادی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ اس مرتبہ کمان افسر کرسم نے بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا۔ چنانچہ ہر ایک لاری میں ایک دو پہرہ داروں کے علاوہ اگلی نشست پر ایک فوجی افسر بٹھایا ہوا تھا۔ جس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور گرمی کا موسم۔ پاس کی شدت سے فوجیوں کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ لیکن پیاس کی تکلیف سے زیادہ جو چیز ان سب کو اس وقت ستا رہی تھی وہ پہاڑی ڈاکوؤں کے حملے کا خطرہ تھا۔ اور وہ سب کے سب بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے اردگرد نظریں دوڑا رہے تھے +

لاریوں کا قافلہ گرد اُڑاتا ہوا ایک پُل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن چونکہ یہ پل اس وقت زیر مرمت تھا۔ اس لئے انہیں سڑک کو چھوڑ کر ایک دوسرے عارضی راستے پر سے گذرنا پڑا۔ اس راستے کے موڑ پر ایک چھوٹا سا نوساختہ مکان کھڑا تھا۔ اور اس کے باہر یہ نوٹس لگا ہوا تھا۔

"برف کا پانی اور بیئر۔ فوجیوں کے لئے مفت"۔ اس نوٹس کو دیکھ کر لاریوں والوں نے بیساختہ خوشی کے نعرے لگائے اور تھوڑی سی دیر کے بعد تمام فوجی سپاہی نوٹس بورڈ کے گرد جمع ہو گئے۔ اُن کے افسر نے اپنے گرگابی نما خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے چند آدمیوں کو لاریوں کے پاس پہرہ دینے کے احکام صادر کئے اور پھر باقی ہمراہیوں کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہو گیا ——————

آدھ گھنٹے کے بعد لاریوں کا قافلہ اُسی طرح گرد اُڑاتا ہوا سڑک پر جا رہا تھا۔ لیکن اس بار لاریوں میں بیٹھے ہوئے فوجی کچھ سست سست سے نظر آ رہے تھے —— دس منٹ کے بعد تمام کے تمام اپنی اپنی جگہوں پر پڑے غافل سو رہے تھے —— برف کے پانی اور بیئر میں کوئی خواب آور چیز ملی ہوئی تھی:

ایک بڑے غار کے اندر سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نکل کر سفید برقعہ پوشوں نے ایکدم لاریوں پر حملہ کر دیا۔ مگر لاریوں والے تو خواب نوشیں کے مزے میں آ رہے تھے۔ مقابلہ کون کرتا۔ چنانچہ حملہ آوروں نے نہایت آرام اور اطمینان کے ساتھ گورنمنٹ کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ لوٹ کے اسباب میں سے جب پرانی شراب کا ایک بڑا پیپا بھی برآمد ہوا تو خوشی کے نعروں سے وادی کی فضا گونج اُٹھی۔ لوٹ کا باقی سامان اُٹھا کر سفید برقعہ پوش اس پیپے کو سڑک پر اپنے آگے آگے دھکیلتے ہوئے پتھریلی پہاڑیوں میں گم ہو گئے +

(۳)

شکستہ مسعودی قلعے کے ایک نیم تاریک کمرے میں لٹیرے لوٹ کا اسباب آپس میں تقسیم کر رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنی سفید چادروں کو اُتار کر الگ رکھ دیا تھا۔ اور اُس وقت وزیرستان کا ریذیڈنٹ وہاں موجود ہوتا تو یہ دیکھ کر اُس کے طوطے اُڑ جاتے کہ تمام کے تمام ڈاکو یورپین ہیں!

کمرے کے ایک کونے میں شراب کا وہی پیپا دھرا ہوا تھا۔ اس پیپے کا ڈھکنا آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا۔ اور اُس کے اندر سے دو انسانی ہاتھ نمودار ہوئے جن میں دو بڑے بڑے چمکدار پستول تھے +

"سب کے سب سیدھے کھڑے ہو جاؤ" کمرے کے اُس تاریک کونے میں سے ہمارے نوجوان خاص افسر نے گرج کر کہا۔ ڈاکو گھبرا گئے اُنہوں نے شراب کے پیپے کی طرف حیرانی کے ساتھ دیکھا۔ اور پھر سب نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ پستولوں کی خوفناک نالیاں اُن کو اپنے ہتھیار اُٹھانے کی مہلت ہرگز نہ دینگی۔ اُنہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ "دوسری طرف منہ موڑ کر قطار میں کھڑے ہو جاؤ" خاصدار ولی جان نے پھر گرج کر کہا۔ اس کے ایک منٹ بعد برقعہ پوشوں کا وہ ظالم گروہ جس نے چھ ماہ تک سرحد پر ایک قیامت بپا کر رکھی تھی۔ بالکل بے طاقت اور بے بس تھا۔ شراب کے پیپے میں سے باہر کود کر نوجوان جاسوس خاصدار ولی جان ڈاکوؤں کے سردار کی طرف بڑھا اور۔ اس کی پیٹھ پر اپنے بوٹ سے ٹھوکر مار کر بولا "میرا گمان درست نکلا۔ کمان افسر کرسم! شیطے کا نیلی آنکھوں والا لونڈا۔ اور سفید برقعہ پوش لٹیروں کا سرغنہ!"

کمان افسر بے بس تھا۔ کچھ دیر تک وہ ولی جان کے خشمناک چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر تھوڑی سی دیر کے بعد اُس نے گھبرا کر ٹوٹے پھوٹے فقروں میں اپنے جرم کا اقبال کیا اور معافی کی اُمید پر تمام راز ولی جان کے سپرد کر دیئے۔ باقی تمام ڈاکوؤں نے شرم کے مارے اپنے سر نیچے جھکا دیئے اور دو چار منٹ تک گہری سوچ میں غرق رہنے کے بعد ولی خان کا یہ مفہوم [illegible] سلیمان کا یہ مفہوم

ہی دل میں رحمدلی سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اور کمان افسر کو ایک نہایت نرم شرط پیش کی ـــــ اگر کمان افسر اپنے تمام ماتحت افسروں اور فوجی سپاہیوں کو اپنے مصارف پر ایک لمبی میعاد کے لئے رخصت دیدے۔ اور اس شرط کو پورا کرنے کے لئے ایک تمسک تحریر کردے تو وہ (ولی جان) اس راز کو پوشیدہ رکھے گا اور دنیا پر ظاہر نہیں ہونے دیگا +

(۴)

سورج غروب ہوچکا ہے اور شام کی دھندلی روشنی میں دو شخص آہستہ آہستہ پہاڑی راستے کی سخت چڑھائی کو طے کرتے ہوئے اُس قلعے کی طرف جارہے ہیں جو پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے +

"آپکے ہمراہ اس اُجاڑ اور سنسان علاقے میں گھومنا گویا جنت کی سیر کرنا ہے" +

"ہوں! ..... میرا خیال ہے کہ ہیں .... میں ..... تمہاری پرستش کرتی ہوں۔ خاصدار، والدار ولی جان!"

"میری مجھے صرف خاصدار ہی کہا کرو"

وہ دونوں چلتے چلتے رُک گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ـــــ تھوڑی سی دیر کے بعد وہ آپس میں بغلگیر ہوگئے +

(مائوس) (خاص) لطیف الرحمٰن

ثروت آرا (مرحومہ)

(یعنی ہمشیرۂ نذر سجاد حیدر صاحبہ کی یاد میں)

دل سے جاتا ہی نہیں آہ! خیالِ ثروت — کیا جوانی میں ہوا خشک نہالِ ثروت

اُس نے راحت کبھی دنیا میں نہ دیکھی آکر — اشک افشاں رہا ہر شخص بہ حالِ ثروت

عمر بھر وہ رہی تسلیم و رضا کی تصویر — فاطمہ سے تھا ضیا گیر جمالِ ثروت

اُس کی شیریں سخنی اور تواضع اُس کی — دلنشیں، دلبر و دلکش تھی خصالِ ثروت

دل میں ارمانوں کے تھے دفن خزانے کیا کیا — ساتھ ثروت کے گیا مال و منالِ ثروت

حور عین بن کے آئی وہ رہے جنت میں

اور باقی رہے دنیا میں مثالِ ثروت

خاص) سید سجاد حیدر

ایک تنقید کا کچّا چٹھا

رسالۂ چمن بابت اگست ۱۹۳۳ء میں جناب آہ سیتا پوری کا ایک مضمون "مواز نۂ قصائد ذوق و سودا پر ایک نظر" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ جسٹس شاہ سلیمان صاحب کا مضمون جس پر جناب آہ نے تنقید کی ہے میری نظر سے نہیں گذرا۔ موصوف نے رسالہ کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ بلکہ نام کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ مجھے محاکمہ کرنا مقصود بھی نہیں ہے لہذا رسالہ کا تعین بیکار ہے +

جناب آہ کا مضمون پڑھ کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ متانت سے گرا ہوا۔ مغز سے خالی۔ لہجہ نہایت خشن۔ ایسے ہی مضامین سے فن تنقید ذلیل و رسوا ہے۔ ہم لوگوں کی اخلاقی حالت اسقدر پست ہوگئی ہے۔ کہ کسی سربرآوردہ شخص کی ذات پر حملہ اور اُس کی منقصت کرنے میں اپنی نمود سمجھتے ہیں +

حضرت آہ سرسلیمان کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

"اتنی اہم ہستی جو بقول اہل علم معلوم ہوتی ہے اور ادب سے اتنی بے نیاز ہے۔ کاش مضمون نگار صاحب اس مضمون کے لکھنے کی زحمت نہ گوارا فرماتے اور اپنی ذمہ دار شخصیت پر نکتہ چینی کا موقع نہ دیتے" +

یہ ہے ہماری ذہنیت کہ جب کوئی "اہم ہستی" کوئی مضمون لکھے تو مضمون معرض ایراد نہ ہو بلکہ اُس کی شخصیت پر نکتہ چینی کی جائے!

ایک طویل تمہید کے بعد جس میں انگریزی داں طبقہ کی مذمت کی گئی ہے۔ اور بظاہر اس لئے کہ اس کا اطلاق سرسلیمان پر بھی ہو جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

"اس مضمون میں جناب جسٹس نے ذوق کو بحیثیت قصیدہ گو سودا پر ترجیح دینے کی سعی لاحاصل کی ہے اور ایسے طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جسے دیکھ کر ایک متین سے متین آدمی بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا" +

جیسا عرض کر چکا سرسلیمان کا اصل مضمون میرے سامنے نہیں ہے مگر جو اقتباسات حضرت آہ نے درج کئے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے۔ کہ حضرت آہ کا یہ ادعا کہ سرسلیمان نے ذوق کو سودا پر ترجیح دینے کی سعی کی ہے غلط فہمی یا اُس سے بدترلینی افترا پر مبنی ہے۔ سرسلیمان کی نقل کردہ عبارت یہ ہے:-

"مرزا رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق نے قصیدہ گوئی کو کمال پر پہنچایا ہے۔

. . . . . .

جو کاملین فن سودا کا مرتبہ بلند تر خیال کرتے ہیں وہ بھی اسکے قائل ہیں کہ سودا کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو ذوق کا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ کوئی دوسرا شاعر قصیدہ گوئی میں ذوق کا ہم پلہ نہیں ہیں اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس عام خیال کے رفع کرنے کی کوشش کروں اور ثابت کروں کہ حقیقتاً یہ غلط فہمی ہے۔ البتہ ذوق کے ایک منتقد کی حیثیت سے یہ فرض سمجھتا ہوں کہ ذوق اور سودا کے مقابلہ میں جو ناانصافیاں ہو جاتی ہیں وہ قایم نہ رہیں"

اس عبارت سے ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ سرسلیمان ذوق کو قصیدہ گوئی میں سودا سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریر کا حاصل صرف اسقدر ہے کہ قصیدہ میں ذوق سودا کا ہمسر ہے۔ غالباً سرسلیمان کے اس جملے نے حضرت آہ کو مغالطہ میں ڈالا:-

"یہ مسلم ہے کہ کوئی دوسرا شاعر قصیدہ گوئی میں ذوق کا ہم پلہ نہیں"

مگر موصوف کو غور کرنا چاہئے تھا۔ کہ جب اس کے پیشتر یہ جملہ ہے کہ "سودا کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو ذوق کا ہے" تو مابعد کے جملہ کا یہ مفہوم ہوگا کہ بجز سودا کے کوئی شاعر قصیدہ گوئی میں ذوق کا ہم پلہ نہیں۔ جس غلط فہمی کی طرف سرسلیمان نے اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ ذوق کا درجہ سودا سے پست قرار دیتے ہیں یعنی اس کو سودا کا ہم پلہ نہیں مانتے۔ اگر سلیمان کا یہ مفہوم

ہوتا تو وہ اپنے اس جملہ میں ——— "یہ مسلم ہے کہ کوئی دوسرا شاعر قصیدہ گوئی میں ذوق کا ہم پلہ نہیں" لفظ دوسرا نہ لاتے۔ بلکہ صرف اس قدر تحریر فرماتے کہ کوئی شاعر قصیدہ گوئی میں ذوق کا ہم پلہ نہیں۔ لفظ دوسرا لانے کا منشا یہی ہے کہ کوئی شاعر باستثنائے سودا قصیدہ گوئی میں ذوق کا ہم پلہ نہیں۔ اسی مفہوم کی طرف ابتدائی الفاظ "یہ مسلم ہے" بھی رہبری کرتے ہیں +

اسی طرح سرسلیمان نے جو سات وجوہ یا دلائل پیش کئے وہ اس بارے میں نہیں کہ ذوق کو سودا پر ترجیح دی جائے۔ بلکہ اس لئے ہیں کہ ان امور کو نظر انداز کر دینے سے ذوق کا پلہ سودا سے ہلکا نظر آتا ہے +

اُن وجوہ کا مختصر خاکہ یہ ہے:-

(۱) "الفضل للمتقدم" کی بنا پر سودا کو ذوق پر ترجیح دیجاتی ہے +

(۲) سودا کا مکمل کلام موجود ہے۔ ذوق کے قصائد کا ایک معقول حصہ تلف ہو گیا۔ بدرجۂ مجبوری پہلے شاعر کی کلیات سے دوسرے شاعر کے جزو کلام کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے +

(۳) سودا کو فرصت نصیب تھی۔ ذوق کا زیادہ وقت بادشاہ کے کلام کی اصلاح میں ضایع ہوتا تھا +

(۴) جیسے قدردان اور ہمت بڑھانے والے سودا کو میسر ہوئے ذوق اُن سے محروم رہا +

(۵) سودا کو فراغت حاصل تھی۔ ذوق نے عسرت میں بسر کی +

(۶) سودا کے زمانہ تک زبان و بیان کی آزادی حاصل تھی۔ وہ قیود عائد نہیں ہوئے تھے جن کے تحت ذوق کو شاعری کرنا پڑی +

(۷) سودا کا کلام مقدار میں زائد ہے۔ مگر عمدہ اشعار کم ہیں۔ ذوق کا کلام کم ہے۔ عمدہ اشعار زیادہ ہیں (اس طرح گویا عمدہ اشعار کی تعداد دونوں کے یہاں مساوی ہو گئی)

لہٰذا یہ حضرت آہ کا محض وہم ہے کہ سر سلیمان نے ذوق کو سودا پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے علی الرغم عموم یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ قصیدہ میں ذوق کا درجہ سودا سے کم نہیں ہے۔ بلکہ اُن کا ہم پایہ ہے +

فرض کیجئے کہ یہ خیال قابل قبول نہیں مگر کیا اُس اہانت و مضحکہ کا مستحق ہے جس کا نشانہ بنایا گیا ہے؟ جس پر حضرت آہ کے نزدیک متین سے متین شخص ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا؟

البتہ وہ لوگ جو قہقہے لگانے کے عادی ہیں حضرت آہ کے اس قول پر لوٹ جائیں گے کہ

"باستثنائے بعض بعض مسلم الثبوت اساتذہ نے طبع آزمائی کی ہے وہ سب ذوق سے بہتر ہیں" +

حضرت آہ کے ہمنوا سر سلیمان سے کہیں کم نکلیں گے۔ اس دور آزادی و مطلق العنانی میں ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا اختیار ہے۔ غزل ہی میں دیکھ لیجئے کوئی میر کو پوجتا ہے۔ کوئی غالب کو سجدہ کرتا ہے۔ کوئی پرستار مومن ہے اور کوئی آتش پرست۔ مگر اختلاف رائے کی بنا پر چیں بجبیں ہونا اور فریق ثانی پر استہزا کرنا نہایت مذموم و ناز یبا ہے۔ خصوصاً ایسے شخص کے لئے جو اپنے زعم میں مشرقی تہذیب کا پتلا ہو اور انگریزی داں طبقہ کو بدمذاق اور اردو رسائل و اخبارات کے قیمتی اوراق سیاہ کرنے میں ذرا بھی دریغ نہ کرنے والا سمجھتا ہو +

سر سلیمان نے ہر جگہ سودا اور ذوق کے تذکرہ میں توازن قائم رکھا ہے اگر ذوق کو شیخ ابراہیم ذوق لکھا تو سودا کو مرزا رفیع سودا۔ ورنہ ذوق و سودا ایک جگہ بمقتضائے بشریت ذوق کو جناب ذوق مرحوم لکھ گئے۔ اور سودا لندورا ہی رہا۔ بس پھر کیا تھا حضرت آہ چراغ پا ہو گئے۔ اور ان الفاظ میں گرفت کی:-

"اس موقع پر ایک نصیحت جناب جسٹس کی خدمت میں پیش کر دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے اپنی تحریر مذکورۂ بالا میں سودا کا نام یونہیں لکھ دیا، اور ذوق کے نام کے ساتھ جناب اور مرحوم سب کچھ لگایا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سودا سے کوئی مخالفت ہے۔ یہ طرز آئین صحافت کے بالکل خلاف ہے"

کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ آپ کی تہذیب اور نیک نفسی کہاں تشریف لے گئی۔ جب ہزار جگہ دونوں کے نام "یونہیں" لکھے گئے۔ ایک جگہ ذوق کے ہاں کچھ تعظیمی الفاظ بڑھ گئے تو یہ ایسی فروگذاشت ہو گئی کہ آپ "چھوٹا منہ بڑی بات" کے مصداق بنکر سر سلیمان کو نصیحت کرنے تو بہ خدمت میں نصیحت پیش کرنے پر اتر آئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آن کی نیت پر بھی حملہ کر دیا۔ مشرقی شائستگی کے دعوے دار آداب صحافت کے علمبردار اور ایسے آپے سے باہر ہو گئے! لاحول ولا قوۃ!

حضرت آہ کی طرز نگارش پر تہذیب انگشت بدنداں ہے اور خوش مذاقی پسینے پسینے +

سر سلیمان کے موازنۂ اشعار کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت آہ یہاں بھی تنقید کا حق ادا نہیں کر سکے ان کی تحریر چند بے سر و پا دعاوی اور بے معنی لفاظی کے سوا کچھ نہیں +

ہاں! ایک بات کی طرف ضرور توجہ دلاؤنگا جس سے واضح ہوگا کہ حضرت آہ نے سودا کی حمایت کا تو بیڑا اُٹھایا ہے۔ مگر اتنی بھی آگاہی نہیں کہ کون کلام اُن کا ہے اور کون نہیں ہے +

کلیات سودا کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اُس کے شروع میں ایک قصیدہ تقریباً نوسو شعر کا سودا کے شاگرد کے نام سے شامل ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ سودا کے انتقال کے بعد مصحفی نے اُن کے کلام پر حملے کئے۔ سودا کے شاگرد نے اس قصیدہ میں مصحفی کو جواب دیا ہے (اور گالیاں بھی دی ہیں) سر سلیمان کو مغالطہ ہوا اور اس قصیدہ کو بھی سودا کا قصیدہ سمجھکر ایک شعر ؎

اشرف علی خاں قاضی یا خلاق مہذب
تھے عمدہ گھرانے سے وہ اک مرد تو قیسر

کا موازنہ ذوق کے اس شعر سے کر دیا ؎

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغز جائے صریر

فاضل اجل حضرت آہ سیتاپوری جو سودا کا کلمہ پڑھتے ہیں اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ مان جاتے ہیں کہ یہ شعر سودا کا ہے اور شکایت کرتے ہیں کہ :-

"جناب جسٹس کا انصاف قابل داد ہے (جسٹس کے لئے انصاف) ہے سبحان اللہ! کیا سودا کے کل دیوان میں اشرف علی خاں قاضی ..... کے علاوہ کوئی شعر ستیاب نہ ہو سکا جسے موازنہ کے میدان میں لاتے۔ میں ہرگز نہیں مان سکتا کہ یہ فعل حالت سہو میں ارتکاب پذیر ہوا۔ بلکہ بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ سودا کا مرتبہ گھٹانے کو یہ حرکت عمداً کی گئی ہے۔ اگر میں بھی یہی روش اختیار کرنے پر تیار ہو جاؤں تو ذوق کو ایک معمولی مبتدی سے پست دکھا سکتا ہوں۔ غضب خدا کا ایک طرف تو سودا کا پست سے پست شعر اور دوسری طرف ذوق کا حاصل غزل مطلع ایک عقلمند اس کے بعد کیا تھوڑی دیر کے لئے بھی مان سکتا ہے کہ آپ کو سودا سے مخالفت نہیں" +

یہ تو مبلغ علم تھا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت آہ ذوق کے کلام پر کسقدر نیک نیتی سے تنقید فرماتے ہیں۔ اُس مطلع کو جسے ذوق کا حاصل غزل قرار دے چکے ہیں دور حاضرہ کے کوئی "شعرا" حضرت رمز سے بھڑا دیتے ہیں حضرت رمز بھی غالباً خوش نہ ہوں گے۔ کیونکہ اوپر حضرت آہ فرما چکے ہیں کہ اگر تیار ہو جاؤں تو ذوق کو ایک معمولی مبتدی سے پست دکھا سکتا ہوں۔ لہٰذا حضرت رمز وہی معمولی مبتدی" ٹھہرے۔ حضرت رمز کا وہ مایۂ ناز مطلع جس نے ذوق کے حاصل عمر کو برباد کر دیا یہ ہے۔ پڑھئے اور وجد کیجئے ؎

قلم نے جب غم قسمت کیا مرا تحریر
جہاں سے نالہ اٹھا پیدا ہوئی وہیں سے صریر

اس گوہر شاہوار کو پیش کر کے سر سلیمان کو یوں مخاطب کرتے ہیں :-

"عقیدتمندی کو بھول جائیے۔ اور انصاف کی عینک آنکھوں پر لگا کر دیکھئے

(۱) ایک شے۔ جو حقیر کو پیدا ہوا۔ عینک آنکھوں پر لگائی جاتی ہے یا ناک پر یا صرف لگائی جاتی ہے۔ اور عینک و عینک کی انصاف کی آنکھوں کو ضرورت بھی ہوتی ہے یا نہیں)

تو آپ کو معلوم ہوگا کہ رمز کے مطلع کے سامنے ذوق کا مطلع کوئی چیز نہیں" +

تاہم حضرت آہ یقین دلاتے ہیں اور مجھے آپ کو ماننا پڑیگا کہ انہوں نے ہٹ دھرمی نہیں کی اور انصاف کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے (ورنہ انصاف کو عینک کی ضرورت لاحق ہو) اور محض اس ایک مطلع کی بہتری پر رمز کو ذوق سے بہتر نہیں کہہ سکتے"

شاید میری طرح ناظرین بھی نہ سمجھے ہوں کہ حضرت رمز کے مطلع میں کیا کیا نکات و غوامض پوشیدہ ہیں۔ لہٰذا اُس وقت تک صبر کے ساتھ انتظار کیجئے کہ حضرت آہ اس کے مطالب نغز بیان فرمائیں +

لیکن مجھے اسقدر احساس ضرور ہوا کہ یہ مطلع ظاہر بین نگاہوں کے لئے نہیں ہے جن کو پہلے مصرع میں لفظ مرا الگ سے ٹکا ہوا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے مصرع جناتی قافیہ قہم اردو سے ملتی جاتی زبان میں ہے۔

ع جہاں سے نالہ تھا پیدا ہوئی وہیں سے صریر

اس کا انداز بیان ہماری آپ کی تعریف سے مستغنی ہے۔ میرے ایک دوست نے جن کا حسن ظن مشہور ہے (بعض لوگوں کا قول ہے کہ تحریف میں یاطولیٰ ہے) دوسرے مسرع میں کتابت کی غلطی فرض کر کے ارشاد فرمایا کہ یوں ہوگا

ع جہاں سے نالہ اُگا تھا اُگی وہیں سے صریر

اور یوں دُور افتاں ہوئے کہ نالہ اور نَے کا ربط ظاہر ہے۔ نَے اُگتی ہے لہٰذا نالہ بھی اُگتا ہے۔ صریر قلم کی آواز ہے۔ قلم نَے کا ہوتا ہے۔ نَے میں اُگنے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا صریر میں بھی ہے۔ چلئے چھٹی ہوئی مگر پہلے مسرع کو تو غلط اصلاح دی جو نہ چاہئے تھا وہ ہونا ع

قلم نے جب مری قسمت کا غم کیا تحریر

میں اس نامہ فرسائی کی زحمت گوارا نہ کرتا اور "کلاوخ انداز" کو "پاداش سنگ" نہ دیتا۔ مگر جانتا ہوں کہ سر سلیمان کو زبان اردو سے دلچسپی نہیں بلکہ عشق ہے۔ اور اس غریب زبان کی ہستی کی امیدیں اُن سے وابستہ ہیں۔ حضرت آہ کی تنقید یا تنقیص یقیناً اُن کے تنفس اور بد دلی کا موجب ہوگی اور ایسی گندی فضا سے علیحدہ رہنا چاہیں گے۔ میں اُن سے بصد التجا عرض کرونگا کہ اردو کی خدمت سے دستبردار نہ ہوں۔ تاکہ میری عرض میں تصفح اور تملق کا شائبہ بھی نہ رہے اپنا نام ظاہر نہیں کرتا علاوہ بریں میں اس سے بھی ڈرتا ہوں کہ جب حضرت آہ نے سر سلیمان پر حملہ "بول دیا" تو بھلا میں کس شمار قطار میں ہوں۔ ایک مور ضعیف (یہ جسٹس اور انصاف کا جواب ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ میں مور نہیں ہوں ضعیف و توانا کا سوال الگ رہا۔ سلیمان کی رعایت سے مور ضعیف! کیا کہنا! پھر مور کے لئے قطرہ بھی حد کر دی۔ اس طرز کے لکھنے والے یا حضرت آہ ہیں یا ——— غضب ہوا تھا اپنا نام قلم سے نکل ہی گیا تھا) ہاں! تو مطلب یہ ہے کہ موجودہ صورت میں حضرت میری تحریر کا جواب دیا جائے گا حالانکہ وہ بھی کلہ بکلہ ہوگا۔ مگر میری ذات پر تو حملہ نہ ہوگا اور ہوگا بھی تو مجھ تک نہ پہنچے گا۔ بلکہ بھٹکتا پھر لگا۔ یعنی۔ (میرے ایک بے تکلف دوست نے جن کی رازداری پر اعتماد ہے مضمون سنکر اعتراض کیا کہ حملہ بھٹکتا نہیں پھرتا۔ میں نے عرض کیا کہ جب حملہ کا مخاطب متعین نہیں ہے "حملہ کا مخاطب کیسا؟" اونہہ! جب وہ ذات متعین نہیں ہے جس پر حملہ کیا جاتا ہے تو حملہ ضرور آوارہ و سرگردان پھرے گا۔ کیونکہ مقتضائے طبیعت سے حملہ کیا ٹھہر رہا ہے گا۔ اگر یہ توجیہ مطبوع نہیں ہے تو خود حملہ کو ایک ذات فرض کر لیجئے۔ اب تو بھٹک سکتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں بھٹک سکتا ہے)

مجھے امید ہے کہ اڈیٹر صاحب نیرنگ خیال بھی اس حملہ کے بھٹکنے یا بھٹکانے میں میرے معین ہونگے۔ اور اشارۃً یا کنایۃً بھی میرا نام ظاہر نہ ہونے دیں گے +

(خاص)

"ماجرائے دل"

راس آگئی ہے حُسن کو آب و ہوائے دل — اللہ رے دستیں تری تنگنائے دل
جوشِ جنوں کرشمۂ رنگینیٔ شباب — رنگِ ریاض و ہر ہے عکسِ فضائے دل
جب کثرتِ جمال سے نظارہ ہو محال — کیونکر بیاں کرے کوئی پھر ماجرائے دل
نازو نیاز میں نہ رہا کوئی اختلاف — جو ہے جفائے حسن وہی ہے وفائے دل
لو اُٹھ گیا وہ پردہ طلسمِ مجاز کا — پنہاں نقابِ یار میں تھا مدعائے دل
ہر اک ادائے یار محرک سہی جنوں — عشوہ عذابِ جان ہے تو غمزہ بلائے دل
سب ہیں تخیلات کی بس حشر خیزیاں — دراصل ابتدا ہے نہ کچھ انتہائے دل

یہ واردات قلب ہیں اظہرؔ غزل نہیں
اس پردے میں سنائے ہیں ہم ماجرائے دل

(خاص) اظہر نعمانی

حکم کی بیگم

(ایک روسی افسانہ)

از جناب انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم۔ اے علیگ

پہلا باب

ایک مرتبہ رات کے وقت کچھ لوگ سوار فوج کے افسر زارہ موف کے مکان پر تماش کھیل رہے تھے۔ جاڑوں کی لمبی رات کھیل میں اسی طرح گزر گئی۔ اور صبح پانچ بجے کے قریب وہ لوگ ناشتہ کرنے بیٹھے۔ جیتنے والوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ لیکن ہارنے والے اپنی خالی رکابیوں کی طرف دیکھتے رہے۔ اور اپنے پریشان خیالات میں محو رہے۔ جب شامپین کا دور چلا تو گفتگو میں تیزی آگئی۔ اور اسی سب نے حصہ لیا +

"آپ نے کیا کیا سورین؟" میزبان نے دریافت کیا +

"معمول کے موافق ہارا۔ اور اب میں انتاہوں کہ سب سے زیادہ بدقسمت ہوں۔ میں نہایت سکون کے ساتھ کھیلتا ہوں کبھی جوش میں نہیں آتا۔ کوئی چیز میری توجہ میں فرق نہیں ڈال سکتی۔ لیکن پھر بھی ہمیشہ ہارتا ہوں" +

"اور آپ کبھی زیادہ جیتنے کی ہوس بھی نہیں کرتے؟ کبھی شبہ کے موقع پر بازی نہیں لگاتے؟ پھر تو واقعی آپ کے استقلال پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ لیکن ہرمان کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟" ایک مہمان نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "شاید اپنی پیدائش کے وقت سے انہوں نے تماش کو ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔ لیکن ہمارے ساتھ صبح کے پانچ بجے تک بیٹھے ہوئے کھیل دیکھتے رہے" +

"مجھے کھیل میں بہت لطف آتا ہے" ہرمان نے جواب دیا۔ "لیکن میرے ذرائع ایسے نہیں کہ فاضل رقم کی امید پر ضروریات کو خطرہ میں ڈالدوں۔ میں جرمن ہوں لہذا دور اندیش ہوں اور اسی لیے یہاں کے نہ کھیلنے کا راز مضمر ہے" طامسکی نے کہا "لیکن اگر ایسا کوئی ہے جسکو میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ تو وہ صرف میری دادی کاؤنٹس فیدوٹونا ہیں" +

"کس طرح؟ کیوں؟" مہمانوں نے یک زبان ہوکر کہا

"میں ابتک یہ نہیں سمجھ سکا" طامسکی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ میری دادی کیوں نہیں کھیلتیں" +

"کیا اس میں بھی کوئی تعجب کی بات ہے کہ ایک اسی برس کی بوڑھی عورت تماش نہ کھیلے؟" نارموف نے دریافت کیا "آپ کو اس کی بابت کچھ معلوم نہیں؟"

"قطعی نہیں، سچی بات ہے مجھے کچھ بھی معلوم نہیں" +

"اچھا تو سنیئے سب سے پہلے آپکو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کوئی ساٹھ برس ہوئے جب دادی اماں پیرس گئی تھیں۔ اور وہاں کی مہذب سوسائٹی میں اُن کی بہت آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ لوگ "ماسکو کی زہرہ جبین" کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق آتے تھے۔ فرانس کا وزیر اعظم رچلیو بھی ان پر فریفتہ تھا۔ اور دادی کہتی تھیں ایک مرتبہ تو ان کے تغافل سے تنگ آکر وہ گولی مار لینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اُس زمانہ میں تمام عورتیں تماش کھیلا کرتی تھیں ایک دن وہ ڈیوک آرلیانس سے کھیل میں ایک بہت بڑی رقم قرض پر ہار گئیں۔ اُسی رات کو اُنہوں نے دادا جان سے اپنے ہار نے کا تذکرہ کیا۔ اور اُن سے کہا کہ وہ یہ رقم ادا کردیں۔ دادا جان مرحوم جہانتک مجھے یاد ہے دادی اماں کے سامنے نوکر کی طرح رہتے تھے اور اُن سے ایسے کانپتے تھے جیسے آگ سے تاہم اس ناقابل تلافی نقصان کو سُنکر وہ بھی بے چین ہوگئے۔ اپنی آمد و خرچ کا حساب اٹھا لائے۔ اور دادی کو دکھایا کہ گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں وہ پانچ لاکھ روبلے کے مقروض ہوگئے تھے۔ اور آنجہانی پیرس میں ان کی ماسکو یا سرائوف کی جائداد بھی نہ تھی۔ گویا کہ اس روپے کو ادا کرنے سے قطعی انکار کردیا۔

دادی اماں نے غصہ میں آکر اُن کی کنپٹی پر ایک تمانچہ مارا اور اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے تنہا سونے کو چلی گئیں۔ دوسرے دن اُنہوں نے دادا جان کو بلایا۔ اور خیال کیا کہ رات کی ناراضی اور سزا نے اپنا اثر دکھایا ہوگا۔ لیکن دادا جان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دادی اماں نے ان سے بحث کی اور اُنہیں قایل معقول کرنا چاہا۔ اُنہیں شرم دلانے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ قرضے تو ہوا ہی کرتے ہیں۔ ورنہ پھر ایک شہزادہ اور ایک ایکہ والے میں کیا فرق ہے۔ لیکن دادا جان نے بغاوت پر کمر باندھ لی تھی۔ اور اپنے انکار پر جمے رہے۔ ہر بات پر نہیں اور پھر نہیں! غرض کسی طرح پر رضامند نہ ہوئے۔ دادی اماں سخت حیران ہوئیں کہ کیا کریں۔ اُن کے ایک بہت گہرے دوست تھے۔ ایک بہت مشہور آدمی۔ آپ نے کاؤنٹ سینٹ جرمین کا نام سنا ہوگا جن کی بابت ایسی حیرت انگیز باتیں بیان کی جاتی تھیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ خود کو ایک جہاں گشت یہودی ظاہر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ میں نے اکسیر حیات، سنگ فلسفی اور دوسری چیزیں دریافت کی ہیں۔ لوگ اُن کا مذاق بناتے تھے۔ اور اُنہیں دغاباز سمجھتے تھے اور کسانووے نے تو اپنی سوانح عمری میں اُنہیں جاسوس لکھا ہے۔ بہرحال اُن کے بھیدوں کو نظرانداز کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ جرمین شکل وصورت کے لحاظ سے بہت معزز اور خوش باش آدمی تھے۔ دادی اماں تو ان سے اب تک محبت کرتی ہیں۔ اور اُنہیں بھول نہیں سکتیں۔ ان کے سامنے اگر ان کی بابت کوئی ہتک آمیز جملے استعمال کرے تو اُنہیں غصہ آجاتا ہے۔ دادی اماں کو یہ معلوم تھا کہ سینٹ جرمین کے قبضہ میں بہت کافی روپیہ ہے۔ لہذا اُن سے ہی مدد لینے کا اُنہوں نے ارادہ کر لیا۔ اور ایک رقعہ لکھکر اسی وقت بلا لیا۔ وہ فوراً چلے آئے۔ اور دیکھا کہ دادی سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ دادی اماں نے بھی خوب نمک مرچ لگا کر اپنے خاوند کی بدتہذیبی کو بیان کیا۔ اور آخر میں کہا کہ بس صرف ایک اُمید سینٹ جرمین کی دوستی اور مہربانی پر باقی ہے۔ سینٹ جرمین نے تھوڑی دیر سوچا۔ اور پھر کہا "میں اتنی رقم تو آپ کو نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ جبتک اس کو ادا نہ کر دینگی آپکو چین نہ آئے گا۔ اور میں آپکو اور زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ لہذا اس کا ایک اور طریقہ ہے۔ یعنی آپ اس رقم کو دوبارہ جیت لیجئے۔" اس پر دادی اماں نے کہا "لیکن عزیز من میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہمارے پاس روپیہ نہیں۔" سینٹ جرمین نے جواب دیا لیکن "اس معاملہ میں روپے کی ضرورت نہیں۔ آپ سنئے تو سہی"۔ اس کے بعد اُنہوں نے دادی اماں سے کوئی راز کی بات کہی جس کے لئے ہم میں سے ہر شخص بڑی سے بڑی رقم دینے کے لئے بخوشی تیار ہو جائے گا +

تمام لوگ بالکل گوش برآواز ہو گئے۔ طامسکی نے اپنا پائپ سلگایا تین چار کش لئے اور پھر کہنے لگا:-

"اسی رات کو دادی اماں وارسیلز گئیں۔ اور ڈیوک آرلیانس سے کھیلیں۔ پہلے تو اُنہوں نے معذرت کی کہ قرض کا روپیہ نہ لاسکی اور بہانہ کے طور پر کوئی قصہ گھڑ دیا۔ پھر بیٹھ کر کھیلنے لگیں۔ اُنہوں نے تین پتے اُٹھائے اور برابر اُن پر بازی لگاتی رہیں۔ اور ہر مرتبہ جیتا۔ اس طرح اپنا تمام ہارا ہوا روپیہ واپس لے لیا"

"اتفاق تھا" ایک مہمان بولا +

"محض گپ ہے" ہرمان نے کہا +

"پتے پہلے سے تیار کر لئے ہونگے" تیسرے نے کہا +

"میرا یہ خیال نہیں" طامسکی نے متانت سے جواب دیا +

"لیکن یکس طرح ہو سکتا ہے" نارووموف نے پوچھا "کہ تمہاری دادی ہر مرتبہ تین بہترین پتے نکال سکتی ہیں۔ اور تم ابتک اُن سے اس راز کو دریافت نہ کر سکے؟"

"بات تو یہی ہے" طامسکی نے جواب دیا۔ "اُن کے چار بیٹے تھے جن میں سے ایک میرے والد تھے۔ اور یہ چاروں بڑے پکے جواری تھے۔ لیکن دادی اماں نے اپنا راز کسی کو بھی نہیں بتایا۔ حالانکہ یہ نہ اُن چاروں کے لئے برا ہوتا نہ میرے لئے۔ لیکن میرے چچا کونٹ آئیون آئیلچ نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ اور اس پر قسم بھی کھائی تھی۔ چیپلٹسکی معروف جو فقیر ہو کر مرا کیونکہ لاکھوں روپیہ اُڑایا تھا۔ ایک مرتبہ اپنی جوانی کے زمانہ میں زور پر سے بہت زیادہ ہار گیا — میرے خیال میں شاید تین لاکھ کے قریب۔ وہ بہت ہی پریشان حال ہو گیا۔ دادی اماں حالانکہ فوجوانوں کی زیادتیوں کے بہت سخت خلاف تھیں لیکن چیپلٹسکی کا اُنہیں بھی بہت افسوس ہوا۔ اُنہوں نے اُسے تین پتے دیئے اور کہا کہ ان پر یکے بعد دیگرے بازی لگانا۔ لیکن اُس سے اپنی عزت کی قسم لے لی کہ اس مرتبہ کے بعد پھر کبھی نہ کھیلے۔ چیپلٹسکی اپنے مقابل کے مکان پر گیا۔ اور دونوں کھیلنے بیٹھ گئے۔ اُس نے پہلے پتے پر ۵ ہزار کی بازی لگائی اور جیتا۔ پھر اُس نے اپنی بازی کو دُگنا کیا اور چوگنا کیا۔

یہانتک کہ اپنی باگ پاگ واپس لے لی۔ بلکہ کچھ نفع ہی میں رہا"۔

"ارے! اب تو سونے کا وقت آگیا۔ پو نے چھ بج چکے"۔

مشرق کی طرف واقعی دن نکلنے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

سب لوگوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کئے اور جدا ہو گئے۔

دوسرا باب

بوڑھی کاؤنٹس اینا فیڈوروٹونا اپنے ملبوس خانے میں آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور تینوں خادمائیں چاروں طرف کھڑی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں پوڈر کی ڈبیہ تھی۔ ایک موگیروں کا صندوقچہ لئے ہوئے تھی۔ اور تیسری ایک بڑی ٹوپی سنبھالے کھڑی تھی۔ جس میں سرخ رنگ کے فیتے لگے ہوئے تھے۔ کاؤنٹس کے چہرہ پہ اب خوبصورتی کا نام ونشان بھی نہ رہا تھا۔ اُس کا دلاویز حسن فنا ہو چکا تھا۔ لیکن اُس میں جوانی کی تمام عادات ابھی تک باقی تھیں۔ وہ اب تک قدیم فیشن کی سخت دلدادہ تھی اور اپنے بناؤ سنگھار میں اسقدر وقت صرف کرتی تھی۔ اُس کا اتنا خیال بھٹتی تھی۔ جتنا کہ ساٹھ سال پیشتر۔ دریچہ کے قریب ایک نوجوان لڑکی جو اُس کی نگرانی میں تھی اپنے کشیدہ کاری کے اڈے پر بیٹھی تھی۔

"کیسے مزاج ہیں دادی اماں"۔ ایک نوجوان افسر نے کمرہ میں داخل ہو کر کہا۔ "آپ سے ایک عنایت کا خواستگار ہوں"۔

"کیا بات ہے طامسکی؟"

"اجازت دیجئے کہ اپنے ایک دوست کا آپ سے تعارف کراؤں۔ اور جمعہ کے دن انہیں آپ کی رقص گاہ میں لے آؤں"۔

"ہاں انہیں سیدھے رقص گاہ میں لے آنا۔ اور وہاں ملا دینا کہ رات تم کہاں ——— ؟"

"بیشک بہت پُرلطف صحبت تھی۔ صبح کے پانچ بجے تک ہم رقص کرتے رہے۔ ایلسکا یا کتنی پیاری معلوم ہوتی تھیں!"

"نہیں بیٹا، تم نے اُس کے اندر کیا بات دیکھی ہوگی؟ وہ اتنی خوبصورت کبھی نہیں ہو سکتی۔ جتنی اُس کی دادی شہزادی ڈاریہ پٹرونیہ تھیں لیکن شہزادی ڈاریہ پٹرونیہ تو اب بہت نحیف ہوتی جاتی ہیں"۔

"کیا مطلب ہے آپکا ——— بہت نحیف ہوتی جاتی ہیں؟" طامسکی نے بلا تامل دریافت کیا۔ "وہ تو سات برس سے زیادہ ہوئے کہ انتقال بھی کر گئیں"۔

نوجوان لڑکی نے سر اٹھایا، اور طامسکی سے کچھ اشارہ کیا۔ طامسکی کو فوراً یاد آگیا کہ کاؤنٹس کی عزیز سہیلی کی موت اُس سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ اور وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ بہرحال جو کچھ اُس کی زبان سے نکلا تھا۔ کاؤنٹس نے نہایت بے پرواہی سے سنا۔ حالانکہ اُس کے لئے بالکل نئی خبر تھی۔

"اچھا؟ تو اُن کا انتقال ہو گیا"۔ وہ کہنے لگی۔ "اور مجھے خبر بھی نہیں ہم دونوں ایک ہی ساتھ اعزازی خادمہ مقرر کی گئی تھیں۔ اور جب ہمیں ملکہ کے روبرو پیش کیا گیا ———"

اور سویں مرتبہ کاؤنٹس پھر اپنے پوتے کو اپنا خاص واقعہ سنانے لگی۔

"اچھا طامسکی"، اس قصہ کو ختم کرنے کے بعد اُس نے کہا۔ "مجھے اُٹھنے میں مدد دو۔ لیزا بیٹی۔ میری ہاس کی ڈبیہ کہاں ہے؟"

خادمہ کے سہارے کاؤنٹس پردے کے پیچھے چلی گئی۔ تاکہ لباس پہن سکے۔ طامسکی اور نوجوان لڑکی کمرہ میں رہ گئے۔

"آپ کس کا تعارف کرانا چاہتے ہیں؟" لیزاویٹہ آئی وانونا نے آہستہ سے دریافت کیا۔

"نارومونوف کا۔ آپ واقف ہیں اُن سے؟"

"جی نہیں۔ وہ فوج میں ہیں یا سول سروس میں؟"

"فوج میں"

"انجینیر ہیں؟"

"نہیں وہ سوار فوج میں ہیں۔ لیکن آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ وہ انجینیر ہیں؟"

نوجوان لڑکی ہنسنے لگی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

"طامسکی" کاؤنٹس نے پردہ کے پیچھے سے چلا کر کہا۔ "کوئی نیا ناول بھیجو، لیکن آجکل کے زمانہ کا نہ ہو"۔

"کیا مطلب ہے آپ کا، دادی اماں؟"

"یعنی ایسا ناول ہو جس میں ہیرو اپنے باپ یا ماں کو پھانسی پر چڑھا دیتا ہے۔ اُس میں ڈوب مرنے کا ذکر نہ ہو۔ مجھے ڈوبی ہوئی لاشوں سے بڑا خوف معلوم ہوتا ہے"۔

"آجکل تو ایسے ناول نہیں ہوتے۔ اور کہئے تو کوئی روسی ناول بھیجدوں؟"

"کیا روسی ناول بھی ہوتے ہیں۔ تو ایک بھیجدو، بیٹا، ضرور بھیج دو"۔

"دادی اماں، معاف کیجئے، مجھے ذرا جلدی ہے۔ لیزاویٹہ آئی وانونا سے

کیجئے۔ آپ کو یہ خیال کیسے ہوا کہ مارووصوف انجیر ہے؟ طامسکی نے کہا' اور ملبوس خانہ سے باہر چلا گیا +

لیزاویٹہ آئیونونا تنہا رہ گئی۔ اُس نے کام چھوڑ دیا اور دریچہ کے باہر نظر ڈالی تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان افسر سڑک کے پرلے کنارے پر دوسرے مکان کے گوشہ کے پاس نمودار ہوا۔ لیزا کے گال شرم و حیا سے سرخ ہو گئے۔ اور اُس نے پھر کپڑے پہ جھک کر کام شروع کر دیا۔ اسوقت کاؤنٹس پوری پوشاک پہنے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی +

"لیزا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیدو' چلو سیر کو چلیں گے" +

لیزا کشیدہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی چیزیں سنبھالنے لگی +

"تمہیں کیا ہو گیا۔ کیا بہری ہو گئیں" کاؤنٹس نے چلا کر کہا۔

"جلدی جاؤ اور گاڑی تیار کرنے کا حکم دو" +

"ابھی کہتی ہوں" نوجوان لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ اور دروازہ کی طرف دوڑی +

اسی وقت ایک نوجوان داخل ہوا۔ اور کاؤنٹس کے لئے کچھ کتابیں لایا۔ جو شہزادہ پال الگزنڈروچ (طامسکی) نے بھیجی تھیں +

"بہت ٹھیک' اُن کا شکریہ ادا کرنا" کاؤنٹس نے کہا "لیزا' لیزا' کدھر کو بھاگ رہی ہو تم"؟

"میں یہاں ہوں جاؤں"؟

"اس کے لئے بہت کافی وقت ہے' بیٹی' لو بیٹھ جاؤ' ایک کتاب کھولو اور مجھے پڑھ کر سناؤ" +

نوجوان لڑکی نے ایک کتاب اُٹھائی اور چند سطریں پڑھیں +

"زور سے" کاؤنٹس نے کہا "لڑکی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری آواز جاتی رہی کیا؟ اچھا ذرا ٹھہر جاؤ' میری پاؤں کی تپائی مجھے دے دو۔ اور قریب' ہاں اب پڑھو" +

لیزاویٹہ نے ایک دو صفحے اور پڑھے۔ کاؤنٹس نے جماہی لی +

"اسے رکھدو" اس نے کہا "یہ کیا بیہودہ کتاب ہے۔ پال کے پاس واپس بھیج دو۔ اور اس کا شکریہ ادا کر دو۔ اچھا گاڑی کہاں ہے؟"

"گاڑی تیار ہے" لیزاویٹہ نے دریچہ سے جھانک کر کہا +

"تم نے ابتک کپڑے کیوں نہیں پہنے؟" کاؤنٹس نے دریافت کیا۔ "تمہارے لئے ہمیشہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات [illegible] برداشت ہے لڑکی" +

لیزاویٹہ اپنے کمرہ کی طرف بھاگی۔ دو منٹ نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ کاؤنٹس نے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ تین خادمائیں ایک دروازہ سے اور ایک نوکر دوسرے دروازے سے بھاگے ہوئے آئے +

"یہ کیا واہیات ہے؟ جب ضرورت ہوتی ہے تو کوئی نہیں آتا۔ لیزاویٹہ آئونونا سے کہو کہ میں اُن کا انتظار کر رہی ہوں"۔ لیزاویٹہ آئونونا لبادہ پہنے اور ٹوپی اوڑھے داخل ہوئی +

"آخر کار آ گئیں"۔ کاؤنٹس نے کہا "لیکن یہ کیا بناؤ سنگار کیا ہے؟ یہ کس کے واسطے ہے؟ کسے پرجانا چاہتی ہو؟ لیکن موسم کی کیا حالت ہے؟ میرے خیال میں ہوا تیز چل رہی ہے"؟

"جی نہیں بیگم صاحبہ۔ موسم نہایت اچھا ہے" نوکر نے جواب دیا +

"تم جو کہتے ہو۔ غلط ہے۔ دریچی کھولو ——— یہی میرا خیال تھا۔ ہوا چل تو رہی ہے اور وہ بھی بہت ٹھنڈی۔ گاڑی کھول دو۔ لیزا ہم سیر کو نہیں جائیں گے۔ تمہارے اس بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں تھی"؟

"یہ ہے میری زندگی" لیزاویٹہ آئونونا نے خیال کیا +

بیچاری لیزاویٹہ آئونونا ایک بہت بدقسمت لڑکی تھی۔ (کہتے ہیں کہ غیر شخص کی روٹیاں تلخ ہوا کرتی ہیں۔ اور دوسرے کے مکان کا زینہ اونچا ہوتا ہے۔ لیکن جو لڑکی اس شمہور بوڑھی کاؤنٹس کی زیر نگرانی رہتی تھی۔ اُس سے زیادہ دوسروں پر منحصر ہونے کی تلخیاں کون جان سکتا ہے؟ کاؤنٹس کا دل بُرا نہ تھا۔ لیکن وہ اُن عورتوں کی طرح جن کو دنیا نے خراب کر دیا ہو۔ متلوّن مزاج تھی اور ان بوڑھے لوگوں کی مانند جو اپنے زمانے میں محبت کے اہل رہ چکے ہوں۔ لیکن آجکل خود کو اجنبی معلوم ہوتے ہوں۔ حاسد تھی۔ اور دنانیت پسند سرد مہری میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس عظیم دنیا کے تمام رسومات میں حصّہ لیتی تھی۔ تمام رقصوں میں شریک ہوتی تھی۔ جہاں وہ ایک گوشے میں پوڈر لگائے اور آیام گذشتہ کی پوشاک پہنے ہوئے بیٹھی رہتی تھی۔ گویا کہ وہ رقص گاہ کی ایک بدنما لیکن ضروری آرائش میں داخل تھی۔ تمام مہمان رقص گاہ میں داخل ہوتے وقت ایک ضروری رسم ادا کرنے کے طور پر اُس کے سامنے جھکتے۔ لیکن اس فرض کی ادائگی کے بعد اس کا کوئی خیال بھی نہیں کرتا۔ وہ اپنے مکان پر تمام دنیا کا خیر مقدم کرتی۔ سخت سے سخت تہذیب برتتی۔ لیکن کسی کو نہ پہچانتی۔ اُس کے لئے ادنیٰ نوکر جو اُس کے مکان میں رہتے رہتے موٹے ہو گئے۔ تھے بڑے

جی چاہتا تھا کرتے تھے، اور بوڑھی خاتون کو لوٹنے میں کبھی دیر نہ کرتے تھے۔ جس کا ایک پاؤں قبر میں پہنچ چکا تھا۔ بیچاری لیزاویٹہ آمونونا اس کی خانہ زاد شہید تھی۔ اُسے چاہے بنا نا پڑتی، اور شکر زیادہ ہونے پر چھڑکیاں کھاتی، اُسے ناول زور سے پڑھ کر سنانے پڑتے، اور مصنف کی غلطیوں کی ذمہ دار ٹھہرتی۔ وہ سیر و تفریح میں کاؤنٹس کے ساتھ جاتی، اور موسم اور بری سڑک کی جوابدہ ہوتی۔ اُس کی تنخواہ مقرر تھی جو اُسے کبھی پوری نہیں ملی۔ بایں ہمہ اسے دوسروں کے سے کپڑے پہننے پڑتے تھے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ایسے کپڑے جو دوسرے لوگ بہت کم پہن سکتے ہوں۔ مجلسوں میں اُس کی شرکت بہت ترحم انگیز ہوتی تھی۔ ہر شخص اُسے جانتا تھا لیکن کوئی اس کی پروا نہ کرتا تھا۔ رقص کے موقع پر اُسے صرف اس وقت رقص کرنے کا موقع ملتا تھا جب کسی عارضی جانشین کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور خواتین ہمیشہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر لیجاتیں جب کبھی اُنہیں بلوس خانے میں جاکر اپنی پوشاک کے کسی حصے کی مرمت کرنی ہوتی۔ اس میں خودداری کا مادہ موجود تھا۔ اور اپنی حالت کا بہت تلخ احساس کرتی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف نظر ڈالتی کہ اس حالت سے بچنے کی کوئی صورت ہو جائے۔ لیکن وہ نوجوان جو اپنی غیر مستثنیٰ خود بینی میں گرفتار ہو کر دھکے کھاتے پھرتے اس کا ذرا سا بھی خیال کرنا گوارا نہ کرتے۔ حالانکہ لیزاویٹہ آمونونا ان شوخ اور مغرور لڑکیوں سے سو درجہ زیادہ خوبصورت تھی۔ جو شریف صحبت ہونے کے قابل سمجھی جاتی تھیں۔ اور جن کے گرد نوجوان پھڑ پھڑاتے پھرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس عظیم الشان لیکن پست کمرہ سے خاموشی کے ساتھ نکل جاتی، اور اپنے چھوٹے سے کمرہ میں جاکر رونے لگتی، جہاں کاغذ کے پردے کمرہ کی کل زینت تھے۔ اور جہاں ایک موم بتی پیتل کے شمعدان میں اپنی مدھم روشنی سے جلتی رہتی تھی +

ایک دن یعنی اُس کے کھیل سے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں، دو دن بعد اور اس منظر سے جسے ہم بیان کر رہے ہیں۔ ایک ہفتہ بیشتر لیزاویٹہ آمونونا حسب معمول دریچہ کے پاس اپنے کشیدہ کاری کے اڈے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ اس نے باہر نظر ڈالی اور دیکھا کہ ایک نوجوان انجنیر بے حس و حرکت کھڑا اس کے دریچہ کو تک رہا ہے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کام کرنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے پھر دیکھا ——— وہ نوجوان انجنیر اُسی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ چونکہ وہ اس بات کی عادی نہ تھی کہ راہرو افسروں سے دل لگی کرے، لہذا اس نے دریچہ سے باہر دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور دو گھنٹے تک بغیر سر اُٹھائے کام کرتی رہی۔ اس کے بعد کھانے کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے سامان کو رکھنا شروع کیا۔ اتفاقیہ اس کی نظر پھر باہر جا پڑی اور اس نے انجنیر کو وہیں کھڑا ہوا پایا۔ یہ اسے ایک انوکھی بات معلوم ہوئی۔ کھانے کے بعد وہ بے اطمینانی کی حالت میں پھر دریچہ کے پاس آئی۔ لیکن افسر اب وہاں نہ تھا۔ اور اس کے بعد لیزاویٹہ نے اُسے جلد فراموش کر دیا +

دو دن کے بعد وہ کاؤنٹس کے ساتھ کہیں جانے کے لئے مکان سے نکلی۔ اور گاڑی میں سوار ہو رہی تھی۔ کہ وہ پھر نظر آیا۔ وہ پھاٹک کے قریب کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ کالر میں چھپا ہوا تھا۔ اور ہیٹ کے نیچے سے اس کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لیزاویٹہ کو خوف معلوم ہونے لگا۔ وہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکی۔ اور ہیجان و اضطراب کا ایک ناقابل فہم طوفان دل میں لئے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جب وہ واپس لوٹی تو دوڑ کر دریچہ کے پاس گئی ——— انجنیر اسی جگہ پر کھڑا ہوا اپنی نگاہیں اُس کے چہرہ پر ڈال رہا تھا۔ وہ وہاں سے چلی آئی۔ لیکن راز جوئی کی خواہش اُسے تکلیف دے رہی تھی۔ اور ایک بالکل نیا جذبہ اس کے دل میں انتشار پیدا کر رہا تھا +

اس وقت سے کوئی دن نہ گذرتا کہ وہ نوجوان ایک مقررہ وقت پر مکان کے دریچوں کے سامنے ظاہر نہ ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک بے قاعدہ سلسلہ قایم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کام میں مشغول بیٹھی رہتی۔ اس کی آمد کو محسوس کرتی۔ اپنا سر اٹھاتی اور روز بروز زیادہ دیر تک اُسکی طرف دیکھتی رہتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نوجوان اس التفات کے لئے اُس کا منت گذار ہے۔ کیونکہ لیزا اپنی جوش شباب سے محظوظ نگاہوں سے یہ دیکھتی کہ دونوں کی نظریں ملتے وقت کس طرح اُس کے ندو رخساروں پر سرخی دوڑ جاتی ہے ..... ایک ہفتہ بعد وہ اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی +

جب طامسکی نے کاؤنٹس سے اپنے ایک دوست کا تعارف کرانے کی اجازت مانگی، تو غریب لڑکی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ لیکن جب اُس نے سُنا کہ نارموف انجنیر نہیں ہے، تو وہ سخت پشیمان ہوئی کہ ان بیہودہ سوالات سے اس نے اپنا راز طامسکی پر ظاہر کر دیا +

ہرمن ایک جرمن کا بیٹا تھا۔ جو اُس کے لئے تھوڑی سی جائداد بھی چھوڑ گیا تھا۔ اُسے اپنی خود مختاری حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس تھا لہذا اپنی جائداد اور اُس کے سود کو ہاتھ تک نہ لگاتا۔ بلکہ صرف تنخواہ پر

کیجئے۔ آپ کو یہ خیال کیسے ہوا کہ نارمونٹ انجنیر ہے؟ طامسکی نے کہا' اور ملبوس خانہ سے باہر چلا گیا +

لیزاویٹہ آئیونونا تنہا رہ گئی۔ اُس نے کام چھوڑ دیا اور دریچہ کے باہر نظر ڈالی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان افسر سڑک کے پرلے کنارے پر دوسرے مکان کے گوشہ کے پاس نمودار ہوا۔ لیزا کے گال شرم و حیا سے سرخ ہو گئے۔ اور اُس نے پھر کپڑے پر جھک کر کام شروع کر دیا۔ اسوقت کاؤنٹس پوری پوشاک پہنے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی +

"لیزا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیدو چلو سیر کو چلیں گے" +

لیزا کشیدہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی چیزیں سنبھالنے لگی +

"تمہیں کیا ہو گیا۔ کیا بہری ہو گئیں" کاؤنٹس نے چلا کر کہا۔

"جلدی جاؤ اور گاڑی تیار کرنے کا حکم دو" +

"ابھی کہتی ہوں" نوجوان لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ اور دروازہ کی طرف دوڑی +

اسی وقت ایک نوجوان داخل ہوا۔ اور کاؤنٹس کے لئے کچھ کتابیں لایا۔ جو شہزادہ پال الگزنڈرووچ (طامسکی) نے بھیجی تھیں +

"بہت اچھا۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا" کاؤنٹس نے کہا "لیزا' لیزا' کدھر کو بھاگ رہی ہو تم"؟

"میں یہاں ہوں جاؤں"؟

"اس کے لئے بہت کافی وقت ہے۔ بیٹھی رہو جاؤ' ایک کتاب کھولو اور مجھے پڑھ کر سناؤ" +

نوجوان لڑکی نے ایک کتاب اُٹھائی اور چند سطریں پڑھیں +

"زور سے" کاؤنٹس نے کہا "لڑکی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری آواز جاتی رہی کیا؟ اچھا ذرا ٹھہر جاؤ' میری پاؤں کی تپائی مجھے دے دو۔ اور قریب۔ ہاں اب پڑھو" +

لیزاویٹہ نے ایک دھنگوا اور پڑھے۔ کاؤنٹس نے جماہی لی +

"اسے رکھ دو" اس نے کہا "کیا بیہودہ کتاب ہے۔ پال کے پاس واپس بھیج دو۔ اور اس کا شکریہ ادا کر دو۔ اچھا گاڑی کہاں ہے؟"

"گاڑی تیار ہے" لیزاویٹہ نے دریچہ سے جھانک کر کہا +

"تم نے ابتک کپڑے کیوں نہیں پہنے؟" کاؤنٹس نے دریافت کیا۔

"تمہارے لئے ہمیشہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات تمہیں معلوم ہونا چاہیئے +

ہے لڑکی"؟

لیزاویٹہ اپنے کمرہ کی طرف بھاگی۔ دو منٹ نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ کاؤنٹس نے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ تین خادمائیں ایک دروازہ سے اور ایک نوکر دوسرے دروازے سے بھاگے ہوئے آئے +

"یہ کیا واہیات ہے؟ جب ضرورت ہوتی ہے تو کوئی نہیں آتا۔ لیزاویٹہ الٹونونا سے کہو کہ میں اُن کا انتظار کر رہی ہوں"۔ لیزاویٹہ الٹونونا لبادہ پہنے اور ٹوپی اوڑھے داخل ہوئی +

"آخر کار آ گئیں"۔ کاؤنٹس نے کہا "لیکن یہ کیا بناؤ سنگھار کیا ہے؟ یہ کس کے واسطے ہے؟ کسے پرجانا چاہتی ہو؟ لیکن موسم کی کیا حالت ہے؟ میرے خیال میں ہوا تیز چل رہی ہے"۔ +

"جی نہیں بیگم صاحبہ۔ موسم نہایت اچھا ہے"۔ نوکر نے جواب دیا +

"تم جو کہتے ہو۔ غلط ہے۔ دریچی کھولو ——— یہی میرا خیال تھا۔ ہوا چل تو رہی ہے اور وہ بھی بہت ٹھنڈی۔ گاڑی کھول دو۔ لیزا ہم سیر کو نہیں جائیں گے۔ تمہارے اس بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں تھی"۔ +

"یہ ہے میری زندگی"۔ لیزاویٹہ آئونونا نے خیال کیا +

بیچاری لیزاویٹہ آلٹونونا ایک بہت بدقسمت لڑکی تھی۔ کہتے ہیں کہ غیر شخص کی روٹیاں تلخ ہوا کرتی ہیں۔ اور دوسرے کے مکان کا زینہ اونچا ہوتا ہے۔ لیکن جو لڑکی اس مشہور بوڑھی کاؤنٹس کی زیر نگرانی رہتی تھی۔ اُس سے زیادہ دوسروں پر منحصر ہونے کی تلخیاں کون جان سکتا ہے؟ کاؤنٹس کا دل برا نہ تھا۔ لیکن وہ اُن عورتوں کی طرح جن کو دنیا نے خراب کر دیا ہو۔ متلون مزاج تھی اور ان بوڑھے لوگوں کی مانند جو اپنے زمانے میں محبت کے اہل رہ چکے ہوں لیکن آجکل خود کو اجنبی معلوم ہوتے ہوں۔ حاسد تھی۔ اور دنیا پسند سرمہری میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس عظیم دنیا کے تمام رسومات میں حصہ لیتی تھی۔ تمام رقصوں میں شریک ہوتی تھی۔ جہاں وہ ایک گوشے میں پوڈر لگائے اور آیام گذشتہ کی پوشاک پہنے ہوئے بیٹھی رہتی تھی۔ گویا کہ وہ رقص گاہ کی ایک بدنما لیکن ضروری آرائش میں داخل تھی۔ تمام مہمان رقص گاہ میں داخل ہوتے وقت ایک ضروری رسم ادا کرنے کے طور پر اُس کے سامنے جھکتے۔ لیکن اس فرض کی ادائگی کے بعد اس کا کوئی خیال بھی نہیں کرتا۔ وہ اپنے مکان پر تمام دن دنیا کا خیر مقدم کرتی۔ سخت سے سخت تہذیب برتتی۔ لیکن کسی کو نہ پہچانتی۔ اُس کے لئے تعمیر ادا کر کے جو اُس کے مکان میں رہتے رہتے موٹے ہو گئے تھے۔

جی چاہتا تھا کرتے تھے، اور بوڑھی خاتون کو لوٹنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ جس کا ایک پاؤں قبر میں پہنچ چکا تھا۔ بیچاری لیزاویٹہ آموفونا اس کی خانہ زاد شہید تھی۔ اُسے چاہے بنانا پڑتی، اور شکر زیادہ ہونے پر چھڑکیاں کھاتی، اُسے ناول زور سے پڑھ کر سنانے پڑتے، اور مصنف کی غلطیوں کی ذمہ دار ٹھہرتی۔ وہ سیر و تفریح میں کاؤنٹس کے ساتھ جاتی، اور موسم اور بری سڑکوں کی جوابدہ ہوتی۔ اُس کی تنخواہ مقرر تھی جو اُسے کبھی پوری نہیں ملی۔ بایں ہمہ اسے دوسروں کے سے کپڑے پہننے پڑتے تھے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ایسے کپڑے جو دوسرے لوگ بہت کم پہن سکتے ہوں۔ مجلسوں میں اُس کی شرکت بہت ترحم انگیز ہوتی تھی۔ ہر شخص اُسے جانتا تھا لیکن کوئی اس کی پروا نہ کرتا تھا۔ رقص کے موقع پر اُسے صرف اس وقت رقص کرنے کا موقع ملتا تھا جب کسی عارضی جانشین کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور خواتین ہمیشہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر لجاتیں جب کبھی انہیں ملبوس خانے میں جاکر اپنی پوشاک کے کسی حصے کی مرمت کرنی ہوتی۔ اس میں خودداری کا مادہ موجود تھا۔ اور اپنی حالت کا بہت تلخ احساس کرتی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف نظر ڈالتی کہ اس حالت سے بچنے کی کوئی صورت ہو جائے۔ لیکن وہ نوجوان جو اپنی غیر مستقل خود بینی میں گرفتار ہو کر دھکے کھاتے پھرتے اس کا ذرا سا بھی خیال کرنا گوارا نہ کرتے۔ حالانکہ لیزاویٹہ آموفونا ان شوخ اور مغرور لڑکیوں سے سو درجہ زیادہ خوبصورت تھی۔ جو شریک صحبت ہونے کے قابل سمجھی جاتی تھیں۔ اور جن کے گرد نوجوان پھڑپھڑاتے پھرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس عظیم الشان لیکن پست کمرہ سے خاموشی کے ساتھ نکل جاتی، اور اپنے چھوٹے سے کمرہ میں جاکر رونے لگتی، جہاں کاغذ کے پردے کمرہ کی کل زینت تھے۔ اور جہاں ایک موم بتی پیتل کے شمعدان میں اپنی مدھم روشنی سے جلتی رہتی تھی +

ایک دن یعنی اُس کے کھیل سے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں، دو دن بعد اور اس منظر سے جسے ہم بیان کر رہے ہیں۔ ایک ہفتہ بیشتر لیزاویٹہ آموفونا حسب معمول دریچہ کے پاس اپنے کشیدہ کاری کے اڈے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ اس نے باہر نظر ڈالی اور دیکھا کہ ایک نوجوان انجنیر بے حس و حرکت کھڑا اس کے دریچہ کو تک رہا ہے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کام کرنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے پھر دیکھا ——— وہ نوجوان انجنیر اُسی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ چونکہ وہ اس بات کی عادی نہ تھی کہ راہرو افسروں سے دل لگی کرے، لہذا اس نے دریچہ سے باہر دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور دو گھنٹے تک بغیر سر اٹھائے کام کرتی رہی۔ اس کے بعد کھانے کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے سامان کو رکھنا شروع کیا۔ اتفاقیہ اس کی نظر پھر باہر جا پڑی اور اس نے انجنیر کو وہیں کھڑا ہوا پایا۔ یہ اسے ایک انوکھی بات معلوم ہوئی۔ کھانے کے بعد وہ بے اطمینانی کی حالت میں پھر دریچہ کے پاس آئی۔ لیکن افسر اب وہاں نہ تھا۔ اور اس کے بعد لیزاویٹہ نے اُسے جلد فراموش کر دیا +

دو دن کے بعد وہ کاؤنٹس کے ساتھ کہیں جانے کے لئے مکان سے نکلی۔ اور گاڑی میں سوار ہو رہی تھی۔ کہ وہ پھر نظر آیا۔ وہ پھاٹک کے قریب کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ کالر میں چھپا ہوا تھا۔ اور ہیٹ کے نیچے سے اس کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لیزاویٹہ کو خوف معلوم ہونے لگا۔ وہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکی۔ اور ہیجان و اضطراب کا ایک ناقابل فہم طوفان دل میں لئے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جب وہ واپس لوٹی تو دوڑ کر دریچہ کے پاس گئی ——— انجنیر اسی جگہ پر کھڑا ہوا اپنی آنکھیں اُس کے چہرہ پر ڈال رہا تھا۔ وہ ہٹنے چلی آئی۔ لیکن راز جوئی کی خواہش اُسے تکلیف دے رہی تھی۔ اور ایک بالکل نیا جذبہ اس کے دل میں انتشار پیدا کر رہا تھا +

اس وقت سے کوئی دن نہ گذرتا کہ وہ نوجوان ایک مقررہ وقت پر مکان کے دریچوں کے سامنے ظاہر نہ ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک بے قاعدہ سلسلہ قایم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کام میں مشغول بیٹھی رہتی۔ اس کی آمد کو محسوس کرتی۔ اپنا سر اٹھاتی اور روز بروز زیادہ دیر تک اُسکی طرف دیکھتی رہتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نوجوان اس التفات کے لئے اُس کا منت گذار ہے۔ کیونکہ لیزا اپنی جوش شباب سے مخمور نگاہوں سے یہ دیکھتی کہ دونوں کی نظریں ملتے وقت کس طرح اُس کے نو رخساروں پر سرخی دوڑ جاتی ہے ..... ایک ہفتہ بعد وہ اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی +

جب طامسکی نے کاؤنٹس سے اپنے ایک دوست کا تعارف کرانے کی اجازت مانگی، تو غریب لڑکی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ لیکن جب اُس نے سنا کہ نارموف انجنیر نہیں ہے، تو وہ سخت پشیمان ہوئی کہ ان بیہودہ سوالات سے اس نے اپنا راز طامسکی پر ظاہر کر دیا +

ہرمن ایک جرمن کا بیٹا تھا۔ جو اُس کے لئے تھوڑی سی جائداد بھی چھوڑ گیا تھا۔ اُسے اپنی خود مختاری حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس تھا لہذا اپنی جائداد اور اُس کے سود کو ہاتھ تک نہ لگاتا۔ بلکہ صرف تنخواہ پر

گزر اوقات کرتا۔ اور معمولی فضول خرچی بھی روا نہ رکھتا۔ چونکہ وہ متین اور نخوت پسند تھا۔ لہٰذا اس کے دوست احباب کو اس کی انتہائی کفایت شعاری پر ہنسنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ اس کے دل میں جذبات نہایت زور دار تھے اور اُس کے تخیل کی پرواز بہت بلند تھی۔ لیکن اس کے کیریکٹر کی مضبوطی نے جوانی کی بے اعتدالیوں نے محفوظ رکھا۔ مثلاً وہ دل میں بہت پکا جواری تھا۔ لیکن کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کیونکہ بقول خود وہ سمجھتا تھا کہ اس کی آمدنی اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ فاضل رقوم حاصل کرنے کی امید میں ضروریات کو خطرہ میں ڈال دیا جائے۔ تاہم وہ رات بھر کھیلنے والوں کے پاس بیٹھا رہتا اور انتہائی دلچسپی سے کھیل کے ہر داؤ کا معائنہ کرتا رہتا +

تین پتوں کے قصے نے اُس کے تخیل پر بہت گہرا اثر کیا۔ اور تمام رات وہ اسے اپنے دماغ سے نہ نکال سکا۔ دوسری رات جب وہ پیرس کی گلیوں میں گھوم رہا تھا اُس نے سوچنا شروع کیا اگر بوڑھی کاؤنٹس اپنا راز مجھ پر ظاہر کر دے۔ تو کیا ہو؟ یا صرف تینوں جیتنے والے پتے ہی بتا دے۔ میں اپنی قسمت کیوں نہ آزما دیکھوں؟ اس سے تعارف حاصل کروں۔ اس کے دل میں جگہ پیدا کروں۔ شاید اس کا عاشق ہی بن جاؤں۔ لیکن ہر کام کے لئے وقت چاہئے اور وہ اسّی برس کی بوڑھی ہے۔ ممکن ہے ہفتہ بھر میں مر جائے۔ دو دن میں ہی مر جائے۔ ہاں اور یقینہ بھی ——— کیا کوئی اسکا یقین کر سکتا ہے؟ نہیں؟ بس کفایت شعاری، اعتدال محنت میرے تو یہی تین محفوظ پتے ہیں۔ جو میرے پس انداز کو تین نہیں بلکہ سات گنا کر دیں گے۔ اور میرے لئے فارغ البالی اور خود مختاری لائیں گے۔ یہ سوچتا ہوا وہ شہر کی ایک مشہور شاہراہ میں پہنچ گیا۔ اور خود کو قدیم صنعت و کاریگری کے ایک مکان کے سامنے کھڑا ہوا پایا۔ سڑک پر سیسیوں گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ یہ تمام گاڑیاں یکے بعد دیگرے مکان کے جگمگاتے ہوئے پھاٹک کے سامنے جا کر رُک جاتیں۔ ہر لمحہ کے بعد اُن گاڑیوں میں سے ایک نہ ایک حسینہ اُترتی اور جلدی سے ہال کے عالی شان پھاٹک کے اندر غائب ہو جاتی۔ ہرمان ٹھہر گیا +

"یہ کس کا مکان ہے؟" اس نے سڑک کے کونے پر ایک نانبائی سے پوچھا +

"کاؤنٹس اینہ فیڈوٹونا کا" نانبائی نے جواب دیا +

ہرمان لرز گیا۔ حیرت انگیز واقعہ پھر اس کے دماغ میں تازہ ہو گیا۔ وہ مکان کے سامنے اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اور کاؤنٹس اور اُس کی حیرت انگیز قابلیت کے متعلق سوچتا رہا۔ رات خاصی گذر چکی تھی۔ جب وہ اپنے خاموش کمرہ پر واپس آیا۔ دیر تک سونے کے لئے لیٹا اور مالآخر جب نیند نے اُس پر غلبہ پا لیا تو خواب میں بھی اسے تاش کے پتے، کھیل کی میزیں، نوٹوں کے انبار اور روپیوں کے ڈھیر نظر آتے رہے۔ اس نے ایک کے بعد دوسرے پتے پر بازی لگائی۔ اپنی بازی کو ثوق کے ساتھ دُگنا کیا۔ ہر مرتبہ جیتا ہوا پیسے چاندی کے ڈھیر اپنی طرف گھسیٹ لئے۔ اور نوٹوں کو اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ صبح کو اُس کی آنکھ بہت دیر میں کھلی اور اپنے خیالی دولت کے ضائع ہو جانے پر ایک آہ کھینچی۔ وہ پھر گھومنے کے لئے شہر میں نکل گیا۔ اور پھر اُس نے خود کو کاؤنٹس کے مکان کے سامنے پایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نامعلوم طاقت اُسے اس مکان کی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ ٹھہر گیا اور دریچوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک دریچہ کے گوشے میں اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا سیاہ بالوں والا سر کسی کتاب یا کسی کام پر جھکا ہوا ہے۔ سر اوپر اٹھا۔ ہرمان کو ایک نہایت خوبصورت چھوٹا سا چہرہ اور سیاہ آنکھیں نظر آئیں۔ اسی لمحہ نے اُس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا + (باقی ہے)

(خاص)

پنکھڑیاں } مغرب اور مشرق کے جواہر رقم ادیبوں کی کاوشوں کا لاجواب مرقع ہے۔ تخیل کی پرواز کے ساتھ پند و موعظت کا گرانمایہ سرمایہ ہے۔ فلسفہ جوشِ عمل۔ اخلاق محبت اور قانون فطرت کے متعلق سیکڑوں قیمتی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ یہ چیزیں قلم سے نہیں خون دل سے لکھی گئی ہیں۔ آپ اس کتاب کو منگا کر لطف اُٹھائیے۔ اس میں ہندوستان کے بیسیوں مشاہیر ادبا کے مضامین درج ہیں۔ قیمت ۱۰ر۔ خریداران نیرنگ خیال سے ۸ر +

ملنے کا پتہ: مینیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارہ دخانہ لاہور

اُردو

نام اور زبان

(از جناب محمد سردار علی صاحب ایڈیٹر تجلی حیدرآباد دکن)

اردو ۱۰۲۷ء میں پیدا ہوئی۔ اس کی جائے ولادت لاہور ہے۔ اس کے والدین قدیم پنجابی ہے۔ قدیم کھری اس کی علاقی ماں ہے ... "اردو" نام سب سے پہلے ۵۰ ۷ سال پیشتر پایا جاتا ہے +

اردو کا مسئلہ ایک مسئلہ ہے جس کا ابھی تک قطعی حل نہیں ہو سکا ہے۔ یہ مضمون اس لئے لکھا ہے کہ اس مسئلہ پر ترتیب وار روشنی ڈالی جائے۔ اگر قلت گنجائش کا خیال مانع نہ ہوتا۔ تو اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھنے کا خیال تھا +

غالباً اس کی تاریخ میں سب سے اہم سال ۱۰۲۷ء ہے یہ وہ زمانہ ہے جبکہ محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کر کے اپنے علاقہ میں شامل کیا۔ اس نے قبل ازیں ملک پر کئی چڑھائیاں کیں تھیں۔ لیکن اس سال اس نے پنجاب پر قبضہ کیا۔ اور دار السلطنت لاہور میں اپنی فوجیں مقیم کر دیں پس یہی سال ۱۰۲۷ء اردو کی پیدائش کا سال خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت فارسی بولنے والے سپاہی ان لوگوں کے ساتھ رہنے بسنے لگے جن کی زبان قدیم پنجابی تھی۔ ان سے ملنے جلنے اور بات چیت سے ان کی زبان سیکھ لی۔ یہ خیال کہ تمام لوگوں نے فارسی بولنی شروع کی ہوگی۔ غلط ہے ضرور ہے فوج بھی قدیم پنجابی زبان بولتی ہوگی جو ان دنوں کی دہلی کی کھری بولی سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے فارسی الفاظ اور محاورات اس میں شامل کر لئے ہوں۔ یعنے واضح طور پر اسکا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اردو بولنا شروع کیا ہوگا +

۱۶۰ سال تک محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں نے پنجاب پر اپنا قبضہ رکھا۔ ۱۱۸۶ء میں پنجاب ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ دوسری دفعہ بھی ان لوگوں نے اس ملک کو فتح کیا جن کی زبان فارسی تھی۔ اس وقت کا فاتح محمد غوری تھا۔ جس کے ایک غلام قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کو فتح کیا اور ۱۲۰۶ء میں اپنے آقا کے انتقال کے بعد خود پہلا سلطان ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی فوجیں ان سپاہیوں کی دوست بن گئیں جن کو انہوں نے لاہور میں شکست دی تھی۔ دونوں فوجیں دہلی بھیجی گئیں اور کچھ فوج لاہور میں رکھی گئی قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ دہلی آئے تھے۔ ان میں قابل لحاظ تعداد قدیم اردو بولنے والوں کی تھی۔ بعد میں بھی فارسی بولنے والی جدید فوج اور شہر کے لوگوں کے اثر سے جن کی زبان قدیم کھری تھی اردو بنی +

اردو کی اصل کے متعلق جو خاکہ ہم نے پیش کیا ہے اس کی بنا پر ہم کو چاہئے کہ دہلی نہیں بلکہ لاہور کو اردو کا جنم بھوم اور قدیم پنجابی کو اس کے ماں باپ قرار دیں۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت کی پنجابی کیسی تھی۔ پھر بھی ہم یقین کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ قدیم کھری سے زیادہ مختلف نہ ہوگی۔ ہم کو چاہئے کہ برج کو بحث سے خارج کر دیں کیونکہ براہ راست اس کا اردو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۱۰۲۷ء میں جب اردو کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت پنجابی زبان جدید صورت اختیار کر رہی تھی۔ اس کے بعد سے ۱۳۴۶ء تک یعنے محمد تغلق کے حملہ دکن اور دولت آباد کی بنا تک ہم کو اردو کا کافی ثبوت نہیں ملتا۔ ۱۳۴۷ء میں علاء الدین بہمنی نے بغاوت کی اور جب خاندان بہمنی کے پہلے فرمانروا کی حیثیت سے تخت نشین ہوا تو اس کی ریاست میں اردو سرکاری طور پر رائج کی گئی +

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مذکورہ بالا بیان محتاج ثبوت ہے۔ تو اسکو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ عہد مغلیہ کے دوران میں دہلی میں اردو کے آغاز کے نظریہ کو قبول کرنے کے متعلق جسقدر ثبوت اب تک قابل تسلیم سمجھے گئے ہیں ان کی نسبت یہ ثبوت قوی تر ہے +

عام طور پر ہندوستانی مصنفین کا خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے بابر نے اپنی تزک بابری میں دہلی کے شاہی کیمپ کو "اردو" لکھا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے۔ کہ بابر ترکی تھا جو ۱۵۲۶ء میں ترکستان سے آیا تھا۔ اور قدرتی طور پر کیمپ کو اردو بولتا تھا لیکن لفظ "اردو" اس سے بہت پہلے جہانگشائے جوینی تصنیف ۱۲۵۰ء میں پایا جاتا ہے +

"در اردوئے شہزادگان درنتوانند آمد" جلد ۱ صفحہ ۱۶۲

"دراندرون اردو آمدند" صفحہ ۱۴۸

اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں بابر سے کئی سو سال پیشتر لاہور یا دہلی کی فوج کو "اردو" نہ کہیں +

اب سوال یہ ہے کہ لفظ اردو پہلی دفعہ کب زبان کے معنی میں استعمال ہوا۔ ۱۸۴۶ء بعد لکھنؤ میں اور ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں لفظ اردو زبان کے معنی میں عام طور پر استعمال ہونے لگا +

غالباً یہ لفظ اکیلا زبان کے معنی میں سب سے پہلے مصحفی، ۱۷۵۰-۱۸۲۴ء کے پاس ملتا ہے ؎

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ یہ شعر کس سال کہا گیا ہے۔ غالباً مصحفی نے اس شعر کو جوان ہونے کے بعد کہا ہوگا۔ وہ ۱۷۷۶ء میں اچھے شاعر تسلیم کئے جا چکے تھے

جی۔ بی۔ گل کرائسٹ نے ۱۷۹۶ء میں اپنی ہندوستانی گرامر میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے:-

"مخلوط بول چال میں اردو یا دربار کی شستہ زبان بھی کہتے ہیں اور جو آج سلطنت کے وسیع صوبوں میں پھیلی ہوئی ہے"

ہندوستانی گرامر صفحہ ۲

جب ہم کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس سنہ میں مصحفی نے مذکورہ بالا شعر کہا ہے تو ہم کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ گل کرائسٹ پہلا شخص ہے جس نے اردو کو زبان کے معنی میں استعمال کیا +

جولس بلاک نے ایک عجیب و غریب خیال پیش کیا ہے۔ جو اُن کا طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ اور جس کے ثبوت کی سخت ضرورت ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ لفظ "اردو" یورپینوں کی یادگار ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا نہایت ضروری ہے کہ گل کرائسٹ نے مندرجہ بالا فقرہ میں نام کے معنی میں جو پہلے ہی رائج ہو چکا تھا، اردو لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ خود گل کرائسٹ ہمیشہ زبان کو "ہندوستانی" لکھا کرتا تھا +

ڈبلیو۔ ایچ۔ بیلی نے ۱۸۰۲ء میں "ہندوستانی" پر ایک مقالہ لکھا ہے جو برٹش میوزیم میں موجود ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہندوستانی" کے نام سے جس زبان کی میں نے تصریح کی ہے کہ وہ اکثر ہندی، اردو، مسلمانی اور ریختہ بھی کہلاتی ہے" +

سید انشاء دریائے لطافت تصنیف ۱۸۰۰ء میں لکھتے ہیں کہ:-

"خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبان ہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ و در بعضے عبارت و الفاظ تصرف بکار بردہ زبان تازہ سوائے زبان ہائے دیگر بہم رسانیدند و اردو موسوم ساختند" +

دریائے لطافت صـ۲

میر امّن نے باغ و بہار کے دیباچہ میں جو ۱۸۰۱ء کی تصنیف ہے۔ اردو کی پیدائش کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ اُنہوں نے لفظ اردو اکیلا استعمال نہیں کیا (ہر جگہ اردو زبان لکھا ہے) لیکن تمام عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو نام کے معنی میں استعمال کیا ہے +

ہم یہ لکھ کر اس بیان کو ختم کرتے ہیں کہ زمانہ دراز سے "فارسی" اور "ہندی" نام بحیثیت اسمائے معرفہ کے استعمال ہو رہے تھے۔ لفظ اردو کو اٹھارہویں صدی کے آغاز تک ان کے برابر وسعت حاصل نہ ہوسکی +

"زبان اردوئے معلّٰی" پہلی دفعہ میر کی نکات الشعرا میں جو ۱۷۵۲ء کی تالیف ہے پایا جاتا ہے۔ مذکرہ مذکور (طبع یادایوں) کے صفحہ ایک پر لکھا ہے کہ

"پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعر لست بداطوار شعر فارسی بزبان اردوئے معلّٰی شاہجہان آباد کتاب تا حال تصنیف نشدہ" +

یہاں غالباً اردوئے معلّٰی سے مطلب فصیح یعنی مستند اور دہلی کی بامحاورہ اردو ہوگا +

اس کے دو سال بعد قائم نے مخزن نکات لکھی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"اکثرے از تراکیبات فرس کہ موافق محاورہ اردوئے معلّٰی مانوس گوش می باشد بنیجہ جواز الا بیان می دانند" +

مخزن نکات طبع اورنگ آباد صفحہ ۳۳

یہاں بھی اس جملہ کا مطلب نیچہ اور بامحاورہ اردو ہوسکتا ہے۔ مصنف کے ذہن

میں فوج کا خیال نہیں۔ لیکن میر اور قائم نے بحیثیت زبان کے ہمیشہ نہری یا ریختہ استعمال کیا ہے +

میر کے فرزند عرش نے جو اُنیسویں صدی بقید حیات تھے لکھا ہے کہ

ہم ہیں اردوئے معلی کے زباں داں اے عرش
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

اس شعر کی تصنیف کا سن نامعلوم ہے۔ عرش کے والد نے بعمر ۹۰ سال ۱۷۹۹ء میں انتقال کیا۔ عام طور پر سن وفات ۱۸۱۰ء جو بیان کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے +

آخر میں محمد عطا حسین نے نوطرز مرصع تصنیف ۱۷۹۸ء میں "زبان اردوئے معلی" کا استعمال کیا ہے مسٹر غلام محی الدین قادری نے دو مخطوطوں کی طرف مجھے توجہ دلائی ہے۔ جن میں زبان اردو کا استعمال سب سے قدیم ہے وہ یہ ہیں

(۱) تذکرہ گلزار ابراہیم مصنفہ علی ابراہیم خاں تصنیف ۱۸۳۳ء میں واصلات خاں ناجت کے ذکر میں لکھا ہے :- "متبع زبان اردو نمودہ"

(۲) تذکرہ شعرائے ہند مصنفہ صحفی تصنیف ۱۷۹۴ء میں محمد امن فگار کے بیان میں لکھا ہے :- "ادائے زبان اردو"

اٹھارہویں صدی میں یا اس سے کچھ زمانہ قبل اس زبان کو عام طور پر ہندی کہتے تھے اور ادب یا شاعری میں ریختہ استعمال ہوتا تھا +

جعفر زٹلی (۱۷۱۳-۱۷۵۹ء) کا شعر ہے

اگر چہ سبھی کوڑ دو کرکٹ است
بہ ہندی و ہندی زباں لٹ پٹ است

فضلی اپنی دہ مجلس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں جو ۱۷۳۲ء کی تصنیف ہے

"اور انبک ترجمہ بہ عبارت ہندی نثر نہیں ہوا سنا"

آتش نے اپنی مثنوی خواب وخیال (۱۷۴۰-۱۸۰۷ء) میں اکثر اوقات ریختہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

جبکہ حضرت نے اس کو فرماغ سکتی ہی
ریختہ نے یہ تب شرف پایا
مثنوی خواب وخیال کا ہ!

یہاں حضرت سے مراد ان کے بھائی اور استاد میر حسن ہیں۔ پھر مثنوی کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے اردو کو "ہندی" لکھا —

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں
باقی اشعار مثنوی سو ہیں

افضل بیگ نے اپنے تذکرہ تحفۃ الشعراء میں جو غیر مطبوعہ ہے۔ زیادہ تر ان شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو فارسی گو تھے لیکن جہاں کہیں وہ اردو نظم ذکر کرتا ہے تو اس کو ہندی لکھتا ہے۔ چنانچہ میر عبدالحق وقار کے حال میں لکھا ہے :- "اشعار فارسی و ہندی طبع درست دارد"

(چمنستان شعراء ص ۱۱۵)

شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ (۱۷۵۵ء) کے دیباچہ میں لکھا ہے :-

"در شعر فارسی پیروی مرزا صائب است در ریختہ دا،،ا استاد میداند"

دیکھو آبحیات مطبوعہ نولکشور ص

میر حسن نے ۱۷۸۶ء میں وفات پائی انہوں نے تمہاری بہتری میں ہندی یا ریختہ استعمال کیا ہے۔ اردو کا استعمال نہیں کیا۔ ج

"تذکرہ سخن آفرینان ہند" کرن جب میر

ہوئی تقدیر بھلا کس کو کہتے ہیں اس
حتی کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے کہا تھا۔ "ہندی کی طرح معلوم ہوتے ہو"

ہندی نام استعمال کیا ہے؟ آہا وہ کیسی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ بہن! تم پر تو دم ہوتا ہے جیسی پیاری صورت ہے۔ ویسا ہی ان کا دل بھی

بت کا یہ عالم کہ ایم اے پاس ہیں۔ تم نے وہ ہی باتوں میں الجھا دیا

میر مجھے اپنے گھر کب بلاؤ گی۔ دیکھنا اپنی نند کی شادی میں نہیں بلا

اکثر بھول نہ جانا۔ یہاں پڑے پڑے تو میری جان سخت لاکھ کوشش

مارے ہنوئی بقول ان کے بڑے رسیلے ہیں "بھون! بھے اب تو

آوازیں سے وہ مجھے مارے ڈالتے ہیں۔ دوسرا خط امر پیچھے کتاب کے پتے

جانا۔ زیادہ اس وجہ سے نہیں لکھا کہ تمہارا قیمتی وقت بیگم کو جلانے اور دکھ پہنچانے

امربابو کی خدمت میں مہرا پر نام۔ اپنی خیر وے کیا فائدہ ؟

کا پتہ چل گیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اپنی قابلیت

دیتا ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ آؤ! مشاعرہ آؤ!

صاحب گنج ۔ ۳ رجون سرکار گنہگار ایک ساتھ بیٹھکر قیامت تک پچھتائیں

شرم بھی کرن بالا دیوی کر معاف کر دو!" گنہگار امرناتھ

بھلی بہن! مجھے سخت ہ

تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ بالے پن اعظم کریلوی

تھی۔ اسکول میں پڑھ کر وہ اور رنگ لا معاف

تعلیم سے زیادہ فائدہ کی امید نہ رکھنی چاہئے

حقایق

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد:- میری (بیوی)، جیرالڈ (میاں)، راجر (بیوی کا دوست)

[ایک آراستہ کمرے کے اندر میری بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کا دل اخبار میں نہیں لگتا۔ اُٹھا کر رکھ دیتی ہے۔ بیتابی سے گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔ ہر آہٹ پر گوش برآواز ہے۔ کبھی آئینہ کے سامنے جاکر اپنے نئے فراک کے شکنوں کو درست کرتی۔ اور کبھی اپنے چہرہ پر پوڈر لگاتی ہے]

میری۔ (ایک آواز سے متاثر ہوکر سر ہلاتے ہوئے) نہیں نہیں میرا خیال ہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز کسی ایسے آدمی کی ہے جو ہمارے مقابل کے کمرے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہو +

[گھڑی کی طرف دیکھتی ہے]

اوہ۔ اُسے ابتک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اُس کا دس بجے کا وعدہ تھا اور دس بج چکے ہیں +

(زور سے گھنٹی بجتی ہے) اوہ! وہ آن پہنچا

دو ڈکر ہال کمرہ میں پہنچتی ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میری آواز دیتی ہے "راجر؟ آؤ۔ میں یہاں ہوں"

راجر میری کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ بلند قامت اور خوبصورت نوجوان ہے۔ عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ ہاتھ میں ایک فلٹ ٹوپی اور چمڑے کا چھوٹا اٹاچی بکس تھا +

میری۔ میرا خیال تھا کہ تم کبھی نہ آؤ گے +

راجر۔ (اپنی ٹوپی اور بکس کو کرسی پر رکھتے ہوئے] مگر مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ کیا میں دیر سے پہنچا ہوں؟

میری۔ ہاں۔ پانچ منٹ +

راجر۔ (معذرت کرتے ہوئے) میں سیدھا بھاگم بھاگ آیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر کلب گھروں میں کھیل دیر سے شروع ہوتے ہیں مجھے معاف کرنا ابھی تک رنگ وروغن میرے منہ پر لگا ہوا ہے۔ دیکھو منہ دھونے میں بھی وقت ضایع نہیں کیا +

[آئینہ کی طرف بڑھتا ہے اور اپنے چہرے پر نظر ڈالتا ہے]

میری۔ دیکھوں میں! (اُسے کھینچکر اپنی طرف کرلیتی ہے۔ غور سے دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے) راجر اسے مت چھوؤ یہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے +

راجر۔ (ذرا تفکر سے) اچھا! ٹھیک ہے!! (اپنے پر نگاہ ڈالتا ہے) میری جیرالڈ ابھی گھر نہیں آیا +

میری۔ (آنکھیں جھکاتے ہوئے) نہیں۔ وہ۔ وہ آج گھر نہیں آئینگے وہ اکثر باہر رہتے ہیں۔ تم کو معلوم ہے نا۔ اُن کا زیادہ وقت سیاحت میں ہی گذرتا ہے (ایک کرسی کو جھاڑتی ہے) راجر ادھر بیٹھ جاؤ +

راجر۔ شکریہ۔ [وہ کچھ کھوئی سی حالت میں کوچ پر بیٹھ جاتا ہے]

(میری انگیٹھی پر سے سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی اُٹھا لاتی ہے۔ پیش کرتے ہوئے) آپ ایک سگرٹ لیجئے گا!

راجر۔ ایک سگرٹ لیتے ہوئے۔ اوہ شکریہ +

میری۔ دیا سلائی!

راجر۔ شکریہ۔ (دیا سلائی کا بکس لے لیتا ہے۔ میری بھی ایک سگرٹ بکس میں سے نکال لیتی ہے۔ راجر دیا سلائی جلاکر پہلے میری کا اور پھر اپنا سگرٹ جلاتا ہے]

میری۔ شکریہ۔ (وہ کوچ کے دوسرے کونے پر آگ کے قریب بیٹھ جاتی ہے) کہئے مزاج تو اچھے ہیں! آج دوپہر سے قبل ہماری آخری ملاقات تک کیسے گذری؟

راجر۔ آپ کی فرمائش بہت طولانی ہے۔ آج دوپہر کی ملاقات سے قبل ہم آخری بار کب ملے تھے +

میری۔ تین سال چار ماہ دو دن قبل +

راجر (سر ہلاتے ہوئے) توبہ۔ میرا یقین ہے کہ تم صرف اندازاً کہہ رہی ہو

میری۔ نہیں۔ مجھے صحیح طور پر یاد ہے کہ جھرات کی رات تھی۔ موسم ابر آلود تھا۔ بارش کی وجہ سے مجھے آپ کی چھتری تلے پناہ لینی پڑی تھی۔ اور تم مجھے مسز ٹیکر کے مکان پر چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ تمہارے آخری الفاظ کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں موجود ہے +

"میں تمہاری خوش بختی کے لئے دل وجان سے متمنی ہوں۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے!!"

کیا اتنے سالوں تک تمہاری یہ خود پسندی حق بجانب تھی؟

راجر۔ میرا خیال تھا کہ حیرالڈ سے شادی کے بعد تمہیں ضرورت نہیں رہی تھی کہ تم اپنا وقت میرے ساتھ ضایع کرو +

میری۔ افسوس +

راجر۔ سچ کہتا ہوں میرا یہی خیال تھا +

میری۔ لیکن راجر۔ ہمیں شادی کے بعد دوستوں کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے +

راجر۔ مگر مجھے اس نظریہ سے اتفاق نہیں +

میری۔ لیکن یہ تو ایک سچائی ہے +

راجر۔ خوب۔ لیکن اگر میری شادی ایسی عورت سے ہو جائے جو حسین اور خوبصورت ہو اور مجھے پسند ہو۔ تو میں تو ہرگز پسند نہیں کرونگا۔ کہ دوستوں کا گروہ ہمارے ارد گرد منڈلاتا رہے +

میری۔ کیا تم درحقیقت مجھے خوبصورت اور پسندیدہ سمجھتے ہو +

راجر۔ اصولاً کہہ رہا تھا +

میری۔ اوہو۔ مگر آپ جھینپتے کیوں ہیں!

راجر۔ میں تو نہیں جھینپتا +

میری۔ شکریہ۔ یہ آپکی پہلی قدر افزائی ہے جو اتنے سالوں کے بعد آپنے فرمائی ہے +

راجر۔ لیکن کمرہ تو آئینوں سے بھرا پڑا ہے +

میری۔ آئینے قابل نفرت ہیں۔ ہر لحظہ جب عورت ان میں اپنا سراپا دیکھتی ہے۔ وہ برابر محسوس کئے جاتی ہے کہ وہ بوڑھی ہو رہی ہے +

راجر۔ یہ آئینہ کا قصور نہیں۔ عورت کی رنگت اسکی ذمہ دار ہے +

میری۔ میری رنگت!

راجر۔ ہاں۔ جب عورت آئینہ دیکھتی ہے تو وہ اس میں اپنے سے مختلف عورت دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے۔ مگر اسے مطلوبہ عورت سوائے ایکبار کے کبھی نظر نہیں آتی +

میری۔ وہ کب؟

راجر۔ وہ اس وقت جب وہ محبت میں گرفتار ہو!

میری۔ لیکن کیا وہ ایک سے زیادہ بار محبت میں نہیں پھنس سکتی؟

راجر۔ نہیں!

میری۔ میں آپ سے متفق نہیں ہوں +

راجر۔ یہ اس لئے کہ تم کبھی محبت میں گرفتار ہی نہیں ہوئی ہو +

میری۔ خوب!

راجر۔ بیشتر آدمی اس سے محروم ہیں +

میری۔ کیا تم نے بھی کبھی محبت کی ہے؟

راجر۔ یہ کوئی پسندیدہ سوال نہیں!

میری۔ کیوں +

راجر۔ اگر میں کہوں کہ نہیں۔ تو تمہیں رنج ہوگا۔ اگر میں کہوں ہاں تو تم پھول جاؤ گی +

میری۔ تم مجھے بہت برا سمجھتے ہو!

راجر۔ ہاں۔

میری۔ اچھا!

راجر۔ تمام عورتیں ایسی ہی ہیں +

میری۔ ہونگی۔ تمہیں بارہا ایسے ہی تجربات حاصل ہوئے ہونگے۔

راجر۔ نہیں بلکہ میں خود برا آدمی ہوں +

میری۔ اتنی جرأت!

راجر۔ یا صرف دلیری +

میری - سچ کہنا یہ دلیری ہے ؟ !

راجر - بیشک اگر اس سے کسی کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہو +

میری - آپکو سچ سے کیا دکھ پہنچیگا +

راجر - (آپ تو بہت دلچسپ موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں) (آگ پر لوہا لکڑیاں ڈالتی ہے)

میری - آپ کو علم ہوگا کہ میں پورے طور پر کبھی سمجھ نہیں سکی - تم میرے بہترین دوست تھے اور تب بھی +

راجر - تب بھی +

میری - تم نے کبھی میرا پیار نہ لیا +

راجر - کیا تم چاہتی تھیں کہ میں تمہارا پیار لیتا +

میری - یہ کوئی اچھا سوال نہیں +

راجر - کیوں ؟

میری - اس لئے کہ اگر میں کہوں نہیں تو تمہیں ریج پہنچیگا - اور اگر میں کہوں ہاں تو تم غرور سے پھول جاؤ گے +

راجر - عورت کی پتلی +

میری - لیکن راجر میں اکثر اس بات سے حیران تھی کہ تم مجھے پسند کرتے تھے +

راجر - مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا تھا

میری - اسی طرح سے لانس - گارڈن اور بل بھی مجھے پیار کرتے تھے -

راجر - کیا یہ تمام تمہیں پیار کرتے تھے -

میری - ہاں +

راجر - گو یا بدقسمتی سے تمہارے بہت سے عاشق تھے +

میری - میرا خیال ہے کہ تم نے کبھی بھی مجھے پسند نہیں کیا +

راجر - ہاں - بہت سی باتوں میں +

میری - اب تو تم میں کافی دلیری پیدا ہو گئی ہے

راجر - نہیں - مجھے اب یاد آیا ہے +

میری - کیا یاد آیا ہے ؟

راجر - جیرالڈ یہاں موجود نہیں +

میری - اس کو اس گفتگو سے تعلق ؟

راجر - مجھے تمہارے سامنے ایک اچھی مثال پیش کرنا ہے +

میری - میں اچھی مثالوں سے تنگ آگئی ہوں - اب میں دو گھڑی چین سے بسر کرنے کی متمنی ہوں +

راجر - شاید اسی لئے تم نے مجھے ایسے وقت میں یہاں آنے کی دعوت دی ہے - جب جیرالڈ یہاں موجود نہیں +

میری - (سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے سینہ تان کر) راجر یہ ناقابل معافی ہے +

راجر - (پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے اور بہ اطمینان ٹانگیں پسارتے ہوئے) ہاں - بالکل - اب تمہیں یہ کہنا چاہئے کہ راجر یہاں سے چلے جاؤ پھر کبھی مت آنا +

میری - میرا خیال نہیں تھا کہ تم ایک لوفر بن جاؤ گے +

راجر - نہیں بلکہ تمہیں اُمید تھی کہ میں پورا لوفر بن جاؤنگا +

میری - (کھڑی ہو کر) ہاں - بیشک ..... استغفر اللہ تو ہین !

راجر - واقعی یہ ناقابل معافی جرم ہے +

میری - تم میری توہین کر رہے ہو

راجر - غلط - میں تو تمہارے سب منشا کام کر رہا ہوں - تمہیں ذرا تیزی طبع کی ضرورت تھی - میں اپنی باتوں اور خیالات سے اسے مہیا کر رہا ہوں +

میری - کیا میں نے تمہیں اس لئے جیرالڈ کی غیر حاضری میں بلایا تھا!

راجر - تم مجھ پر تہمت تراش رہی ہو +

میری - (ہاتھوں کو ملتے ہوئے) اوہ - ہو +

راجر - یہ حرکت یقیناً ناقابل معافی ہے +

میری - (جس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے) کیا مجھ سے ایسا سلوک کرنا تمہارے نزدیک درست ہے +

راجر - درست تو نہیں البتہ ضروری ہے +

میری - تم بالکل وحشی پن کا اظہار کر رہے ہو (آہ سرد بھرتی ہے) اگر تمہیں علم ہوتا کہ میں کیسی بدقسمت اور مصیبت زدہ ہوں ! (آہ سرد) میں کبھی کسی سے نہیں مل سکتی - میں کبھی باہر نہیں جا سکتی - میں زندہ درگور ہوں +

راجر - ہوں - ہیں !!

میری - اور جیرالڈ استقدر حاسد ہے - کہ اگر کسی آدمی سے بات تک

کرتی ہوں تو وہ خیال کرتا ہے کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہے۔ مجھے صرف اس وقت دو گھڑی تفریح و سکون نصیب ہوتا ہے۔ جب وہ کہیں سفر پر چلا جاتا ہے +

راجر۔ بہت خوب!!

میری۔ جیرالڈ کا نکتہ نظریہ ہے کہ ہر غروب آفتاب کے وقت ہم اس کال کوٹھری کے اندر چھپ کر بیٹھے رہیں۔ ایک معمولی گون اور ٹوٹے پھوٹے سلیپروں میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہیں۔ یا اخبار پڑھتے رہیں۔ تماکو پئیں یا کتابیں پڑھیں۔ راجر تم نہیں جانتے کہ اس سے کتنی کوفت ہوتی ہے۔ میں آگ کے سامنے بیٹھی جیرالڈ کے موزے اُس وقت خشک کر رہی ہوتی ہوں جب مجھ جیسی ہزاروں باغات میں سیر کر رہی ہوتی ہیں۔ حالانکہ میری عمر ابھی صرف ۲۴ سال کی ہے +

راجر۔ صحیح ہے۔ صحیح ہے۔ لیکن اگر تم ۴۳ سال کی ہوتیں تو تم زیادہ محسوس نہ کرتیں +

میری۔ مجھے یقین ہے کہ تم محض میرا تمسخر اُڑا رہے ہو +

راجر۔ نہیں نہیں میرا حرف حرف جذبات صحیحہ کا مظہر ہے +

[راجر کے ہونٹ سکڑنے لگتے ہیں اور بے اختیار ہنسنے لگتا ہے]

میری۔ (غصہ سے) تم۔ تم!! یقیناً ایک انسان ناجیوان ہو۔ راجر!

راجر۔ ہاں۔ ہاں!! میری۔ لیکن کیا تمام مرد ہی ایسے نہیں؟

میری۔ (زمین پر پاؤں مارتے ہوئے) تم میں سے کسی میں بھی انسانیت نہیں تم درندے ہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں +

راجر۔ بھلا میرے خیال میں وحشی یا درندہ ہونا۔ اور نفرت کیا جانا زیادہ محفوظ ہے +

میری۔ مطلب

راجر۔ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) اچھا خیال رکھو۔ دیکھو میں کہتا ہوں (سنجیدگی سے) میری! یہ بات میرے دل کو پاش پاش کئے دیتی ہے کہ تم خوش نہیں رہتیں۔ تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ تمہاری آواز کی لوچ جاتی رہی ہے۔ تمہارے ہونٹ نیچے کی طرف سکڑ گئے ہیں۔ تمہارے ہاتھوں میں سختی اور کھردرا پن پیدا ہو گیا ہے۔ تم تھکی ماندی اور مضمحل سی نظر آتی ہو۔ آہ مجھے تمہاری مصیبتوں میں تم سے دلی ہمدردی ہے۔ (وہ اُس کے ہاتھ پر گرمجوشی سے بوسہ دیتا ہے)

[یکایک پرانے انداز پر واپس لوٹ کر]

فرض کیجئے کہ میں ایسا کرتا تو اس سے ہم دونوں پر کیا حالت طاری ہوتی +

میری۔ راجر! راجر!! کاش کہ تم ایکٹر نہ ہوتے +

راجر۔ ہاں کبھی کبھی مجھے ایکٹر بھی بننا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اکثر بہت مفید پڑتا ہے +

میری۔ میرا خیال ہے تمہیں کبھی بھول کر بھی کسی سے محبت پیدا نہ ہوگی کیونکہ تمہیں ہزاروں دفعہ نقلی محبت کا اظہار سٹیج پر کرنا پڑا ہے +

راجر۔ میرا خیال ہے کہ میں ان دونوں سے محروم ہوں۔ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ ساتھ مذاق بدل جاتا ہے۔ اور اب کوئی بھی سچی محبت نہیں کرتا۔ ہم میں سے زیادہ محض تبدیل ہوتی رہنے کی کوشش کرتے ہیں +

میری۔ تمہارا مطلب +

راجر۔ کیا تمہیں جیرالڈ سے محبت ہے؟

میری۔ (حیرت زدہ ہو کر) کیوں۔ ہاں مجھے اُس سے محبت ہے۔ ہم ہندوستان سے آنے والے ہم وطنوں سے پہلے بولی جاتی ہے +

راجر۔ (سختی سے) مجھے کوئی اعتماد نہیں۔ درحقیقت تمہیں کسی کی سچی محبت نہیں محض حیلہ سازی سے کام لیتی ہو +

میری۔ اچھا!

راجر۔ ہاں۔ اور جب جیرالڈ تمہیں کسی دوسرے دوست کی طرح مایوس کر دیتا ہے تو تم مجھے اُس کی جگہ پُر کرنے پر مجبور کرتی ہو +

میری۔ راجر!

راجر۔ تم اس چھوٹی لڑکی کی طرح سے ہو جو ننھی ننھی گڑیوں کی ماں بنکر ان سے کھیلتی ہے۔ اور اپنے مصنوعی انداز میں پوری پوری تسلی حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن جب وہ بڑھ کر اصلی بچے پیدا کرتی ہے۔ تو اس وقت اسے زندگی دشوار اور مصائب کا گھر معلوم ہوتی ہے +

میری۔ تم تخیلات کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو +

راجر۔ نہیں۔ میں صرف حقایق پرست ہوں۔ کیا تم اصلی بچوں کو پسند کرو گی؟

میری۔ یقیناً۔ (راجر میں رُک جاتی ہے)

راجر۔ تم ہرگز پسند نہ کرو گی۔ تم صرف اُن کا تصور کرنا پسند کرتی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم اُن سے بھاگنا چاہتی ہو تم اپنے آپ کو کھونا چاہتی

ہوکر میں شادی بیاہ کے بندھنوں اور دھندوں سے اُکتا گئی ہوں۔
آؤ ہم اسے ایک طرف رکھ دیں اور کسی دوسری چیز سے دل بہلائیں +

میری ۔ (کسیقدر تیزی سے) تم جو مجھے طعن و تشنیع کا مرکز بنائے ہوئے ہو۔ کچھ اپنے متعلق بھی ارشاد ہو +

راجر ۔ میں خود بھی ویسا ہی پاجی ہوں۔ میں ہمیشہ حقایق سے پرہیز کرتا اور تخیلات کی دنیا کا شیدائی ہوں +

میری ۔ میں تخیلات میں گم نہیں ہوسکتی یہی چیز ہے جو میں کھو چکی ہوں۔

راجر ۔ (تاجرانہ انداز میں) اب مجھے بتلاؤ کہ تمہارا جیرالڈ سے جھگڑا کیوں ہوتا ہے؟

ـ میں جیرالڈ سے نہیں جھگڑی +

جیرالڈ تم سے کب جھگڑا تھا؟

ارکو +

، کہا تھا کہ تم اُسے پھوڑ دوگی؟

، اور کیا اس نے جواب دیا تھا کہ وہ پسند کر خوش ہوا ہے۔

ری ۔ ہاں +

عبر ۔ گویا کچھ بھی خرابی واقع نہیں ہوئی +

میری ۔ مطلب؟

راجر ۔ عام طور پر مرد سوموار کے دن ایسے ہی ہوتے ہیں +

میری ۔ وہ کہتا تھا کہ میں اپنے سر کے بال بڑھاؤں +

راجر ۔ اس کے لئے تم اس پر الزام نہ دو۔ یہ تمہارے بال ہیں جو اسقدر خوبصورت ہیں +

میری ۔ (خوش ہوکر) اوہو +

راجر ۔ اگر تمہارے بال بڑے ہوتے تو یقیناً اُسنے تمہیں بالوں سے پکڑ کر کھینچا ہوتا اور تمہیں زمین پر دے پٹکا ہوتا۔ اور تم دونوں نے بالوں سے فائدہ اٹھایا ہوتا +

[سامنے کے دروازے میں کنجی گھومنے کی آواز سُنائی دیتی ہے
وہ دونوں گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں]

میری ۔ (سرگوشی سے) جیرالڈ۔ خدا کے لئے کہیں جلدی چھپ جاؤ۔

[راجر اپنی ٹوپی اور چمڑے کا بکس اُٹھا لیتا ہے۔ اور پاس کے دوسرے کمرے میں دوڑ کر چھپ جاتا ہے۔ عین اس وقت ساٹھ کا ہو والا کھلتا ہے اور جیرالڈ کمرے میں داخل ہوتا ہے]

جیرالڈ ۔ ہیلو!

میری ۔ (تعجب کو چھپاتے ہوئے) کیوں۔ خوب۔ آپ آگئے!!

جیرالڈ ۔ خلاف معمول میرا کام جلدی ہوگیا۔ اور مجھے واپس آنا پڑا۔ مجھے اپنی قبل از وقت آمد کی اطلاع تمہیں بذریعہ تار دینی چاہئے تھی مگر میں رات ہی کی گاڑی پر سوار ہوکر (چھپتی) آج تم بہت چست و چوبند نظر آتی ہو۔ گون بھی نیا پہن رکھا ہے؟!

میری ۔ (گون پر نظر ڈالتے ہوئے) جی۔ ہاں!

جیرالڈ ۔ کہیں باہر تھیں؟

میری ۔ نہیں تو۔ میں نے اس لئے پہنا تھا کہ دیکھوں کیسا معلوم ہوتا ہے۔

جیرالڈ ۔ (قریب آکر) یہ نیا ہے۔ ہے نا؟

میری ۔ ہاں!

جیرالڈ ۔ خوب۔ بہت خوبصورت +

میری ۔ (حیران ہوکر) کیا آپ واقعی اسے پسند کرتے ہیں؟

جیرالڈ ۔ ہاں۔ اور یہ موزے بھی نئے ہیں!

میری ۔ ہاں +

جیرالڈ ۔ یہ بھی نظر فریب ہیں +

میری ۔ مگر بہت گراں ہیں +

جیرالڈ ۔ پرواہ نہیں۔ مجھے یہ بہت پسند ہیں۔ ایسی تین چار جوڑی اور خرید لو +

میری ۔ (ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے) جیرالڈ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے؟

جیرالڈ ۔ کیا تم محسوس کرتی ہو +

میری ۔ آج تم بالکل مختلف قسم کے مرد معلوم ہوتے ہو +

جیرالڈ ۔ کیا میں واقعی مختلف قسم کا آدمی ہوں +

میری ۔ (پاس جاکر) جیرالڈ مجھے بتلاؤ بھی؟

جیرالڈ ۔ میں اپنی جیب میں چھ سو پونڈ کی زاید رقم محسوس کر رہا ہوں +

میری ۔ مطلب +

جیرالڈ ۔ میرا تقرر ایک نئی آسامی پر ہوگیا ہے۔ ایک مہینہ کے بعد میں اس

نئی آسامی پر چلا جاؤں گا۔ کمپنی کے کارخانہ کا منیجر۔ مانچسٹر کی شاخ کا افسر اعلیٰ۔ میری تنخواہ ایک ہزار پونڈ سالانہ ہوگی +

میری۔ (جیرالڈ سے چمٹتے ہوئے) ایکہزار اشرفی سالانہ!

جیرالڈ۔ (بیوی کو چھاتی سے لگاتے ہوئے) ہاں۔ پیاری +

میری۔ مجھے تو یقین نہیں آتا +

جیرالڈ۔ نہ ہی مجھے شروع میں یقین آیا تھا +

میری۔ ایکہزار سالانہ! ہفتہ وار کیا ہوا؟

جیرالڈ۔ قریباً بیس پونڈ +

میری۔ یہ تعجب انگیز ہے۔ تم نے پہلے مجھے کیوں نہ بتلایا +

جیرالڈ۔ خود مجھے بھی اس کا بخوبی علم نہ تھا۔ ابتدا میں یہ صرف زبان قلمے تھے۔ مجھے یقین نہ تھا کہ میرا تقرر اس آسامی پر ہو سکے گا۔ لیکن جب میں یہاں سے سوموار کو روانہ ہوا۔ اور میں نے نہ کرنے والا کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا تو وہ مجھے مل گئی +

میری۔ سوموار کے دن تم کسقدر وحشی بنے ہوئے تھے + زبان ہونے

جیرالڈ۔ اس روز درحقیقت میرا یہی تصور تھا + جوانشاپردازی

میری۔ نہیں نہیں۔ اس دن میرا یہی تصور تھا + بجھانے کی نہ کرتے ہیں ورنہ

جیرالڈ۔ میں غلطی پر تھا +

میری۔ تم نے مجھے سمجھایا ہوتا + سے زیادہ

جیرالڈ۔ تم نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا + رسی جانتے ہیں

میری۔ نہیں نہیں وہ سب جھوٹ تھا + ی دانی مطلق ناکافی

جیرالڈ۔ نہیں تم سچی تھیں (وہ بیوی کا پیار لیتا ہے اردو رسایل میں فارسی کے گرد باہیں حمایل کر کے اس کا جواب دیتا ہے کی جا سکتی ہے +

پیاری اب ہمیں کبھی بھی لڑنا جھگڑنا رسایل میں فارسی غزلیات

میری۔ نہیں کبھی نہیں + فیسریں ہو۔ مگر ہمارے لئے

جیرالڈ۔ تم مانچسٹر چلنا پسند کرو گی + ہمیں اردو کو اسقدر وسیع اور

میری۔ یقیناً + نہ فارسی زبان کی لذت فراموش

جیرالڈ۔ ہم وہاں خوبصورت بنگلہ لیں گے۔ محض اردو کی ترقی تک محدود

میری۔ اور ——

جیرالڈ۔ (کان میں) بچے۔ بشرطیکہ تم پسند کرو بھی ظاہر کرتی ہے کہ اڈیٹر یا سے زیادہ ذوق رکھتے ہیں

میری۔ جیرالڈ!

جیرالڈ، ہار میری، جے غزلیات

جب رائج ہے تو اردو کی بجائے فارسی رسالہ جاری کر دینا چاہئے۔ تاکہ انکا فی بخوبی پورا ہو سکے۔ اور ایسے اصحاب جو فارسی میں معقول دستگاہ نہ رکھتے ہوں اس رسالہ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں +

میرے خیال میں ہر اردو شاعر فارسی داں ہوتا ہے۔ اور اپنے خیالات کو اردو کی بجائے فارسی میں بھی نظم کر سکتا ہے۔ مگر فارسی زبان ہندوستان میں بولی نہیں جاتی۔ اس لئے ناممکن ہے کہ اسی قدرت سے فارسی اشعار ادا کئے جا سکیں۔ جس قدرت سے اردو اشعار ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر زبان زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ فارسی زبان بھی اس تبدیلی سے محفوظ نہیں۔ عام طور سے ہم ہندوستانی میں اس فارسی کی تعلیم پاتے ہیں جو آج سے پانچسو برس پہلے بولی جاتی تھی۔ ہماری درسگاہوں میں آج بھی وہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ جدید فارسی کے جاننے والے یا پڑھانے والے ہندوستان میں اسقدر کم ہیں کہ انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا فارسی میں شعر کہنا اور اردو رسایل کا ان اشعار کو دلچسپی سے شایع کرنا ہرگز مناسب نہیں +

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ فارسی شعرا پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ ایک معقول تعداد ایسے فارسی شعرا کی نظر آتی ہے جنہیں اردو شاعری میں کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور علوم پر اپنے علم اور شاعری کا سکہ بٹھانے کی غرض سے فارسی میں شعر کہنے لگے، ممکن ہے کہ ان کا یہ بھی خیال ہو کہ گرامی اور اقبال کو فارسی شاعری ہی نے معراج کو پہنچایا ہے +

میرے خیال میں ایسے شعرا کو ہرگز فارسی میں شعر نہ کہنا چاہئے۔ اس میدان میں وہ کوئی نمایاں ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کو فارسی کلام کی داد فارسی داں طبقہ سے مل سکتی ہے اور فارسی داں طبقہ اس وقت تک ان کی قدر نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ دیگر شعرا کے مقابلہ میں کوئی امتیازی خصوصیت پیدا نہ کر لیں۔ ایسا کرنے کے لئے مجتہد محنت کی ضرورت ہے۔ اس سے کم

محنت میں وہ اردو کے کامیاب شاعر بن سکتے ہیں۔ اس لئے ان کا فارسی میں شعر کہنا اور رسائل میں ان کی اشاعت کرانا موزوں نہیں +

سب سے بڑی تعداد ایسے فارسی شعرا کی ہے۔ جنہوں نے اردو میں بہت کچھ کہہ لیا ہے۔ اور خود کو اساتذہ کی صف میں خیال کرتے ہوئے اس امر کے خواہشمند ہیں کہ اُن کے ذخیرہ میں فارسی کلام کا بھی معقول حصّہ شامل ہو جائے۔ تاکہ انہیں غالبؔ کی طرح دونوں زبانوں میں کوئی مرتبہ حاصل ہو سکے +

ایسے شعرا نے فارسی شعر کہنے میں سخت غلطی کی ہے۔ وہ فارسی میں اردو کی طرح ہرگز قادر الکلامی سے شعر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ نہ وہ ہماری زبان ہے۔ اور نہ ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ اردو کے وہ مشاق شاعر سہی۔ مگر فارسی میں آکر مبتدی بن جائیں گے۔ اپنی زبان میں شعر کہتے کہتے کہنہ مشق ہونے کے بعد اس کو چھوڑ دینا غریب اردو پر ظلم کرنا ہے کیونکہ جب ان کا کلام اس قابل ہوا کہ زبان میں کسیقدر اضافہ کر سکے۔ تو وہ خود کنارہ کش ہو گئے۔ اپنی زبان کی خدمات ترک کر کے کسی دوسری زبان کی خدمات میں حصّہ لینا بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ درحقیقت نہ فارسی کو اُن کی خدمات کی ضرورت ہے اور نہ وہ خود باوجود انتہائی کوششوں کے کسی قسم کی خدمات موجودہ دور میں انجام دے سکتے ہیں +

کچھ تعداد ایسے فارسی شعرا کی ہے۔ جنہیں قدرتاً فارسی سے دلچسپی ہے۔ اور فارسی کے کثرت مطالعہ نے اُنہیں اس زبان کا ایسا دلدادہ بنا دیا ہے کہ اردو زبان میں شعر کہہ کر کوئی لطف ہی حاصل نہیں ہوتا اس کے علاوہ فارسی زبان سے زیادہ وابستہ ہونے کے سبب سے اُن کے اردو اشعار میں فارسی ترکیبیں خود بخود کثرت سے آ جاتی ہیں۔ اکثر مصرع کا مصرع فارسی میں نکل جاتا ہے۔ جس سے اُن کی اردو شاعری میں ایک قسم کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے شعرا نے اردو میں شعر کہنا ہی بند کر دیا۔ اور صرف فارسی شاعر بن کر رہ گئے +

ایسے شعرا کی فارسی شاعری پر کچھ زیادہ مخالفت نہیں کی جا سکتی ممکن ہے کہ وہ اس میدان میں ترقی کر سکیں اور ہندوستان میں اُن کی فارسی شاعری کسیقدر وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائے۔ مگر موجودہ دور میں ایران کی زبان اور شاعری میں اسقدر انقلاب ہوا ہے کہ کسی ہندوستانی فارسی تعلیم یافتہ کا کلام وہاں سے خراج تحسین حاصل نہیں کر سکتا۔ میں ایسے لوگوں کی توجہ میرزا غالبؔ کے اس شعر کی طرف مائل کرتا ہوں ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیسے ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

جو لوگ فارسی کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ اس لطافت کو جو ان کے قلب کو فارسی کی طرف کھینچتی ہے۔ اردو میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے مطالعہ سے اردو کو مستفید کریں اور اپنی مادری زبان کو زیادہ وسیع جامع بنانے کی جدوجہد مصروف ہو جائیں۔ میرے خیال سے اپنی زبان سے زیادہ کسی دوسری زبان کو عزیز سمجھنا کوئی خوبی نہیں ہے۔ بلکہ اپنی زبان کی کوتاہی کو دور کرنا ایسے لوگوں کے فرائض میں داخل ہے۔ اس لئے میں تو ان لوگوں سے بھی یہی استدعا کرونگا کہ اپنی زیادہ توجہ اردو کی طرف مبذول کریں +

اسی قسم کے فارسی شعرا میں کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے ایران جا کر یا کسی اور ذریعہ سے جدید فارسی کی تحصیل میں اپنا کافی وقت صرف کیا ہے۔ اور اپنی نظم و نثر کی مثال پیش کر کے ہندوستان کے فارسی داں طبقہ کو سیدھے راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ضرور فارسی میں شعر کہنا چاہئے تاکہ ہندوستانی فارسی داں طبقہ جدید فارسی سے واقف ہو جائے۔ مگر ان کو چاہئے کہ وہ اپنے مضامین نثر و نظم کے لئے اردو رسایل کا انتخاب نہ کریں۔ بلکہ ہندوستان میں فارسی زبان کے قیام اور اُس کی اصلاحات کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے ایک فارسی ادبی رسالہ جاری کریں

فارسی شاعری کی طرف اس وجہ سے بھی شعرا رغبت کرتے ہیں۔ کہ جو بات اردو میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی فارسی میں ادا کرنے پر سامعین سے کافی داد مل جاتی ہے۔ مگر جو شعرا محض اس وجہ سے فارسی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ٹوٹی پھوٹی فارسی جاننے والے اصحاب نے کچھ تو خود کو سخن فہم ظاہر کرنے کے خیال سے۔ اور کچھ فارسی کی شیرینی سے متاثر ہو کر اُن کے معمولی معمولی اشعار پر کافی سے زیادہ داد دے کر ..... انکو اس غلط فہمی میں ڈالدیا ہے کہ وہ فارسی میں بڑی کامیابی سے شعر کہہ سکتے ہیں۔ اُن کو یاد رکھنا چاہئے کہ اسی قسم کے نااہل غلط فہمی پیدا کرنے والوں نے ہماری اردو شاعری کو خراب کیا ہے۔ مشاعروں میں نااہل اور مبتدی شعرا کو ضرورت سے زیادہ داد دیکر اُن کے دماغ میں خودی کے جراثیم پیدا

کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ترقی مسدود ہو گئی۔ مذاق شاعری خراب ہو گیا اور تحصیل علم و کمال کے دروازے بند ہو گئے +

موجودہ فارسی شعرا میں حضرت اقبال کا نام سب سے پہلے آتا ہے اور درحقیقت اس شاعر پر ہندوستان جسقدر ناز کرے کم ہے۔ تمام دنیائے اسلام کی خدمات جس خصوصیت سے اقبال انجام دے رہا ہے آجتک کسی اردو یا فارسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ فارسی ہی ایک ایسی زبان ہے جس کے سمجھنے والے مسلمان دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں۔ اور جو شاعر تمام دنیا کے مسلمانوں کو کچھ پیام دینا چاہے۔ اس کو ضرور فارسی زبان میں شعر کہنا چاہئے +

مگر اُن کے اس اہم مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی میں علامہ اقبال سے یہ استدعا کرونگا کہ کسی زبان میں معقول سرمایہ فراہم کرنا ایسے ہی فاضل شعرا کا کام ہوتا ہے۔ اور ہر زبان ہمیشہ ایسے شعرا کی دست نگر ہوتی ہے۔ یقیناً اُن پر زبان کے کچھ اہم حقوق ہوتے ہیں۔ جن کا انجام دینا فرض شناسی میں داخل ہوتا ہے۔ غریب اردو کی بے کسی ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی خدمات سے کسی قسم کا تغافل بھی جائز رکھا جائے۔ یہ کہنے سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ اقبال نے اردو کی کوئی خدمت ہی انجام نہیں دی۔ یقیناً اُن کی ہر اردو نظم نے اردو ادب میں معقول اضافہ کیا ہے۔ لیکن ان کے فضل و کمال اور فارسی ذخیرہ پر نظر ڈالتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ اب تو عرصہ سے زیادہ تر تازہ کلام فارسی ہی میں نظر آتا ہے۔ اور یہ یقیناً اردو پر بڑا ظلم ہے۔ کیونکہ اس زبان میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی ضرورت ہے۔ میں ان کے عظیم مقصد پر نظر ڈالتے ہوئے فارسی میں شعر کہنے پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر یہ ضرور کہونگا کہ اردو کے بھی ان پر کچھ حقوق ہیں۔ اگر وہ اس غریب کو بھی پوچھتے رہیں تو کیا گناہ ہو +

عرصہ سے حضرت ہادی مچھلی شہری کا کلام بھی فارسی میں شائع ہو رہا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے فارسی کلام کو جس میں وہ کئی سال سے کوشش کر رہے ہیں۔ اردو کلام کے مقابلہ میں اچھا سمجھتے ہوں۔ مجھے تو اس امر کا افسوس ہے کہ خدا جانے غریب اردو نے ایسا کونسا گناہ کیا تھا کہ اُس سے نفرت کا اظہار کیا گیا۔ میرے خیال سے ہر اردو شاعر پر فارسی سے زیادہ اردو کے حقوق ہیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ فارسی اشعار کہنے پر مجبور ہیں۔ تو میں ان سے یہ استدعا ضرور کرونگا۔ کہ غریب اردو رسایل کو اس ذوق کے لئے انتخاب نہ کیا جائے +

ارادہ تھا کہ تفصیلاً خاص خاص ہندوستان کے موجودہ فارسی شعرا پر روشنی ڈالوں۔ اور اُن کے کلام پر بھی اظہار خیال کروں۔ مگر طوالت کے خیال سے اور دیگر مصلحتوں کے لحاظ سے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انشاء اللہ ایک جداگانہ مضمون کی صورت میں پیش کروں گا +

اب میں اردو رسایل سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ فارسی غزلیات کی اشاعت بند کر دیں۔ کیونکہ رسالے کا وہ حصہ۔ جو اُن غزلیات پر صرف ہوتا ہے اکثر ناظرین کے لئے بے کیف ہو جاتا ہے اور ہندوستانی فارسی شعرا سے استدعا کرونگا کہ وہ اردو رسایل میں فارسی غزلیات شایع کرانے کی بجائے ایک فارسی رسالہ جاری کر دیں۔ ہندوستان میں فارسی زبان کے قیام کے لئے ایک رسالہ کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یا پھر اردو میں شعر کہنا شروع کر دیں،

چشم ما روشن دل ما شاد +

(خاص) ثمر میرٹھی

تین تین پیسہ میں ایک ایک تصویر +

یعنی نیرنگ خیال کی ان تصاویر کا انتخاب جو وقتاً فوقتاً نیرنگ خیال میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجموعہ میں کل تیس تصاویر ہیں۔ جن میں سے دس تصاویر سہ رنگی اور بیس تصاویر یکرنگی ہیں۔ تمام بڑے بڑے اور بہترین بلاک انتخاب کر لئے گئے ہیں۔ اور ہر تصویر آرٹ پیپر کے صرف ایک ہی طرف شایع کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ اپنی لائبریری میں رکھنے یا آرایش کے لئے چوکھٹوں میں لگوا کر رکھنے کے لئے بہترین اور لاجواب ہے۔ ٹائیٹل بھی خوشنما لگایا گیا ہے۔ اس قسم کے تصویری اہم جو کلکتہ کے انگریزی رسایل شایع کیا کرتے ہیں انکی قیمت صرف عہ رکھی ہے۔ حالانکہ بعض تصاویر اتنی قیمتی اور نظر فریب ہیں کہ ایک ہی تصویر اس قیمت میں بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ فی الفور طلب کیجئے نیرنگ خیال کے خریدار دکھو محصول ڈاک معاف۔ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارود خانہ لاہور

بُلبل

ع۔ آواز ہائے یہ کسی دردآشنا کی ہے

(محترمہ مس حجاب اسمٰعیل صاحبہ کے قلم سے)

آہ پھر وہی پرندہ ——— !

دو سال ہوئے گرمی کی ایک صبح تھی۔ کسان بیلوں کو لئے کھیتوں میں آ گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی اُبلتے ہوئے چشمے کے کنارے سے کوئل کی دلگداز کوک سُنائی دے جاتی تھی +

میں اُس وقت اپنی خوابگاہ میں لیٹی تھی + کوچ پر لیٹی تھی۔ اور صبح کی روشنی میرے سیاہی مائل سرخ زلفوں کو چمکا رہی تھی۔ دفعتاً کمرے کے باہر اک سُریلی سیٹی شناسا کے ایک چھوٹے سے درخت پر بجنے لگی +

کیا آپ کو بُلبل کے فسانوں سے کسی طرح کی دلچسپی ہے ؟۔ آپ نے کچھ نہیں تو جان کیٹس کی بلبل کے ترانوں کے متعلق تو پڑھا ہوگا؟ میں یہ صرف اس لئے پوچھتی ہوں کہ اگر آپ کو اس قصۂ پارینہ سے کسی قسم کی دلبستگی نہ ہو تو ساز کے اس تار کو میں چھیڑوں ہی نہیں +

اچھا ——— میں تو وہ سرگذشت بیان کر رہی، اور کہاں اب سوال و جواب کرنے لگی ! ———

اُس دن مجھے بہت سے کام انجام دینے تھے۔ اس لئے میرا پروگرام یہ تھا کہ صبح ہے سے اپنے مشاغل میں مصروف ہو جاؤں۔ تاکہ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی میرے کام بھی ختم ہو جائیں +

ان تمام مشاغل میں سب سے زیادہ ضروری کام ایک فسانے کی تکمیل تھی، جس کو میں نے تین رات قبل لکھنا شروع کیا تھا۔ اور آج دن کے ابتدائی گھنٹوں میں اُسے مکمل کر دینا چاہتی تھی +

میری بوڑھی خادمہ آہستہ آہستہ اپنے کام کر رہی تھی۔ اب وہ بہت بوڑھی ہو گئی تھی۔ بولتی بھی کم تھی، سنتی بھی کم۔ مجھے عموماً ایسے ہی لوگ زیادہ پسند ہیں۔ اُس نے صبح ہی لکھنے کی میز باغ کی دھوپ گھڑی کے قریب شاہ بلوط کے فسانہ پرور سائے میں لگا دی تھی۔ کاغذات رکھ دیئے تھے جب سب کچھ ہو گیا تو "عمر خیام" کا ایک نامکمل شعر گنگناتی ہوئی میرے قریب سے نکل گئی +

میں صبح سے اپنا فسانہ سوچ رہی تھی۔ اور اپنے فسانے کے افراد اک سینما کے فلم کی طرح میرے دماغی پردوں پر گذرنے لگی ہے۔ اور یہی وقت قصّہ کو صفحۂ قرطاس پر اُتار لینے کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ اور وہ صبح بھی فسانہ نویسی کے لئے بہت موزوں تھی۔ کیونکہ گرمیوں کے دنوں میں، دریچہ کے پاس اک آسمانی روشنی ناچا کرتی ہے۔ ایسے ہی مناظر قصّہ نویسوں کے لئے فسانہ لکھنے کی بنیاد بن جاتے ہیں +

میں کوچ سے اُٹھی موسم کا لحاظ کر کے سمندری رنگ کا ایک گہرا نیلا لباس پہنا۔ باغ کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ دفعتاً کھڑکی کے پاس ایک درخت پر باریک آواز میں اک تیز سیٹی بجنے لگی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو نرگس کے پودوں کے قریب ایک نیلگوں چشم یونانی بلبل بیٹھی سُریلی سیٹیاں بجا رہی تھی جو صبح کی زندگی بخش ہواؤں میں مل جل کر کسی دُکھی کی پکار کی طرح مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ آہ کمبخت ——— یہ پرند ہمیشہ میرے مشاغلِ حیات اور مصروفیتِ زندگی میں خلل اندازی کرتا ہے !

گرم موسم کی اوس چمکیلی صبح، یونانی دیوتا کی اس چھیڑ چھاڑ نے میرے خوابِ پرست جذبات میں اک تلاطم پیدا کر دیا۔ مگر یہ تلاطم سمندر کے تلاطم سے بہت مختلف تھا۔ کیونکہ سمندری تلاطم میں تو اک وحشیانہ غصّے اور تکبرانہ جلال کے آثار ہوتے ہیں۔ مگر اس تلاطم میں اک سرور آگیں کیفیت ملی ہوئی تھی۔ جو میرے جسم و جان کو جاڑوں کے گلاب کی طرح شگفتہ اور

دل و جذبات کو مئی کے پسینے کی سوسن کی طرح سوختہ کر رہا تھا!

آہ ——— ! میری بدگمانی میں اس خوش گلو پرندے کی سیٹیوں کا بہت بڑا دخل ہے +

مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس شعر و نغمہ کی عاشق چڑیا نے میرے مشاغل حیات میں خلل اندازی کی!

رات کا وقت تھا اور آپ کو معلوم ہے، کہ مشرقی ممالک کی راتیں کیسی پر افسوں ہوا کرتی ہیں ——— میں کمرے میں بیٹھی اپنی اک نظم لکھ رہی تھی۔ نیلے آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ جیسے نیلی آنکھوں پر روشنی جگمگا رہی ہو۔ ٹہنیاں رات کی خاموش ہوا سے جھوم رہی تھیں اور چڑیوں کے گھونسلے نیند سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دریچے کے پاس ہندی شاعروں کا محبوب مطرب گرم موسم کا ایک بھونرا رسیلا گیت گا رہا تھا ——— ! معبود جانے وہ نارنگی کے خوشبودار پتوں میں کہاں چھپی بیٹھی تھی کہ دفعتاً بالکل اچانک طور پر کیکس کی اس خوش گلو اور دل پسند محبوبہ نے ——— یا یوں کہئے کہ یونانیوں کے راگ و عشق کے دیوتا نے اس زور کی سیٹی سامنے تاریکی میں نارنگی کے درخت پر بجائی کہ مجھے تو ایسا محسوس ہوا۔ کہ میرے ساتھ ہی رات کی تاریکیاں بھی لرز گئیں! ———

اور آہ —!! وہ رات بھی کیسی عجیب اور پر تاثیر رات تھی! گرم ممالک کی راتیں بھی واقعی کیسی افسانوی ہوا کرتی ہیں! وقت سنسان تھا، فاختہ زور زور سے پانی کے راستوں پر چلا رہی تھی۔ دریائی طوطے اور دوسری مرغابیاں دور کے مقامات پر بول رہی تھیں۔ آسمان سے ایک پراسرار مسکراہٹ برس رہی تھی۔ اور زمین پر ایک دھیمی مسرت کا سایہ تھا۔ دنیا مجھے اک جزیرۂ خواب نظر آتی تھی۔ نارنگی کی ایک سبز ٹہنی پر بلبل نغمہ سرائی کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی فرشتہ خواب کے راستوں پر بیٹھا نجات کی بیوگل بجا رہا ہو +

آج اس واقعہ کو دو سال گذر گئے۔ اس اثنا میں میں نے کئی مضامین اور کئی فسانے لکھے۔ مگر میری وہ نظم ادھوری ہی رہ گئی جن جذبات سے متاثر ہو کر میں نے وہ نظم لکھنی شروع کی تھی۔ وہ بلبل کی گیت کی لے میں ڈوب کر، موج کی طرح جو سمندر میں غائب ہو جاتی ہے، ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئے! ——— اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس نامکمل نظم کو بلبل کے نام سے منسوب کر دوں +

کوئی شک نہیں کہ رات کے سناٹے میں سرو کا درخت بھی گاتا ہے اس کی موسیقی ہم کو عبادت الٰہی کی طرف کھینچتی ہے۔ اور اس میں بھی کلام نہیں کہ ٹہنی سن کا "چشمہ" بھی

men may come and men may
go, But i go on FOR Ever

کے میٹھے ترانے الاپتا ہے۔ اور اس کی آواز ہم کو کھینچکر نیچر کی شفقت پناہ آغوش میں دے دیتی ہے۔ مگر بخدا ——— کیٹس کی بلبل کے ترانوں کی بات ہی جدا ہے۔ اس کی ملکوتی موسیقی ہم کو آدم و حوا کے قصے کی یاد دلاتی ہے۔ ہم کو "بہشت گمشدہ" کے فسانے سے عشق دلاتی ہے۔ تتلی کی کوئی موسیقی اتنی جاں نواز، اتنی رومانوی نہیں، جتنی ایک عندلیب کی!

میں نے سمندری موجوں کی موسیقی کے متعلق وہ کہانی آپ کو نہیں سنائی؟ وہ مجھے حفظ ہے۔ کہتے ہیں، پرانے زمانے میں ساحل نیل پر ایک دفعہ گیتوں کا بادشاہ بیٹھا اپنی محبوبہ سے اظہار عشق کر رہا تھا۔ وہ اپنی آواز پر بڑا نازاں تھا۔ اتنے میں ایک یونانی بلبل، اس کے سر پر سے نغمے الاپتی ہوئی اڑ گئی۔ اور راگ و نغمہ کا شہنشاہ دریائے نیل کی الڑھ موجوں میں کود پڑا۔ کیونکہ بلبل کا گیت سننے کے بعد اس کو اپنی آواز میں کوئی موسیقیت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور اسی وقت سے تو سمندری موجیں اک دہشت خیز گرج کیساتھ گیتیں گایا کرتی ہیں۔ سیکڑوں لوگ آج سمندر کی آواز کو سنتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی، یہ خیال نہیں ستاتا کہ اس غم و غصہ کی گرج کا راز معلوم کریں +

آہ ——— ! اے رومانوی روح!

خوش گلو اور راتوں میں گانے والی! ——— اے تو، جو آسمانی ہوائی سلطنتوں کو اپنی آواز کے ترنم سے درہم برہم کر دیتی ہے، ——— اور جو ہماری روح کے خوابیدہ خوابوں کو بیدار، اور ضمیر کی آلائشوں کو پاک کرتی ہے، ——— تو دنیا میں صرف اس لئے بھیجی گئی ہے، کہ انسان اور الوہیت کے درمیان ترجمانی کی خدمت انجام دے!

ترے لہجے ہمیں دنیا کے پرانے چرمنے قصے یاد دلاتے ہیں ——
اور تری آواز میں ہم کو دنیا کی تاریخ نظر آتی ہے ———
آدم کا عشق، اور مریم کا تقوٰی کی کہانی از سر نو ہمارے خیالات پر مسلط ہو جاتی ہے +

انسان کی رنجیدہ مسکراہٹ' اور نیچر کی پژمردہ خوشی ترے نغمے
کی آغوش میں پہنچکر اک طویل اور موثر گیت کی صورت میں کائنات
میں گونج اٹھتی ہے +
ہماری روحیں دنیا میں تکالیف و مصائب' اضطراب و بے اعتنی
کے فیر دلچسپ اور ڈراؤنے خواب دیکھنے کے لئے بھیجی گئی تھیں +

مگر ——— اے حسن و عشق کے خوبصورت دیوتا' تیرے نغمے
ہماری خوابوں کی وادی کو مرتعش اور تراحسن ہمارے تخیل کے راستے کو
منور کر رہا ہے +

اے قدرت کی بہترین افتتاح !

(خاص) مس حجاب اسمٰعیل

اطمینان

شاہوں کی با عظمت' پُر رعب اور دلچسپ محفلوں میں اس کو میں نے تلاش کیا مگر بے سود!
امراء و رؤسا کی مجالس طرب میں' میں نے اُسے ڈھونڈھا مگر فضول !
کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ہالوں میں' میں نے اس کی جستجو کی مگر بیکار !
زہاد و فقراء کی خانقاہوں' بزرگان ملت کے جنت آثار مزاروں میں اس کی تلاش کی مگر عبث !
صحرا کے روح پرور مناظر' فضائے دشت میں جان پیدا کرنے والے خودرو پھولوں میں۔ مجھے اس کی تلاش رہی۔ مگر ناکامی!
ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں پر' مانسرور کی سرسبز وادیوں میں' راجپوتانہ کے بے آب و گیاہ ریگستانوں میں۔ میں اسکی تلاش میں سرگرداں رہا' مگر بیکار!
اجنٹا و ایلورا کے پرسکون غاروں میں' کوہ بندھیاچل کے خاموش کنجوں میں میں نے اسے تلاش کیا۔ مگر بے فائدہ !
سینما کے دلکش سینوں میں' تماشیل کے لاجواب پردوں میں بھی اُسے نہ پا سکا !
سیکڑوں اور ہزاروں پھیرے میں نے پارکوں اور تفریح گاہوں کے لئے مگر اسے حاصل نہ کر سکا !
علوم قدیم و جدید کے نادر کتب خانے' دلچسپ اور محیر العقول عجائب خانے بھی اس تک نہ پہنچا سکے !
ہارمونیم اور ستار کے ترنم ریز تاروں اور پردوں میں میں نے اس کو ڈھونڈھا مگر بجز حسرت و یاس کچھ نہ ملا !
بلبل کے چہچہے میں' پپیہے کی ہوک میں' کوئل کی کوک میں' سرود کے سحر آمیز اور ساغر بکف لمحوں میں' میں اُسے تلاش کیا مگر لاحاصل !
گنگ و جمن کی سنہری موجوں میں' شب ماہ کی پرسکوت فضا میں۔ جگمگاتے ہوئے ستاروں سے منقش چادر فلک میں' بادلوں کے عرصائے ناہموار میں اور بجلی کے خرمن سوز شعلوں میں بھی مجھے اس کا پتہ نہ ملا!
جام و مینا کی رنگین اور خمار آلود ادائیں و گلہائے خوش رنگ کی مشک بیز اور معطر سانسیں نسیم سبک خرام کی اٹھکیلیاں مجھے اس سے ہمکنار کرنے سے قاصر رہیں!
اجداد و اقربا کے پہلو۔ حسن مجازی کے جاذب نظر بت' سعدی کے دیدۂ شکست حسنان شیراز' خیام کے لبریز پیمانے' نیم تن۔ حزیں کے بچہ ہائے برہمن بھی اس کا پتہ نہیں دے سکتے!

. . . . . .

ہاں اسکا ایک اور صرف ایک پتہ ہے..... وہ اسکی یاد کے تسکین دہ اور خواب آور پردوں میں ہے!!!

سراج

منظومات

غزل

از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم۔اے لکچرار گورنمنٹ کالج لاہور

چمپئی ساقی نہ دھانی چاہئے — تشنہ لب ہوں مجھ کو پانی چاہئے
کچھ تو رنگ خوں فشانی چاہئے — پردۂ چشم ارغوانی چاہئے
پھر ہے ہم کو آرزوئے خواب خوش — پھر ہوائے زندگانی چاہئے
آنسوؤں سے کیا بجھے دل کی لگی — آگ یہ تم کو بجھانی چاہئے
بود و نابود جہاں سے کیا غرض — اک نشانِ بے نشانی چاہئے
دل ربائی کے کرشمے ہو چکے — اب ادائے جاں ستانی چاہئے
دل اڑا کر ہو گئے اچھے نجنت — خاک بھی میری اڑانی چاہئے
اپنے کشتے کی قضا سے باز پرس! — تم کو ایسی بدگمانی چاہئے
موت کیا لائے نویدِ زندگی — یہ پیام اُن کی زبانی چاہئے
پھر کوئی کھویا گیا ہے طور پر — شمع کوئی پھر جلانی چاہئے

یاد کریں گے خدا کو بھی تپش
ان بتوں کی مہربانی چاہئے

(خاص) تپش

غزل

(از جناب شیخ محمد عالم بٹ مضطر بی۔ اے)

تم دیکھتے ہو زخموں کو مرے، پھر آنکھیں موڑے جاتے ہو
کرتے ہو تارِ نظر سے رفو، پھر ٹانکے توڑے جاتے ہو

ہوتے ہو پسینے پسینے تم جو شرم سے، یہ بھی کرشمہ ہے
اللہ نے دیا ہے پھول سا منہ، تم عرق نچوڑے جاتے ہو

اُٹھ اُٹھ کر چھالے ملتے ہیں کانٹوں سے تو رو کر کہتے ہیں
یہ جلے پھپھولے کس دن کے تم آخر پھوڑے جاتے ہو

اک آس تمہارے آنے کی دلمیں تھی مرنے کی پھانس یہی
اب آنکلے ہو لحد پر تم، اس کو بھی تو توڑے جاتے ہو

بیمار کی آنکھیں حسرت سے دروازے کی جانب مڑتی ہیں
کہتی ہیں مسیحا شرم کرو، اوروں پر چھوڑے جاتے ہو

مضطر جو تڑپ دیکھی میری، تو ظالم نے یہ بگڑ کے کہا
کیا فائدہ ہے بننے سے ترے کیوں سر کو پھوڑے جاتے ہو

مضطر

(خاص)

نقد و تبصرہ

(نیرنگ خیال کے ریویو ایڈیٹر مولانا سید نجیف اشرف صاحب ندوی ایم اے کے قلم سے)

تاریخ الامت

(حصہ ہفتم) مصنفہ مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری صفحہ ۱۲۰ قیمت ایک روپیہ۔ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

آج سے تقریباً پچاس صدی پہلے مولانا اسلم نے حیات حافظ و حیات جامی کی اشاعت کے ساتھ جس طریق تصنیف کی ابتدا کی تھی اس نے ان کو ہندوستان کے اردو داں حلقہ میں اچھی طرح روشناس کر دیا ہے لیکن ان کی زیر تنقید تصنیف ایک خاص خصوصیت میں ان کی باقی تصانیف سے ممتاز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں صاف صاف اپنے ماخذوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کی یہ تصنیف سیاسی ہے۔ اگر مولانا موصوف ابتدا ہی میں اس بات کو کھلا کر دیتے اور اس سلسلہ کی اوّلین کڑی ہی میں یہ بات صاف کر دی جاتی تو شاید "بعض لوگ" نہ "اس مختصر میں سب کچھ دیکھنا چاہتے" اور نہ "زبان طعن دراز کرتے"۔

مولانا نے تاریخ الامت کے نام سے "اسلام کی مکمل مستند اور مربوط تاریخ" کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہ حصہ ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی آخری کڑی تجویز کی گئی ہے۔ حالانکہ تاریخ اسلام کے وسیع عنوان کے ماتحت ہندوستان چین۔ ایران۔ وسط ایشیا، مراکش وغیرہ کے بدقسمت مسلمان بھی آ سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ دراصل "خلافت اسلامیہ" کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ اور اس لئے اس کو تاریخ الامت کی جگہ تاریخ الخلافت کہنا زیادہ صحیح ہوتا +

اس حصہ میں آل عثمان کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ آخری خاندان تھا جس نے صدیوں تک اسلامی خلیفہ کی حیثیت سے حکومت کی، اور اس کے خاتمہ کے ساتھ خلافت کا بھی بظاہر خاتمہ ہو گیا۔ کتاب کے دوسرے حصوں کی طرح یہ حصہ بھی اجمالی تاریخ کے لئے بہت موزوں و مفید ہے اور اس خاندان کے تقریباً تمام اہم سیاسی کارناموں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کتاب میں جس چیز کی خاص کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ان خلفا کے وہ سیاسی تعلقات ظاہر نہیں کئے گئے ہیں۔ جو انکو ہندوستان کے مغل سلاطین بابر، اکبر وغیرہ کے دوسرے حاکموں سے تھے۔ حالانکہ ایک ایسی کتاب میں جو ہندوستان سے ایک اسلامی ادارہ سے اور مسلمانوں کے دار السلطنت سے شایع ہو اس کی توقع کیجا سکتی تھی۔ بہرحال عام معلومات کے لئے کتاب اچھی ہے۔ اور تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یقیناً لائق مطالعہ ہے +

سلطان شہید

مصنفہ جناب محمود خاں صاحب محمود بنگلوری، مدت قیمت ۱۲ ار پتہ:۔ نمبر ۹۴ بلاکپلی روڈ۔ کنٹونمنٹ، بنگلور

سلطان شہید ٹیپو، ہندوستان کا آخری بڑا سچا مسلمان بادشاہ تھا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی فضا پر حوادث کا بادل چھایا ہوا تھا۔ اور یہ آخری بجلی تھی جو چمکی اور دفعتہً آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن اس کی درخشندگی آج تک آنکھوں کو خیرہ کئے ہوئے ہے۔ وہ علم و عمل کی زندہ تصویر تھا۔ اس نے اس ملک میں اسلام کی گرتی ہوئی عمارت۔ اور اس کے مٹتے ہوئے نشان کو سنبھالنے اور باقی رکھنے کی کوشش میں اپنی جان عزیز سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اور اگر وہ کسی دوسری قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو نہ معلوم اس وقت تک اس کی کتنی سوانح عمریاں شایع ہو چکی ہوتیں، مگر چونکہ بدقسمتی سے وہ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوا جو اپنی غفلت و جہالت میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس لئے اردو میں دو دو چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ کچھ بھی اس کے متعلق موجود نہیں۔ حالانکہ خود انگریزی اور فارسی میں اس کی حکومت کے متعلق قصہ و تصانیف موجود ہیں۔ ایسی حالت میں خود اس کے وطن کے ایک بزرگ کا اس طرف متوجہ ہونا یقیناً لائق صد آفرین و قابل ہزار تحسین ہے۔ اس کتاب میں سلطان کے علمی و ملکی، مذہبی و معاشرتی، تمدنی و تجارتی کارروائیوں پر ایک حد تک مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سلطان شہید پہلا شخص ہے جس نے اتحاد اسلامی کا خواب دیکھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ انگریزوں نے پہلے عرب کے ایک بادیہ نشین کو نہ کہ اس عہد کے ترکی

ولیعہد کی موت

(فرانس کے مشہور افسانہ نگار الفونس دودی کے چار بہترین مختصر افسانوں میں سے ایک)

ننھا ولیعہد بیمار ہے۔ سلطنت کے تمام گرجوں میں اُسکی صحت کی دعائیں کی جا رہی ہیں۔ قریباً ہر گاہوں پر لمبی لمبی شمعیں روشن ہیں۔ دارالسلطنت کی شاہراہوں پر خوفناک سکوت طاری ہے۔ کلیسیا کے گھنٹوں کے مسرت انگیز نغمے خاموش ہیں۔ قصر کے ارد گرد عوام کا ہجوم ہے جو ولیعہد کی کیفیت سننے کے منتظر ہیں۔ درباری اپنے ریشمی زرتار لباسوں میں سائبان میں جمع ہو کر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

سارا قصر سراپا قلق و اضطراب بنا ہوا ہے۔ خادم اور مامائیں مرمریں زینوں پر ادھر سے ادھر دوڑ رہے ہیں۔ خانہ باغ میں ڈاکٹروں کا ازدحام ہے۔ ولیعہد کا اتالیق اور وزیر سلطنت کبھی ڈاکٹروں کے پاس آتے ہیں کبھی عوام کے مجمع کی طرف جا کر انہیں خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔

لیکن بادشاہ سلامت کہیں نظر نہیں آتے؟ وہ دروازے بند کر کے خلوت میں بیٹھے ہیں۔ کیونکہ داب شاہی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انہیں کوئی روتا ہوا دیکھ لے۔ مگر ملکہ کی شان جداگانہ ہے۔ وہ ولیعہد کے بستر سے لگی بیٹھی ہے۔ آنسو رخساروں پر گرم گرم آنسوؤں کی موٹی موٹی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ اور وہ بار بار کسی غریب مزدور کی حقیر بیوی کی طرح چیخ کر رونے لگتی ہے۔

کم سن ولیعہد تکیوں کے بیچ میں [redacted] لیٹا ہے۔ اُسکا چہرہ اُسکے تکیے اور اُس کی چادر سے بھی زیادہ سفید ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں دیکھنے والے سمجھ رہے ہیں کہ سو رہا ہے۔ لیکن وہ بیدار ہے۔ اور اپنی ماں کے رونے کی آواز سُن کر اُس کی طرف منہ پھیر کر کہتا ہے:-

"آپ کیوں رو رہی ہیں۔ کیا آپکو یقین ہو گیا ہے کہ میں واقعی مر رہا ہوں؟"

ملکہ بولنا چاہتی ہے مگر اسکی نہ رکنے والی سسکیاں اسے بولنے سے باز رکھتی ہیں

"آپ خواہ مخواہ ہلکان ہو رہی ہیں۔ شاید آپ یہ بھول گئی ہیں کہ میں ولیعہد ہوں۔ اور ولیعہد کبھی نہیں مرا کرتے۔"

ولیعہد کی ان باتوں سے ملکہ کے گریہ و بکا میں مزید اضافہ ہوتا ہے حتیٰ کہ ہچکیوں اور سسکیوں کا تار بندھ جاتا ہے۔ اور ولیعہد خوفزدہ ہو کر کہتا ہے:-

"میں موت کو اپنے قریب نہیں آنے دے سکتا۔ مجھے اُسے روکنا دینے کی تدابیر معلوم ہیں ——— جاؤ انہیں میرا یہ حکم پہنچا دو کہ فوج کے چالیس قوی ہیکل جوان مسلح ہو کر یہاں آجائیں اور میرے بستر کے ارد گرد حلقہ ڈالدیں نیز میرے کمرہ کی کھڑکیوں کے نیچے سو توپیں نصب کر دی جائیں۔ اور ان سے رات دن بلا وقفہ آگ برسائی جائے۔ اس کے بعد موت مجھ تک پہنچنے کی جرأت کرنے میں اپنے آپ کو خطرات میں گھرا ہوا پائیگی"

شہزادہ کی تسکین کے لئے اُس کے احکام کی تعمیل کی گئی۔ چالیس قوی ہیکل جوان اپنے لمبے نیزوں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور ولیعہد کے کوچ کو اپنے حلقہ میں لے لیتے ہیں۔ قصر کے نیچے توپیں گرجنے لگیں اور ہر طرف آگ برسنے لگی۔

ولیعہد ایک سپاہی کو پہچان کر اُسے پکارتا ہے۔

"لورین! لورین!"

سپاہی شہزادے کے قریب ہو گیا۔

"لورین! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہاری شجاعت پر مجھے کامل اعتماد ہے۔ کیوں جب موت میری طرف پیشقدمی کریگی تو تم اپنی لمبی دودھاری تلوار سے اُسے قتل کر دوگے نا؟"

"ہاں میرے آقا!" لورین نے جواب دیا۔ مگر اس کے پرشکن رخساروں پر آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے ٹپک پڑے۔

اسی دوران میں پادری ولیعہد کیطرف بڑھا۔ اُسے صلیب دکھائی اور نہایت پست آواز سے تلقین کرنے لگا۔ ننھا ولیعہد اس کی بشارت غور سے سن رہا تھا اور صلیب کو تعجب اور حیرت سے سن رہا تھا کہ اُس نے دفعتہً پادری کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "میرے مقدس باپ آپ کا مطلب میں بخوبی سمجھ رہا ہوں

لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میرا دوست بنیو بہت سا زر و جواہر لے کر میرے بے سر جائے +

پادری نے ولیعہد کے سوال کا جواب دیئے بغیر اپنی تلقین و جاری رکھی۔ شہزادہ کی حیرت بڑھتی گئی۔ آخر جب پادری خاموش ہوا تو شہزادہ نے نہایت حزیں اور دردناک آواز میں کہا:-

"میرے مقدس باپ آپ نے جو کچھ فرمایا میرے لئے بے حد تکلیف دہ اور باعث ملال ہے۔ ہاں صرف اس خیال سے میری کچھ تسلی ہوئی ہے کہ وہاں جنت میں بھی میں ولیعہد ہونگا ـــ مجھے معلوم ہے کہ خدا میرا چچازاد بھائی ہے اور وہ مجھ سے میرے رتبہ کے موافق پیش آئے گا!!"

ملکہ کی طرف متوجہ ہو کر" میں چاہتا ہوں کہ اپنا شاندار رسمی ملبوس زیب تن کروں۔ میری خوبصورت پروں والی سفید ٹوپی اور میرا مخمل کا کامدار جوتا لاؤ۔ مجھے فرشتوں سے شاندار اور خوبصورت لباس میں ملنا چاہئے۔ اور جنت میں ایک ولی عہد کے شایانِ شان ملبوس میں داخل ہونا چاہئے!!"

پادری دوبارہ ولیعہد کی طرف جھکا۔ اور اُسے تلقین کرنے لگا۔

چند لمحہ کے بعد ولی عہد معاندانہ انداز میں گویا ہوا:- "لیکن ان حالات میں اس سے کیا فائدہ کہ انسان ولیعہد کہلائے؟؟"

جواب کا انتظار کئے بغیر ننھے ولی عہد نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ اُس کی گردن پھر گئی۔ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اور ایک لمبی ہچکی کے بعد وہ ایک بے جان لاش کی طرح رہ گیا +

(ترجمہ) خاص

صدیق طبیب

نغمۂ دل

پنجاب کے نوجوان شاعر شیخ نذیر احمد صاحب ظفر کے اشعار عالیہ کا نام "نغمۂ دل" ہے جو $\frac{20 \times 30}{8}$ سائز کے پورے سوا دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ظفر صاحب کے افسانے ہیں، غزلیں ہیں۔ رباعیاں ہیں۔ کتابت۔ طباعت۔ ٹائیٹل نظر فریب۔ مصنف کی تصویر بھی نغمۂ دل کی زینت ہے۔ قیمت صرف ۱؎ + ملک میں کتابیں تو بہت شایع ہوتی ہیں اور بیشتر کہن سال اور کہن مشق اہل قلم کے افکار کا نتیجہ ہوتی ہیں لیکن یہ کتاب ایک ایسے مصنف کی خشت اول ہے جس کی عمر شاید ۱۹-۲۰ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس لحاظ سے ہم مصنف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اوائل عمر میں ہی اُنکے نظم و نثر کا مجموعہ شایع ہو کر پبلک کے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ جبکہ بڑے بڑے کہنہ مشق ادیب بھی اپنی تصنیفات کو شایع کرنے سے گھبراتے ہیں + افسانے دلچسپ ہیں اور سبق آموز۔ غزلیں تخیل اور معانی کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔ رباعیاں بھی خوب ہیں۔ ہمیں یہ سنکر بیحد مسرت ہوئی ہے کہ کتاب بیحد مقبول ہو رہی ہے۔ بنسبت صاف ملک کا نوجوان طبقہ اسے ذوق و شوق سے خرید رہا ہے۔ آیندہ نمبر میں جناب ملک محمد اقبال صاحب رضوانی بی اے کی طرف سے ایک تفصیلی ریویو اور بعض مخالفین کا دنداں شکن جواب شائع ہو رہا ہے جسمیں ایک معاندانہ تنقید کی دھجیاں اُڑائی گئی ہیں۔ ناظرین آئندہ نمبر ملاحظہ فرمائیں۔ + اسسٹنٹ ایڈیٹر

ہفتہ وار تازیانہ

ہفتہ وار تازیانہ نے اب زندگی کے تیسرے سال میں قدم رکھا ہے۔ اسکے ہر پرچہ میں نہایت دلچسپ مضامین شایع ہوتے ہیں۔ منتظمۂ گذشتہ تمام تازہ نمبروں کے بعض مضامین حسب ذیل ہیں:- (۱) بالکن ۱۹۲۱ء ایران کا وزیر مالیات۔ خرگوش کی مالی حکمت عملی۔ مسلمانان چین۔ سرحدی مسلمانوں کا فرض اور کانگرس۔ کردوں کا جھگڑا۔ اسلامی دنیا کی ایک آزاد سلطنت جنوبی افریقہ ڈربن کا خط۔ دنیائے علم و ادب کا جزیرہ جاوا میں اسلام کس طرح پھیلا + (۲) دو نفلیں۔ ترکستان سائبیریا ریلوے۔ کانگرسی رہنماؤں کی ناخوشگوار گرفتاری کے لال۔ کانگرس کی شرائط صلح اور صوبہ سرحد۔ فیلڈ انگریز اور ایک مفرور ہندوستانی قبول اسلام۔ انور بیجیا نے کھوڑا کھو لیا۔ شرق کیلئے برطانوی تعلیمی فلم۔ اردو اشتہارات کی خانہ جنگی۔ نیاؤنڈ (افسانہ) کیا ہمارا ہی جنداں ایک رقاصہ عورت تھی + (۳) ایران کے دور ترقی پر ایک چھبتی نظر۔ دور حاضرہ کا بخار۔ سلطنت مسقط و عمان۔ گندم کی ارزانی کی اصلی وجہ۔ شراب اور یورپ۔ نانک سبحا۔ افسانہ۔ مسلمانان روس + یہ صرف تین نمبروں کے اہم مضامین کی فہرست ہے۔ اس کے علاوہ تیز و شگفتہ شذرات وغیرہ ہر نمبر میں ہوتے ہیں مہینہ بھر میں ۴ پرچے شایع ہوتے ہیں جنکا مجموعہ ۸۰ صفحات ہوتا ہے۔ سالنہ نیرنگ خیال سے دگنا۔ گویا نیرنگ خیال کے ۹۶ صفحوں کے برابر۔ اخبار کی دوہری مواد دیا جاتا ہے۔ سال بھر میں ۱۲ سو صفحات کا مجموعہ ہوگا اور چندہ صرف تین روپیہ سالانہ۔ آج ہی آرڈر دیجئے اور ہفتہ وار تازیانہ جاری کرائیے۔ پتہ نیجر "تازیانہ لاہور"



جن اصحاب نے نیرنگ خیال کا ۱۹۳۰ء کا سالنامہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایک روپیہ آٹھ آنہ کی قلیل رقم میں ہم نے انہیں کتنی رنگین اور کتنی سادہ تصویریں دی تھیں کتنے صفحات مضامین کے پیش کئے تھے۔ اور ان صفحات میں کن کن اصحاب کے علمی شاہکار موجود تھے۔ یقیناً اگر آپ بیس پچیس روپے کی بہترین کتابیں بھی خریدیں تو اتنا اچھا مواد آپ کو کسی صورت نہیں مل سکیگا۔ یہی وجہ تھی کہ سالنامہ ۱۹۳۰ء کی ہزاروں جلدیں صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں فروخت ہوگئی تھیں اور صرف ایک دن میں اُس کی تین ہزار جلدیں فروخت ہوئی تھیں +

نیرنگ خیال کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ہر نمبر پہلے سے بہتر ہو۔ امسال بھی ہم خود اپنے سالنامہ ۱۹۳۰ء۔ سالنامہ ۱۹۲۹ء و سالنامہ ۱۹۲۸ء کو شکست دینے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اور بلاشبہ ہم اسمیں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم آپ کو کیا کچھ پیش کرنے والے ہیں +

جیسا کہ ہمارا دستور ہے ہم دسمبر کا رسالہ عام ماہواری رسائل کی طرح علیحدہ شایع کرتے ہیں۔ اور سالنامہ علیحدہ شایع ہوتا ہے۔ جو کم و بیش ۲۵۰ صفحات اور کئی درجن تصاویر سے مرصع ہوتا ہے۔ اس کی قیمت عہ محصول ڈاک ۴ ریکل عہ کا وی پی ہوتا ہے۔ اور صرف انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا ہے جو اس نادر تحفہ کو خریدنا پسند کرتے ہوں۔ پس جن اصحاب نے گذشتہ سال سالنامہ بذریعہ وی پی وصول کیا تھا اُن کی خدمت میں اس سال بھی وی پی کیا جائے گا۔ وہ درخواست نہ بھیجیں۔ البتہ جن اصحاب نے گذشتہ سال وی پی طلب نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا نام درج کرا دیں تاکہ شایع ہوتے ہی ہم اُن کی خدمت میں وی پی کے ذریعہ سے بھیجدیں۔ نیرنگ خیال کے خریداروں کو ہر کی رعایت دی جاتی ہے۔ اس لئے انکی خدمت میں بھی کا ہی وی پی ہوگا +

سالنامہ ۱۹۳۱ء کے مضامین کے متعلق ہم ابھی سے پورے طور پر اعلان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس سے ہمارے پروگرام کا انکشاف ہمارے بعض نقال معاصرین پر ہو جاتا ہے۔ جن کی زندگی محض نیرنگ خیال کی نقالی کے لئے وقف ہے تاہم بھی اس ماہ ہمیں کچھ نہ کچھ اپنے ناظرین کو بتانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ ہیر کی قلیل رقم میں ہم کیا کچھ اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں +

نیرنگ خیال کے سالنامہ کے لئے جناب محمد حبیب صاحب بی۔ اے آکسن۔ بار ایٹ لا پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا مشہور افسانہ "اکبر کا انصاف" لکھا جا چکا ہے۔ یہ افسانہ فلسکیپ کے ۵۰ صفحوں پر پھیلا ہوا۔ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ یقیناً ایک مکمل ناول سے کسی صورت کم نہیں۔ یہ افسانہ اتنا دلچسپ اور اتنا پرلطف ہے کہ جبتک ہم نے اسے پڑھ نہیں لیا ہمیں چین نہیں آیا۔ دوسرا مضمون حضرت آغا حشر کاشمیری المدعو شیکسپیئر

کا غیر مطبوعہ ڈرامہ "**عشق و فرض**" ہے۔ جو ایک ہزار روپیہ کے بیمہ کے ذریعہ سے ہمیں موصول ہوا ہے۔ یہ ڈراما ابھی تک اسٹیج پر نہیں دکھلایا گیا۔ اس لئے اسے ایک گرانقدر رقم کے مقابلہ میں بیمہ کر کے بھیجا گیا ہے۔ یہ ڈراما اپنی جگہ مکمل ہے۔ ڈراما عشق و فرض میں بھی ایران کے مشہور تاریخی کریکٹر سہراب، ہیرو کا پارٹ کر رہا ہے۔ اس ڈراما کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:-

سہراب (اپنے مغلوب دشمن کو مرد کے لباس میں ایک حسین عورت پاکر) رعنائی نسائیت کی جمیل ترین تصویر مردانہ مرقع میں، حسن کی دنیا کا ماہ کامل زرہ بکتر کے بادل میں، موسم بہار کے تبسم کی رنگینی جنگی نقاب میں،

چمک رہا ہے نگار قدرت کا تاج زر خاک کی جبیں پر — کہ شاخ انجم سے گر گیا ہے کوئی گل روشنی زمیں پر
طلوع نور سحر کا عالم ہے جلوہ جسم نازنیں پر — نثار ہے حسن شام جنت۔ بہار گیسوئے عنبریں پر
حسین آنکھوں میں سحر ناطق۔ نظر میں انداز دلبری کے — بلوری گردن پہ روئے روشن۔ چراغ ہو ہاتھ میں پری کے

گرد آفرید۔ (عورت کے لباس میں)

اقبالند۔ سہراب۔ وہ ایران کی بہادر لڑکی جس کے بازوؤں میں طاقت کا طوفان جس کی تلوار میں بجلیوں کا سیلاب جس کے حملہ میں کوہ آتش فشاں کا ہنگامہ پوشیدہ تھا۔ جو حریف کو کتاب زندگی کا مہمل لفظ۔ اور فتح کو اپنے گرز کی صدائے بازگشت سمجھتی تھی۔ آج اس کے اعتقاد کی دنیا ناکامی کے زلزلے سے تباہ ہو گئی۔ اس کے یقین کا فلک بوس قلعہ بنیادوں سے اکھڑ کر عاجزی کی زمین پر سرنگوں ہو گیا ہے۔ امان دو میں اظہار درماندگی کے ساتھ اپنی شکست کا اقرار کرتی ہوں +

اس قسم کی موثر رنگین اور پرجوش تحریر کے پورے ۲۰۰ صفحات فلسکیپ کاغذ کے سالنامہ میں شایع ہو رہے ہیں۔ کیا یہ فخر نیرنگ خیال کے لئے کم ہے کہ ملک کے سب سے بڑے کامیاب ڈراما نویس نے اپنا بہترین شاہکار اس کے سٹیج پر ظاہر ہونے سے قبل اشاعت کے لئے بھیجدیا ہے۔ کیا سالنامہ کی کامیابی کے لئے یہی ایک چیز کیا کم ہے؟ آیندہ نمبر میں مکمل تفصیلات پیش کی جائینگی + منیجر

حسن و خوبصورتی قایم رکھنے والی دوائیں

حسن گھر لاہور کے نایاب نسخے

آج ہر گھر میں حسن و خوبصورتی بڑھانے اور آرائش و زیبائش کے جملہ سامان استعمال میں آتے ہیں مغرب اور مشرق کی ایجادیں ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہیں لیکن جانچ کے دیکھا گیا ہے۔ بادام روغن فروخت ہونے والی اشیاء بہت مضر اور نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ مغرب کی بعض تیار کردہ چیزیں اچھی ہیں اور بعض بہت ہی ناقص۔ اسیطرح سے ہندوستانی مصنوعات کا بیشتر حصہ ناقص ہے۔ اور ہندوستانی مزاج و موسم کو مدنظر رکھ کر تیار نہیں کیا جاتا۔ ہمارا دعوے ہے کہ ہماری ادویات بے انتہا مفید ہیں۔ ایک بار کی آزمایش سے آپ پر صداقت روشن ہو جائیگی +

گلپاش (پوڈر) منہ دھونے یا حجامت بنانے کے بعد آپ پوڈر کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں تو اسے استعمال کیجئے۔ چہرہ کو گرد و غبار سے پاک صاف رکھتا ہے۔ جلدی امراض سے بچاتا اور چہرے کی رنگت کو خراب نہیں ہونے دیتا۔ عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ قیمت فی بکس ۱۲ء

غازہ نوبہار منہ دھونے اور داغ دھبوں اور میل کچیل سے صاف رکھنے کے لئے تھوڑا سا ہتھیلی پر ڈالکر ذرا سا پانی یا دودھ ملا کر منہ پر ملنے سے چہرہ پھول کی پتی کی طرح صاف و خوشنما نکل آتا ہے۔ خالص مشرقی ایجاد ہے۔ قیمت فی بکس ایک روپیہ ۔ (دیکھو صفحہ ۶۰)

شفق سرخ - گلپاش پوڈر کے بعد اگر آپ رخساروں کے بعض حصوں کو سرخ کرنا چاہیں تو اس پوڈر سے کام لیجئے۔ فی بکس ایکروپیہ ۔

عنابی - یہ ہونٹوں کو سرخ بنانے کیلئے بیمثل روا ہے۔ مدت تک کیلئے کافی ہوتی ہے فی بکس عہ

کاکل دراز (تیل) } عام طور پر گھروں میں استعمال کے لئے بے ضرور اور مفید تیل ہے۔ اس کے اجزا آملہ، بھیڑا اور ہڑ ہیں۔ خوشبودار اور اصلی تلی کے تیل سے مرکب ہے۔ فی شیشی عہ فی سیر تے

سوسن (تیل) } جن اشخاص کے بال ہر وقت تر رہتے ہوں اور بالوں سے ہر وقت تیل سا نکلتا رہتا ہو۔ ان کے لئے ایسی دوا کی ضرورت ہے جو بالوں سے فیر قدرتی تیل کا نکلنا بند کر کے بالوں کو امراض سے محفوظ بنا دے۔ قیمت فی شیشی دو روپے ۔

سُنبل (تیل) } ان لوگوں کے لئے مفید ہے جن کے بال خشک رہتے ہوں۔ بالوں سے بھوسی نکلتی ہو۔ اور سر کی خشکی سے بال خراب ہو رہے ہوں۔ اگر وہ عام بازاری تیل استعمال کریں گے تو ان کے بال اور خراب اور ناقص ہو جائینگے۔ ان کے لئے سنبل تیل ہی مفید ہے۔ فی شیشی عہ

زلف پیچاں (تیل) } یہ تیل بالوں کے جھڑنے کے مرض کو دور کر کے بڑھاتا اور بال پیدا کرتا ہے۔ فی شیشی تین روپے ۔

بال اُڑانیکی ولایتی دوا } یہ بال صاف کرنے کی ولایتی دوا ہے۔ (ساختہ لندن) گو گراں قیمت ہے۔ لیکن ہر جگہ کے بال بغیر کسی ضرر یا تکلیف کے صاف کر دیتی ہے۔ نہ اس میں بدبو ہے نہ خراش کرنے کا مادہ۔ امرا یا صاحب استطاعت ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ بہت دنوں کیلئے کافی ہوتی ہے۔ فی شیشی تین روپے ۔

نہانے اور بال دھونے کیلئے صابن } ہندوستان میں ولایتی اور دیسی ہر قسم کے صابن فسل کے لئے استعمال میں آتے ہیں۔ جو لوگ روپیہ خرچ کر سکتے ہوں وہ ہرگز منہ دھونے والے صابن کا اندازہ نہ لگا کر ہی تمام جسم پر مَلنے میں تو ان کے لئے اس سے بہتر چیز دوسری نہیں ہو سکتی۔ جو اتنی رقم خرچ نہ کر سکیں وہ سادہ صابن کا استعمال کریں مندرجہ ذیل صابن غسل کیلئے مفید ہیں ۔

۱۔ کار بالک صابن (ولایتی) مگر جسم پر پھوڑے پھنسی یا خارش کی تکلیف ہو۔ فی ٹکیہ ۱؍۲ فی بکس چار ٹکیہ ۴

۲۔ سلفر سوپ۔ (ولایتی) جن لوگوں کے بال خشک ہوں اور سر سے بھوسی نکلتی ہو وہ سلفر سوپ استعمال کریں۔ فی بکس عہ

۳۔ گلاب کا خوشبودار صابن (ولایتی) عام استعمال کے نہایت قیمتی اجزا سے مرکب ہے۔ فی بکس تین روپے ۔

شفائے دنداں } دانتوں کے مہلک امراض پائیوریا۔ پیپ اور خون آنے کی حالت میں جبکہ مسوڑھے بالکل خراب ہو گئے ہوں مجرب ترین۔ مجرب ترین۔ مجرب ترین دوا ہے۔ فی شیشی دو روپے ۔

سفید منجن } دانتوں کو جملہ امراض سے محفوظ رکھنے اور معمولی امراض کے دفعیہ کے لئے مفید ہے۔ فی ڈبیہ ۸ر

کالا منجن } رنگ کالا نتیجہ سفید۔ چھالیہ اور بادام کے چھلکوں کے کوئلہ اور دیگر ادویات سے مرکب ہے۔ ہر صبح دانتوں پر ملنے سے دانت صاف اور موتی کی طرح سفید رہتے ہیں۔ فی ڈبیہ ۵ر

سرمہ نوربصر } آنکھوں کی خوبصورتی اور صحت چمک اور روشنی کیلئے عورتوں اور بچوں کے یکساں مفید۔ فی شیشی ۸ر

سرمہ سفید } خارش، دھند، جالا۔ نزول کی ابتدا اور دیگر امراض میں اکسیر ہے۔ آپریشن سے قبل ایک دو ماہ استعمال کر کے دیکھ لیجئے کئی آدمی اپریشن کے خرچ اور تکلیف سے بچ گئے پھر اسی سرمہ سے صحتیاب ہو گئے۔ فی شیشی عہ

عطر عروس } مہندی کی سبز پسز پتیوں سے سرخ سرخ رنگین خوشبو میں بسا ہوا عطر ہے۔ رومال و کپڑوں کو لگانے کے لئے۔ فی شیشی ۸ر

نسیم چمن } ایک درجی خوشبودار پھولوں کا روح جس کی بھینی بھینی خوشبو دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ فی شیشی عہ

نہایت ضروری } چونکہ یہ دواخانہ محض حسن و خوبصورتی کے امراض کے متعلق جاری کیا گیا ہے۔ تمام جلدی امراض۔ پرانے زخم۔ پرانی خارش۔ کوڑھ مسئے۔ تمام جلدی امراض۔ چھاتیوں کے امراض۔ دانتوں کے امراض۔ ناک کے امراض وغیرہ کا علاج مفصل حالات آنے پر نہایت توجہ سے کیا جاتا ہے۔ برسوں کی پرانی شکایات بذریعہ خط و کتابت دور کی جاتی ہیں۔ حالات مفصل لکھئے اور جواب کیلئے ایک آنہ کا ٹکٹ ہمراہ آنا چاہئے ۔

المشتہر ڈاکٹر بیوٹی اسپیشلسٹ (ماہر امراض حسن و خوبصورتی) حسن گھر۔ لاہور

(جملہ حقوق محفوظ)

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اسلئے ہمیشہ اس میں اشتہار دو

جنوری ۱۹۰۰ء — اشاعت ۵۲۰۰ — نمبر ۱

ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن

قیمت فی پرچہ ۵ر۔ ویلیو بک ٹال پر ۱۰ر۔ چندہ سالانہ مع محصول ڈاک ۶ر۔ خریدہ وی۔پی سے ۷ر۔ ممالک غیر سے ۱۰ر شلنگ

نیرنگ خیال

"ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا"

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء

شذرات ۔ از ایڈیٹر	۳	تنکے کی یادگار ۔ از مولانا صدیق حسین بہاری	۴۴
رنگ زیب کا لاڈلا بیٹا ۔ جناب ریاض حسین صاحب۔ بی۔ اے	۵	نغمۂ دل اور حضرت عابد ۔ جناب ملک باقر صاحب نعمانی بی اے آنرز	۴۸
حکم کی بیگم ۔ جناب رئیس الدین احمد صاحب رضوی ایم اے علیگ	۱۰	نقد و نظر ۔ جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی۔ ایم۔ اے	۵۲
آسکر وائلڈ ۔ جناب سید باد شاہ حسن صاحب حیدرآبادی	۲۰	منظومات	
علیگڑھ سے ڈربن ۔	۲۷	کلام سہیل ۔ جناب اقبال احمد صاحب سہیل۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی	۵۵
جناب عبدالشکور صاحب ایم اے جی ٹی علیگ لکچرار شاستری کالج ڈربن		غزل ۔ جناب رگھوپت سہائے صاحب فراق گورکھپوری	۵۲
چھبھوکن (افسانہ) جناب محمد رافع الہدیٰ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ	۳۵	رباعیات ۔ حضرت شوکت بلگرامی مرحوم	۵۷
انشائے لطیف		نظریات ۔ از حضرت ظفر ہاشمی	۵۸
پگ ڈنڈی ۔ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب امرتسری	۴۱	غزلیات ۔ حضرت فروغ مرحوم، خیر بہوروی، شاطر غزنوی۔ قدسی ٹونکی	۵۹
آئینے کے سامنے ۔ حضرت "بالم"	۴۲	آل انڈیا مشاعرہ ۔ مختلف شعراء کا کلام	۶۰

دمہ کی انوکھی دوا | "کشتمال" کی ایک خوراک سے اتنا فائدہ ہوتا ہے۔ جو دوسری دواؤں سے ایک ماہ میں بھی نہیں ہو سکتا بخت سے سخت دورہ چند منٹوں میں کافور ہو جاتا ہے۔ نیا پرانا خشک و تر دمہ ایک ہی شیشی کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ پہلی خوراک سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہو تو دوا واپس کر کے اُس کی قیمت معہ دو طرفہ محصول ہم سے لے لیجئے۔ تکمیل شرط کے واسطے دو خوراکیں نمونتاً اور واپسی قیمت کا اقرار نامہ ہر پارسل میں بھیجا جاتا ہے (فوٹو) گردہ و مثانہ کے مرض اور سوزاک والوں کو نقصان دیتی ہے قیمت پے منہ محصول۔ پتہ: منیجر کشتمال فارمیسی ۱/۱۴ وکٹوریہ پارک شہر بنارس

دیوان غالب مطبوعہ جرمنی۔ قیمت تین روپے۔ کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی سے طلب فرمائیے

(۴۸۶)

شذرات

ادبی شاہکاروں کا تاریخی ہفتہ

ہندوستان اور انگلستان میں ہر ایک وقت علمی ادبی رسالوں اور معتبر صحیفوں کے خاص نمبر شائع ہوتے ہیں اور تقریباً تمام دسمبر کے پہلے ہفتہ میں اخبار فروشوں کی شالوں کی زینت ہو جاتے ہیں۔ یہ ہفتہ گویا ادبی ہفتہ ہوتا ہے جس میں ہر رسالہ اپنے حسن مذاق کی نمائش کرتا ہے۔ اور ملک اپنے بہترین اہل قلم کے رشحات سے مستفید ہوتا ہے +

دسمبر ۱۹۳۰ء کا پہلا ہفتہ بھی ۱۹۳۰ء کے سالناموں اور خاص نمبروں کی بھرمار کے لئے چشم انتظار کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ ہر شخص منتظر ہے کہ کب دسمبر کا پہلا ہفتہ آئے اور کب وہ سالنامے کے مطالعہ سے تلذذ اندوز ہو +

مختلف رسایل کے خاص نمبر اور سالنامے

اگر ہم یہ لکھیں کہ خاص نمبروں اور سالناموں کی موجودہ "وبا" کے ایک حد تک ہم ذمہ دار ہیں۔ تو اسے اعتراف گناہ کے ساتھ کسی قسم کی تعلّی نہ سمجھا جائے گا۔ اردو رسایل کی بے رنگی اور تنگ نظری کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ اوّل عام حالت میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ ظاہری شان و شوکت (کاغذ، کتابت، طباعت کی خوبیاں، تصاویر کی دلکشی اور رجاذبیت، تاریخ اشاعت کی پابندی، چندہ کی ارزانی، مضامین میں تنوع اور جدت وغیرہ کے مجموعہ سے عام پبلک مذاق میں ہیجان پیدا کر کے انہیں علم و ادب کی سرپرستی پر مایل کیا جائے۔ بالکل اسی طرح سے جس طرح ایک طبیب کڑوی کسیلی کونین پر سفید سفید شیریں شکر کا ایک غلاف چڑھا دیتا ہے۔ ہم نے بھی رسایل میں دلکشی کے لئے کئی کئی راہیں نکالیں اور ملک کی تمام پڑھی لکھی جماعتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس حد تک تو انہیں خریداری کا شرف بخشیں کہ وہ بقدر پانچ ہزار چھپ سکیں اور اپنے آمد و خرچ کے بلڈ اکو مساوی رکھ سکیں۔ اگرچہ ہمیں اردو زبان کے سرپرستوں کے سامنے اس حقیقت کے بے نقاب کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندی کا رسالہ چاند چھ روپے چندہ پر بھی ۵ ہزار فروخت ہوتا ہے۔ اور اردو کے ہیشتر شاید یقین ہمارے سرپرستوں سے مانگ کر پڑھ لینے کے ابھی تک عادی چلے آتے ہیں۔ خیر مضایقہ نہیں۔ جب یہاں تک ترقی ہو چکی ہے۔ تو ترقی کی بقیہ منزلیں طے کر لینے کی بھی امید رکھنی چاہئے۔ آج جو مانگ کر پڑھ رہے ہیں کل احساس پیدا ہو جانے پر خریدنے بھی لگیں گے۔ اس وقت اردو رسایل کی اشاعت بھی دس دس پندرہ ہزار تک جا پہنچے گی +

ہم نے اس شذرہ کی ابتدا میں خاص نمبروں اور سالناموں کی "وبا" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اکثر بہی خواہان علم و ادب بعض رسایل کے خاص نمبروں سے بددل و بدظن ہو چکے ہیں۔ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان پر پھبتیاں کہی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ روش سراسر غیر معقول اور حوصلہ شکن ہے۔ حسن مذاق کی تلاش اور اس کی مکمل صورت ایک ہی جگہ نظر آنا محال ہے۔ آپ کو کم از کم داد تو دینی چاہئے کہ ہر رسالہ ایک ضخیم نمبر بطور سالنامہ ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر اس کاغذوں کے انبار میں آپ کو حسن مذاق کی مٹی پلید ہوتی نظر آئے تو اس کا رنج نہ کیجئے "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ایک وقت آ جائے گا کہ یہی رسایل ترقی پذیر صورت میں پیش نظر ہونے لگیں گے۔ اس لئے حوصلہ شکنی کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کے نقائص نکالنے کی جگہ ان میں جو خوبیاں ہوں ان کا اعتراف کیجئے۔ اس سلسلہ میں نیرنگ خیال تمام سالناموں اور خاص نمبروں کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہے اور ان کی ہمت و کوشش کو بنظر استحسان دیکھتا ہے +

بعض رسایل کی بے راہ روی

بعض رسایل نے اپنے سالناموں کا اشتہار اس ڈھنگ سے دیا ہے گویا وہ نیرنگ خیال پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے بھائیوں کی خدمت میں پھر عرض کرتے ہیں کہ اگر وہ نیرنگ خیال سے بڑھ جائیں گے تو چشم ما روشن

دل ماشاد اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان رسایل کا معیار ترقی نیرنگ خیال ہے اور وہ نیرنگ خیال سے مقابلہ کرنے اور اُس کو شکست دینے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے اطلاعات پڑھ کر ہمیں دلی مسرت ہوتی ہے۔ اور ہم اسے نیرنگ خیال کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں کہ جو بھی ترقی کے لئے قلم بکف ہوتا ہے اُس کی منزل مقصود نیرنگ خیال ہی ہوتی ہے لیکن عامیانہ اور مبتذل رنگ میں ان امور کو معرض تحریر میں لانا رسایل کے مابین اتفاق و اتحاد کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے اس سے ذرا اجتناب کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

سالنامہ نیرنگ خیال کی خصوصیات

یوں تو بفضل خدا نیرنگ خیال کا سالنامہ نئی نئی خوبیوں اور جدتوں کا مرقع ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات جو ہم ناظرین نیرنگ خیال کے ذہن نشین کرانا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ نیرنگ خیال کی ایک مخصوص خوبی یہ ہے کہ وہ مجموعہ ہوتا ہے مشہور و معروف ادیبوں کے بہترین مضامین کا آپ کو کسی سالنامہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ نظر آئیں گے تو کسی میں منشی پریم چند کسی میں حضرت تاثیر اور کسی میں حنیف ہاشمی یعنی ہر رسالہ کے خاص نمبر میں ایک دو یا تین نام ایسے مضمون نگاروں کے نظر آئیں گے جو صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن نیرنگ خیال ہی ایک ایسا رسالہ ہے کہ اس میں یہ تمام کے تمام اپنے اپنے بہترین شاہکاروں کے ساتھ پیش کئے جائیں گے۔ نیرنگ خیال کے سالنامہ میں کم از کم پندرہ بیس ایسے ادیبوں کے مضامین ہوتے ہیں جو "ادبائے عہد" تصور کئے جاتے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ حضرت ناجی ایم۔ اے۔ منشی پریم چند۔ مجید ملک بی اے ایل ایل بی۔ پروفیسر محمد حبیب بی اے آکسن۔ آغا حشر کاشمیری۔ پروفیسر ہادی حسن خاں شروانی۔ ایم اے۔ آکسن صدر شعبۂ تاریخ مولانا ظفر علی آزاد۔ مولانا عبدالقوی فانی ایم اے۔ ادیب اے آبادی۔ اقبال احمد سہیل ایم اے۔ ایل ایل بی۔ حنیف ہاشمی ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ ملک عبدالقیوم صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا۔ مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی اے مدیر انقلاب۔ ضیاء الدین شمسی۔ عطاء الرحیم ایم اے ایل ایل بی۔ شوکت تھانوی اور رس مجاب اسمٰعیل جیسے محترم ادیبوں کے مضامین آج ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء تک موصول ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ چند اور ایسے مضامین کے وصول ہونے کی توقع ہے جس کا ذکر فی الحال مناسب نہیں۔ اس قسم کا اجتماع انشاء اللہ سوائے نیرنگ خیال کے آپ کو دوسری جگہ نظر نہیں آئے گا۔

سالنامہ کا سائز

ہمیں افسوس جواب لکھ رہے ہیں کہ نیرنگ خیال کا سائز بڑھا دینے کے بعد کہیں سالنامہ کا سائز نہ بڑھا دیا جائے۔ اس کے متعلق ہم اپنے ناظرین کو اطمینان دلاتے ہیں۔ کہ ہم اس قسم کی غلطی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ آزمودہ را آزمودن جہل است ہم ایک بار بہت بڑے سائز پر سالنامہ نکال کر بدنام ہو چکے ہیں۔ موجودہ سائز سے بڑا سائز عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ناظرین مطمئن رہیں کہ سالنامہ اس سائز پر شایع ہوگا جس پر عام پرچہ نکل رہا ہے۔ ہمارے خریدار سالنامہ خرید کر بیکار جلد بندھوا سکیں گے۔ اور جنوری سے پھر نیا فائل مرتب کرنا شروع کر دیں گے۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر

سالنامہ کی خریداری کے متعلق

جیسا کہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہے کہ ہم دسمبر کا پرچہ باقاعدہ شایع کرتے ہیں۔ اور سالنامہ دسمبر میں جدا چھاپتے ہیں گویا دسمبر کے مہینہ میں یہ دو نمبر شایع ہوتے ہیں۔ اس لئے سالنامہ صرف نیرنگ خیال کے اُن خریداروں کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے جو اسے طلب فرمائیں۔ چونکہ ہر سال سالنامہ خریدنے والے احباب یہ لکھا کرتے تھے کہ جو خاص نمبر پیچھے وہ وی پی کر دیا کریں۔ اسکا اشتہار کی ضرورت نہیں اس لئے اس سال یہ انتظام کیا گیا ہے کہ جن اصحاب کی خدمت میں گذشتہ سال سالنامہ وی پی کیا گیا تھا اس سال بھی ان کی خدمت میں سالنامہ وی پی کر دیا جائے۔ وہ حضرات اس سال از سر نو کارڈ لکھنے سے بچ جائیں گے۔ جن اصحاب نے گذشتہ سال سالنامہ نہیں خریدا تھا وہ اس سال کے سالنامہ کے لئے وی پی کی اجازت بھیجدیں۔ سالنامہ کی قیمت عہ ہوگی۔ ہر محصول ڈاک عہ کا وی پی ہوگا۔ لیکن نیرنگ خیال کے خریداروں کو عہ کا وی پی ہوگا۔ اُسے وصول فرمایئے۔

اس معاملہ میں نیرنگ خیال کے معاونین کی توجہ درکار ہے۔ آپ نے گذشتہ سال جس پتہ پر سالنامہ وصول کیا تھا۔ اگر آپ کا پتہ اُس سے مختلف ہو تو دفتر کو اطلاع دیدیجئے۔ نیز اگر کوئی صاحب کسی وجہ سے سالنامہ خریدنے سے معذور رہوں تو وہ بھی دفتر کو اطلاع دیدیں۔ اُن کے ایک کارڈ لکھ دینے سے

تم ہو کہ محکموں کے نقصان سے بچ جائیں گے۔ دیانت و اخلاق کا تقاضا ہے کہ احباب یا تو وی پی وصول کریں یا پیشتر ہی سے وی پی کرنے سے ہمیں روکدیں تاکہ دفتر نقصان سے محفوظ رہے +

نیرنگ خیال اس سائز پر موجودہ چندہ میں نہ نفع میں ہے نہ نقصان میں۔ جن صاحب کو اعتبار نہ ہو وہ ہم سے حساب پوچھ لیں۔ اس لئے نیرنگ خیال کے معاونین کو اشاعت بڑھانے۔ سالنامہ خریدنے اور نیرنگ خیال بک ڈپو سے کتابیں وغیرہ منگوانے کی طرف خاص توجہ رکھنی چاہئے +

نیرنگ خیال کے اشتہارات

اردو اخبارات و رسایل کے اشتہارات کی نازک حالت پر جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ایکہزار کی اشاعت رکھنے والے رسالے کی اُجرت فی صفحہ کم و بیش پانچ روپے ہوتی ہے۔ لیکن نیرنگ خیال جو پانچہزار شایع ہوتا ہے اُس کو بارہ اور پندرہ روپے اجرت محض اس لئے لینی پڑتی تھی۔ کہ بعض مقامی معاصرین نے اُجرتیں کم کردی تھیں۔ آئندہ نیرنگ خیال میں کوئی اشتہار پچیس روپیہ فی صفحہ فی بار سے کم اُجرت پر نہ لیا جائے گا۔ اور نہ ہی کوئی اشتہار بغیر پیشگی اجرت کے شایع ہوگا۔ ٹائیٹل کی اُجرت ۳۵ روپیہ فی صفحہ ہوگی۔ آخری صفحہ ٹائیٹل کی ۵۰ روپیہ فی بار۔ نیز وہ تمام اشتہارات بھی شایع نہیں کئے جائیں گے جن کی صداقت پر ہمیں شبہ ہوگا۔ کیونکہ بیشتر مشتہرین کی ادویات اور کتب وغیرہ کے متعلق ہمیں شکایات دفتر میں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ناظرین نیرنگ خیال یہ سُنکر مسرور ہونگے کہ حکیم محمد یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال جو شیرہ سال سے برابر مطب کر رہے ہیں اور اپنے مطب کی آمدنی کا ایک معقول حصہ نیرنگ خیال کے ابتدائی چند سال نقصانات کی تلافی کی نذر کرتے رہے ہیں۔ ہیروبخات کے مریضوں کو بھی باقاعدہ دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن باہر کے مریضوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ ہر روز صرف ایک مریض دیکھتے ہیں جس کے لئے دس روپے فیس لی جاتی ہے۔ وقت اور تاریخ کا پیشتر سے تعین کر لینا چاہئے مریض لاہور میں مقررہ اوقات پر دیکھے جاتے ہیں۔ جو صاحب لاہور تشریف نہ لاسکیں وہ بذریعہ خط و کتابت مشورہ لے سکتے ہیں۔ اس صورت میں فیس مشورہ صرف ایک روپیہ ہے جو منکوں کی صورت میں حالات مرض کے ہمراہ آنی چاہئے۔ حکیم صاحب کی زیر نگرانی دواخانہ ہندی ویونانی ۱۵ سال سے قایم ہے۔ دواخانہ نے نیرنگ خیال کے اشتہارات کے چند صفحات دواخانہ کے لئے مخصوص کرائے ہیں۔ اس سے ناظرین کو دو فایدے پہنچیں گے۔ ایک تو اچھی اور مفید دوائیں دستیاب ہونگی۔ دوسرے ہر قسم کی شکایت کی تلافی حکیم صاحب خود کرانے کو تیار رہونگے۔ اور مریضوں کو مشورہ بھی دے سکیں گے۔ اور ادویات بھی روانہ کرا سکیں گے +

سالنامہ کے اشتہارات اس تکلیف سے مستثنیٰ ہیں +

اکتوبر نمبر کی شکایات

آج ۲۷ اکتوبر ہے۔ لیکن ابھی تک ہر ڈاک میں دو چار شکایات عدم رسیدگی اکتوبر نمبر کی موصول ہو رہی ہیں۔ اس ماہ میں کم و بیش ۴۰۰ پرچے دوبارہ بھیجنے پڑے ہیں اور شکایت بڑھ گئی ہے۔ ہم محکمۂ ڈاک کو توجہ دلائیں گے اور آپ بھی توجہ دلائیے۔ رسالہ ۴ تاریخ کو لاہور سے روانہ ہو کر ۱۰ تاریخ تک ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ عدم رسیدگی کی اطلاع ۱۵ تک آنی چاہئے۔ ورنہ دوبارہ ارسال نہ ہوگا +

مینجر

نیرنگِ خیال کے خاص نمبر طلب فرمائیے

سالنامہ ۱۹۲۸ء	سالنامہ ۱۹۲۹ء	سالنامہ ۱۹۳۰ء
دو پرچے بغیر ٹائیٹل موجود ہیں + قیمت فی پرچہ پانچ روپے	مجلد موجود ہیں + قیمت فی پرچہ تین روپے	۵۴ پرچے موجود ہیں نی پرچہ دو روپے

سنہ ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۲۹ء عیدنمبر	سنہ ۱۹۳۰ء عیدنمبر
عیدنمبر کوئی پرچہ موجود نہیں	۲۸۰ صفحہ مضامین کئی رنگین تھا دیدہ زیب +	کوئی پرچہ موجود نہیں +

ایک بنا خریدار پیدا کرنے والے کو عیدنمبر سنہ ۱۹۳۰ء مفت اور دو نئے خریدار پیدا کرنے والے کو عیدنمبر سنہ ۱۹۲۹ء مفت +

مینجر نیرنگ خیال۔ شاہی محلہ لاہور

اورنگ زیب کا لاڈلا بیٹا

(از جناب ریاض حسین صاحب بی۔ اے)

[یہ دلچسپ تاریخی مقالہ بنگال کے اپنے نازموضوع سر جادوناتھ سرکار کے قلم کی تراوش ہے جسکو اظہرین نیرنگ خیال کی ضیافت طبع کے لئے اردو کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے + مترجم]

کام بخش اورنگ زیب عالمگیر کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اور چونکہ بڑھاپے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے باپ کو نہایت عزیز تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یعنی ۲۴ فروری ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کی عمر قریباً پچاس سال تھی۔ اور زینت النساء بیگم کی والدہ اودے پوری بیگم پر دل و جان سے مفتوں تھا۔ یہ راجپوت راجکماری کسی وقت دارا کے حرم میں رہ چکی تھی۔ دارا کے بعد اورنگ زیب کے حرم میں داخل ہوئی۔ اور عمر بھر اس کی دلدار و رفیق بنی رہی چونکہ شہنشاہ کو اس بیگم سے بے انتہا محبت تھی۔ اس لئے پاس خاطر سے وہ اس شہزادہ کو ضروری تعلیم و تربیت سے بہرہ ور نہ کر سکا۔ اور نہ اسے فنون جنگ میں کوئی علمی تعلیم دلا سکا۔ اس میں تو شک نہیں کہ کام بخش کی تعلیم کے لئے نہایت فاضل اتالیق مقرر کئے گئے۔ لیکن چونکہ اس کی والدہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی۔ کہ اس کے لخت جگر کو غفلت و بے توجہی کے لئے گوشمالی کرنا تو درکنار زجر و توبیخ تک نہ کی جائے۔ وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکا۔ تاہم اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ دس سال کی عمر تک قرآن شریف حفظ کر چکا تھا۔ لیکن اس کی ذہنی تربیت اور دماغی نشوونما محروم توجہ رہیں +

بیگم اودے پوری ایک کمزور طبیعت عیش پسند اور دماغی لحاظ سے ادنیٰ قسم کی عورت تھی۔ اس لئے اس کے بیٹے میں بھی انہی اوصاف کی جھلک پائی جاتی تھی۔ وہ بھی نہایت متلون مزاج اور عیش پسند تھا اور زندگی بھر خودسرانہ خواہشات کی تکمیل میں ایسی ایسی ناشائستہ حرکتیں کرتا رہا۔ کہ اس پر مجنون و دیوانہ ہونے کا گمان ہوتا ہے +

اسی زمانہ کے متعلق تاریخوں میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ شہزادہ کام بخش تحصیل علوم میں دلی ذوق و شوق سے کام نہ کرتا تھا۔ ایک روز اس کا اتالیق سعادت خاں محل میں اسے تعلیم دینے آیا۔ اور اس کو بلا بھیجا۔ لیکن کام بخش نہ آیا۔ سعادت خاں نے دو تین گھنٹہ تک انتظار کیا۔ ازاں بعد شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور یہ واقعہ اس کے گوش گذار کیا۔ شہنشاہ نے فوراً کام بخش کو طلب فرمایا اور اس سے انکار کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا کہ میں اپنی قسمت میں تھا۔ وہ حاصل کر چکا ہوں۔ اب یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ میں پھر اسی تحصیل علم کے جھمیلے میں پڑا رہوں۔ اس جواب سے شہزادہ کی خام پسندی کا اظہار ہوتا تھا۔ شہنشاہ کو غصہ آگیا۔ اور شہزادہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ "علم کے بغیر انسان حیوان مطلق ہے۔ شہزادوں کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔ کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں" اس کے بعد حکم دیا۔ کہ کام بخش کو محل سے نکلنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہاں تک کہ وہ دربار میں حاضر ہونے کے علاوہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتا۔ ڈیڑھ ماہ بعد شہنشاہ نے آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اسکو معاف کر دیا +

شہزادہ کام بخش اکثر فخر کے ساتھ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ دہلی کے تخت کا باقی تمام شہزادوں سے زیادہ میں حقدار ہوں۔ اور اس دعویٰ کی دلیل یہ دیا کرتا تھا۔ کہ باقی شہزادوں کی پیدائش اس وقت ہوئی جبکہ وہ شہنشاہ بن چکا تھا۔ اس کے برعکس اس کے سوتیلے بھائی اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اسے رقاصہ کا لڑکا اور پرستار زادہ ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے +

مغل شہنشاہوں کا طریقہ تھا کہ وہ شاہزادوں کو سولہ سترہ سال کی عمر میں فوجوں کی کمان دے کر جنگی مہمات پر دارالحکومت سے دور بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن ہر شہزادہ کے ہمراہ کوئی آزمودہ کار بلند مرتبہ معتبر جرنیل بطور مشیر و اتالیق کے بھیجا جاتا تھا۔ لیکن کام بخش کو والدین کے لاڈ پیار نے چوبیس سال کی عمر تک اس علمی تعلیم سے محروم رکھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ابھی وہ چودہ ہی سال کا تھا کہ اس کی شادی کر دی گئی۔ اور وہ بھی ایک چھوڑ دو دو۔ اور ابھی سترہ سال

تین ماہ کا نہ ہونے پایا تھا۔ کہ وہ صاحب اولاد ہوگیا چونکہ وہ ہمیشہ والد کے حضور میں رہتا تھا اور صرف دربار کی رسوم یا جلوسوں میں شریک ہوتا۔ یا کسی مقتدر مہمان کے استقبال کو یا کسی امیر وزیر کے ہاں شہنشاہ کی جانب سے بغرض تعزیت جاتا۔ وہ صرف بزم کا ماہر لیتے " میر فرش بن سکا۔ یہی وجہ تھی کہ جب والد نے اس کو چوبیس سال کے بعد آگ اور خون سے بتبسم دینے کے خیال سے میدان جنگ کو روانگی (قلعہ جنجی کے محاصرہ میں وہ نہ صرف بری طرح ناکام رہا۔ بلکہ ایسی ایسی احمقانہ اور فعل سوز حرکات کا مرتکب ہوا۔ کہ اسکو گرفتار کر لینا ضروری سمجھا گیا +

ت یہ قلعہ صوبہ مدراس کے ضلع ارکاٹ کے شمال میں واقع ہے۔ اس وقت
می اس تاریخ میں مرہٹوں کا سفرور یا شاہ راجہ رام پناہ گزین تھا۔ اگرچہ اس قلعہ کا محاصرہ تو مغلوں کے جرنیل ذوالفقار نے ستمبر ۱۶۹۰ء سے کر رکھا تھا لیکن دشمن کے جتھوں نے جو گرد و نواح میں لوٹ مار کر رہے تھے اس کو اس قدر تنگ کیا کہ شہنشاہ کو دسمبر میں اپنے وزیر اسد خاں اور شہزادہ کام بخش کی سر کردگی میں بہت بڑی کمک وہاں بھیجنی پڑی +

یہاں پہنچکر شہزادہ اس وزیر کی داخلت سے اسقدر سخت تنگ آ گیا کہ خفیہ خفیہ راجہ رام کے ساتھ سازباز کرنے لگا۔ مغلوں نے اسے خوب جنگ پر چڑھایا۔ مفسدانہ تجویزوں پر اسے ابھارا ابھار کر آمادہ کر دیا۔ ایک سال بعد مرہٹوں کا لشکر جرار جو مغربی ہند میں فراہم کیا گیا تھا۔ دھن جاوداور سنت گھورپارے کے زیر قیادت جنجی پہنچا +

اور منغلوں کی فوج کے وسائل رسد رسانی منقطع ہوگئے اور چند ہفتوں کے لئے
ں شہنشاہ اورنگ زیب کے مابین نامہ و پیام بند رہا۔ سنسنی پھیلانے والی
ش افواہیں فوراً اڑنے لگیں۔ جن کو مرہٹوں نے بڑھا چڑھا کر پھیلانا شروع کیا۔ مشہور کیا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور شاہ عالم تخت پر قابض ہو چکا ہے۔ کام بخش ان افواہوں کے سننے سے سخت مضطرب ہوا اور اپنے آپ کو سخت خطرے میں محسوس کرنے لگا۔ اسے خیال ہوا کہ اسد خاں اور ذوالفقار میرے دشمن ہیں اور شاید مجھے گرفتار کر کے میرے بھائی اور حریف کے حوالہ کر دیں۔ اس کو خوشامدی مصاحبوں نے سمجھایا۔ کہ اب اگر کوئی بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے تو یہی کہ راجہ رام کے ساتھ صلح کر لیں۔ اور جنجی کے قلعہ میں اہل و عیال سمیت رات کی تاریکی میں داخل ہو کر پناہ گزین ہو جائیں۔ شہزادہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اور اس نے اپنے خدام کو اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے تیار ہونے کا حکم دیدیا +

لیکن اس راز کو دو جاسوسوں نے جو اس کے زمرۂ مصاحبین میں شامل تھے افشا کر دیا۔ اسد اور ذوالفقار نے شاہی فوج کے برگزیدہ سرداروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے صلاح دی کہ شہزادہ کی شدید نگرانی کی جائے۔ اور تمام فوج کو محاصرہ سے ہٹا کر کسی محفوظ مقام پر ڈیرے لگا لئے جائیں +

ذوالفقار نے سخت لڑائی کے بعد فوجوں کو پیچھے ہٹا لیا۔ قریباً چار صد مقتول اور ہزاروں مجروح ہوئے۔ شام کے قریب وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے اسد خاں کے قیام گاہ پر جا پہنچے۔ جس کے قریب ہی کام بخش کا خیمہ نصب تھا +

یہاں جوں جوں ذوالفقار اور اسد زیادہ خطرات و مہالک میں مبتلا ہو رہے تھے۔ اسیقدر شہزادہ زیادہ خوشی منا رہا تھا۔ اس نے اپنے احمق مصاحبوں سے ملکر یہ منصوبہ باندھا تھا کہ جس وقت یہ دونوں جرنیل اس کی ملاقات کو آئیں ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ اور پھر خود مختار بن کر بیٹھے لیکن یہ سازش بھی دوسری سازشوں کی طرح طشت از بام ہوگئی۔ ذوالفقار خاں دن بھر کے جدال و قتال اور دیگر تفکرات سے تھک کر رات کے قریب والد کے پاس پہنچا۔ نئی سازش کی خبر سنی۔ اور پھر دونوں جرنیلوں نے فوراً فیصلہ کیا کہ تمام فوج کی حفاظت اور شہنشاہ کے رعب و اقتدار کو قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ شہزادہ کو مزید شرارت سے جبراً باز رکھا جائے۔ چنانچہ وہ فی الفور ہاتھیوں پر سوار ہو کر کام بخش کے خیمہ میں پہنچے۔ اسی حالت میں جالی کے اندر بے محابا چلے گئے۔ اور اس کے درباری کمرے کے پردوں کو گرا دیا۔ دوسرے امرا خاموش کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ تاکہ شہنشاہ کے فرزند عزیز کو گرفتار کرنے کے جرم سے ان کا دامن آلودہ نہ ہونے پائے۔ شہزادہ کے ملازموں نے حماقت سے کچھ گولیاں اور تیر چلائے اور یونہی شور و غوغا کرنے لگے۔ لیکن اسد خاں کی قوت بہت زیادہ تھی۔ اور یہ سب کام اس نے نہایت پھرتی اور مستعدی سے سرانجام دیا +

کام بخش بے حوصلہ ہوگیا۔ اور نہایت مایوسی کے عالم میں حرم سرا کے بڑے دروازہ کی راہ سے باہر نکل آیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی گیا ہوگا کہ خان کے بھلیوں نے آگے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور ننگے پاؤں کشاں کشاں اسد کے سامنے لے چلے۔ راؤ دلپت نے یہ دیکھ کر نہایت پھرتی سے اپنا ہاتھی آگے بڑھایا۔ اور دفعتہً شہزادہ کو اٹھا کر ہودہ میں اپنے آگے بٹھا لیا۔ اللہ

خود محافظ کی حیثیت میں اُس کے پیچھے بیٹھا رہا اور اسد خاں کے سامنے اسکو لے آیا +

وزیر اس وقت نہایت خشمناک بیٹھا تھا۔ اُس نے شہزادہ کو بہت لعنت ملامت کی۔ بلکہ یہانتک کہا کہ تو شہزادہ نہیں بلکہ رتاصہ زادہ ہے اور حکومت کرنے اور فوجوں کی قیادت کے یکسر ناقابل ہے۔ پھر بولا جوانو ہم تم سے چکے ہوہ سراسر جھوٹ ہیں بشہنشاہ زندہ وسلامت ہیں۔ یہ تم نے کیسی بیہودہ حرکتیں کی ہیں۔ نہ صرف تم نے اپنے آپ کو ذلیل وخوار کیا ہے۔ بلکہ میری سفید ڈاڑھی کی بھی لاج نہیں رہنے دی۔ پھر شہزادہ کو اسد خاں کے خاص خیمہ میں لے گئے۔ جہاں اُس کے ساتھ نہایت اخلاق و نوازش کا سلوک روا رکھا گیا۔ تاہم اس کی نگرانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ باوجود اس کے اُس کا ادب واحترام پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم اُس کے سامنے کورنش بجا لاتا تھا۔ اور اُس کا خاصہ اپنے ہاتھوں سے اُس کے آگے چنتا تھا۔ جب دن نکلا۔ ذوالفقار نے فوج کے سب چھوٹے بڑے افسروں کو اکٹھا کیا۔ اُن کے سامنے شہزادہ کی گرفتاری کے اسباب واضح کئے۔ انہیں اپنی نیک نیتی کا یقین دلایا اور انعام واکرام کی بارش سے ان کو اپنے ساتھ وابستہ کر لیا۔ اسیطرح ایک ہی ہاتھ میں انتظامی باگ کے آجانے سے شاہی فوج ہلاکت سے محفوظ ہوگئی +

مغلیہ فوج یہ دیکھ کر کہ جنجی کے سامنے پڑے رہنا اُن کے لئے بیحد خطرناک ہے۔ چوبیس میل شمال مشرق میں وندواش کی جانب ہٹ گئی۔ یہاں پہنچکر دونوں جرنیل کام بخش کے متعلق شہنشاہ کے احکام کا انتظار کرنے لگے۔ کرناٹک کی فوج کے افسر خصوصاً اسد اور ذوالفقار نے اب معاملہ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور اُن کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ کہ شاید شہنشاہ اپنے لاڈلے فرزند کے ساتھ اس قسم کے سلوک کو کس نظر سے دیکھے۔ عجیب وغریب افواہیں بھی اُڑنے لگیں کہ شہنشاہ جرنیلوں کے اس فعل پر نہایت غضبناک ہو رہا ہے۔ بلکہ وندواس میں تو یہ خبر بھی پھیل گئی۔ کہ شہنشاہ نے اسد خاں کو ذلت کے ساتھ موقوف کرنے کا حکم دیدیا ہے۔ اور اسد خاں نے زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے +

آخر اورنگ زیب کا حکم پہنچا کہ شہزادہ کو اسد خاں کی نگرانی میں حاضر بارگیا جائے۔ نیز یہ کہ جو جو سامان جنجی میں چھوڑا یا لوٹ لیا گیا تھا۔ اُس کے بجالائے اور سامان اُسے دیا جائے۔ کام بخش گل گالا کے مقام پر جو دریائے کرشنا کے کنارے واقع ہے ۴ ار جون کو اپنے باپ کے کیمپ میں پہنچا۔ اور حرم میں اپنی ہمشیرہ زینت النسا کی وساطت سے شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ یہاں اُس لاڈلے نوجوان نے اپنے طرز عمل کو حق بجانب ثابت کرنیکی کوشش کی۔ اور اسد خاں پر غداری کا الزام لگایا۔ اور کہا۔ کہ وہ عمداً محاصرہ کو بے وجہ طول دینا چاہتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نہایت دانا اور زیرک انسان تھا۔ اُس نے اپنے وفادار اور آزمودہ کار جرنیلوں کے خلاف کام بخش کے ان الزامات کو تسلیم نہ کیا +

تاہم اگرچہ شہنشاہ کو کام بخش کی ناکامی اور فنون جنگ میں اُسکی اولین کوشش کے مایوس کن نتیجہ سے بے حد رنج ہوا تھا +

لیکن بیگم اودے پوری کے آنسوؤں کے طوفان میں یہ رنج وخشم خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ حمید الدین نے اپنی کتاب وقائع اورنگ زیب میں اُس کے غیض وغضب بحال نہایت وضاحت سے لکھا ہے +

پہلی مہم میں ایسی نمایاں ناکامی کے بعد کام بخش کو ہمیشہ دربار میں رکھا گیا۔ اور پھر کبھی کسی مہم پر یا کسی دور دراز علاقہ میں نہیں بھیجا گیا۔ یہ درست ہے کہ اس کو پہلے ۱۶۸۶ء میں اور پھر ۱۶۹۶ء میں بیدر کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ اور پھر ۱۷۰۱ء میں حیدرآباد کی صوبہ داری اور ۱۷۰۷ء میں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوا۔ لیکن اُس کو اجازت دی گئی تھی۔ کہ وہ اپنے نائب کے ذریعہ حکومت کرے۔ اور خود شہنشاہ کے حضور میں رہے +

اس راحت وآرام کی زندگی گذارتے ہوئے بھی پھر ایک مرتبہ کام بخش نے اپنی حماقت ونادانی سے اپنے آپ کو مشکل میں پھنسا لیا۔ اس وقت وہ اکتیس سال کا تھا +

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۲ار دسمبر کی رات تھی۔ جب خواجہ یاقوت جو کام بخش کے محل کا ناظر تھا۔ شہزادہ سے رخصت ہوکر اپنے مکان واقعہ بہرام پوری کو جا رہا تھا۔ اس وقت رات کی تاریکی میں اُسے ایک تیر آکر لگا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے ہوئے تھا۔ تیر ایک بازو پر لگا۔ ورنہ یقین تھا۔ کہ اس کا پیٹ کٹ جاتا۔ خواجہ یاقوت خون آلودہ بازو کے ساتھ فوراً شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ اور صورت حال عرض کی۔ درباری پولیس کے افسر اعلیٰ نے شہنشاہ کے حکم کے مطابق فی الفور تحقیقات شروع کی۔ تو معلوم ہوا کہ چونکہ یاقوت اپنے فرائض نہایت ایمانداری سے بجا لاتا تھا

اور اپنے آقا کے معاملات کی سختی سے نگرانی کرتا۔ اس لئے شہزادہ کے بدباطن مصاحب جن کی بدصحبت میں وہ اکثر اپنا وقت گذارا کرتا۔ اس کے دشمن ہوگئے۔ خصوصاً کام بخش کے رضاعی بھائی اُس سے بہت برخاش رکھتا تھا۔ اور وہی ناظر سے نجات پانے کے لئے اُس خفیہ حملہ کا محرک ہوا تھا +

شہزادہ کی فوج کے چار کپتان جو شبتہ قرار دیئے گئے بلا وقت گرفتار کرلئے گئے۔ لیکن کوکہ نے مقابلہ کیا۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ شہزادہ کام بخش کو کوکہ حاضر کرے۔ لیکن راہ میں بعض فتنہ انگیزوں کے سمجھانے سے کوکہ کی نیت بدل گئی اور وہ محل کے دروازہ سے بھاگ گیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع شہنشاہ کو ہوئی۔ تو اُس نے کام بخش کو لکھا۔ کہ کوکہ کو اپنی مصاحبت سے برخواست کردے۔ شہزادہ نے کوکہ کو دو سو اشرفیاں۔ ایک خیمہ اور کچھ ملازم دیکر اپنی جاگیروں کو بھیجدیا۔ اور اشک آلود آنکھوں کے ساتھ بغلگیر ہو کر اُسے خدا حافظ کہا +

جب اس واقعہ کی خبر اورنگ زیب کو پہنچی تو اُس کا دل نرم ہوگیا۔ وہ کام بخش کو بخیدہ اور غمناک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک تیسرا حکم دیا کہ شہزادہ اپنے کوکہ کو خود حضور میں لائے۔ اور سفارش کرکے اُسکا قصور معاف کرائے +

اس حکم کی تعمیل میں جب یہ دونوں حاضر ہونے کے لئے آئے تو شہنشاہ نے حکم دیا کہ شہزادہ کو اندر آنے دیا جائے۔ لیکن کوکہ کو فی الحال باہر ٹھہرایا جائے مگر کام بخش نے اپنے کوکہ سے جدا ہونا منظور نہ کیا۔ بلکہ ایک چادر کے ذریعہ اس کو اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ یہ سنکر شہنشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اور اُس نے یکے بعد دیگرے کئی وزیر بھیجے کہ کام بخش کو سمجھائیں۔ لیکن اُس بدقسمت شہزادہ نے اُن کی ایک نہ سنی۔ اور اپنی ضد سے باز نہ آیا +

آخر الامر حمید الدین خاں کو بھیجا گیا کہ وہ جبراً کوکہ کو شہزادہ سے جدا کرکے اُسے پولیس کے حوالہ کرے۔ شہزادہ نے یہ دیکھکر اپنا خنجر نکالا۔ اور نفسوں پر حملہ کرنے کو تیار ہوگیا۔ حمید الدین نے شہزادہ کے ہاتھ سے خنجر چھیننے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ زخمی بھی ہوگیا۔ ادھر شہزادہ حمید الدین سے مصروف پیکار تھا۔ اُدھر ملازموں نے متفقہ حملہ کرکے کوکہ کو گرفتار کرلیا۔ اور اُسے کشاں کشاں لاٹھیاں مارتے ہوئے ہتھکڑیاں لگاکر قید خانہ میں لے گئے۔ کام بخش کو جواہرات خانہ کے قریب ایک چھوٹے سے خیمہ میں نظر بند کردیا گیا۔ اس کا منصب چھین گیا۔ اور تمام جاندار ضبط ہوگئی۔ نہ صرف اس پر اکتفا کی گئی۔ بلکہ اس کی فوج شہنشاہی فوج میں ملادی گئی۔ شہنشاہ نے شہزادہ کی ان حرکات کو اُس کی بری صحبت کا نتیجہ قرار دیا +

لیکن چھ ماہ بھی نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ کام بخش کو معافی دے دی گئی۔ اُس کا منصب اور جاگیر اُسے واپس مل گئے۔ دسمبر ۱۶۹۹ء سے پھر وہ اپنے والد کی حضوری میں رہنے لگا۔ کبھی تو اپنی ہمشیرہ زینت النسا کو میدان جنگ سے دار السلطنت پہنچانے جاتا۔ اور کبھی بڑے بڑے امراء کے ہاں جاکر شہنشاہ کی بجائے مراسم تعزیت بجالاتا +

دا گن گرہ (حال واقعہ ضلع شولاپور مملکت نظام) کے محاصرہ میں اسے ایک حصہ فوج کی برائے نام کمان دی گئی۔ اسی سال اُسے حیدرآباد کی صوبہ داری پر جانا تھا۔ لیکن شہنشاہ نے ازراہ محبت اُس کی روانگی کو ملتوی کردیا +

آخر جنوری ۱۷۰۱ء میں اورنگ زیب احمد نگر میں بیمار ہوگیا۔ اور اُسے اپنا انجام قریب نظر آنے لگا۔ اُس کے لڑکوں میں سے اس وقت تین بقید حیات تھے۔ اُن میں سے محمد اعظم و کام بخش اُس کے پاس تھے۔ لیکن اورنگ زیب کو معلوم تھا کہ ان دونوں کی یکجائی کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ اُس کی آنکھیں بند ہوتے ہی یا شاید اس سے بھی پہلے دونوں میں تخت کے لئے کشت وخون کا بازار گرم ہوجائے۔ پس اُس نے فوراً اعظم اور کام بخش کو اپنی اپنی صوبہ داریوں یعنے مالوہ اور حیدرآباد بھیجدیا +

اپنے عزیز اور لاڈلے فرزند سے جدا ہونے کے غم اور اپنے بستر مرگ سے اس کو دور بھیجنے کی مجبوری نے شہنشاہ کو نڈھال اور دل شکستہ کردیا۔ لیکن اُسے بخوبی معلوم تھا کہ شہزادہ کی جان بچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ لہذا اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی +

اپنی زندگی کے اخیر چند دنوں میں بوڑھے اور دنیا سے بیزار شہنشاہ نے ذیل کا پُرتاثیر خط کام بخش کو لکھا تھا۔

فرزند دلبند اگرچہ اُن دنوں جب مجھ میں طاقت اور زور تھا سب کو نصیحت کیا کرتا تھا کہ مشیت ایزدی کے آگے تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کریں۔ اور خود بھی امکان سے بڑھ کر اس پہلو میں کوشش کیا کرتا تھا لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ کسی نے میری بات پر کان نہ دھرا۔ اب کہ میں جاں بلب ہوں ایسا کرنا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اب مجھے ان تمام گنہ گار ہوں اور معصیتوں کا بار جو مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں اُٹھانا ہوگا۔ کسقدر تعجب کا مقام ہے کہ میں دنیا میں

تن تنہا آیا۔ لیکن اب اس قافلہ کے ساتھ یہاں سے جا رہا ہوں جب میں نگاہ اُٹھاتا ہوں تو سوائے خدا کے مجھے کوئی قافلہ سالار نظر نہیں آتا۔ فوج اور ملازموں کی فکر اور عذاب اُخروی کے خوف نے مجھے غمزدہ بنا رکھا ہے۔ اگرچہ خدا خود اپنے بندوں کی حفاظت کرے گا۔ لیکن مسلمانوں اور میرے فرزندوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں۔ جب میں پورے زوروں پر تھا تو اس وقت بھی ان کی پورے طور پر حفاظت نہ کر سکا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ خود اپنی حفاظت کرنے سے بھی معذور ہوں۔ میرے اعضا حرکت کرنے سے قاصر ہیں۔ جو سانس اندر جاتا ہے پھر آمید نہیں ہوتی۔ کہ واپس بھی آئے گا۔ ایسی حالت میں سوائے دعا کے کیا کر سکتا ہوں۔ تمہاری والدہ اودے پوری بیگم نے اس بیماری میں میری بہت خدمت اور تیمارداری کی ہے۔ بلکہ اُس کی خواہش ہے کہ دوسری دنیا میں بھی میرے ہمراہ جائے۔ میں تجھے اور تیرے بچوں کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں۔ میں اضطراب میں ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ دنیا کے لوگ گندم نما جو فروش ہیں ان کی وفاداری کے بھروسہ پر کوئی کام نہ چھوڑنا۔ ہر کام اشاروں کے ذریعے ہونا چاہئے۔ دارا شکوہ نے ناقص انتظامات کئے تھے۔ اس لئے اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس نے اپنے ملازموں کی تنخواہیں بہت زیادہ بڑھا دی تھیں۔ لیکن بوقت ضرورت اُن سے بہت تھوڑا کام لیا۔ اسی لئے وہ مصائب میں مبتلا ہوا۔ تمہیں چاہئے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ۔

مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں اور اب رخصت ہوتا ہوں۔ اسکا خاص خیال رکھو کہ کسان اور رعایا ناروا طور پر تباہی و بربادی کا شکار نہ ہوں۔ اور مسلمانوں کا خون نہ بہایا جائے۔ مبادا اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑے"۔

اس خط کے چند روز بعد یعنی ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا۔ مرنے کے بعد اُس کے تکیے کے نیچے ایک دستخطی وصیت پڑی ملی جس میں اُس نے اپنی سلطنت کو اپنے فرزندوں میں تقسیم کیا ہوا تھا کام بخش کے حصہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے صوبے آئے۔ لیکن وہ ان دونوں صوبوں پر قانع نہ ہوا۔ بلکہ اُس نے سر پر تاج رکھا اور شہنشاہ ہند کے طور پر سکوں پر اپنا نام کندہ کرا دیا۔ بعد ازاں حیدرآباد میں بھی مجنونانہ حرکات کا ارتکاب کرتا رہا۔ انجام کار اپنے بڑے بھائی بہادر شاہ اوّل کیساتھ مصروف پیکار ہوا اور حیدرآباد سے چار میل باہر ایک جنگ میں مملکت طور پر زخمی ہوا اور رات ہی رات میں اسکا انتقال ہو گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

شہزاد حسرتناک

لغرض اس طرح وہ تباہی و ہلاکت جسکو اُس کے ہوشمند باپ نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور جسے وہ روکنا چاہتا تھا۔ اُسکی احمقانہ حرکات کی بدولت اُس پر نازل ہو کے رہی۔

(خاص)

ریاض بی اے

محبّت؟

۱۔ محبت ایک ایسا درخت ہے جو کبھی پھل نہیں لاتا +
۲۔ محبت ایک ایسا طبیب ہے جس کے پاس کوئی دوا نہیں۔ مگر درد +
۳۔ محبت ایک ایسا مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ مگر موت +
۴۔ محبت ایک آگ ہے جو انسان کو اندر ہی اندر جلاتی ہے +
۵۔ محبت ایک آگ ہے جس کی لپٹ پانی سے نہیں بجھتی طوفان میں نہیں ڈوبتی +
۶۔ محبت ایک ایسی جنگ ہے جس میں ہزیمت کی فتح ہوتی ہے +
۷۔ محبت غیر فانی ہے +
۸۔ محبت ایک سیلاب ہے جس کی روانی معلوم نہیں ہوتی، ۹۔ محبت کی کشتیوں میں دریائے بے نام آسانیوں سے زیادہ حلاوت ہے، ۱۰۔ محبت ایک ایسا سیلاب ہے جسمیں انسان اپنا غرق ہونا محسوس نہیں کرتا +

اظہر فاروقی۔ مولوی فاضل۔ اودے پرتاپ کالج بنارس

حُکم کی بیگم

از جناب انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم اے علیگ
(گذشتہ سے پیوستہ)

تیسرا باب

لیزاویٹہ آٹونونا اپنا لبادہ اور ٹوپی اُتارنے بھی نہ پائی تھی کہ کاؤنٹس نے پھر بلا بھیجا اور گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ دو نوکر کاؤنٹس کو اُٹھا کر سوار کرا رہے تھے۔ کہ لیزا نے اپنے انجنیر کو دیکھا۔ جو گاڑی کے پہیے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ انجنیر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور وہ اپنے خوف و ہراس کی وجہ سے ہوش میں نہ آنے پائی تھی کہ غائب ہو گیا۔ ایک خط لیزا کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس نے خط کو بستانہ میں چھپا لیا۔ اور خیالات کے ہجوم کی وجہ سے تمام تفریح کے وقت نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ کاؤنٹس کی عادت تھی کہ اس تمام وقت میں ہر قسم کے سوالات کرتی رہتی تھی "یہ ہماری طرف کون آ رہا ہے؟" "اس بگھی کا کیا نام ہے؟" "اس سائن بورڈ پر کیا لکھا ہوا ہے؟" آج لیزاویٹہ آٹونونا نے استقدر بے تکے جواب دیئے کہ کاؤنٹس کو غصہ آ گیا۔

"لڑکی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تمہارے کان پٹ ہو گئے ہیں؟ یا تو تم میری بات سنتی ہی نہیں یا سمجھتی نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ خدا کا شکر ہے کہ میں تو ابھی صاف صاف بولتی ہوں۔ اور میرے ہوش و حواس قایم ہیں"۔

لیزاویٹہ نے اُس کی بات بالکل نہ سُنی جب وہ واپس لوٹے۔ تو لیزا دوڑ کر اپنے کمرہ میں گئی۔ اور دستانہ میں سے خط نکالا۔ لفافہ بند تھا۔ اُسے کھولکر لیزا نے خط پڑھا۔ اُس میں محبت کا اظہار تھا۔ اور اس کا لہجہ عاشقانہ مگر مودبانہ تھا۔ اور اسے حرف بحرف ایک جرمن ناول سے نقل کیا گیا تھا چونکہ لیزاویٹہ آٹونونا نے جرمن زبان نہ پڑھی تھی۔ لہذا اس نے خط کو بہت پسند کیا۔

یا اینکہ اُس خط کو قبول کر لینے پر اُس کے دل میں ایک عجیب کشمکش پیدا ہو رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی نوجوان سے خفیہ اور عاشقانہ ربط ضبط قایم کیا ہو۔ انجنیر کی جرأت سے اُسے خوف معلوم ہونے لگا۔ اُس نے خود کو ہی اس بے قصوری کا ملزم ٹھہرایا۔ اور بالکل نہ سمجھ سکی کہ اُسے کون سا اختیار کرنا چاہئے۔ کیا وہ دریچہ کے پاس بیٹھنا چھوڑ دے اور نوجوان سے کسی توجہ کا اظہار۔ کر کے اُس کی دلی خواہشات کو سرد کر دے؟ کیا وہ اس کا خط اس کے پاس واپس بھیج دے؟ کیا اس کو سرد مہری اور سختی کے ساتھ جواب دیدیا جائے؟ دنیا میں اس کے لئے ایسا کوئی نہ تھا جو اسکو نصیحت کرتا۔ ایسا کوئی نہ تھا جو اس کا دوست یا مشیر ثابت ہوتا۔ اور بالآخر لیزا ویٹہ آٹونونا نے خط کا جواب دینے کا ارادہ کر لیا۔

وہ لکھنے کی میز پر پہنچی۔ قلم اور کاغذ اُٹھایا اور سوچنے لگی۔ اُس نے کئی خط شروع کئے۔ لیکن ہر ایک کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ کسی مرتبہ تو خط کا لب و لہجہ زیادہ پر محبت معلوم ہوتا تھا۔ کبھی بہت زیادہ سخت۔ آخر کار وہ چند سطریں لکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اس خط سے اسے اطمینان ہو گیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ

"مجھے یقین ہے کہ آپ کے خیالات پاک و صاف ہیں۔ اور آپ کسی بے سوچے سمجھے کام سے میری توہین کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہمارے روابط اتحاد اس طریقہ سے شروع نہ ہونے چاہئیں میں آپ کا خط واپس کرتی ہوں۔ اور اُمید کرتی ہوں کہ آئندہ مجھے نامناسب بے قراری کی شکایت کا موقعہ نہ ہو گا"۔

دوسرے دن جب اُس نے ہرمان کو آتے ہوئے دیکھا لیزاویٹہ کشیدہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ملاقات کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں دریچہ کھولی۔ اور،

نوجوان افسر کی عجلت اور مچلتی پر اعتماد کر کے خط کو سڑک پر پھینک دیا۔ ہرمان نے دوڑ کر خط اٹھا لیا۔ اور نانبائی کی دوکان میں جا گھسا۔ لفافہ کھولنے پر اُسے اپنا خط اور لیزاویٹہ کا جواب نظر آیا۔ اُسے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہ تھی۔ اور اپنی محبت کے تخیلات میں محو مکان کو لوٹ گیا۔

تین دن بعد درزی کی دوکان کی ایک چھوٹی سی تیز آنکھوں والی لڑکی لیزاویٹہ آٹونونا کے نام ایک خط لے کر آئی۔ لیزاویٹہ نے لرزتے ہوئے اسے کھولا۔ اس خوف سے کہ روپیہ کا مطالبہ ہوگا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے ہرمان کا ہاتھ پہچان لیا۔

"بچی تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ یہ خط میرا نہیں ہے"۔

"نہیں آپ کا ہی ہے" لڑکی نے جرأت سے کہا۔ اور شرارت آمیز تبسم اُس کے چہرہ پر آگیا۔ "براۓ مہربانی اسے پڑھ لیجئے"۔ لیزاویٹہ نے خط پر ایک نظر ڈالی۔ ہرمان نے ملاقات کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ اس مطالبہ کے اسقدر جلد کئے جانے سے اور جو ذرائع کہ خط کو اس تک پہنچانے کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ اُن سے خوفزدہ ہوگئی اور لڑکی سے کہنے لگی:-

"یہ میرا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً میرا نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر اُس نے خط کو پُرزے پُرزے کر ڈالا۔

"اگر آپ کا خط نہ تھا تو آپ نے پھاڑ کیوں ڈالا؟ میں بھیجنے والے کو واپس کر دیتی"۔

"بچی یاد رکھو" لیزاویٹہ نے غصہ ہو کر کہا "مہربانی کر کے آئندہ میرے پاس کوئی خط نہ لانا۔ اور اُس شخص سے جس نے تمہیں بھیجا ہے کہدینا کہ اُسے شرم آنی چاہئے"۔

ہرمان پھر بھی ناامید نہ ہوا۔ روزانہ لیزاویٹہ آٹونونا کو کسی نہ کسی ذریعہ سے اُس کا خط مل جاتا۔ اب ان میں جرمن ناولوں کے ترجمے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ہرمان خود اپنے جذبات سے متاثر ہو کر لکھتا تھا۔ اور ایسے الفاظ لکھتا تھا جو قدرتی طور پر اُس کے دل و دماغ سے نکلتے تھے ان خطوط میں وہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے مستقل ہونے کا اظہار کرتا۔ اور اپنے وسیع تخیلات کی پریشانی اور انتشار دماغ کو بیان کرتا۔ لیزاویٹہ آٹونونا نے اس کے بعد خط واپس کرنے چھوڑ دیئے۔ بلکہ وہ انہیں پڑھ کر از خود رفتہ ہو جاتی تھی۔ وہ اُن کا جواب دینے لگی۔ اور روز بروز اس کے جواب طویل اور زیادہ پُرمحبت ہونے لگے۔ آخر کار ایک دن اس نے دریچہ سے حسب ذیل خط نیچے ڈالا۔

"آج رات کو..... سفارت خانہ میں رقص کی محفل ہے۔ کاؤنٹس وہاں جائیں گی۔ اور دو بجے تک وہیں رہیں گی۔ آپکے لئے مجھ سے تنہا ملنے کا اچھا موقعہ ہے۔ کاؤنٹس کے روانہ ہوتے ہی اُس کے نوکر شاید ادھر اُدھر بھاگ جائیں گے۔ صرف دروازہ پر دربان موجود رہے گا۔ لیکن وہ بھی عموماً اپنی کوٹھری میں چلا جاتا ہے۔ آپ ساڑھے گیارہ بجے آئیے۔ سیدھے زینے پر چڑھ جائیے۔ اگر سیڑھیوں پر کوئی ملے تو کاؤنٹس کو دریافت کیجئے۔ آپ سے کہا جائے گا کہ وہ مکان پر نہیں ہیں۔ اور اسکے بعد آپکو سوائے واپس چلے جانے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہیگا۔ لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ آپ کو کوئی نہ ملیگا۔ خادمائیں تمام اپنے کمرہ میں بیٹھی ہونگی۔ آپ دروازہ سے بائیں طرف مڑیئے اور سیدھے چلے جائیے۔ جبتک کہ آپ کاؤنٹس کے سونے کے کمرہ میں نہ پہنچ جائیں۔ اُس کمرہ میں پردوں کے پیچھے آپکو دو چھوٹے دروازے نظر آئیں گے۔ داہنے ہاتھ پر تو ایک خفیہ کمرہ ہے جس میں کاؤنٹس کبھی نہیں جاتیں۔ بائیں پر ایک راستہ اور ایک تنگ زینہ ہے جو میرے کمرہ کو جاتا ہے"۔

ہرمان وقت مقررہ کی آمد کی خوشی میں سر سے پیر تک کانپنے لگا۔ اس رات کو دس بجے ہی وہ کاؤنٹس کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ موسم نہایت خراب ہو رہا تھا۔ تیز ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ برف کے بڑے بڑے ٹکڑے برابر گر رہے تھے۔ سڑک کی لالٹینوں کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔ اور کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی والا کسی بھولے بھٹکے مسافر کی تلاش میں ادھر اُدھر سے گذر جاتا تھا۔ ہرمان بغیر اوور کوٹ پہنے وہاں کھڑا رہا۔ اور اُس نے ہوا اور برف کو بالکل محسوس نہ کیا۔ آخر کار کاؤنٹس کی گاڑی آئی۔ ہرمان نے دیکھا کہ نوکر اُس بوڑھی خاتون کو جو سرتاپا سموریں لپٹی ہوئی تھی تقریباً بالکل اُٹھائے ہوئے لا رہے ہیں۔ اُس نے نوجوان لڑکی کو بھی دیکھا جو باریک کپڑے پہنے ہوئے اور اپنے بالوں میں تازہ پھول لگائے ہوئے کاؤنٹس کے پیچھے گاڑی میں سوار ہوگئی۔ اس کے بعد دروازہ بند کیا گیا اور گاڑی برف کے ٹکڑوں پر سے آہستہ آہستہ گذر گئی۔ پہیے

کمرہ کے دربان نے بھی دروازہ بند کرلیا۔ دریچوں میں بالکل تاریکی پھیل گئی اور ہرمان اس خالی مکان کے سامنے اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہ ایک لالٹین کے قریب پہنچا اور گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجکر بیس منٹ آچکے تھے۔ وہ لالٹین کے نیچے کھڑا ہوا اپنی ہاتھ کے ساتھ گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتا رہا۔ اور بقیہ وقت کے گذرنے کا انتظار کرتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے وہ کاؤنٹس کے زینہ پر چڑھا۔ اور ہال میں داخل ہوا۔ چودھنی سے بتھوڑا نور بنا ہوا تھا۔ دربان وہاں موجود نہ تھا۔ ہرمان پھر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اور ایک برابر کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ جہاں اُس نے دیکھا کہ ایک پُرانی ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر لیمپ کے نیچے ایک نوکر بیٹھا ہوا سو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا ہرمان آگے بڑھ گیا۔ رقص گاہ اور طاقاتی کمرہ میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف برابر والے کمرہ کے لیمپ کی دھیمی شعاعیں چھن چھن کر آرہی تھیں ہرمان سونے کے کمرہ میں داخل ہوا کمرہ کے ایک گوشہ میں عبادتگاہ تھی۔ جس میں پُرانے بُت اور مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ اور ایک سُنہری لمپ اپنی دھیمی شعاعوں سے روشنی پھیلا رہا تھا۔ کمرہ کی دیواروں پر چین کا بنا ہوا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف پرانے صوفے اور کرسیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ جن کے گدّے خراب اور میلے ہو چکے تھے۔ دیوار پر پیرس کی مصورہ مادام لبرون کے ہاتھ کی بنی ہوئی دو بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ ہرمان پردہ کے پیچھے گیا۔ ایک چھوٹا سا لوہے کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ پر ایک دروازہ تھا جو غسلخانہ کمرے کو جاتا تھا۔ بائیں پر ایک اور دروازہ تھا۔ جو کہیں کا راستہ تھا۔ ہرمان نے اُسے کھولا اور ایک تنگ چکردار زینہ نظر پڑا۔ جو اُس کی محبوبہ کے کمرہ کو جاتا تھا لیکن وہ واپس لوٹ آیا اور خفیہ کمرہ میں داخل ہوگیا۔ وقت آہستہ آہستہ گذرتا رہا۔ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ملاقاتی کمرہ کی گھڑی نے بارہ بجائے۔ اور ہر کمرے میں یکے بعد دیگرے گھنٹے بجنے لگے۔ پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی ہرمان ایک سرد طاق پر جھک کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اور کسی ایسے شخص کے دل کی طرح جس نے کسی خطرناک لیکن ضروری کام کرنے کا تہیہ کرلیا ہو اُسکا دل بھی باقاعدہ حرکت کر رہا تھا۔ گھڑیوں نے ایک بجایا پھر دو بجائے۔ اور اس نے دور سے کسی گاڑی کی آواز سُنی۔ اُس کے دل میں بے اختیار ایک جوش پیدا ہونے لگا۔ گاڑی قریب آتی گئی۔ اور دروازہ پر آکر ٹھہر گئی۔ اُس نے سُنا کہ تمام مکان میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ نوکر چاروں طرف دوڑنے لگے آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ اور تمام مکان روشن ہوگیا۔ تین پُرانے نوکر بھاگتے ہوئے سونے کے کمرہ میں آئے اور ان کے بعد کاؤنٹس جو بمشکل زندہ معلوم ہوتی تھی داخل ہوئی اور آتے ہی ایک آرام کرسی پر گر پڑی۔ ہرمان کواڑوں کے شگاف سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیزاویٹہ آلوٹونا اُس کے قریب سے گزری اور تیزی کے ساتھ زینہ پر چڑھ گئی ہرمان نے اُس کے قدموں کی آواز سنی۔ اور اُس کے دل میں پشیمانی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ لیکن یہ کیفیت فوراً ہی دب گئی۔ اور وہ پتھر ہوگیا +

کاؤنٹس آئینہ کے سامنے بیٹھ کر اپنے کپڑے اُتارنے لگی۔ خادماؤں نے اُس کی ٹوپی اُتاری جس میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ اُس کے سفید سر سے مصنوعی بال علیحدہ کئے۔ اس کے کپڑوں میں بے انتہا موگیر لگے ہوئے تھے۔ اس کا زرد لباس جس پر چاندی کا کام ہو رہا تھا۔ اس کے بھاری قدموں پر گر پڑا۔ ہرمان نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کہ کس طرح وہ عمر کی زیادتیوں کو چھپانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ آخر کار کاؤنٹس صرف اپنے شب خوابی کے لباس میں نظر آنے لگی۔ اور اس لباس میں جو اس کی عمر کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ وہ بہت کم بدصورت اور خطرناک معلوم ہوتی تھی تمام بوڑھے آدمیوں کی طرح وہ بھی بے خوابی کے مرض میں گرفتار تھی۔ جب وہ لباس تبدیل کر چکی تو دریچہ کے پاس آرام کرسی پر آبیٹھی اور خادماؤں کو رخصت کردیا۔ شمعیں بھی اٹھا دی گئیں۔ اور کمرے میں صرف اُسی سُرخ لمپ کی روشنی باقی رہ گئی۔ کاؤنٹس آرام کرسی پر لیٹی ہوئی بالکل زرد معلوم ہوتی تھی اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اور برابر پہلو بدلتی جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے خیالات کے نقدان کا پتہ چلتا تھا۔ اگر آپ اُسے دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ اُس کا پہلو بدلنا کسی اختیاری جذبہ کے ماتحت نہ تھا۔ بلکہ کسی پوشیدہ مرض کی بنا پر تھا +

یکایک اُس زرد چہرہ کا رنگ بیحد متغیر ہوگیا۔ ہونٹ ہلنا موقوف ہوگئے۔ آنکھوں میں ایک تیز چمک آگئی۔ ایک اجنبی شخص کاؤنٹس کے سامنے کھڑا ہوا تھا +

"ڈریئے نہیں، خدا کے لئے ڈریئے نہیں" وہ صاف صاف آہستہ آواز میں کہنے لگا۔ "میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانے کے ارادہ سے نہیں آیا میں آپ سے صرف ایک نوازش کی التجا کرنے حاضر ہوا ہوں"

بوڑھی خاتون خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ معلوم ہوتا

تھا کہ اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ ہرمان نے خیال کیا۔ کہ وہ بہری ہے۔ اور اُس کے کان کے قریب جھک کر اُنہیں الفاظ کا اعادہ کیا۔ لیکن وہ اب بھی خاموش تھی +

"آپ میری زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہیں"۔ ہرمان نے کہنا شروع کیا۔ "اور اس میں آپ کا کچھ نہیں جائے گا۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ آپ بالترتیب تین پتے تاش میں بتا سکتی ہیں"+

ہرمان ٹھہر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کاؤنٹس سمجھ رہی ہے کہ اُس سے کسی چیز کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور جواب دینے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہی ہے +

"وہ تو صرف مذاق تھا"۔ اس نے آخرکار کہا۔ "میں قسم کھاتی ہوں کہ محض مذاق تھا"+

"اس معاملہ میں مذاق کو بالکل دخل نہیں"۔ ہرمان نے غصہ ہو کر کہا۔ "چیپلٹسکی کو یاد کیجئے جسے اپنے نقصان کی تلافی کرنے میں آپ نے مدد دی"+

کاؤنٹس کے چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس کے خدوخال سے ایک زبردست ذہنی کشمکش کا اظہار ہونے لگا۔ لیکن اس کے بعد وہ فوراً پھر اپنی سابقہ غیر شعوری حالت میں "ڈوب گئی"+

"کیا آپ مجھے یہ تینوں یقینی پتے بتا سکتی ہیں؟" ہرمان نے پوچھا +

کاؤنٹس ساکت و صامت رہی۔ ہرمان کہنے لگا:-

"اس راز کو آپ کسی کے لئے محفوظ رکھے ہوئے ہیں؟ کیا اپنے پوتوں کے لئے؟ وہ تو پہلے ہی سے مالدار ہیں۔ اُنہیں روپے کی قدر نہیں معلوم۔ آپ کے تین پتے کسی نوجوان فضول خرچ کی مدد نہیں کر سکتے۔ جو شخص اپنے باپ کی جائداد کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو۔ وہ تمام شیطانی قوتوں کے باوجود اسی طرح مفلسی میں مریگا۔ لیکن میں فضول خرچ نہیں۔ روپے کی قدر و قیمت جانتا ہوں۔ میں آپ کے تین پتوں کو ضایع نہیں جانے دونگا۔ ہاں تو فرمائیے"+

وہ ٹھہر گیا اور بے چینی کے ساتھ اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ ہرمان اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑا +

"اگر آپ کا دل کبھی محبت کے جذبات سے آشنا رہا ہے۔ اگر اس سرور انبساط کی یاد آپ کے دماغ میں تازہ ہے۔ اگر آپ کسی نومولود بچہ کی آواز پر ایک مرتبہ بھی مسکرائی ہیں۔ اگر کسی انسانی جذبہ نے آپ کے سینہ میں کبھی طوفان بپا کیا ہے تو آپ کو اُنہیں جذبات کا ——— بیوی کے عاشق بنکے۔ اور ماں کے جذبات کا ——— بلکہ زندگی کی ہر مقدس چیز کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری درخواست کو نہ ٹھکرائیے۔ اپنا راز مجھ سے کہدیجئے۔ اب آپ کو یہ کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ ..... ممکن ہے کہ اس راز کے ساتھ کوئی گناہ عظیم ہو۔ ابدی جنت کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہو۔ کوئی شیطانی معاہدہ ہو؟ ..... ذرا سوچئے آپ بوڑھی ہو گئی ہیں زیادہ عرصہ دنیا میں رہنا نہیں۔ میں آپ کے گناہوں کو اپنی روح پر لینے کے لئے تیار ہوں۔ صرف اپنا راز مجھے بتا دیجئے۔ خیال تو کیجئے کہ ایک شخص کی مسرت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور صرف میں بلکہ میرے بیٹے میرے پوتے اور اُن کے بیٹے پوتے آپکو دعائیں دیا کریں گے۔ اور اولیاء کی طرح یاد کر کے آپکی عزت کیا کریں گے +

بوڑھی عورت نے جواب میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ ہرمان کھڑا ہو گیا +

"بوڑھی ساحرہ"۔ اُس نے دانت پیستے ہوئے چلا کر کہا۔ "اب میں تجھے جواب دینے پر مجبور کرونگا"+

ان الفاظ کے ساتھ ہی اُس نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر کاؤنٹس کے چہرہ پر پھر بہت زیادہ پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُس نے اپنا سر پیچھے ڈال لیا۔ اور ہاتھ اُٹھا کر سامنے کر لئے گویا کہ خود کو فیر سے بچانا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ کرسی پر پیچھے کو گر پڑی۔ اور بے حس و حرکت ہو گئی +

"یہ بچوں کی سی باتیں چھوڑ دو"۔ ہرمان نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں آخری مرتبہ تم سے پوچھتا ہوں۔ کہ تم اپنے تینوں پتے بتانا چاہتی ہو؟ ہاں یا نہیں؟"

کاؤنٹس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہرمان نے دیکھا وہ مر چکی ہے +

چوتھا باب

لیزاویٹا آلوٹونا ابھی تک محفل رقص کی خوبصورت پوشاک پہنے اپنے کمرہ میں بیٹھی تھی اور خیالات میں محو تھی۔ مکان پر واپس آتے ہی اُس نے

خادمہ کو رخصت کر دیا۔ اور اُس سے کہدیا کہ تمہاری ضرورت نہیں۔ میں خود ہی کپڑے تبدیل کر لونگی۔ وہ لرزتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی اس امید میں بلکہ اس خوف میں کہ ہرمان بیٹھا ہوگا۔ لیکن کمرہ میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ ہرمان موجود نہیں۔ اور ان موانع کی وجہ سے جوان دونوں کی ملاقات میں حارج ہوئے تھے اُس نے قدرت کا شکر ادا کیا۔ وہ بغیر کپڑے اُتارے بیٹھ گئی اور ان واقعات پر غور کرنے لگی۔ جنہوں نے اس قلیل مدت میں اُسے پھنسا دیا تھا۔ ابھی تین ہفتے بھی نہ گذرے تھے کہ اس نے ہرمان کو دریچہ میں سے جھانک کر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اور اب وہ اس سے خط و کتابت بھی کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ رات کے وقت ملاقات کے مطالبہ کی جرأت بھی کر چکا تھا۔ وہ اس کے نام سے واقف تھی۔ کیونکہ کئی خطوں پر اُس نے اپنے دستخط کر دیئے تھے لیکن اُس سے بات چیت کبھی نہ کی تھی۔ اس کی آواز کبھی نہ سُنی تھی۔ اس کی بابت کوئی بات معلوم نہ تھی ——— اس رات سے پیشتر تک۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ تھا۔ اس رات کو رقص میں طامسکی کا مزاج برہم ہو رہا تھا۔ کیونکہ شہزادی پالین خلافِ معمول اُس کے ساتھ نہ رہی۔ طامسکی بھی شہزادی پر اپنی بے نیازی کا اظہار کر کے اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے لیزاویٹہ آٹونونا سے اپنے ساتھ ایک طویل مزید رقص کرنے کی درخواست کی۔ وہ اس تمام عرصہ میں انجنیر افسروں کی طرف لیزاویٹہ کے جذبات کا مذاق اُڑاتا رہا۔ اور اُسے یقین دلایا کہ وہ اس امر کی بابت اس سے زیادہ جانتا ہے جتنا لیزا سمجھتی ہے۔ اتفاقیہ طور پر اُس کے بعض جملے اسقدر چست بیٹھتے تھے کہ کئی مرتبہ لیزاویٹہ نے خیال کیا کہ طامسکی اُس کے راز سے واقف ہے +

"آپ کو یہ تمام باتیں کس سے معلوم ہوئیں؟" لیزاویٹہ نے ہنستے ہوئے دریافت کیا +

"ایک ایسے شخص کے دوست سے جس کو آپ بخوبی جانتی ہیں۔" طامسکی نے جواب دیا۔ "ایک نہایت عجیب و غریب شخص سے" +

"اور یہ عجیب و غریب شخص کون ہے؟"

"اس کا نام ہرمان ہے۔"

لیزاویٹہ نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن اُس کے ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے +

"ہرمان واقعی افسانوں کی شخصیت معلوم ہوتا ہے۔" طامسکی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایک رُخ سے دیکھا جائے تو وہ نپولین کا ہم شکل نظر آتا ہے۔ اس کے جسم میں مفیسٹوفلیز کی روح ہے۔ میرے خیال میں اُس کے ضمیر کو کم از کم تین گناہ داغدار بنائے ہوئے ہیں ——— لیکن آپ کتنی زرد معلوم ہو رہی ہیں +

"میرے سر میں درد ہے ——— لیکن آپ سے کہا کیا ہرمان نے۔ یا جو کچھ بھی اُن کا نام ہو؟"

"ہرمان اپنے دوست سے بہت خفا ہے۔ اس کا قول ہے کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا۔ تو اور طریقہ سے کام کرتا۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ شاید ہرمان کے آپ کی نسبت بھی کچھ ارادے ہیں۔ بہرحال وہ اپنے دوست کے ان عشقیہ بیانات کو بے توجہی سے نہیں سُنتا" +

"لیکن اس نے مجھے کہاں دیکھا ہوگا؟"

"گرجا گھر میں یا ممکن ہے کسی دعوت میں ——— خدا بہتر جانتا ہے ——— شاید آپ ہی کے کمرے میں آپ کے سوتے وقت وہ تو ———"

گفتگو کا سلسلہ لیزاویٹہ آٹونونا کے لئے انتہائی دلچسپی اختیار کر چکا تھا۔ کہ تین خواتین نے قریب آکر اُسے منقطع کر دیا۔ طامسکی شہزادی پالین کے ساتھ رقص میں مشغول ہوگیا۔ جس نے رقص کے دوران میں اپنی مشعولیت کے اسباب کی بخشش کو معاف کر دیا۔ اور جب طامسکی اپنی جگہ پر واپس آیا ہے تو اس کے دل میں نہ ہرمان کا خیال تھا۔ نہ لیزاویٹہ آٹونونا کا۔ لیزاویٹہ چاہتی تھی کہ وہ منقطع سلسلہ کلام پھر جاری کیا جائے۔ لیکن رقص ختم ہوگیا اور تھوڑی دیر بعد کاؤنٹس مکان کو روانہ ہوگئی +

طامسکی کے الفاظ رقص گاہ کی معمولی بات چیت سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس نوجوان لڑکی کی روح میں بہت گہرے اُتر گئے۔ طامسکی نے جو تصویر کھینچی تھی وہ اس کے بالکل مطابق تھی۔ جو خود اُس نے اپنے دماغ میں اُتاری تھی۔ اور یہی معمولی نوجوان شخص اُس کو خائف کر رہا تھا۔ لیکن اُس کے تخیل پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ اسی خیال میں بیٹھی تھی۔ اُس کے مخروطی بازو ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے تھے۔ اور اس کا سر جس میں پھول اب تک زینت دے رہے تھے۔ اس کے کھلے ہوئے سینہ پر پڑا ہوا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور ہرمان داخل ہوا۔ وہ لرز گئی +

"آپ رہے کہاں؟" اُس نے خوفزدہ آواز میں آہستہ سے پوچھا +

"بوڑھی کاؤنٹس کی خواب گاہ میں۔" ہرمان نے جواب دیا۔ "میں ابھی

وہیں سے آرہا ہوں۔ کاؤنٹس کا انتقال ہوگیا"۔

"خدا کی قسم!۔۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کی موت کا سبب میں ہوں" ہرمان نے کہا۔

لیزاویٹہ آٹونونا نے اس کی طرف دیکھا اور طامسکی الفاظ اس کے دماغ میں گھومنے لگے۔ "میرے خیال میں اُس کے ضمیر کو کم از کم تین گناہ واغدار بنائے ہوئے ہیں"۔ ہرمان اس کے قریب کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ اور سارا واقعہ بیان کردیا۔

لیزاویٹہ آٹونونا ایک خوف کے ساتھ اُس کی باتیں سنتی رہی اس کے یعنی تھے کہ وہ تمام جذبات سے بھرے ہوئے خطوط، وہ پُرجوش مطالبات وہ بیبا کانہ سخت تعاقب ——— یہ سب باتیں محبت سے تعلق رکھتی تھیں۔ روپیہ دراصل اس کی روح کی غرض وغایت تھا۔ لیزا اُس کی خواہشات کو پورا کرنے اور اس کو مسرور و متبسم بنانے کے لئے تھی۔ وہ غریب تو اس ڈاکو کے لئے اس کی مرتبیہ کے قاتل کے لئے صرف ایک بے بصر شریک کار سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ وہ تکلیف دہ لیکن بعد از وقت پشیمانی کی حالت میں زار زار رونے لگی۔ ہرمان خاموشی کے ساتھ اسکو دیکھتا رہا۔ تکلیف اس کی روح کو بھی پہنچ رہی تھی۔ لیکن اس کا سخت دل نہ تو بے چاری لڑکی کے آنسوؤں سے متاثر ہوا نہ ان دردوں سے جن کی دل آویزیوں سے۔ اس کا ضمیر مردہ بوڑھی خاتون کے خیال پر اسکو ملامت نہ کر رہا تھا۔ بلکہ صرف ایک خیال اُس تکلیف دے رہا تھا ——— یعنی اس راز کا ناقابل تلافی طور پر ضایع ہوجانا۔ جس پر وہ خود کو مالدار بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

"تم بڑے خونخوار عفریت ہو" لیزا نے آخر کار کہا۔

"میں اس کی موت کا خواہاں نہ تھا" ہرمان نے جواب دیا "میرا پستول بھی بھرا ہوا نہ تھا"۔

دونوں خاموش ہوگئے۔

اب صبح ہونے لگی تھی۔ لیزاویٹہ آٹونونا نے موم بتی جو تقریباً بالکل جل چکی تھی۔ بجھادی۔ ایک دھندلی شعاع کمرہ کو روشن کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے آنسو خشک کئے اور ہرمان کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک دریچی کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بازو لپٹے ہوئے تھے۔ اور چہرہ پر سختی اور جھلاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس صورت میں وہ بالکل نپولین کے مشابہ معلوم ہو رہا تھا اور اس مشابہت سے لیزاویٹہ آٹونونا کو سخت تعجب ہوا۔

"اب آپ اس مکان سے باہر کس طرح نکلیں گے؟" لیزا نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ خفیہ زینہ سے آپ کو نکال دونگی۔ لیکن اس کے معنی یہ ہوئے کہ خوابگاہ میں ہوکر جانا پڑیگا۔ اور مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے"۔

"مجھے اس خفیہ زینہ کا پتہ بتادیجئے۔ میں خود نکل جاؤنگا"۔

لیزاویٹہ آٹونونا کھڑی ہوگئی اپنی جیب سے کنجی نکال کر ہرمان کو دی۔ اور باہر جانے کا راستہ بتادیا۔ ہرمان نے اُس کا سرد اور بے حس وحرکت ہاتھ دبایا۔ اور اس کے جھکے ہوئے سر کو بوسہ دیکر کمرہ سے چلا گیا۔ وہ چکردار زینہ سے نیچے اُترا اور پھر کاؤنٹس کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ بوڑھی خاتون کی لاش کرسی پر سخت ہوچکی تھی۔ اُس کے چہرہ پر کامل سکون طاری تھا۔ ہرمان لاش کے سامنے رُک گیا اور دیر تک چہرہ کو دیکھتا رہا۔ گویا کہ وہ اس خوفناک صداقت کا یقین کرلینا چاہتا تھا۔ آخر کار وہ ملبوس خانہ میں داخل ہوا۔ کپڑوں کے پیچھے ٹٹول کر خفیہ زینہ معلوم کیا۔ اور دل میں عجیب وغریب جذبات لئے ہوئے تاریک سیڑھیوں پر اُترنے لگا۔ "شاید اسی زینہ سے تقریباً ساٹھ سال پیشتر" وہ سوچنے لگا "اسی خوابگاہ سے اسی وقت کوئی نوجوان خوش باش آدمی چھپ چھپا کر اُترا ہوگا۔ جس کے کفتانوں پر زردوزی کا کام ہو رہا ہوگا۔ اور جس کے بال شانہ انداز میں بنے ہوئے ہونگے۔ اور وہ اپنی سہ رُخی ٹوپی کو اپنے سینہ سے لگائے ہوگا۔ عرصہ ہوا کہ وہ اپنی قبر میں گل چکا ہوگا۔ اور آج اُسکی محبوبہ کے دل نے دھڑکنا بند کردیا"۔

زینہ کے خاتمہ پر ہرمان کو ایک دروازہ ملا۔ اس دروازہ کو بھی اُسنے اسی کنجی سے کھولا۔ اور ایک برآمدہ میں داخل ہوا۔ جہاں سے سڑک کو راستہ جاتا تھا۔

پانچواں باب

اس خونی رات سے تین دن بعد صبح کے نو بجے ہرمان ..... کی خانقاہ میں گیا۔ جہاں مرحومہ کاؤنٹس کے جنازہ کی مراسم ادا کی جانے والی تھیں۔ حالانکہ وہ اپنے فعل پر ذرا بھی پشیمان نہ تھا۔ تاہم وہ ضمیر کی آواز کو بالکل نہ دبا سکا جو اُس سے متواتر کہہ رہا تھا "اس بوڑھی خاتون کے قاتل تم ہو"۔ اس کے اعتقادات میں ایمان کم اور اوہام زیادہ تھے۔ اسے یقین تھا کہ کاؤنٹس اس کی زندگی پر بُرا اثر ڈالے گی۔ لہٰذا اس نے ارادہ کرلیا کہ اُسکے

جنازہ پر جاکر اس سے معافی مانگے +

گرجا بالکل بھرا ہوا تھا اور بعد مشکل ہرمان لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ نکال سکا۔ جنازہ مخملی شامیانہ کے نیچے ایک صندوق پر رکھا تھا۔ جس پر زردوزی کے کام کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ متوفیہ خاتون وہاں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ صلیب کی شکل میں اس کے سینہ پر رکھے تھے۔ اور ایک بیل لگی ہوئی ٹوپی اور سفید ساٹھن کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے تمام نوکر چاکر چاروں طرف کھڑے تھے۔ مرد خدام سیاہ کفنیاں جن کے کندھوں پر متوفیہ کا نشان ریاست بنا ہوا تھا پہنے ہوئے تھے۔ اور اپنے ہاتھوں میں موم بتیاں اٹھائے ہوئے تھے۔ تمام اعزہ واقارب انتہائی رنج وملال میں مبتلا تھے۔ کاؤنٹس کے بیٹے، پوتے اور پڑپوتے سب موجود تھے۔ لیکن کوئی رو نہ رہا تھا کیونکہ آنسوؤں سے ظاہرداری کا اظہار ہوسکتا تھا۔ معمر خاتون کی عمر اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس کی موت سے کوئی متعجب نہ معلوم ہوتا تھا۔ یہانتک کہ اس کے اکثر رشتہ دار اس کو عرصہ سے مرحومہ لکھ چکے تھے۔ ایک نوعمر پادری نے جنازہ پر تقریر کی۔ اس نے سادہ لیکن پُراثر الفاظ میں مرحومہ کا تذکرہ کیا۔ جو عرصہ سے اپنا انجام بخیر ہونے کے متعلق خاموش اور موثر تیاریاں کر رہی تھی۔ اس نے بیان کیا کہ وہ موت کے فرشتہ نے اس کو اس حالت میں پایا کہ وہ بھلائی کے کاموں پر غور وفکر کر رہی تھی۔ اور نصف شب کے توشہ کی منتظر تھی۔ جنازہ کے مراسم غمگین فضا میں تمام وکمال ادا کئے گئے۔ سب سے پہلے اعزہ مردہ جسم سے اجازت لینے کے لئے آگے بڑھے۔ ان کے بعد لاتعداد اور مہمان جو اس کی نوازانہ ضیافتوں کا لطف اٹھا چکنے کے بعد اس کے سامنے جھکنے کو آئے تھے پھر تمام نوکر چاکر آگے آئے۔ آخر میں ایک بوڑھی خادمہ لائی گئی جو متوفیہ کی ہم عمر معلوم ہوتی تھی۔ دو نوعمر لڑکیاں بغلوں میں ہاتھ دیئے ہوئے اس کو سنبھال رہی تھیں۔ اس میں جھکنے کی طاقت نہ رہی تھی اور صرف چند آنسو بہا کر اس نے اپنی ملکہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ہرمان نے جنازہ تک جانے کا ارادہ کیا۔ وہ جھکا اور تھوڑی دیر تک سرد فرش پر پڑا رہا جو صنوبر کی شاخوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر وہ اٹھا، اور آنکھ لیکر خوف کی حالت میں لاش کی طرح زرد معلوم ہوتا تھا۔ صندوق کی سیڑھیوں پر چڑھا، اور جنازہ پر جھک گیا..... اس وقت اسے یہ معلوم ہوا کہ گوش نے اس کو حقارت سے دیکھا۔ اور ایک آنکھ ماری ہرمان فوراً پیچھے ہٹا۔ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کو پکڑ کر اٹھایا گیا۔ اسی لمحہ لیزاویٹہ آٹونونا کو بیہوشی کی حالت میں باہر لے گئے۔ اس واقعہ نے تھوڑی دیر کے لئے ان الم انگیز مراسم کی متانت میں خلل ڈال دیا۔ جو لوگ موجود تھے، ان میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور خواجگاہ کے ایک دبلے پتلے اور بوڑھے خادم نے جو متوفیہ کا قریبی رشتہ دار بھی تھا۔ ایک انگریز کے کان میں جو برابر کھڑا تھا۔ چپکے سے کہا۔ کہ نوجوان افسر خاتون کا حرامی لڑکا ہے۔ انگریز نے سرد مہری کے ساتھ جواب دیا "اوہ!"

حرمان تمام دن سخت پریشان رہا۔ اس نے ایک علیحدہ ہوٹل میں کھانا کھایا اور اپنی عادت کے خلاف دل کے اضطراب اور بے چینی کو رفع کرنے کی امید میں بہت سی شراب پی گیا۔ لیکن شراب نے صرف اس کے پرواز تخیل کو تیز کر دیا۔ جب وہ مکان پر پہنچا تو بغیر کپڑے اتارے بستر پر پڑ گیا۔ اور گہری نیند سو گیا +

اس کی آنکھ کھلی تو رات ابھی باقی تھی اور چاند کمرہ میں اپنی زرد شعاعیں پھیلا رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پونے تین بجے تھے۔ لیکن اب نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا، اور کاؤنٹس کے جنازہ کی تفصیلات اس کے دماغ میں گھومنے لگیں +

اس وقت کسی نے کمرہ کی کھڑکی میں سے جھانکا اور فوراً چلا گیا۔ ہرمان نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ ایک لمحہ بعد اس نے پچھلے دروازہ کے کھلنے کی آواز سنی۔ ہرمان نے خیال کیا کہ اس کا اردلی حسب معمول شراب کے نشہ میں مدہوش آدھی رات تک آوارہ گردی کرنے کے بعد واپس آیا ہوگا۔ لیکن قدموں کی چاپ اسے غیر مانوس معلوم ہوئی، کوئی شخص سلیپر پہنے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک عورت سفید لباس پہنے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی۔ ہرمان نے سمجھا کہ اس کی بوڑھی انا ہے۔ اور اس کے ایسے ناوقت آنے پر متعجب ہوا۔ لیکن سفید عورت پھسلتی ہوئی ایکدم اس کے سامنے آگئی۔ اور ہرمان نے پہچان لیا کہ وہ کاؤنٹس ہے +

"میں اپنی مرضی کے خلاف تمہارے پاس آئی ہوں" اس نے سخت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہاری درخواست کو منظور کر لوں۔ تین، سات، ایک علی الترتیب تمہیں جتا سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں تم ایک مرتبہ سے زیادہ نہ کھیلو۔ اور اس کے بعد

عمر بھر تاش کو ہاتھ نہ لگاؤں میں اپنی موت کا قصہ اس بھی اس شرط پر جانے کی کرتی ہوں کہ تم میری زیر نگرانی لڑکی ہیزل ویٹ آپٹون سے شادی کر لو"

ان الفاظ کے ساتھ وہ خاموشی سے لوٹی اور اپنے سلیپر وں پر پھسلتی ہوئی غائب ہوگئی۔ ہرمان نے ہال کے بند ہونے کی آواز سنی اور اور ایک مرتبہ پھر کسی نے کھڑکی میں سے جھانکا +

ہرمان بہت دیر میں اپنے پریشان دماغ کو کیسو کر سکا۔ وہ دوسرے کمرہ میں گیا۔ اس کا اردلی فرش پر پڑا سو رہا تھا۔ ہرمان بصد مشکل اسکو جگا سکا۔ وہ حسب معمول شراب میں بدمست تھا۔ اور ہرمان اس سے کوئی بات معلوم نہ کر سکا۔ ہال کا دروازہ مقفل تھا۔ ہرمان اپنے کمرہ پر چلا آیا۔ ایک موم بتی جلائی اور اپنی خواب کے حالات قلمبند کر لئے +

چھٹا باب

جس طرح کہ عالم طبیعی میں ایک ہی جگہ پر دو ہستیاں نہیں سما سکتیں اسی طرح دماغی دنیا میں بھی دو خیالات ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ستا اور ایکے نے ہرمان کے دل و دماغ سے مرحومہ کاؤنٹس کے خیال کو یکقلم محو کر دیا۔ تگی ستا اور ایکہ اس کے خیالات پر متصرف ہو گئے۔ اور ہر وقت اس کے ہونٹوں پر رہنے لگے۔ اگر وہ کسی نوجوان لڑکی کو دیکھتا تو کہتا "کسقدر خوبصورت ہے" بالکل بان کی تگی ہے"۔ اگر کوئی اس سے وقت پوچھتا۔ تو یہ جواب دیتا کہ "ستے میں پانچ منٹ ہیں"۔ ہر موٹے آدمی پر اُس کو ایکے کا گمان ہوتا۔ تگی ستا اور ایکہ مختلف شکلیں اختیار کر کے خواب میں بھی اس کے ساتھ رہتے۔ تگی اُس کی نظروں کے سامنے ایک بڑے خوبصورت کھلے ہوئے پھول کی صورت میں نمودار ہوتی۔ ستا ایک گاتا بجاتا محراب کی شکل اختیار کر لیتا۔ اور ایکہ ایک بہت بڑی مکڑی بن جاتا۔ اس کے تمام خیالات اس مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف رہتے کہ وہ اس راز سے جس نے اس کو اسقدر پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ بہترین فائدہ کس طرح اُٹھائے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ اپنی نوکری سے استعفا دیدے اور سفر کرے۔ اسکا ارادہ ہوا کہ پیرس کے عام قمارخانوں میں جا کر قسمت آزمائی کرے۔ لیکن ایک اتفاقی واقعہ نے اُس کو اس مصیبت سے بچا لیا +

ماسکو میں چند مالدار قمار بازوں نے ایک کمپنی قایم کی تھی۔ اس کمپنی کا صدر مشہور و معروف چیکالنسکی تھا۔ جس نے اپنی تمام عمر تاش کھیلنے میں گنوائی تھی اور جو جیتی ہوئی رقوم کے بل وصول کر کے اور ہاری ہوئی رقوم کو نقد ادا کر کے بھی کئی لاکھ روپیہ کما چکا تھا۔ اس کے وسیع تجربہ نے اس کے تمام شرکائے کار کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ایک عالیشان مکان۔ ایک نفیس باورچی اور ان کے ساتھ اس کی خوش اخلاقی اور شگفتہ روئی نے ماسکو کی اعلیٰ سوسائٹی کی توجہ اس طرف منعطف کر دی تھی۔ اب وہ سینٹ پیٹرزبرگ آیا۔ اس کی آمد پر نوجوانوں نے تماش کی خاطر رقص و سرود کی محفلیں چھوڑ دیں اور اس لہو و لعب کے پیچھے عشق و محبت کی داستانوں کو فراموش کر دیا۔ ہر اس کے مکان پر جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ تاروموف ہرمان کو بھی اس مکان میں لے گیا +

وہ کئی عالی شان کمروں میں سے ہو کر گذرے جن میں نوکر چاکر بھرے تھے۔ تمام کمروں میں مہمانوں کا ہجوم تھا۔ کئی جنرل اور پریوی کونسل کے ارکان شاہ کٹ کھیل رہے تھے۔ نوجوان نرم اور ملائم صوفے پر بیٹھے ہوئے برف اور سگرٹ کے مزے اُڑا رہے تھے۔ ملاقات کے کمرے میں ایک لمبی میز پر جس کے گرد بیس کے قریب کھیلنے والے جمع تھے۔ مالک مکان بیٹھا ہوا بینک کا کام کر رہا تھا۔ اور پتے بانٹ رہا تھا اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ اور اس کے چہرہ پر رعب اور متانت کے آثار ہویدا تھے۔ اس کے بال کچھ کچھ سفید ہو چلے تھے۔ اس کے بڑے اور خوبصورت چہرہ سے اس کی اچھی فطرت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک ہلکے تبسم کے ساتھ ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں۔ تاروموف نے ہرمان کا تعارف کرایا۔ چیکالنسکی نے دوستانہ طریقہ پر ہاتھ ملا کر اُس کا خیر مقدم کیا۔ اور پھر پتے بانٹنے لگا +

یہ تقسیم ذرا دیر تک رہی۔ میز پر تیس سے زیادہ پتے رکھے ہوئے تھے۔ چیکالنسکی دو دو پتے بانٹنے کے بعد رُکھ جاتا تاکہ قمار باز اپنے پتے ٹھیک کر لیں اور ان کی ہاری ہوئی رقوم لکھتا جاتا۔ وہ اُن کے مطالبات کو بڑی ملائمت کے ساتھ سُنتا اور اس سے زیادہ ملائمت کے ساتھ بازی کی اس زائد رقم کو واپس کر دیتا۔ جو کسی بے پرواہ قمار باز نے چھوڑ دی ہو۔ آخر کار بانٹ ختم ہوئی۔ چیکالنسکی نے ایک اور گڈی اُٹھا کر پتے پھاڑے۔ اور پھر بانٹنے کے لئے تیار ہوا +

کیا آپ مجھے بھی ایک پتا رکھنے کی اجازت دیں گے؟" ہرمان نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط آدمی کے سر کے اوپر سے بڑھا کر کہا۔ بحوالہ میز کی اس جانب

بیٹھا ہوا بازی لگا رہا تھا +

چیکالنسکی مسکرایا اور سر کے اشارہ سے اپنی منظوری دے دی۔ ناروموف نے ایک قہقہہ لگا کر ہرمان کو اپنا طویل کفر توڑ دینے پر مبارکباد دی۔ اور اُس کے پہلے کھیل کی کامیابی کی دعا کی +

"میں بازی لگاتا ہوں ——" ہرمان نے چاک سے اپنے پتے پر ایک رقم لکھ کر کہا +

"کتنی؟" بینکر نے ذرا غصہ ہو کر دریافت کیا۔ "معاف فرمائیے میں یہاں سے نہیں دیکھ سکتا" +

"سینتالیس ہزار" (۴۷۰۰۰) ہرمان نے جواب دیا +

ان الفاظ پر یکایک تمام سر اور تمام آنکھیں اُس کی طرف پھر گئیں۔ ناروموف نے خیال کیا کہ وہ پاگل ہو گیا +

"مجھے اتنا عرض کرنے کی اجازت دیجئے" چیکالنسکی نے اسی ناقابل تغیر تبسم کے ساتھ کہا۔ "کہ آپ کی بازی بہت زیادہ ہے۔ ابتک کسی نے ایک بازی پر دو سو پچھتر سے زیادہ نہیں لگائے" +

"پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟" ہرمان بولا "آپ میرا پتہ منظور کرتے ہیں یا نہیں؟"

چیکالنسکی نے حسب معمول سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ منظوری کا اقرار کیا اور کہنے لگا :-

"میں یہ اور عرض کرنا چاہتا تھا کہ اپنے شرکائے کار کے اعتماد کا شرف حاصل کرنے کی بنا پر میں صرف نقد پر کھیل سکتا ہوں۔ یقیناً میں خود تو بالکل مطمئن ہوں کہ آپ کے الفاظ کافی ہیں۔ لیکن کھیل کے قواعد کی رو سے آپ سے یہ درخواست کرونگا کہ روپیہ آپ اپنے پتہ پر رکھ دیجئے" +

ہرمان غصہ سے جھک کا ایک کاغذ نوٹ نکال کر چیکالنسکی کو دیدیا۔ جس نے اس پر ایک نظر ڈال کر ہرمان کے پتہ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے پتے بانٹنے شروع کئے۔ ایک نہلا داہنی طرف گرا اور ایک تگی بائیں طرف +

"میں جیتتا ہوں" ہرمان نے اپنا پتا دکھاتے ہوئے کہا +

قمار بازوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ چیکالنسکی کے چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہوئے۔ لیکن فوراً ہی تبسم نے ان کو مٹا دیا +

"کیا آپ اپنی رقم لینا چاہتے ہیں؟" اس نے ہرمان سے پوچھا +

"اگر آپ کی عنایت ہو" +

چیکالنسکی نے بہت سے نوٹ اپنی جیب سے نکالے اور فوراً حساب صاف کر دیا۔ ہرمان نے اپنا روپیہ لیا اور میز سے اُٹھ گیا۔ ناروموف کو بمشکل یقین آتا تھا۔ ہرمان نے لیمونیڈ کا ایک گلاس پیا اور چلا گیا +

اگلی رات کو وہ پھر چیکالنسکی کے مکان پر گیا۔ مالک مکان خوبنیک کے کام پر تھا۔ ہرمان میز کے پاس آیا۔ قمار بازوں نے فوراً اس کے لئے جگہ خالی کر دی۔ چیکالنسکی خوش خلقی کے ساتھ اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرایا۔ ہرمان پتوں کے دوبارہ بانٹنے تک رکا رہا۔ پھر ایک پتا لے کر اُس پر اپنے ۴۷ ہزار اور گذشتہ شب کا جیتا ہوا روپیہ ملا کر لگا دیا۔ چیکالنسکی نے پتے بانٹنے شروع کئے۔ ایک غلام داہنی جانب گرا۔ اور ایک تاباہیں طرف +

ہرمان نے اپنا پتا اُلٹ دیا +

سب کی زبان سے تعجب کے کلمات نکل گئے۔ چیکالنسکی بالکل پریشان ہو گیا۔ اس نے ۹۴ ہزار روپے گن کر ہرمان کو دیدیئے جو سرد مہری کے ساتھ اُنہیں لے کر فوراً مکان سے چلا گیا +

تیسری رات کو وہ پھر میز پر آموجود ہوا۔ ہر شخص اُس کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ جنرل اور پریوی کونسل کے ارکان اپنا کھیل چھوڑ کر یہ غیر معمولی کھیل دیکھنے کو آ گئے۔ نوجوان افسر بھی صوفوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام نوکر چاکر بھی ملاقات کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ ہر شخص نے ہرمان کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ دوسرے کھیلنے والوں نے اپنے پتے نہیں رکھے۔ اور بیتابی سے نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔ ہرمان چیکالنسکی کے خلاف بازی دکھانے کے لئے میز کے سامنے تنہا کھڑا تھا۔ چیکالنسکی کا چہرہ زرد تھا۔ لیکن مسکراہٹ نمایاں تھی۔ دونوں نے تاش کی ایک ایک گڈی اٹھائی۔ چیکالنسکی نے پھیٹنا شروع کیا۔ ہرمان نے ایک پتا لیکر میز پر رکھا۔ اور اسکو ہاتھوں کے ایک پورے انبار سے ڈھک دیا۔ یہ کھیل بالکل ڈوئل کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی مسلط تھی +

چیکالنسکی نے پتے بانٹنا شروع کئے۔ اُس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ داہنی طرف ایک بیگم گری۔ بائیں طرف ایک ایکہ +

"ایکہ جیتا" ہرمان نے کہا اور اپنا پتا اُلٹ دیا +

"آپ کی بیگم تو چل بسیں" چیکالنسکی نے تسلی بخش لہجہ میں کہا +

ہرمان لرز گیا۔ حقیقت یہی تھی۔ ایکہ کی بجائے اُس کے ہاتھ میں حکم کا

کہا کہ اس سے ایک سنگین جرم سرزد ہوا ہے۔ اور پولیس اُس کے تعاقب میں سرگرداں ہے۔ اس لئے وہ جلد از جلد فرار ہونا چاہتا ہے۔ آسکر نے یقین دلایا کہ ابھی ابھی وہ سکاٹ لینڈ یارڈ کے آدمی اس کو دروازہ کے قریب دکھائی دیئے۔ یہ سنکر دوست کے ہوش اُڑ گئے۔ چہرے پر انتہائی کرب و بیچینی کے علامات دکھائی دیئے۔ مایوسی کے عالم میں اس نے جیب سے پستول نکالا اور بدنامی کی زندگی سے موت بہتر سمجھا۔ آسکر غیر معمولی سرعت کے ساتھ آگے بڑھا پستول جھپٹ کر پھر اسی کی جیب میں رکھدیا۔ اور مشورہ دیا کہ وہ فوراً جیسا بھی ہو سکے دریچہ کی راہ سے بھاگ جائے۔ آئندہ جو کچھ بھی گذرے گا آسکر اُس کا مردانہ وار مقابلہ کریگا۔ ٹھیک اُسی وقت کسی نے کواڑ پیٹے۔ آسکر نے فوراً چٹخنی چڑھا دی۔ دھکا دھکا ہوا۔ کواڑ ٹوٹنے کے قریب تھے۔ اُس نے اپنی پیٹھ لگا دی۔ دھکے پر دھکا ہوا۔ لیکن اس نے بدستور کواڑ کو کھلنے نہ دیا۔ تاوقتیکہ آرٹسٹ فرار ہو گیا۔ بعد کو جب پولیس داخل ہوئی۔ اور آسکر کو مزاحمت کے جرم میں گرفتار کرنا چاہا تو اس نے سمجھایا کہ وہ اس سے محض ناواقف تھا۔ کہ آرٹسٹ مجرم ہے۔ علاوہ اس کے وہ بہت دیر پہلے یورپ چلا گیا تھا۔ اس شور و شغب اس کو گاہکوں کا شبہ ہوا۔ جو تصویر کے تقاضے کے لئے آئے ہوں۔ مگر نے یقین دلایا کہ صرف اسی وجہ سے اُس نے مزاحمت کی۔ تو پولیس نے رہا کر دیا ✦

بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اُس کی زندگی میں ایسی جانبازی کے واقعات بہت کم ملتے ہیں تو بھی یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ بزدل اور بودا تھا۔ بہت سے ادیب آپ کو دنیا میں ایسے نظر آئیں گے۔ جن کو کھیل کود اور مردانہ مشاغل میں مطلق دلچسپی نہ تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو کسی نے ڈرپوک نہیں کہا۔ ڈکنز ہیگو نے کسی قسم کی ورزش نہیں کی۔ ڈاؤٹ لنگڑا ہونے سے پہلے بھی سوائے ناچ کے کسی اور مشغلہ میں حصہ نہ لیتا تھا۔ کھیلنا تو بڑی چیز ہے زولا کو کھیل دیکھنے سے بھی ایک قسم کی نفرت تھی۔ اینن کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے دوست سے کہا "شکر خدا کا کہ میں فوجی ملازمت میں نہ ہوا ورنہ جنگ کے موقع پر یا تو مجھے فرار ہونا پڑتا یا خودکشی کی نوبت آتی" ✦

بیکن ایک جگہ لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی شہرت چاہتا ہے۔ تو اس کو چاہیے کہ اپنی آپ تشہیر کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے منہ میاں مٹھو بنے۔ بلکہ اس کی شخصیت میں ایسی حاذبیت ہو کہ ہر شخص خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ آسکر والڈ کا بھائی اُس وقت کا مشہور جرنلسٹ تھا۔ اس کی ماں جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے شعر و سخن کا چسکا رکھتی تھی۔ ان کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ باعث کشش تھی وہ آسکر کی خوش گفتاری تھی۔ اس کا لہجہ نہایت شیریں اور ایسا نرم تھا جیسا کہ گوش گل پر پیغام شبنم۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے۔ جس کے لئے لوگ ہمیشہ دامن پھیلائے رہتے۔ صدائے لب گویا غنچہ کے چٹکنے کی آواز تھی کہ سامعین کے دل اس سے کھلے جاتے تھے۔ باتونی سے باتونی شخص کو اس کے آگے چپ لگ جاتی اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا۔ یعنیہ اس طرح جیسے لوگ بہار کی فضا میں بلبل کو شاخ گل پر چہکتے سنکر بہوت ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ وہ زبان ہی نہیں رکھتے۔ یا کوئی شخص سبزہ زار میں کوئل کی "کو کو" سنکر وارڈسورتھ کی طرح گم سم ہو جاتا ہے ✦

چارلس بادلیر کی شاعری سے انگریز محض ناآشنا تھے۔ دفعتاً آسکر کے دماغ میں خدا جانے کیا سمائی کہ آس نے اس فرانسیسی شاعر کے عجیب و غریب خیالات انگلستان میں پھیلانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اس کا خیال تھا کہ آرٹ (فن) اور اخلاق دو علیحدہ چیزیں ہیں اور یہ ایک دوسرے کے حکوم نہیں ہو سکتے۔ مصور اخلاقی رنگوں کی مدد کے بغیر بھی آرٹ کا ایک مکمل نمونہ تیار کر سکتا ہے۔ اور ایک ناول جس سے کوئی اخلاقی سبق حاصل نہیں کیا جا سکتا ناولسٹ کا شاہکار ہو سکتا ہے۔ گناہ کے متعلق اس کے خیالات انوکھے تھے۔ وہ لکھتا ہے "بیوقوفی کا دوسرا نام گناہ ہے ــــ" معلوم ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں کا اثر آرٹ پر بہت اچھا پڑا۔" اسی قسم کی چیزیں ڈورین گرے میں بہت مل سکتی ہیں ✦

۱۸۸۲ء میں امریکہ والوں نے اس کو مدعو کیا۔ وہاں اُس نے کئی لکچر دیئے۔ آسکر کو معلوم تھا کہ وہاں کے لوگ آزادی کے دلدادہ اور جمہوریت قائل ہیں۔ علاوہ اس کے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ امریکن خوشامد پسند کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اکثر مواقع پر ان کے خیالات کی تعریف دل کھول کر کیا کرتا۔ ایک لکچر میں وہ کہتا ہے:-

"امریکہ کی فضا غیر معمولی طور پر لطیف ہے۔ سمندر اس کے اطراف آزادی کے ترانے گاتا ہے ..... مجھے یقین ہے کہ اگر یہاں کے نوجوان سمندر کے جزر و مد پر غور کریں تو آپ نہیں

آزادی کے ترانوں کے سوا اور بہت سے ہمت افزا نغمے اور
ترقی کے گیت اونچے سروں میں سنائی دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

امریکہ کے سفر میں جیسی کامیابی کی توقع تھی اُسے حاصل نہ ہوئی۔ ایک سال بعد جب وہ واپس ہوا تو انگلستان میں متعدد جگہ اس سے متعلق اس نے لکچر دیئے۔ ان سے امریکہ والوں کا مذاق اُڑانا مقصود تھا۔ ایک مرتبہ اُسنے کہا "امریکہ عورتوں کے لئے جنت ہے ـــــ اس لئے یہاں کی عورتیں حضرت حوّا کی طرح اس سرزمین سے نکل جانے کی خواہشمند ہیں ـــــ"
"تمام امریکہ والے نفیس نفیس لباس پہنتے ہیں جنہیں وہ پیرس سے حاصل کرتے ہیں ـــــ" "نیک امریکن مرکے پیرس جاتے ہیں ـــــ اور بد وہیں رہتے ہیں ـــــ"

"کوئین" "اسپیکر" "پالمال گزٹ" اور "انیسویں صدی میگزین" میں جو اُس زمانہ کے مشہور رسائل تھے۔ اس کے مضامین خاص طور سے چھپتے اور عام طور پر بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے +

حالانکہ آسکر شادی کا بہت مخالف تھا لیکن ۱۸۸۴ء میں اس نے کانسٹنس لائڈ سے شادی کرلی۔ ایام عسل منانے کے لئے وہ پیرس چلا آیا۔ اُس وقت اس کی آمدنی تقریباً چالیس ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ وائلڈ کے میں اس کا قیام تھا۔ وہ نہایت ٹھاٹ سے بسر کرتا تھا۔ وقار و تمکنت جاہ و حشمت۔ شان و شوکت۔ متانت و نفاست غرض ہر چیز سے وہ اپنے آپ کو شہنشاہ تیرو ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ نیرو ایک وسیع قطعہ زمین کا شہنشاہ تھا۔ اور آسکر ادبی ذوق و شوق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کے دلوں کا مالک +

بہت تھوڑے عرصہ میں روپیہ کی فراوانی اور پیرس کی فضا نے اسکو عیاش اور غضب کا مے نوش بنا دیا۔ بس اسی وقت سے آسمان ادب کے اس درخشاں ماہتاب کو گھن لگنا شروع ہوا جس طرح گھن لکڑی کو دھیرے دھیرے کھا جاتا ہے۔ اسیطرح شراب نے آسکر کے قویٰ کو مضمحل کرنا شروع کیا اور آخر ایسا نکما کر دیا جیسے عشق نے غالب کو ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس نکمے پن میں بھی داد و فاداری کردخت رز کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

عیش پرستی نے اس کے نظام العمل پر قبضہ کرلیا۔ اب اسے لکھنے کے لئے وقت نہ ملتا تھا۔ آسکر اسقدر مسرف تھا کہ آمدنی کے وقت اس نے ایک جبہ بھی پس انداز نہ کیا۔ اس لئے اب موقع پا کر مفلسی کا بھوت اُس کی گردن پر سوار ہوگیا۔ اُس نے اپنے دوست شیرارڈ کو خط لکھا کہ وہ لندن آرہا ہے۔ اور اس کے گھر مہمان ٹھہرنا چاہتا ہے۔ شیرارڈ لکھتا ہے کہ یہ خط دیکھ کر اس کو سخت تعجب ہوا کہ آسکر جیسے مدبر شخص نے ایسے الفاظ لکھنا کیونکر گوارا کیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ آسکر پر یقیناً بُرا وقت پڑا ہے۔ پریشان حال دوست کی مدد کرنا فرض سمجھ کر وہ مقررہ وقت پر اسٹیشن گیا۔ گاڑی آئی تو وہ سیدھا فرسٹ کلاس کے ڈبہ کی طرف لپکا یہاں مایوسی ہوئی تو سکنڈ کلاس کی طرف گیا۔ ہر ہر شخص کو بغور دیکھا لیکن آسکر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یعنی اُسیوقت ایک آواز "ہلو! شیرارڈ!" سنائی دی یہ آواز تھرڈ کلاس کے دروازہ سے آئی تھی۔ شیرارڈ متوجہ ہوا تو ایک شخص پرانے لباس میں سرتاپا مفلسی کی تصویر بنے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا یہی آسکر وائلڈ تھا۔ شیرارڈ نے تپاک کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "تھرڈ کلاس میں کیوں آئے تم آسکر؟" "اس لئے کہ اس گاڑی میں کوئی فورتھ کلاس نہ تھا" وہ بولا +

چارلس جے فنگر کا خیال ہے کہ بعض بیماریوں کی طرح اخلاق و عادات بھی اکثر لوگوں کو آبا و اجداد سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ خاندان جوکس کا حال لکھتا ہے۔ ماکس جوکس انتہا درجہ کا شرابی تھا۔ پچھتر سال کے اندر اُس کے خاندان سے دو سو چور اور قاتل، دو سو اسّی پاگل اور "ماہیتا" نوّے بدا طوار اور قریباً تین سو افراد عالم طفولیت میں انتقال کرگئے۔ آسکر کا باپ سر ولیم وائلڈ عیاش اور اپنے زمانہ میں میگساری میں فرد سمجھا جاتا تھا۔ مشہور ہے "جیسی روح ویسے فرشتے" پس کوئی تعجب نہیں کہ آسکر کو عیش پرستی اور میخواری سر ولیم سے ترکہ میں ملی ہو۔ اسی قسم کی بہت سی مثالیں نامور ادیبوں کے حالات میں بکثرت ملتی ہیں۔ بیرن کو اپنی نیم دیوانی ماں کا تھوڑا بہت اثر آیا تھا۔ شاپن ہار کو اپنے دائم المریض باپ سے روگ ملا تھا۔ ہیتان اپنے بیوقوف دادا کے اثر سے مجبور ہوکر کبھی کبھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا تھا +

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عیاش آدمی دنیا کے کسی شعبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر ٹالبٹ نے اس کی تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہ اطوار شخص اس دنیا میں ایک کامیاب وکیل، زبردست سائنٹسٹ، ماہر ریاضی، مشہور ڈاکٹر اور نامور شاعر ایسا ہی ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک نیک اور راستباز آدمی ہو سکتا ہے۔ پال ورلین جو پرلے درجہ کا عیاش شخص تھا زبردست شاعر مشہور ہوا۔ فرانسے دلن چوروں کا دوست، ڈاکوؤں کا شریک، عیاشوں کا ہم مشرب اور شرابیوں کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ لیکن ان تمام برائیوں سے اس کی ادبی شہرت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ باڈلیر کا فلسفۂ محبت کچھ عجیب ہی تھا۔ لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن کبھی کسی نے اُسے بوالہوس مشہور نہیں کیا۔ اعتراض جو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ فقط اس کے فلسفہ کی حد تک۔ شہریت کے متعلق اس کو مقبولیت عام حاصل تھی۔ ہمارا مقصد ان تمام چیزوں سے یہ ثابت کرنا ہے کہ آسکر وائلڈ صحیح معنوں میں باڈلیر کے فلسفہ کا پیرو تھا باوجود اپنی آبائی لغزشوں اور ذاتی خرابیوں کے ایک بڑا شاعر ہو سکتا ہے اور ہوا ہے +

فنگر لکھتا ہے کہ انہیں ایام میں آسکر کے دماغ میں خلل پیدا ہوا۔ جو کچھ وہ کرتا تھا خود اُسے اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔ اس کے ثبوت میں وہ ایک خط شیرارڈ کے نام اُس کی بیوی کا نقل کرتا ہے :-

"پیارے شیرارڈ

یقین جانو مجھے توقع سے زیادہ رنج پہنچا۔ بات کرنا تو کجا میں "انہیں" نہ دیکھ سکتی ہوں اور نہ چھو سکتی۔ دوشنبہ کو "ان کے" یہاں جانے سے پہلے ذرا مجھ سے مل لینا۔ دو بجے کے بعد جب چاہو آ سکتے ہو۔ تقریباً تین سال سے "ان کے" دماغ میں خلل واقع ہو گیا ہے۔ "وہ" کہتے ہیں کہ اگر ——— کو دیکھیں تو فوراً اُسے جان سے مار ڈالیں گے اس لئے ان صاحب کو پرے ہی رہنا چاہئے۔ ایک کا نیا زندگی کو خواہ مخواہ انہوں نے خراب کیا۔ کہہ دو کہ اسی پر اکتفا کریں +

میرے خیال میں تم وہی شخص ہو جن سے آسکر ملنا پسند کریں گے .....

"کانسٹنس وائلڈ"

۱۸۹۵ء میں آسکر پر مارکوئس آف کوئنس بری کو ذلیل کرنے کے جرم میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ آسکر کی طرف سے کئی وکیلوں نے پیروی کی۔ لیکن مارکوئس کا اثر ہی مقدمہ جیتنے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ اس زمانہ میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ امراء۔ روسا۔ حکام اور خود عدالت بھی ایک گونہ اُس کے زیر اثر تھی۔ ایسے بارسوخ آدمی کے خلاف مقدمہ لڑنا کوئی کھیل نہ تھا۔ آسکر کے موئدین کی چھوٹی سی جماعت ایک طرف اور باوقار انگریزوں کی ایک مہذب جماعت دوسری طرف۔ یہی نہیں بلکہ بعض یورپین اخباروں نے بھی آسکر کے خلاف لکھنا شروع کیا +

پہلے پہلے تو بیرسٹر دلچسپی سے کام کرتے رہے۔ اور آسکر نے بھی خود اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ لیکن جب بیرسٹروں نے اپنی پوری لیاقت صرف کر دی اور دیکھا کہ عدالت کس سے مس نہیں ہوتی تو اُن کے دل چھوٹ گئے۔ ساتھ ہی وہ ڈورا بھی ٹوٹ گیا جس سے آسکر کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ بحث بخیر ختم ہوئی اور جج نے جیوری کے سامنے سارا معاملہ پیش کیا۔ کامل دو گھنٹہ تک جیوری میں باہم نزاع ہوتا رہا۔ آخر ایک ووٹ سے آسکر کے خلاف فیصلہ ہوا +

جیوری نے اپنا فیصلہ جج کے سامنے اعلان کے لئے پیش کیا۔ شیرارڈ کہتا ہے کہ وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ جج کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ ایک نامعقول جو پاس بیٹھا تھا چلایا "وہ کالی ٹوپی ڈھونڈ رہا ہے ——— معلوم ہوتا ہے کہ سزائے موت تجویز ہوئی ہے"۔ آخر وہ گون کو برابر کرتے ہوئے اُٹھا اور لکنت کرتے ہوئے دو سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی +

آسکر کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ۔ حواس باختہ اور دل بے قابو۔ اعضا سے بے بسی ظاہر تھی۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا وہ چلایا "کیا آپ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں گے ——— میرے لارڈ"۔ لیکن جج نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ہاتھ کا اشارہ ہوا جس کے ساتھ ہی سرکاری چپراسیوں نے آگے بڑھ کر حراست میں لے لیا اور کٹہرا کھلا دروازے کی طرف لے چلے۔ آسکر جو اب تک نظریں جھکائے تھا۔ اپنے رفیقان ہمدم و یاران غمگسار پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے ہال سے رخصت ہوا +

آسکر کو قید میں دو وقت آدھا آدھا پیٹ کھانا دیا جاتا۔ لیکن دن

کولھو کے بیل کی طرح مشقت لی جاتی تھی۔ سن کی رسّی بٹتے بٹتے اُس کے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے۔ غم غلط کرنے کے لئے کوئی مونس نہ کوئی ہمدرد۔ جیل خانہ میں سب ایک سے بڑھ کر ایک بدمعاش۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ یہیں گذارا تھا۔ بھلا ایسے لوگوں کو آسکر وائلڈ سے کیا ہمدردی اور آسکر کو ان سے کیا دلچسپی ہوتی۔ تنہائی سے یہ بہت جلد گھبرا گیا۔ کتابیں نہیں کہ دل بہلائے۔ اخبار رات جن کا یہ بیحد شوقین تھا کہاں سے پڑھتا۔ اس قسم کی تمام چیزیں سخت ممنوع تھیں +

ایک عرصہ اسی طرح گذر گیا۔ رفتہ رفتہ پبلک کو آسکر پر ترس آنے لگا لوگوں کے دلوں میں احساس پیدا ہوا کہ اس ہونہار شاعر پر خواہ مخواہ ظلم ہو رہا ہے۔ دوستوں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اعلان کر دیا کہ آسکر کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی بجائے اب تک ترکیب عمل میں لائی جا رہی ہے۔ انگریزی اخبارات نے کالم کے کالم سیاہ کرنا شروع کئے۔ بار بار گورنمنٹ کو توجہ دلائی گئی دوسرے ممالک میں بھی اس کی بے گناہی اور انگریزی حکومت کی طرفداری کا چرچا پھیل گیا۔ خصوصاً امریکہ اور فرانس کے اخباروں نے تو کھلم کھلا صدائے احتجاج بلند کی۔ اسی اثناء میں ایک جماعت انگلستان میں ایسی قایم ہوئی جو حکومت کو جابر و ظالم اور آسکر وائلڈ کو "شہید" (حالانکہ وہ زندہ تھا) سمجھنے لگی +

اس بڑھتے ہوئے جوش سے گورنمنٹ کو سخت تشویش ہوئی۔ ایک طرف شورش عام کا ڈر اور دوسری طرف اپنی عدل گستری پر زعم۔ غرض عجب کشمکش تھی۔ قید سے بالکل بری کر دینا ناممکن۔ اور حسب حال عملدرآمد بحال رکھنا خطرناک تھا۔ عالی دماغ حاکموں نے باہم مشورے کے بعد طے کیا کہ آسکر کے ضعیف قویٰ کی نگہداشت کے لئے ایک ڈاکٹر متعین کر دیا جائے اور روزانہ کی مشقت میں قدرے کمی کر دی جائے اسی ضمن میں اسے تھوڑی بہت آزادی نصیب ہوئی۔ چوری سے اخبار بھی پڑھنے کے لئے ملتا تھا۔ کہتے ہیں کہ آسکر قید ہونے سے پہلے اخباروں کو بالکل سرسری نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن اب یہ حالت تھی کہ مضامین تو خیر پڑھنے ہی کی چیز ہوتے ہیں لیکن یہ اشتہاروں تک کو حرف بحرف دیکھ لیتا تھا۔ آسکر ہی پر کیا منحصر ہے؟ بیکاری میں ہر شخص یہی کرتا ہے۔ اور پھر جیل خانہ کی سے جو چیز ملے۔ اس میں سب سے سوا مزا ہوتا ہے +

۱۸۹۷ء میں آسکر وائلڈ قید سے رہا ہوا۔ اس کا تن و توش بہت کچھ چھٹ چکا تھا۔ جسم نحیف و لاغر اور دماغ میں اب محنت کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ قید سے چھوٹ کر وہ سیدھا پیرس روانہ ہوا۔ اس کی جسمانی حالت میں اسقدر تغیر ہو گیا تھا کہ اُسے شناخت کرنا مشکل تھا۔ ایٹنڈری گئی ڈی اسکا دوست لکھتا ہے۔ کہ قید سے چھوٹنے کے بعد پہلی ملاقات پیرس کے گرد و نواح کے ایک ہوٹل میں آدھی رات کے قریب ہوئی گئی ڈی آسکر کو بمشکل پہچان سکا۔ اس کے سر کے بال چمکدار اور جمے ہوئے نہ تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے۔ چہرہ پر جھرّیاں۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے اور ہڈیاں اُبھری ہوئیں معمولی لباس پہنے ہوئے تھا۔ سگریٹ بھی ادنیٰ درجہ کا پی رہا تھا۔ غرض دو سال میں غیر معمولی جسمانی اور مالی تبدیلی ہو گئی +

آسکر وائلڈ کی صحت قید سے پہلے بہت اچھی تھی۔ وہ خاص اہتمام کا عادی تھا اور شاید ہی کبھی بیمار پڑتا ہوگا۔ اکثر مواقع پر وہ کھانے پینے یا اور دوسری مصروفیتوں میں منہمک رہ کر دوستوں اور ایڈیٹروں کو اطلاع دینا کہ بیماری کی وجہ سے وہ وقت مقررہ پر کام نہ کر سکا (یعنیہ جیسے کوئی ہفتہ وار رسالہ اگر وہ بر سے شایع ہو تو آپ شذرات میں ضرور ملاحظہ فرمائیں گے "خاکسار ایڈیٹر بیمار تھا" (آسکر قید سے چھوٹا تو بیماریوں نے گھیر لیا۔ اور تنگی و عسرت گلے کا ہار تھے۔ انہیں تکالیف سے وہ تنگ آکر ڈی پروفنڈس میں لکھتا ہے:-

"سوسائٹی نے میرے ساتھ بیوفائی کی۔ کیا نیچر بھی ظلم کریگی؟ نہیں! ہرگز نہیں! اس کا سلوک شاہ و گدا کے ساتھ یکساں ہے۔ کوہسار ہو خواہ سبزہ زار اس کا ابر رحمت ہر جگہ برستا ہے..... سنسان جنگل کے تاریک سماں میں قندیل عرش یقیناً میری رہنمائی کرے گی..... پہاڑوں کے شگاف مجھے اپنی آغوش میں لے لینے کے لئے کھلے رہیں گے..... ہوا کے تیز و تند جھونکے میرے نقش قدم مٹا دیں گے ــــ تاکہ سوسائٹی کے خونخوار درندے میرا تعاقب نہ کر سکیں....!"

سوسائٹی کی حدود سے باہر دنیا کے دسترس سے دور علایق سے پرے حوادث سے محفوظ۔ ایک ایسے ویرانے میں شاعر مظلوم اپنی بقیہ زندگی گذارنا چاہتا ہے۔

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور ہمسایاں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

جو شخص لندن کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز رہ چکا ہو اور پیرس کے والپٹر کیلئے میں ایسا نہ ٹھاٹ کر چکا ہو۔ اب اس کی حالت قابل ملاحظہ تھی" ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک کمرے میں جہاں آفتاب کی شعاعیں بھی دن دھاڑے آنے سے کانپتی تھیں۔ ایک بوسیدہ پلنگ پر۔ کثیف فرش پر آسکر سر کے درد سے کراہتا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے موافق سر پر برف رکھے لیٹا رہتا ہے۔ ایک بیت کی ٹوٹی ہوئی کرسی، ایک کونچ" ایک پرانی میز۔ اسکا کل فرنیچر تھا۔ آخر وہ درد سے تڑپ تڑپ کر ایک دن مر گیا" رابرٹس راس جو اس کے بستر مرگ پر موجود تھا لکھتا ہے" ۳۰ نومبر ۱۹۰۰ء صبح کے ساڑھے پانچ بجے اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ منہ سے کف اور لہو مسلسل آتا تھا۔ ایک بجے اُس کا سانس رُک رُک کر چلنے لگا خراٹوں کی آواز سے ہمارے دل دہلتے تھے۔ پونے دو بجے اُس کا جسم سرد پڑ گیا۔ آنکھیں چھت کو لگ گئیں۔ میں (راس) اُس کا ہاتھ لیکر نبض دیکھنے لگا۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ــــ دو بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ اُس کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی!"

شیرارڈ لکھتا ہے کہ جب آسکر کی موت کی اطلاع آئی تو اُسے ہرگز یقین نہ آتا تھا۔ جب وہ کبھی آسکر کی کتاب پڑھتا تو کاغذی پیرہن میں خود آسکر کی زبان سے وہ الفاظ سنتا کہ" ہر بڑی ہستی کے متعلق حسن عقیدت سے یہی گمان ہوتا ہے" کئی سال بعد نہ معلوم کس نے خبر اڑائی کہ آسکر مرا نہیں زندہ ہے۔ تمام شہر میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ چرچے عام ہو گئے۔ جس جگہ دس بیس آدمی جمع ہوں یقین مانیئے کہ وہاں ضرور آسکر کے زندہ ہونے کے متعلق بحث کی جا رہی ہوگی۔ فرانس اور انگلستان کے اخبارات نے بھی لکھنا شروع کیا کہ آسکر بھیس بدل کر دوسری زندگی کا لطف اُٹھا رہا ہے۔ ایک امریکن اخبار نے تو غضب ہی کر دیا:۔

"آسکر وائلڈ زندہ ہے"

"آرتھر کاروِن لائیڈ جو آسکر کی بیوی کا بھانجا ہے ہمیں خاص طور سے اطلاع دیتا ہے کہ اُس کا ماموں (آسکر) ابھی بقید حیات ہے۔ حال ہی میں اُس نے ایک ہوٹل میں آسکر سے ملاقات کی۔ شام کا کھانا دونوں نے وہیں کھایا۔ بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے حالات وہ خود لکھ رہا ہے۔ وہ پبلک کی نظروں سے پوشیدہ رہنا ہی پسند کرتا ہے۔ ایک لمبی ڈاڑھی سے وہ اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ہے ....."

لیکن تحقیق سے ثابت ہے کہ آسکر نے اپنی خاکی زندگی کا خاتمہ ۱۹۰۰ء ہی میں کر دیا +

اب ہم آسکر کی مشہور تصانیف کا ذکر کریں گے۔ ان پر تنقید و تبصرہ کرنے کو تو جی بہت چاہتا ہے۔ لیکن طوالت کا خوف قلم روکے دیتا ہے۔ اسکو آئندہ پر رکھ چھوڑتے ہیں۔ اب صرف نام گنوا دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں "لارڈ آرتھر کا گناہ" اور "لکھ پتی" شائع ہوئیں ۱۸۸۸ء میں "شہزادہ خرم اور دوسرے افسانے" چھپے ۱۸۹۱ء میں "خاندان بام گرٹیس" "ڈورین گرے کی تصویر" اور "سلومی" طبع ہوئے۔ سلومی کے دو ترجمے ہوئے ایک جناب مجنوں گورکھپوری نے کیا اور دوسرا جناب محمد دین صاحب تاثیر نے (آخر الذکر کا ترجمہ سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۵ء میں چھپا) ۱۸۹۲ء میں "لیڈی ونڈرمر کا پنکھا" ۱۸۹۵ء میں "وفادار شوہر" اور "ارنسٹ" شائع ہوئے۔ ارنسٹ کا ترجمہ جناب نگین کاظمی اور سعیدی نے کیا۔ قید کے بعد "ڈی پروفنڈس" چھپی +

ایک مرتبہ کسی دعوت میں آسکر نے شیرارڈ سے کہا کہ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے اس میں زیادہ محنت نہیں کرتا۔ غیر معمولی تیزی سے اسکا قلم صفحۂ قرطاس پر گلفشانی کرتا ہے۔ ارنسٹ جس کے متعلق جارج مور کا خیال ہے کہ یہ اُس زمانے کی بہترین کامیڈی ہے۔ اس کو آسکر نے صرف پندرہ دن میں ختم کیا۔ اسی طریقہ سے اور بہت سی کتابیں اس نے بہت تھوڑی مدت میں مکمل کر لیں لیکن "سلومی" اور "ڈوریں گرے" کے متعلق اس نے اپنی محنت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی کامیابی پر وہ ایسا خوش ہوا جیسا کہ ایک مصور اپنی تصویر کو مختلف رنگوں میں رنگ کر اس کو شاہکار بنتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا ہے +

آسکر وائلڈ بڑی سخت تنقید کا عادی تھا۔ لیکن اس میں جو چیز باعث ہر دلعزیزی ہوئی وہ اس کی غیر معمولی دلچسپی اور انوکھا مذاق تھا۔ لیرڈ تھ کے متعلق وہ لکھتا ہے" اس کا انداز طوفان بپا کرتا ہے ..... مجلسوں میں گزرتا ہے تو یوں

کی حیثیت سے اس کو سب چیزوں پر قابو ہے سوائے زبان کے ــــ!
ناول نگار کی حیثیت میں وہ سب کچھ کر سکتا ہے سوائے قصہ گوئی کے ــــ!
مصور کی حیثیت سے وہ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے سوائے حسن کے ــــ!"

جیروم کے مذاق کو وہ "عامیانہ لکھتا ہے شیلی اور کیٹس کی البتہ تعریف کی ہے۔ فرانسیسی ناولسٹ بلزک کی کتابوں کے بارے میں وہ لکھتا ہو اس کی ناولوں کا چرچا ہر زبان پر ہے۔ لیکن کوئی آنکھ انہیں نہیں پڑھتی۔"

باوجود اس مذاق کے وہ بہت ہی ہمدرد واقع ہوا تھا۔ اکثر لوگ اس سے مشورہ کرنے آتے اور وہ سب کو مخلصانہ اور ہمدردانہ جواب دیتا۔ ایک شخص نے ادبی کامیابی کا طریقہ دریافت کیا۔ آسکر اس کے جواب میں حسب ذیل خط لکھتا ہے:-

"یقین مانو دنیا میں صرف ادب کا پیچھا کرنے سے زندگی نہیں نہیں گزرتی!

جرثومے سے آدمی پیسے کما سکتا ہے۔ لیکن خالص ادبی خدمت سے نہیں!

میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم کوئی پیشہ پہلے اختیار کر لو تاکہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ایک وسیلہ ہو جائے۔ اور ادب کو اپنے پرسکون لمحوں کے لئے اٹھا رکھو۔ ادب کے بہترین نمونے انہیں لوگوں کے دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن پیٹ کی فکر نہ تھی ــــ شاعر وہی ہے جو جذبہ بے اختیار کے تحت گائے۔

شہرت کے پیچھے مت جاؤ۔ وہ خود نہیں دوڑتی ہوئی آئیگی۔"

"آسکر وائلڈ"

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ چند جملے اس کے طرز تحریر کے متعلق لکھیں۔ یہ انگلستان کا پہلا "ناولسٹ شاعر" ہے۔ خیلڈنگ۔ ڈکنسز۔ تھیکرے۔ یہ سب شاعر نہیں ناولسٹ تھے شیلی نے البتہ کچھ ناولیں لکھیں لیکن بہت ہی کم۔ جلد ہی اس نے ناول نگاری چھوڑ شاعری اختیار کی۔ اسکاٹ کی شہرت اس کی نظموں میں زیادہ ہے بہ نسبت ناولوں کے۔ فرانس میں البتہ لوگوں نے نثر میں شاعری کی۔ ہیگو۔ فلیبیرٹ وغیرہ اس قسم کے ناولسٹ ہیں جس نے گلیٹ جیسا عاشق پیدا کیا۔ جس نے جین وجین کو تکلیفیں جھیلتے منظر عام پر لایا۔ یقیناً وہ شاعر ہے۔ لیکن جس نے ڈورین گرے کی بے جان اور ساکت وصامت تصویر میں زندگی کے انقلابات کا پرتو ڈالا اور دنیا ہی تغیرات کا آئینہ بنایا وہ شاعروں کا بابا، شاہ کہلانے کا مستحق ہے۔

یہ طرز جرمنی میں اسقدر پسند کیا گیا کہ ڈاکٹر میکس میئر فلڈ نے اس کی کئی کتابوں کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ اسکی اتنی شہرت ہوئی کہ شیکسپیئر کے ساتھ ساتھ اس کا نام لیا جاتا تھا۔

سوئیٹزرلینڈ میں اس کی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں کالج کے کورس میں بھی گئیں فقط۔

(خاص)

سید بادشاہ حسن

مرور ایام اور محبت

خواہ اشیائے معدنی ہوں۔ خواہ پتھر۔ یا خود زمین یا بحر بیکراں۔ مگر افسوس! موت کا پنجہ جانکاہ سب پر مسلط ہے۔

پھر حسن جو پھول سے زیادہ نازک ہے۔ اس خونخوار کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بھلا نسیم سحری کے نرم نرم جھونکوں کی کیا مجال ہے جو حوادث زمانہ کے محاصرہ میں مخل ہو سکیں۔ جبکہ غیر متزلزل البنیان چٹانیں۔ آہنی قلعے۔ زمانہ کے حملوں کو نہ روک سکے۔

افسوس! کیسا المناک خیال ہے۔ زمانہ کا بہترین لعل اس کے دندان آز سے بچا کر کہاں چھپا دیا جائے۔ یا وہ کسی کا زبردست ہاتھ ہے جو اس کے غیر مرئی قدموں کو اکھاڑ دے۔ یا کون شخص ہے جو اس کو روک کر وہ حسن کو پامال نہ کرے۔ آہ کوئی نہیں۔

لیکن جب تک زمانہ میں گردش اور اس کی نیرنگیاں موجود ہیں۔ میری تحریر کے سیاہ حروف میرے دلفریب محبت کو روشن کرتے رہیں گے۔

(سٹاکٹن)

اظہر فاروقی۔ بدیلی۔ کالج بنارس

علیگڑھ

علیگڑھ سے ڈربن

(۲)

(از جناب عبدالشکور ایم اے - بی ٹی - علیگ - لکچرر شاستری کالج ڈربن)

ہائی ڈیر نیرنگ خیال! تسلیم! مزاج مبارک!!!

اپنے گذشتہ عریضہ میں سفر کے نصف حالات آپ کی خدمت میں روانہ کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ڈربن کی نئی زندگی، نئے حالات، مغربی طریقۂ زندگی کی اجنبیت، اور جنوبی افریقہ کی یورپین فضا نے کچھ ایسا مبہوت بنایا کہ سفرنامہ کی دوسری قسط لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ہندوستان میں جب تک رہا مفتکن کی تیاری کے لئے مجھے غیر معمولی اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً کمرہ اندر سے بند اور باہر سے مقفل۔ عبداللہ دروازہ پر متعین۔ محض اس کا اعلان کرنے کے لئے کہ خدا جانے آج ہمارے آقا کدھر چلے گئے۔ لکھنے کے میز پر قلم دوات، بہت سا سفید روٹدار کاغذ اور جاذب، ریلیف نب خوب گھسی ہوئی قریب میں چھوٹی میز پر سفید تھالی۔ بہت سے پان بنے ہوئے۔ پرانی ڈلی باریک کتری ہوئی۔ دو تین خلال۔ قریب میں اگالدان نوشہ صاحب کا عطا کیا ہوا۔ غرض یہ کہ اس ساز و سامان کے ساتھ مضمون نویسی شروع ہوتی تھی۔ اور اگر طبیعت حاضر ہوئی تھی تو صفحہ کے صفحہ رنگ دیئے جاتے تھے۔ اسقدر طویل اور اچانک سفر کے بعد جب طبیعت ذرا یکسو ہوئی اور ارد گرد کے حالات کا جائزہ لیا تو ایک بالکل نئی دنیا سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر آقائے محترم علامہ احسن مارہروی کا فرمان یاد تھا۔ کہ افریقہ جاکر کہیں غریب ارد و کو نہ بھول جانا۔ چنانچہ جہاز سے اترتے ہی ارادہ کیا کہ لاؤ نیرنگ خیال کے لئے اگر اور کچھ نہ ہو تو سفرنامہ ہی مرتب کردوں۔ لیکن کچھ ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ یہ ارادہ علی جامہ نہ زیب تن کرسکا۔ ڈربن میں اوّل تو عبدالرحمان اور اگر بفرض محال کسی حبشی کو عبداللہ سمجھ بھی لیا جائے تو وہ اردو کی خصوصیات اس میں کہاں سے آسکتی ہیں۔ خیر یہ بھی جانے دیجئے۔ اتنے دور دراز ہمدیس میں یکایک سکون خاطر کہاں میسر آسکتا ہے۔ اس لئے یہ دوسری قسط اگر آپ کے پاس تاخیر سے پہنچے تو مجھے معذور سمجھ کر معاف فرمائیگا +

ممباسہ سے روانہ ہوکر دو دن میں ساحل ساحل ہوتے ہوئے زنجبار پہنچے۔ شہر عین ساحل پر واقع ہے۔ اور عربی وضع کا نہایت خوبصورت شہر ہے۔ گو ابتک بعض گلیاں اور سڑکیں نہایت تنگ ہیں۔ مگر اس کا افسوس رہا کہ ہمیں شہر میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ جی بہت چاہتا تھا کہ عربوں کے تمدن کے اس مرکز کو بھی دیکھ لیتے لیکن قرنطینہ کے افسروں کی عاقبت اندیشی سد راہ ہوئی اور بارہ گھنٹہ تک ہم ڈک پر بیٹھے ہوئے شاہ زنجبار کے محلات اور قلعہ کو دیکھا کئے۔ ایک مسافر کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نعیم سہارنپوری وہاں نہایت کامیابی کے ساتھ طبّی پریکٹس میں مصروف ہیں۔ اور ان کی بیمار نوازی کا شہرہ دور دور پھیل چکا ہے۔ جہاز میں ایک پرانے علیگ سے بھی ملاقات ہوئی جو زنجبار کے ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا نام میں بھول گیا۔ مگر اتنا یاد ہے کہ وہ بہت دیر تک مادر کالج کے متعلق مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ زنجبار میں عربی خاندان شاہی اب تک قائم ہے۔ گو ان کی حالت وہی ہے۔ جو ہندوستان میں والیان ریاست کی۔ اس جزیرہ کی سیاسی فضا انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور شاہ مذکور انگریزی خزانہ سے تنخواہ پاتے ہیں۔ زنجبار پہنچنے سے قبل یہ مستقل خیال تھا کہ شہر میں پہنچکر شاہی دربار میں ضرور حاضر ہونگا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت یہ خیال پورا نہ ہوسکا۔ افریقہ کے ساحل تک پہنچنے سے قبل ہی یہ خیال پختہ ہوچلا تھا کہ عربوں کے عروج کے زمانہ میں افریقہ کے ساحل پر ہر جگہ اسلامی نوآبادیاں ہونگی۔ چنانچہ اس خیال کی تصدیق برابر ہوتی گئی۔ افریقہ کے جنوبی ساحل تک حبشیوں کی آبادی میں کہیں کہیں اسلام کا پتہ چلتا ہے۔ خود ڈربن میں جمعہ کی نماز صرف دو مسجدوں میں ہوتی ہے۔ اور ان نمازوں میں حبشی برابر شامل ہوتے ہیں۔ گو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ کیونکہ اس نوآبادی میں سینکڑوں برس سے مسیحی مبلغوں کی

(باقی آئندہ پرچہ میں)

سفر کے آخری حصہ میں ایک نہایت حسین بندرگاہ میں گذر ہوا۔ اس مقام کو یہاں کی بول چال میں ڈیلوگوا بے کہتے ہیں۔ مگر اس شہر کا صحیح نام لورنکو مارکوئیس ہے۔ یہ شمال کے جانب ڈربن سے دو دن کے فاصلہ پر واقع ہے یہ ایک پرتگالی مقبوضہ ہے۔ لیکن یہاں کافی تعداد میں ہندوستانی تجارت پیشہ آباد ہیں۔ ہمارے ایک ہم سفر مارواڑی سوداگر اسی مقام پر اترنے والے تھے۔ دن کے ایک بجے جہاز اس بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ سوداگر صاحب نے دن کے چار بجے مکان پہنچکر ایک موٹر بھیجکر ہم سب کو ڈنر پر مدعو کیا۔ اس ناگہانی تواضع سے طبیعت فیر معمولی طور سے مسرور ہوئی۔ چنانچہ ہم سب ان کے دولت کدہ پر پہنچے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم منزل مقصود پر پہنچتے۔ ہم لوگوں نے شہر بھی سرسری طور سے دیکھ ڈالا۔ یہ شہر اپنی خوبصورتی وسعت اور پاکیزگی کے لحاظ سے ہمرتبہ دوبن اور رائے سینا کا مجموعہ ہے۔ مغربی انداز کا یہ پہلا شہر تھا جس نے ہم لوگوں کو تھوڑی دیر کے لئے مبہوت بنادیا۔ جابجا خوش قطع باغات اور قہوہ خانے قدم قدم پر خوبصورت درخت اور پودے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ طلسمات کا عالم ہے۔ قہوہ خانے بڑی کثرت سے آباد۔ مگر قہوہ خانہ کی بغل میں ایک نہایت خوبصورت اور سرسبز باغ۔ یا ہر باغ کے پہلو میں ایک قہوہ خانہ، ان باغات میں اس کثرت سے تتلیاں اڑ رہی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ اگر شاستری کالج ڈربن کی بجائے یہاں ہوتا تو شاستری جی کا کیا ہرج تھا۔ ہندوستان سے دو دن کا راستہ اور کم ہو جاتا۔ ایک آدھ پونڈ کرایہ میں بھی تخفیف ہو جاتی۔

یہاں ہندوستانیوں کا ایک کلب ہے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ شردھانند جی یہاں تقریر کرگئی ہیں۔ دوسرے دن پھر صبح کے وقت شہر کی دیکھ بھال شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد شہر میں کافی ہے۔ اور ان کی ایک مردہ سی سوسائٹی بھی ہے جس کے سرپرست مسٹر احمد شکور ہیں۔ اور جن کی ذات سے اس وسیع آبادی کی ساری قومی کارروائیاں جاری ہیں مسٹر احمد سے ملاقات ہوئی۔ نہایت خلیق اور جوشیلے مسلمان ہیں۔ ان کی بدولت کچھ گھنٹوں میں شہر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ اور نہایت خلوص سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بندرگاہ کو واپس ہوئے۔ اس مقام سے روانہ ہونے سے قبل ہم لوگوں کو تین تار وصول ہوئے۔ ایک نیٹال انڈین کانگرس کا، ایک ادارت کا۔ [illegible] چرس سوسائٹی کا۔ اب تک ایک طریقہ سے غیر ذمہ دارانہ طور پر سفر کر رہے تھے۔ اب وہ حالت شروع ہوئی جو دق پر اترنے والوں کی جہاز پر سے پل کو عبور کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ یعنی ٹوپی کا جائزہ لینا۔ اس پر اٹی ہوئی گرد کو رومال سے جھاڑنا۔ سوٹ کیس میں پاؤں کی ڈبیہ اور بٹوہ رکھ کر قفل لگانا۔ کچھ دیر بعد کوٹ اور چہرہ کی گرد کو چلد جلد رومال سے دور کرنا۔ اور ٹین لگا کر اترنے کے لئے آمادہ ہونا۔ الغرض دو دن اسی ادھیڑ بن میں صرف ہوئے۔ اور لحظہ بہ لحظہ یہ خیال ستانے لگا کہ یا الٰہی! اس پردیس میں مولانا ابرار صاحب ہونگے نہ نوشہ صاحب، نہ معین ہوگا نہ سعید، بس تیرا ہی آسرا ہے۔ سات سمندر پار کا معاملہ ہے۔ نیا ملک اور نئی دنیا ہے۔ آخری عنایت کر کہ یہ مہم کامیابی کے ساتھ سر ہو جائے۔ اس جذبہ نے دل کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ سمندر کی موجوں نے نیم طوفانی پل کھانا شروع کئے۔ اور جہاز ایک حد تک زیر و زبر ہونے لگا۔ اتفاقاً مسافروں نے تسلی دی کہ یہ تو معمولی بات ہے اسے طوفان کا پیش خیمہ تصور نہ کیجئے اور یہ بھی حقیقت کو خوف کی بجائے ایک قسم کا لطف پیدا ہونے لگا تھا۔ گو چار پانچ مسافر متلیوں میں گرفتار پائے گئے۔ اسی امید و بیم کی حالت میں ۱۶ اپریل کی صبح کو ڈربن کا دلکش نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا جسے دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اسی آبادی میں عمر کے تین سال بسر کرنا ہیں۔ یہی ہمارے حرکات و سکنات، محبت و اخلاص۔ نفرت و غصہ کا عاصی گہوارہ ہوگا۔ عیش و آرام کی مسرور گھڑیاں۔ تردد ات کے لمحات، دلدوز آہیں۔ آہنی قہقہہ گویا سب کچھ اسی چار دیواری میں کرنا ہونگے۔ جہاز ابھی ٹھہرنے بھی نہیں پایا تھا کہ ڈربن کا پورا رقبہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ..... یہ دیکھئے۔ ان ہی مکانوں میں سے ایک مکان ہمارا جانے قیام ہوگا۔ اسی مکان میں کالج سے واپس آکر اور آرام کرسی پر لیٹ کر دل دردمند کے رقیق جذبات بے تاب آہوں کے ہمراہ جگر خراش اشعار کی صورت میں نکلا کریں گے۔ اور دوری کے صدمہ سے پدھواس ہو کر خدا جانے اللہ میاں سے براہ راست کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہو جایا کریں گی!

صبح چھ بجے کا راپارا ڈربن کے بندرگاہ میں داخل ہوا اور تقریباً نصف ساعت ٹھہر کر ساحل سے جا لگا۔ وصول شدہ تاروں سے اتنا تو پتہ چل گیا تھا کہ کانگرس اور سینٹ کلب اور ٹیچرس سوسائٹی کے نمایندے ہمارے خیر مقدم کے لئے موجود ہوں گے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جو استقبال ہم لوگوں کو

ملا وہ دنیا کی تاریخ میں کہیں کسی لکچرر یا پروفیسر کو نہ ملا ہوگا۔ ذات کے علیگ اور پیشہ معلمی۔ آپ خود اندازہ فرمایئے کہ اگر ساحل پر ہزاروں ہندوستانی خیر مقدم کو آجائیں تو انسان خواہ مخواہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ ابھی ہم جہاز ہی پر تھے کہ مسٹر ٹائین اور مسٹر بیزنگ ڈک پر آموجود ہوئے۔ اور وہی رسمی باتیں شروع ہوگئیں کہ موسم کیسا رہا۔ سمندر کیسا تھا۔ صحت کیسی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ابھی ان سے نجات نہ ملی تھی کہ اخباروں کے نمایندے اوپر تلے کیمرے لئے ہوئے آدھمکے۔ اور قبل اس کے کہ ہم ترتیب سے کھڑے ہوسکیں۔ ہماری جماعت کی دس بارہ تصاویر کھینچ لی گئیں۔ مسٹر بیزنگ ہمارے اسباب کی دیکھ بھال میں مصروف ہوئے۔ اور ہم نے ساحل پر قدم اُتارے۔ لیکن موٹر میں پہنچنے سے قبل گجروں کی بھرمار نے "مدو کا تخت" یا سیتا گڑھ کا زخمی ہیرو بنا دیا +

---

۱۶ اپریل ۱۹۳۰ء کی سہ پہر میری زندگی میں ایک یادگار سہ پہر گذری صبح نوٹس ملا کہ آج شام کو کانگرس کی جانب سے لکچر سپلیس میں آپ لوگوں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ خیر مقدم کے جواب میں آپ کو تقریر کرنا ہوگی۔ کیونکہ اور کوئی صاحب آمادہ نہیں ہیں۔ مجمع بہت ہوگا۔ اندازکتنا؟ تقریباً تین چار ہزار۔ اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے۔ خیال ہوا کہ اگر عزیز پوری کی شاگردی کرلی ہوتی تو آج کے دن یہ کیوں بخار چڑھتا۔ مگر قہر درویش برجانِ درویش۔ ہمت کرنے کے باوجود جوں جوں شام آتی جاتی تھی نبض میں حرارت بڑھتی جاتی تھی۔ اس پس وپیش کی حالت میں پختہ ارادہ کیا کہ اب جہاں کہیں عزیز پوری ملیں گے۔ سب سے پہلے اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کردونگا +

پوائنٹ سے سیدھے میول کیسل پہنچے۔ اور لگے اجنبی اصحاب سے رسمی باتیں کرنے۔ ایک صاحب آئے چلے گئے۔ دو اور آئے۔ وہ جانے پائے کہ تین اور آگئے۔ دن کے دو بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں پھر اخباروں کے نمایندے آن پہنچے۔ تقریباً ساڑھے تین بجے ہم سب لوگ لکچر سپلیس میں داخل ہوئے +

"وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا"

سپلیس کا چپہ چپہ ڈربن کی ہندوستانی آبادی سے لبریز تھا۔ کانگرس کے پریسیڈنٹ مسٹر سہراب جی ہمارے ہمراہ تھے اور ٹرالیس پر ہندوستان

کے ایجنٹ جنرل سے لے کر ڈربن کے لارڈ میئر تک موجود تھے۔ خوب تقریریں ہوئیں۔ ہم نے بھی دل کھول کر داد شجاعت دی۔ اور تقریباً پانچ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

اس کے دو ہفتہ بعد تک تقریباً صبح و شام جلسے اور دعوتیں۔ جلسے اور دعوتیں نتیجہ یہ ہوا کہ جلسوں اور دعوتوں دونوں سے کوفت پیدا ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ جسقدر بے تکلف دوستوں کی دعوتیں پرلطف اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی ہوتی ہیں، اسی لحاظ سے پُرتکلف دعوتیں آگے چل کر دماغی کوفت اور ایک حد تک پریشانی کا موجب ہوجاتی ہیں۔ موسم کی نیرنگی۔ بحری سفر کے حالات۔ ہندوستان کی سیاسی فضاء۔ وطن کی تعلیمات پھر کہاں تک رسمی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ انگلستان میں تو ہر آن موسم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے موسم پر خوب دل کھول کر بات چیت ہوسکتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ نیرنگیاں کہاں اگر گرمی ہے تو صبح سے شام تک لو چلتی رہے گی۔ اور اگر بارش کا موسم ہے تو کئی کئی دن تک بادہ پیمائی بادہ نوشی کے ہم پلہ ہوجاتی ہے۔ موسم سرما میں سورج کا صبح کے وقت کانپنا۔ غریبوں کا الاؤ پر تاپنا۔ امیروں کا لحاف اور گدّوں میں ملفوف رہنا صبح و شام کا منظر ہے +

اس بحری سفر میں تعجب ہے کہ یلدرم کے خیالات برابر میرے دل و دماغ پر طاری رہے، بالخصوص "ہجوم میں تنہائی" کا منظر نہ صرف میں نے بھی میں دیکھا۔ بلکہ یہاں ڈربن میں بھی اپنے آپ کو آبادی میں تنہا پاتا ہوں۔ اس کے بعد اُن کی عربی گھوڑے کی مثال ہفتوں میرے پیش نظر رہی۔ مسٹر سہراب جی کچھ عرصہ کے لئے ہمارے سرپرست ہوگئے تھے۔ اور تاسستری کالج کے ہم چند نئے ہندی نژاد لکچرس اجنبیوں کو اس طرح دکھائے جاتے تھے جیسے کوئی دولتمند اپنے نئے خریدے ہوئے عربی گھوڑے اپنے دوستوں کو دکھاتا ہے۔ کوئی ہمارا قد و قامت دیکھتا۔ کوئی وضع قطع بھانپتا۔ کوئی ہاتھ پاؤں پر نظر ڈالتا۔ کوئی چال پرکھتا۔ کوئی نسل اور خاندان پر تنقید کرتا۔ عربی گھوڑا خدا جانے کن جذبات سے متاثر ہوکر اس تنقید اور مشاہدہ کا شکار بنتا ہے لیکن اس نقد و تبصرہ نے ہم گرگھٹوں کو تو بہت ہی قلیل عرصہ میں بدحواس کردیا +

ڈربن ہے اور اسی شہر میں ہندوستانیوں کی سب سے زائد آبادی ہے۔ یعنی ان کی اکثریت تو نہیں ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ہندوستانی اور کسی شہر میں نہیں پائے جاتے۔ ہندوستانی کئی ہزار تو معمولی قلی اور مزدور ہیں۔ اور یہاں کے صنعت و حرفت کے مرکزوں میں بہت بڑی تعداد میں کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں کی تجارت کا تقریباً نصف حصہ ہندوستانی تاجروں کے ہاتھ میں ہے جو بالعموم گجراتی بہوری اور میمن مسلمان ہیں۔ یہ سوداگر بالعموم غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ لیکن تجارت کے اصول میں انکی مہارت یورپین اقوام سے بڑھی چڑھی ہے۔ یہ سب مسلمان مہمات کے شوق میں تجارت کی غرض سے اپنے وطن چھوڑ کر چل نکلے تھے۔ چنانچہ عربی کی پرانی مثل السفر وسیلۃ الظفر ان کے حق میں صحیح ثابت ہوئی۔ مگر اب ملک ان کو تعلیم سے اور تعلیم کی اہمیت سے لگاؤ اور دلچسپی کم ہے۔ عموماً ان کا لڑکا پانچویں چھٹی جماعت سے بھاگ کر دوکان میں جا بیٹھتا ہے۔ اور نہایت انہماک کے ساتھ تجارت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ مذہب کے بہت پکے ہیں۔ ان کی مسجدیں بہت پر رونق اور آباد ہوتی ہیں۔ ان کی مستورات پردے کی پابند ہیں۔ لیکن عورتوں کی تعلیم بہت کم ہے۔ تھوڑی سی گجراتی اور اس سے بھی کم اردو جانتی ہیں۔ ان مسلمان مستورات کی وہی حالت ہے جو عموماً یو۔پی اور بہار میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مغربی لباس پہنتے ہیں۔ لیکن ہیٹ کی بجائے ترکی ٹوپی کو اب تک طغرائے امتیاز تصور کرتے ہیں۔

۱۸۶۰ء سے لیکر ۱۹۱۱ء تک اس نوآبادی میں ہندوستانیوں کو آنے اور بسنے کی اجازت تھی۔ لیکن اس کے بعد یہاں کی حکومت نے ہندوستانیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ اس زمانہ میں محض سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستانی یہاں آسکتا ہے۔ ۱۸۶۰ء کے قریب یہاں کی حکومت کو قلیوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ صوبہ مدراس اور گجرات سے ہزاروں قلی یہاں آکر آباد ہو گئے۔ اُس زمانہ میں ہندوستانیوں نے چھوٹی چھوٹی تجارتیں شروع کر دیں۔ اور اب وہی دولتمندی اور سرمایہ کے لحاظ سے یورپین سرمایہ دار کے دوش بدوش ہے۔ مگر ان ہندوستانی سوداگروں نے اپنی معاشرت [illegible] میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ اب تک حبشی کی طرح غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ تصور کرتی رہی۔ بلکہ ایک حساب سے ہندوستانیوں کی حالت حبشیوں سے بھی زیادہ گئی گذری ہے۔ حبشی افریقہ کا اصلی متوطن ہے۔ لیکن ہندوستانی باہر سے لایا گیا ہے +

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی قومی تحریکات کی ابتدا مہاتما گاندھی کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں ایک بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ ان کا مفصل حال خود گاندھی جی نے اپنی سوانح عمری میں نہایت وضاحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اس لئے میں اسکو معرض تحریر میں لانا باعث خیال کرتا ہوں۔ گاندھی جی کی یہ کتاب کئی حیثیتوں سے ہندوستان کے سیاسی لٹریچر میں شامل ہونے کے قابل ہے۔ اس لئے میں سفارش کرونگا کہ نیرنگ خیال کے ناظرین اگر ممکن ہو سکے تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ اس کے بعد مسٹر گوکھلے آنجہانی یہاں تشریف لائے پھر کچھ عرصہ ہوا کہ شریمتی سروجنی نے جنوبی افریقہ کی خاک پاک کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ ان کی تشریف آوری یہاں کی تاریخ میں ہمیشہ یاد گار رہے گی۔ ان کی آمد سے قبل یہاں کا یورپین طبقہ اس خیال میں تھا۔ کہ ہندوستان ہمیشہ تہذیب سے ناآشنا رہا۔ یہاں کے ٹاؤن ہال میں شریمتی مذکور نے ہزاروں انگریزوں کے مجمع میں ایسی دلآویز تقریر کیں کہ یہاں کا یورپین حصہ آبادی پاگل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ہر تقریر میں ہزاروں انگریز جوق جوق پہنچتے تھے اور اُن کی تقریر پر دیوانہ وار وجد کرتے تھے۔ میمیں ہر ممکن طریقہ سے اُن پر فدا ہوتی تھیں۔ اور جنوبی افریقہ کی کل آبادی ان کے قدموں پر تھی۔ ان کی تقریروں کا اولین اثر یہ ہوا کہ ڈربن کا انگریز یہ سمجھنے لگا کہ ہندوستان سے اور تہذیب سے کچھ شناسائی ضرور ہے۔ اور ہندوستان میں بھی کچھ پڑھے لکھے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد شاستری جی یہاں کے ایجنٹ جنرل ہو کر تشریف لائے۔ انکی طلسمی تقریروں نے رہا سہا خیال باطل بالکل دور کر دیا۔ تقریر شروع ہونے سے دو تین گھنٹہ قبل سارا ہال انگریزوں سے بھر جاتا تھا۔ اور تقریر ختم ہوتے ہی ہزاروں انگریز اُن پر پروانوں کی طرح فدا ہوتے تھے شاستری جی کی شخصیت طلسمی شخصیت ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا حلقہ ہوگا۔ جس کو انہوں نے رام نہ کر لیا ہو۔ ہندوستانی آبادی تو ان کی حقیقتاً پوجا کرتی تھی۔ ڈربن میں مشکل سے کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں شاستری جی کی تصویر آویزاں نہ ملے۔ جنوبی افریقہ میں اگر شاستری جی پیغمبری کا دعویٰ کرتے تو ہندوستانیوں کے

علاوہ ہزاروں انگریزان کا کلمہ پڑھنے لگتے۔ یہاں کے برٹولا بریری کے لائبریرین نے خود مجھ سے کہا کہ گو یہ شرم کی بات ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاستری جی کی فصاحت و بلاغت انگریزی زبان میں عدیم المثال ہے انگریزوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جو کچھ شاستری جی ہندوستانیوں کے لئے تین سال میں کر گئے وہ کوئی شخص دس سال میں بھی نہ کر سکتا تھا۔ اب کثرت سے انگریز یہاں ایسے ملتے ہیں جو ہندوستان کے گذشتہ حالات سننے کے لئے بیتاب پائے جاتے ہیں۔ خود مجھ سے یہاں کے ایک نامور کلب نے یہ درخواست کی ہے کہ میں ٹیگور کے "ڈراما" پوسٹ آفس" کو اسٹیج کرنے میں انہیں مدد دوں۔ اس کے علاوہ ہم لوگوں کی تقریریں سننے کے لئے کثرت سے انگریز آموجود ہوتے ہیں اور ہمارے مضامین شوق سے پڑھتے ہیں +

شاستری جی کا سب سے نامور کارنامہ شاستری کالج ہے۔ اب تک ہندوستانیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مدارس کے اساتذہ محض واجبی طور سے ٹرینڈ ہوتے تھے۔ انکی ٹریننگ کے لئے یہ کالج معہ ایک ماڈل ہائی اسکول کے کھولا گیا ہے کالج کی عمارت خود ہندوستانیوں نے چندہ کر کے تعلیمات کے محکمہ کو نذر کر دی۔ اور محکمہ نے چند ہندوستانی لکچرس گورنمنٹ آف انڈیا کی معرفت حاصل کر کے کالج کا کام شروع کر دیا۔ نینیتال میں جو علیحدہ یونیورسٹی زیر تعمیر ہے۔ اس کے ارباب حل و عقد اس کالج کو اپنی درسگاہ میں مدغم کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ اور اگر ہندوستانی آبادی اس کالج سے دلچسپی لیتی رہی تو یہ کالج یقیناً یہاں کا بہترین کالج ہو جائے گا +

افسوس ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ابتک کچھ انتظام نہیں ہوا اسکول کے جو دو پرائیوٹ مدرسہ ہیں۔ وہاں بہت چھوٹی چھوٹی بچیاں بہت قلیل تعداد میں محض دینیات، اردو اور بگراتی پڑھتی ہیں۔ مجھے ایک مدرسہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ لڑکیوں کی جماعت میں مشکل سے بارہ لڑکیاں ہونگی۔ دوسرے اسکول میں ان کی تعداد اس سے زائد ہے۔ غور فرمایئے کہ ڈربن میں جہاں چالیس پچاس ہزار مسلمان بستے ہیں۔ وہاں محض ۴۰-۵۰ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ چند دولتمند گھرانے ایسے ضرور ہیں جہاں کی بیگمات گورنس رکھکر تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں مشکل سے نصف درجن ہونگی۔ ہمارے کالج کے قریب ایک ابتدائی گرلس اسکول ہے۔ مگر اس میں ایک لڑکی بھی مسلمان نہیں۔ زیادہ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ بعض نوعمر لڑکیاں زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار مل جاتی ہیں شریف پڑھ لیا کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کا شمالی افریقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے مصر کی تمدنی حالت۔ یہاں کی مسلم سوسائٹی پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انگریزی آبادی ہندوستانی سے بالعموم علیحدہ رہتی ہے۔ اس لئے ان کی خاندانی روایات وہی ہیں جو ہندوستان میں تھے۔ اور جن کی بدولت ہندوستان کے مسلمان روز بروز گرتے چلے جا رہے ہیں۔ بہرحال یہ ایک دوسرا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس پر کسی دوسری صحبت میں اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرونگا +

یہاں کا ہندوستانی دو چیزوں کا عاشق ہے ایک تقریر اور دوسرے کھیل (گیمس) کا۔ تقریر کا معیار آن کے خیال میں نہایت افوکھا ہے۔ تقریر میں بے اندازہ روانی ہونی چاہئے اوطوالت، اصلی مواد کے اور خیالات کی تربیت کے وہ قائل نہیں مصطفیٰ کمال پاشا اور غازی امان اللہ خاں ان کے خیال میں دنیا کے سب سے بڑے مقرر ہیں۔ کیونکہ دونوں ۲۴-۲۴۰ گھنٹے مسلسل تقریریں کر چکے ہیں۔ کھیل کود میں فٹ بال اور کرکیٹ کا علی الترتیب شیدائی ہے۔ موہن بھگن۔ پنڈی ٹیم۔ دلیپ سنگھ اور نواب پٹودی۔ وزیر علی نذیر علی اور نائیڈو سب کے کارنامے ان کی زبان پر ہیں۔ کھیلنے کا دستور شام کو نہیں ہے۔ بلکہ ہفتہ اور اتوار کے دن ڈربن کے کھلاڑی دن بھر کھیلتے رہتے ہیں اور پھر ہفتہ بھر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ ہفتہ اور اتوار کو یہاں برابر تعطیلیں ہوتی ہیں +

یہاں کے ہندوستانیوں پر ہماری اصطلاح میں "مغربیت" کا غلبہ ہے۔ اور یہ ایک حد تک ہے بھی فطری۔ کیونکہ یہاں جسقدر ہندوستانیوں نے ہجرت فرمائی وہ کسی دیگر بلند پایہ تمدن کے حامل نہ تھے۔ اس لئے بغیر کسی مقاومت کے انہوں نے مغربی سرمایہ داروں کی تقلید شروع کر دی۔ لباس اکثر سوائے ٹوپی کے سراسر انگریزی ہوتا ہے۔ چند سن رسیدہ مذہبی بزرگ کوٹ کی بجائے کوٹ نما اچکن زیب تن فرماتے ہیں۔ مگر ان بزرگوں کی تعداد دو تین درجن سے زائد نہ ہوگی۔ وہی بزرگ ریش و بروت کی رسم تازہ کرتے رہتے ہیں بیمقیٹی کی تیز دھار نے یہاں بھی ہندوستان کی طرح اس سنت کا بری طرح خاتمہ کر دیا ہے۔ ہندوستانی

تامل یا گجراتی۔ مگر مسلمان آسانی اردو خوب سمجھ لیتے ہیں۔ مفرس جملوں کی شیرینی اور حلاوت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اردو فارسی سے نصرف محبت رکھتے ہیں۔ بلکہ اسے سیکھنا بھی چاہتے ہیں۔ گھر کے باہر انگریزی زبان کا دور دورہ ہے۔ جیسے معمولی ہندوستانی بہت روانی اور بے تکلفی سے بولتا ہے ویسا ہی معلوم ہوگا کہ آپ کسی برک یا گلیڈسٹن سے مکالمہ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ بدحواس بھی ہوجائیں اور اپنی کم مائگی پر افسوس بھی کرنے لگیں لیکن تھوڑا سا غور فرمائیے۔ تعجب ہوتا ہے کہ انگریزی زبان استعداد روانی کے باوجود بھی استعداد مختلف ہوسکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں جسقدر بھی کج کلاہ موجود ہیں وہ سب عموماً کلونیل زبان بولتے ہیں۔ لیکن یہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ سب شدید مغالطہ میں مبتلا تھے۔ ان غریب ہندوستانیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ہندوستان کے گلی کوچہ میں نہایت متعفن گندگی، ناپاکی اور جہالت کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہندوستانی بھائی اس قابل ہے کہ انگریز اس پر حکومت کرتا رہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جو گجراتی یہاں آگیا وہ یہیں کا ہو رہا۔ ایسے افراد بہت کم ہیں جو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی تعلیم کا یہ حال ہے کہ یہاں ڈربن میں ہندوستانی انٹرنس پاس اتنے ہونگے جتنے ہندوستان میں ڈی لٹ یہاں طالب علم نے آٹھواں درجہ پاس کیا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ کالیدس اور وپاس بریجیز اور برنڈفا، ٹالسٹائی اور لینن سب کو اس کا حاجۃ بگوش ہوجانا چاہئے۔ ورنہ سب دوزخ کی آگ میں جلکر بھسم ہوجائیں گے صرف ایک مسلمان صاحب جو مفصلات میں زمینداری کرتے ہیں سکنڈ یونیورسٹی کے ایم۔ اے ہیں۔ دو مسلمان ڈاکٹر ولایت کے ایم۔ بی۔ ایس ہیں۔ جن میں ایک پرانے بیچلر ہیں۔ اور انگلش ہاؤس میں باباذوالحسن صاحب قبلہ کی مدتوں جوتیاں سیدھی کرچکے ہیں۔ ان کی بیوی مسلمان انگریز ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ میرے پڑوسی ہیں۔ اس لئے میں اکثر ان کی پرسکون گھڑیوں میں خلل انداز ہوکر ان کی بیلگی محبت و صداقت سے ہمیشہ مسرور ہوتا رہتا ہوں۔

ڈربن میں ہندوستانیوں کے کلب کافی ہیں۔ لیکن کلبوں میں صرف ہفتہ اور اتوار کو چہل پہل ہوتی ہے۔ روزانہ کی آمد و شد کا سلسلہ نہیں ہے بالعموم کلب کے ممبران اتوار کے دن صبح کو کلب میں آجاتے ہیں اور شام تک یہیں گفتگو کرتے۔ یہاں کا سب سے شاندار کلب اونینٹ کلب ہے جس کی شاخ ایک غیر آباد شہر میں موجود ہے۔ مگر جس کی اصلی عمارت اور آرائشی اسٹیشنگو میں واقع ہے۔ یہ مقام ڈربن سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ خطہ اغلباً نیٹال کا سب سے زیادہ حسین خطہ ہے۔ فطرت کی ساری دلکش آرائشیں اس مقام پر موجود ہیں۔ ایسے سبز، شاداب اور متبسم خطے میں نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس آراضی کے پشت پر بحیرۂ ہند اپنی پوری سطوت اور شان عالمگیری کے ساتھ موجیں مارتا ہوا ساحل سے ہم کنار ہوتا ہے۔ سمندر کی ان حسین مگر پُر رعب موجوں کو میں جب دیکھتا ہوں تو مجھے لارڈ بائرن کی نظم "چائیلڈ ہیرلڈ" یاد آجاتی ہے جہاں وہ کہتا ہے

شاید اسی نظم سے متاثر ہوکر آقائے سخن سید سجاد حیدر یلدرم نے یہ لکھا تھا:-

"بہے جا . . . . بہائے جا . . . . . "

جس کے پُر شکوہ تخیل کی وسعت کا اثر میرے دل پر نقش کلیجر کی طرح ثبت ہے . . . . . .

اورینٹ کلب یہاں کے بڑے بڑے تاجروں کا کلب ہے۔ سب لوگ اپنی موٹروں میں اتوار کے دن دس گیارہ بجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور شام تک اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ میں اس کلب میں محض ٹینس اور برج کے خیال سے جاتا ہوں لیکن یہ دونوں وہاں نہایت غیر دلچسپ ہوتی ہیں۔ کلب میں ٹینس کا رواج کم ہے۔ رہی برج اس میں ندارد، آپ خود اندازہ فرمائیے کہ ایسی حالت میں ٹینس کورٹ کا اور گیندوں کا نہایت اعلیٰ ہونا اور برج ٹیبل کا ولایت سے منگوایا جانا دونوں بیکار اور محض بیکار سب سے بڑی خوابی یہ ہے کہ کلب کی گجراتی ہے۔ چاہے آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ اب صرف کلب کی فطرتی خوبصورتی باقی رہ گئی۔ مگر بدقسمتی سے میں ٹینس کی قدر تو یقیناً بے حد کرتا ہوں۔ لیکن نیچرل حسن کا بہترین مصرف یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ کسی عنوان سے کسی اور دلچسپی کا ہوجائے ورنہ "محض حسن خود حسن کے لئے" میرے خیال میں ایک ناقابل وجود وہم ہے۔ جس کی تاریک گہرائی میں مغرب کے کئی شعرا بُری طرح گرکر گمراہ ہوگئے۔

ان گذشتہ سطروں میں میں نے کیٹس سے جس اختلاف کا اعلان کیا ہے اُس سے میرے عزیز دوست کاظمی صاحب (ولایت پلٹ) ضرور چراغ پا ہونگے۔ مجھے خود ان کے اور کیٹس کے ساتھ ہمدردی ہے۔ لیکن اسکا کیا علاج کہ کیٹس کا سب سے نمایاں کارنامہ میرے خیال میں وہ خطوط ہیں جو اُس نے فینی براؤن کے نام نہایت جوش و خروش کی حالت قلمبند کئے ہیں اور جن کا شایع کرنا ایک گروہ کے خیال میں نہایت نامناسب ہوا مجھے خوف ہے کہ یہ آخری جملہ کاظمی صاحب کو اور زیادہ پریشان کردیگا۔ میں پھر ان کی خدمت میں ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ غور فرمائیے کہ کیٹس کے اگر جذبات عالیہ اُس سے علیحدہ کرلئے جاتے تو کیا وہ ایک بھی چاہنے والا دنیا میں پیدا کرسکتا تھا۔ بالفاظ دیگر اُس کے جذبات نے اُسے کیٹس بنایا۔ اور ان جذبات کا حسین ترین مظاہرہ اُن خطوط میں موجود ہے جن کا میں ابھی ذکر کرچکا ہوں +

کیٹس، "جذبات عالیہ"، فینی براؤن، شیلے، بائرن، اٹلی، فلورنس، "ایریل"، "اڈونس"۔ غرض یہ ہے کہ اس گفتگو نے ایسے دلکش دنیائے رنگ و بو میرے سامنے پیدا کردی۔ جس کی گلابی فضا میں فٹوسرکل کے دوران قیام میں ہم دونوں (میں اور کاظمی صاحب) کچھ عرصہ تک روز رات کو نہایت عقیدت اور سچی محبت کے ساتھ عالم خیال میں طواف کیا کرتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ مغرب کی اس یادگار وادی میں بھی ہم کو فانی۔ اصغر اور جگر کی ترنم ریزیاں بھی سننے کو مل جاتی تھیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ کاظمی صاحب کا حسن مذاق، تنقید عالیہ کی دلکش مثالیں، مشرق و مغرب کے ادب و شاعری کا محاکمہ فطرت انسانی کی تحلیل نفسی۔ حسن و عشق کے اسرار سربستہ پر عالمانہ تبصرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ،

"جو ترا عدا کے گلے لگے، تیری جدائی کے گلے"

"اس دلِ تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے"

کا شدتِ فراق سے بیتاب ہوکر الاپنا۔ . . . . . .

اگر نیرنگ خیال کی شکایت آپ شایع کرنا پسند نہ کریں تو بقیہ صفحہ ۱۵ (صفحہ ۱۶ و ۱۷ بالکل نکال دیجئے اور صفحہ ۱۸ سے پھر آگے شروع کردیجئے +

مجھے خوف ہے کہ میری ہر زہ سرائی ضرورت سے زیادہ طولانی ہوگئی ہے

عش عش کرتا ہے۔ اور دل ہی دل میں اس کا قائل ہوتا جاتا ہے +

آب و ہوا کے لحاظ سے ڈربن دنیا کے بہترین شہروں میں داخل ہے۔ آفتاب عالمتاب یہاں بھی صبح سویرے بلند ہوتا ہے اور اس کو دیکھ کر یہاں کی مخلوق بھی اپنے اپنے کاروبار میں لگ جاتی ہے۔ لیکن خدا جانے یہ واقعہ ہے "یا مراحسن خیال ہے" کہ میں یہاں کے سورج میں روشنی اور حدت کم پاتا ہوں۔ قمر کی ضو فشانی اور نیلگوں آسمان پر اس کا لحظ بلحظ بلند ہونا اور دنیا پر چادر سیمیں کا تانتے جانا فطرت کی حسین ترین کرشمہ سازی ہے جیسے میں نے مٹسو سرکل کی ادب نواز فضا میں اکثر دیکھا ہے۔ لیکن ڈربن کا چاند مجھے خوف ہے اپنی نصف سے زائد ضیا کھو چکا۔ آسمان پر بلند تو ضرور ہوتا ہے۔ چادر سیمیں بھی پھیلاتا ہے۔ لیکن اس میں وہ لطافت معصوم نہیں ہوتی۔ جس کے خوشگوار تجربے میں نے "حصار علی" کی فضا میں اکثر کئے ہیں میں عرض نہیں کر سکتا کہ یہ واقعہ ہے یا "مراحسن خیال ہے"۔ بہرحال کیرۂ ہند اپنی پرجلال عظمت اور شان جہانبانی کے ساتھ موجیں مار رہا ہے۔ دن میں ہزاروں خندہ زن ناؤیں قندیل آسکے ساحل پر آموجود ہوتے ہیں۔ مگر شب میں سطح آب کی پوری وسعت پر ایک خاص قسم کی حسین مگر نہایت خوفناک خاموش مگر شور مچانیوالی سنجیدہ مگر نہایت بھیانک تاریکی مستولی ہو جاتی ہے۔ ساحل کے چمکیلے ریت پر بیٹھکر میں اپنی کتاب حیات کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہوں۔ اور آخر کار یہ گنگناتا ہوا واپس ہوتا ہوں ؎

بنا کے ہجر کی راتونکو بے نیاز سحر تعینات کے پردے اُٹھا دیئے تو نے

(باقی)

ن تین پیسہ میں ایک ایک تصویر

اب جو وقتاً فوقتاً نیرنگ خیال میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجموعہ میں کل ۲۴ تصاویر ہیں جن میں سے التصاویر عام بڑے بڑے اور بہترین بلاک انتخاب کرلئے گئے ہیں۔ اور ہر تصویر آرٹ پیپر کے صرف ایک ہی طرف شایع کئے یا آرائش کے لئے چوکٹوں میں لگوا کر رکھنے کے لئے بہترین اور لاجواب ہے۔ ٹائیٹل بھی خوشنما لگایا گیا ہے اس شایع کیا کرتے ہیں انکی قیمت دو روپے ہوتی ہے۔ مگر ہم نے اس کی قیمت صرف رکھی ہے۔ حالانکہ بعض تصاویر قیمت میں بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ فی الفور طلب کیجئے نیرنگ خیال کے خریدار وکو محصول ڈاک معاف +

نیرنگ خیال بک ڈپو۔ شاہی محلہ۔ لاہور

پچا

(۱)

گاڑی کی رفتار ٹوٹ چکی تھی۔ مگر اسٹیشن ابھی [illegible] نکال کر کنے دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے جھانک کر پھر رشید سے جن پر سے رات کی تاریکی دور نہیں ہوئی تھی دیکھنے لگا۔ سیتلا میں صبح کی روشنی نمودار تھی۔ اور آہستہ آہستہ [illegible] یا لکھا ہے۔ سیتلا ہاتھ میں لیا اور پڑھنے لگا تھی۔ گاڑی کاشی چک اسٹیشن پر بہت کم ٹھیری کہ سیتلا پلٹ کر سیدھے میں عجلت سے کام لیا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور [illegible] یا۔ اور دیر تک ہنستے رہے

اس چھوٹے سے اسٹیشن پر جبتک گا [illegible] ہلائے جائیں۔ جب رشید مگر گاڑی کے روانہ ہو چکنے پر بالکل سناٹا [illegible] ے چچا آخر ماجرا کیا ہے۔ بابو کی کھانسی اس خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ گاڑ [illegible] ارے دھت تیرا بھلا آواز بہیم رشید کے کانوں میں گونج رہی تھی [illegible] ناطحہ ہے۔" پھر رشید نے رہا تھا۔ وہ پلٹا اور اسٹیشن کے آفس میں جو [illegible] تھا کہ دو مہینے امدہ دہ ہو کی اور مال گھر بھی تھا۔ پہنچا۔ اسٹیشن ماسٹر کو جو [illegible]

دریافت کیا کہ کوئی قلی مل سکیگا۔ اسٹیشن ماسٹر رتھا۔ تمام گرہست اپنے منگرا آواز دینی شروع کی۔ مگر جواب نہ ملا۔ پوست بدگاؤں سے ... ارے دھنواں" کی صدائیں بلند کیں۔ مگر [illegible] نے چشمہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور کھڑاؤں کھٹکھٹاتے باول پچھم سے لگے۔ بار بار نام بدل کر پکارنے پر دور ایک جھونپڑ [illegible] دور ہی تھا کہ پانی (حضور آیا)"..... قلی کے آنے کے بعد رشید نے [illegible] بدتیزی سے کہا اور اسٹیشن ماسٹر بابو کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا + [illegible] وہ چاہتا [illegible] کا عالم تھا صبح کی روشنی سیاہی [illegible] تھی۔ آس پاس کے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ [illegible] جھونکے نے سوتے پتوں کو بیدار کیا۔ اور ہلکی ہلکی خوشگوار [illegible] کے

کے پیچھے پناہ لینے کے لئے جا کھڑا ہوا۔ موٹے تنے کے دوسری جانب سے کچھ آواز اس کے کان میں پڑی۔ اس طرف پلٹا تو دیکھا کہ چند عورتیں اور مرد شرابور پانی میں بھیگے بیٹھے ہیں۔ اس نے ایک نظر میں پہچان لیا کہ سیتلا بیٹھی ہے۔ اور اس کا باپ بھی۔ رشید کے آتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔ عورتیں ایک طرف کو ہو بیٹھیں۔ دُنی نے کہا "سرکار برسات کا پہلا پانی ہے۔ خوب برس جائے تو اچھا ہے۔" کچھ دیر تک آیندہ فصل کی اُمیدوں پر باتیں ہوا کیں اور سب اسی طرح بھیگتے رہے۔ رشید سردی سے کانپنے لگا۔ دُنی نے نے کہا۔ "بیٹی وہ گھونگھنی کہاں ہے بابو کو دے۔ یہ بہت بھیگ گئے ہیں۔" سیتلا تو کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر درخت کے تنہ کی آڑ میں سے گھونگھنی نکالا اور نیچی نظریں کئے رشید کی طرف بڑھانے لگی۔ رشید نے کچھ پس وپیش کیا۔ پھر کن انکھیوں سے سیتلا کی طرف دیکھ کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اور گھونگھنی اوڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ سیتلا سے آنکھ ملاتے ہی رشید نے ایک تمسخر آمیز شوخی اس کی آنکھوں میں دیکھی۔ جب بارش کسی طرح نہ تھمی تو سب نے ویسے ہی گھر کی جانب روانہ ہو جانا مناسب سمجھا۔ رشید آگے آگے تھا سب گرہست اُسکے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ دُنی کا بھائی بولا "ایک جگ سے ایسی برسات نہیں پڑی تھی +

(۴)

ایک مہینہ سے زیادہ برسات گذر چکی تھی۔ کسانوں کے مطلب کے موافق کافی سے زیادہ بارش ہو چکی تھی۔ ہر طرف کھیتی اور جوار کے ہرے بھرے کھیت کھڑے تھے جسے دیکھئے خوش نظر آتا تھا۔ پر تین روز سے ایسی جھڑی لگی کہ کسی کو باہر جانے کا موقع ہی نہ تھا۔ دن بھر موسلا دھار بارش ہوا کی۔ راستے، کھیت، میدان جل تھل تھے۔ رات کے وقت رشید کی بیٹھک پر آج صرف دو تین ہی آدمی تھے۔ چچا بھوکن اپنے مویشوں کے خلاف اتنے رات گئے بھی نہیں پہنچے تھے۔ رشید نوجوان تھا۔ مگر اس کی سلیم طبیعت گاؤں کے بڈھوں کی صحبت سے خاص لطف اندوز ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے دو تین بڈھے اکثر فرصت کے گھنٹوں میں رشید کی بیٹھک پر نظر آتے تھے۔ خاکر چچا بھوکن کا تو اڈا ہی وہاں تھا۔ صفیر نے کہا "جانے چچا بھوکن کہاں رہ گئے؟" منھو میاں بولے "بیچارہ دیکھتے ہوئے کس زور کا برس رہا ہے بھلا

* برسات میں بارش سے بچنے کے لئے مانڑ کے پتوں سے ایک برساتی بنا لیتے ہیں جسکو کسان گھونگھ کہتے ہیں +

بڈھے کو جان بھاری ہوئی ہے۔ کہیں ایک چلم تمباکو مل گیا ہوگا۔ پی کر پڑ گیا ہوگا۔ اتنے میں گلی کے گھپ اندھیرے میں کسی کے بھاری بھرکم پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ایک موٹا ڈنڈا دھرتی دھمک کی طرح زینے پر پڑا سب یکلخت بول اٹھے "وہ آ گئے چچا آ گئے"۔ چچا نے اپنی چھتری جس پر چار مختلف کپڑے ایک کے اوپر ایک چڑھے تھے موڑی اور کونے میں کھڑی کر کے چٹائی پر آ بیٹھے۔ پھر ایک پُرمعنی نظر مٹھو میاں کی طرف ڈالی۔ جو عمر میں تقریباً چچا کے برابر ہی تھے۔ اور غراکر بولے ارے دھنئے کی دھنیٹی جیسا خود بودا ہے ویسا ہی سب کو سمجھتا ہے۔ پانی پڑے پتھر برسے اولے گریں مگر میرے معمول میں آج تک فرق نہ آیا ہے۔ لو ایک چلم تمباکو تو چڑھا۔ ارے بھائی دیر ہو گئی وہاں۔۔۔۔۔۔ رشید نے پوچھا کہاں رہے چچا؟ بولے "چلا آ رہا تھا۔ راستہ میں رمضانی کھینچ رہا تھا۔ کہ اس کا گھر گرا۔ جن جن کو خبر ہوئی دوڑے۔ جیسے ہی میں آنگن میں داخل ہوا چھپر دھم سے زمین پر آ رہا۔ ارے وہ تو بھلا ہوا جو میں نے پہلے ہی ڈانٹ کر سب کو الگ کر دیا تھا۔ ورنہ اللہ یاد آ جاتا"۔ اسیطرح باتیں ہوا کیں۔ بڈھوں کے حلقہ میں حقہ کا دور چل رہا تھا۔ جلتے تمباکو کی بُو آس پاس پھیل رہی تھی۔ جب رات زیادہ گئی تو سب اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے۔ چچا بھوکن نے چلم ایک کونے میں الٹ دی اور چادر لپیٹ کر چٹائی پر دراز ہو گئے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ چچا نے ایک لمبی جمائی لی۔ اور رشید سے بولے "اب سو جاؤ۔ بٹیا رات کافی گئی ہے"۔ تھوڑی ہی دیر میں چچا کے خراٹوں کی آواز زینہ کے شور و ہنگامہ میں مل جل کر ایک عجیب خوفناک آواز پیدا کرنے لگی +

تپائی پر لالٹین جل رہی تھی۔ رشید کے سامنے کھڑکی کھلی تھی۔ مینہ کا ڈیرا کھڑکی کی کج سے ٹکرا رہا۔ اور ننھے ننھے چھینٹے رشید کے بستر تک پہنچتے تھے۔ جب رشید کے ہاتھوں اور چہرہ پر یہ چھینٹے پڑتے تو ایک برقی رَو اس کے سارے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ بجز مینہ کے جھگڑا مہ کے کوئی اور صدا کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تو کھڑکی کے پار کا منظر رشید کی آنکھوں کے سامنے صاف دکھلائی دے جاتا۔ دنی کا مکان اور اس کے آس پاس کے پھوس کے مکان بھیگے بگلوں کی طرح پر جوڑے کھڑے معلوم ہوتے۔ دنی کے مکان پر نظر پڑتے ہی رشید کی آنکھوں کے سامنے سیتلا کھڑی نظر آئی۔ سینما کی تصویروں کی طرح آن کی آن میں اس کی صدہا حرکتیں سامنے سے گزر گئیں۔ پھر اُسے سیتلا پیپل کے درخت کے نیچے گھونگھ بڑھاتے نظر آئی۔ اس نے دل میں کہا سیتلا یقیناً اس وقت مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر وہ زبان سے کچھ نہ بول سکی اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ کہ تم مینہ میں بھیگنے کے عادی نہیں ہو۔ جلد گھونگھ اوڑھ لو۔ نہ جانے کیوں اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کیا وہ بھی مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی؟۔۔۔۔ ضرور اگر حجاب کا پردہ حائل نہ ہوتا"۔ اس کا سلسلہ تخیل یہیں تک پہنچا تھا کہ دفعتاً بجلی کڑکی اور آنکھوں کو چکا چوندھ کر دینے والی بے پناہ چمک سے دنیا لمحہ بھر کو اٹھی۔ رشید کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی نظر کھڑکی کے باہر دنی کے مکان کے متصل جھونپڑے میں جا پڑی جس میں کئی گائیں اور بیل بندھا کرتے تھے۔ اس قیامت خیز کڑک سے بے زبان کے جانور اٹھ کھڑے ہوئے خوف سے ان کی گردنیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں اور سب پر لرزہ طاری تھا۔ جب رشید کا دل ذرا ٹھکانے ہوا۔ تو پھر خیالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب کی سیتلا کا تخیل آتے ہی رشید مسکرا دیا اور دل میں کہنے لگا "واہ میں بھی کہاں سے کہاں پہنچا۔ کہاں سیتلا اور کہاں میں"۔ ایک موہوم سی آواز اس کے کان میں آئی۔۔۔۔ "اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔۔۔۔ اس کا قد کتنا اچھا ہے۔۔۔۔ یقیناً خوبصورت ہے۔۔۔۔"۔ رشید نے کہا ہاں گدڑی میں لال بھی ہوتے ہیں۔ اس کو نیند آ چلی تھی۔ وہ سونا نہ چاہتا تھا۔ مگر ہوا کے ایک جھونکے نے اُسے تھپک کر سُلا دیا +

معلوم نہیں رات کتنی گئی تھی۔ ایک عجیب و غریب دھماکے نے رشید کو چونکا کر بستر پر بٹھا دیا۔ دھماکے کی آواز فضا میں ٹکرا رہی تھی۔ رشید کا سر چکرا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ چچا بھوکن بھی چٹائی پر سے سیدھے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ بڑھا کر ڈنڈا اپنے قبضہ میں کر لیا۔ رشید نے پوچھا "کیا ہوا؟" چچا بولے "ارے اسی نالاب کے کنارے والے تار گر گئے"۔ نیند کا اثر رشید کے دماغ سے ہٹ چکا تھا۔ ایکبار پھر بجلی چمکی اور رشید پر حقیقت کھل گئی وہ چیخ کر بولا "دنی کا مکان گر گیا"۔ چچا بولے "نہیں بیٹا دنی کا نہیں" رشید کمرہ سے نکل کر تیزی سے اس کے مکان کی طرف دوڑا۔ چچا نے لالٹین اٹھائی۔ اور "چلو چلو" کہتے ہوئے دوڑے۔ لوگ گھروں سے نکل نکل کر آ رہے تھے۔ راہ میں رشید کو ایک عورت اپنی طرف گھبرائی ہوئی آتی نظر آئی۔ رشید سے اس نے

کچھ کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھا۔ مگر اُس نے پہچانا کہ وہ ستیلا ہے۔ رشید دُنّی کے مکان کے پاس پہنچا۔ تو اُسے ایک نظر میں معلوم ہو گیا کہ کیا حادثہ ہوا ہے۔ گری ہوئی دیواروں کی سوندھی بو فضا میں پھیل رہی تھی۔ لوگ مٹی ہٹانے میں مصروف تھے۔ چچا بھوکن آس پاس والوں کو آوازیں دے رہے تھے +

(۵)

اس چھوٹے سے گاؤں میں رشید کی ہمدردی کا گھر گھر شہرہ تھا۔ گو یہی کہتے تھے کہ دُنّی تو مر چکا تھا۔ مگر رشید نے اُسے بچا لیا۔ رشید کو فوری طبّی امداد کے کچھ اصول معلوم تھے۔ اور اپنے پاس وہ چند خاص خاص دوائیں بھی رکھتا۔ جب تک دُنّی کو طبّی امداد نہ پہنچ سکی رشید نے فوری تدابیر سے اُسے سنبھالا۔ بعد میں جب ڈاکٹر آ گیا تو اس کا علاج باقاعدہ طور پر ہونے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دُنّی کے تمام زخم اچھے ہو گئے۔ مگر ایک پاؤں سے لنگڑا کر چلنے لگا۔ اس کو بھی لوگوں نے ہزار در جہ غنیمت سمجھا۔ اس کے بیٹے دار تو اُس کی زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جبتک دُنّی چارپائی پر پڑا رہا ستیلا اکثر رشید کو بلانے آیا کرتی تھی۔ رشید اُس کے گھر جا کر دُنّی کی حالت دیکھتا اور ضرورت کے مطابق ہدایتیں کر دیتا۔ رشید کی صورت دیکھتے ہی دُنّی اور اس کے گھر والوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔ ستیلا رشید سے باتیں کرنے میں کچھ زیادہ نہ جھجکتی تھی۔ دُنّی کا کتا جو عموماً سفید پوش شکلوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتا۔ اور اکثر رشید اور اس کے دوستوں پر بُری طرح ٹوٹا کرتا تھا۔ اب اُس کو بیگانہ تصوّر نہ کرتا تھا۔ بلکہ جب وہ غنودگی کے عالم میں ہوتا تو دوسرے سفید پوش راہبروں کو بھی رشید کے دھوکے میں چھوڑ دیا کرتا +

دُنّی کے گھر کچھ مہمان آئے تھے۔ ستیلا پانی لینے کنواں پر نہ آئی۔ بلکہ اُس کی ماں پانی لے جاتی رہی۔ رشید نے اپنی بیٹھک پر سے دیکھا کہ ستیلا نئے کپڑے پہنے اپنے گھر کے پچھلے حصّہ سے گائے بیلوں کو سانی دینے آئی اُس نے گلے اور ہاتھ میں کچھ زیور پہن رکھے تھے۔ جن کی جھجھناہٹ رشید کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ جب کبھی اُس کے سر سے آنچل سرک جاتا تو اُس کی سیند وریھری مانگ دور سے جھلک جاتی۔ اُس کے بازوؤں سے زیور کے سرخ ڈورے لٹکتے تھے۔ بیلوں کو سانی دیتے وقت وہ اپنے کپڑوں اور زیوروں کا کچھ خیال نہ کرتی تھی۔ آج وہ کام میں بیحد منہمک تھی۔ جھک کر جانوروں کو بڑی محبت سے کھلا رہی تھی۔ باری باری سے سب جانوروں کے بیٹھ اور منہ پر ہاتھ پھیرتی اور جانور پریم بھری نگاہوں سے گردن ٹیڑھی کر کے اُس کی طرف دیکھتے۔ اور زبان سے اُس کا ہاتھ چاٹتے۔ باسمو مودی کے یہاں جاتے ہوئے کئی بار ستیلا رشید کے پاس سے گذری۔ اُس کی نگاہیں ہر دفعہ زمین پر گڑی رہیں۔ رشید نے محسوس کیا کہ وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی ہے +

(۶)

شام ہونے کے قبل ہی چچا بھوکن اپنے سارے ڈھور ہانکے چراگاہ سے واپس آ گئے۔ اور سب کو اُن کے ٹھکانے کر دیا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے رشید گھر سے روانہ ہوا۔ اُس کے دوست سب ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک کھیت کی مینڈ پر چچا بھوکن بھی انتظار میں کھڑے تھے صغیر نے پوچھا "کہاں غائب ہو گئے تھے چچا۔ رشید بچارے جا رہے ہیں۔ ہم نے تو سمجھا کہ جاتے وقت آپ ملاقات بھی نہ کریں گے"۔ چچا بولے "ارے دوگاہ میں گائیں باندھ کے جو نکلا تو ستیما پکار رہا تھا۔ اُس کے یہاں گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی گائے اُچٹ گئی ہے۔ دودھ دوہنے نہیں دیتی۔ اسی گڑبڑ میں بچارے کے پاؤں پر گھر رکھ دیا۔ سیلی باندھ کے دو سونٹے جو رسید کئے تو درست ہو گئی" اُس کے پاؤں میں ہلدی چونا لگوا آیا ہوں۔ بیٹا اتنی جلدی کا ہے کو جا رہے ہو۔ ابھی گاڑی آنے میں بڑی دیر ہے" صغیر نے کہا "نہیں چچا پہلے پہنچ جانا اچھا ہے"۔ چچا بولے آج دُنّی کا سمدھی آیا تھا۔ ستیلا کی فصتی کرا کے اسی گاڑی سے لے جاتا ہے۔ ہم نے کہا رشید بیٹا بھی جا رہے ہیں۔ چلو سب کو پہنچا آئیں +

کاشی چک اسٹیشن میں رات کے نو بجے پورب سے بھی گاڑی آتی ہے اور پچھم سے بھی۔ پہلی گھنٹی ہو چکی تھی۔ گاڑی اسٹیشن سے چھوٹ چکی تھی۔ بہت سے کسان گھنٹی سنتے ہی سر پر بوجھ اُٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ رشید اسی گاڑی سے جانے والا تھا۔ صغیر اور رشید پلیٹ فارم پر جو در اصل پلیٹ فارم نہ تھا۔ ٹہل رہے تھے۔ چچا بھوکن۔ دُنّی۔ اس کا سمدھی اور دوسرے آدمی حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ جس گاڑی سے ستیلا جانے والی تھی اُس میں ابھی دیر تھی۔ رشید نے دیکھا کہ مردوں سے الگ روشنی کے کھمبے سے لگی ستیلا کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ بیحد اداس نظر آیا۔ رشید نے محسوس کیا کہ وہ گھر سے چلتے وقت بہت روئی ہے۔ اور راستہ بھر روتی آئی ہے۔ اُس کی ماں بھی گٹھری لئے وہیں بیٹھی تھی۔ رشید کئی بار ستیلا کے پاس سے گذر گیا۔ ایک بار جب اُس کے قریب پہنچا تو ستیلا نے نہایت شگفتگی سے پوچھا "آپ بھی جا رہے ہیں"۔ پھر یاس و امید بھری نگاہوں

سے رشید کو دیکھنے لگی۔ رشید نے ٹرک کر جواب دیا "ہاں میں بھی جا رہا ہوں"۔ سیتلا نے پھر فوراً پوچھا "کہاں؟"..... رشید نے کچھ سوچکر جواب دیا..... "قید خانہ" سیتلا کے چہرہ پر ایک اداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے پوچھا "سچ بتائیے کہاں جا رہے ہیں؟" رشید نے مسکرا کر کہا..... "پڑھنے" اتنے میں گاڑی کی روشنی دور سے دکھلائی پڑی چچا بھوکن گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے..... "وہ آگئی گاڑی"..... "اے منگرا..... منگرا..... کدھر گیا۔ ارے دوڑ گاڑی آگئی..... ہائے سوَر کدھر گیا..... بٹیا رشید۔ رشید میاں!..... لو گاڑی آگئی۔ جاؤ بیٹا..... وہ آگیا منگرا" پھر ڈپٹ کر بولے "لے بیٹا بکس وکس اٹھا۔ پھرتی سے چڑھا دیجیو، گاڑی بہت کم ٹھیرتی ہے۔ دُنی!..... اے دُنی بکس کٹوالو۔ تمہاری گاڑی بھی اب پورب سے آیا چاہتی ہے۔ بیٹا رشید لوٹے دوئے میں پانی ہے؟ لاؤ لاتا ہوں... لوٹا لے کر پانی لانے دوڑے۔ اتنی میں گاڑی آگئی۔ دو منٹ کی گڑبڑ کے بعد سب سوار ہو چکے تھے۔ رشید قلی کو انعام دے کر دروازہ کی دونوں سلاخیں پکڑ کے کھڑا تھا۔ سب لوگ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک کنارے سیتلا بھی تھی۔ چچا بھوکن نے عمر بھر میں آج سب سے زیادہ پھرتی کا کام کیا تھا..... لوٹے میں پانی لاکر رشید کو دیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ جبتک گاڑی آہستہ چلتی رہی چچا بھوکن ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ جب ان کی ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا تو کھڑے ہو کر بولے "بیٹا دروازہ بند کر لو..... بڈھے کو بھولیو مت..... خیر صلاح لکھیو" رشید نے کہا بہت اچھا..... خدا حافظ۔

گاڑی دور نکل گئی تھی۔ سیتلا گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے..... چچا بھوکن سانس بھرتے ہوئے بولے:-

"بیٹی رو مت ایک مہینہ بعد دُنی جا کر تجھے لے آئے گا"

(خاص) **محمد رافع الہدیٰ**

"بہار"

فصلِ بہار آئی۔

بڑ کے گہنوں پر ننھی ننھی سبز کونپلیں اگنی شروع ہوگئیں۔

پیپل پر سرخ سرخ پیپلیوں پر طوطے شور مچانے لگے۔

اور رس بھرے غنچوں نے شہد کی مکھیوں کو دعوت دینی شروع کر دی۔

گل لالہ جا و سیمیں پر اپنے رنگوں کی بہار دکھانے لگے۔

جھیل کے کنارے سفید و سنہرا بگلا کی نازک پتیاں چمک رہی ہیں

— فصلِ بہار آئی —

مرغانِ آبی اپنے پروں کی مسلسل جنبش سے ہوا میں ارتعاش و اضطراب پیدا کرنے لگے۔

نیلی نیلی پہاڑیوں پر جنگلی گلاب کے گرد ننھی تتلیاں اپنے ارغوانی رنگوں کے ساتھ فضا میں متحرک ہونے لگیں۔

غرض فصلِ بہار آگئی۔

کملا ناتھ والے مندر کے مقدس پائین باغ میں مخدوم ہوئی کرشنا نے اپنی نسری میں "محبت" اور "بہار" کے شیریں نغمے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔

غرض فصلِ بہار آگئی۔ (ترجمہ)

ظفر قریشی دہلوی

انشائے لطیف

بنگالی اور گجراتی کے دو شاہکار

پگ ڈنڈی

(ٹیگور بنگالی)

(۱)

جنگل سے ہوتی ہوئی میدان میں آئی ہے۔ میدان سے ندی کے کنارے گھاٹ کے پاس بڑھ کے درخت کے نیچے سے پھر ندی کے اُس پار ٹوٹے ہوئے گھاٹ کے پاس سے بل کھاتی ہوئی گاؤں میں چلی گئی ہے +

السی کے کھیت کے کنارے کنارے، آموں کے باغیچے کے سائے میں سے ہوتی ہوئی، کنول تالاب کا پہلو کاٹ کر، کسی گاؤں میں جا نکلی ہے، معلوم نہیں +

کچھ لوگ میرے پاس سے گذر گئے ہیں۔ کچھ میرے ساتھ ہو لئے۔ کوئی دور سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اکیلے سے منہ چھپائے آرہی ہے۔ کوئی پانی بھرنے جا رہی ہے۔ اور کوئی بھر کے واپس آرہی ہے +

(۲)

دن ختم ہو چکا ہے اور اندھیرا چھا رہا ہے +

ایک دن میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ راہ میری ہے فقط میری۔ آج دیکھتا ہوں کہ صرف ایک ہی دفعہ اس راہ پر سے گذرنے کی اجازت ہے۔ دوسری بار نہیں +

لیموں کے درختوں کے جھنڈ کے پاس سے گذر کر، اس تالاب کے کنارے بارہ دیوتاؤں کی گھاٹ، گوالا کا گھر اور وہ چاول توشہ خانہ پار کر کے ان آشنا نگاہوں جانی پہچانی گفتگو اور دیکھے بھالے چہرے والوں کے یہاں واپس جا کر نہ کہہ سکوں گا۔ یہ لو میں لوٹ آیا۔ یہ راہ جو آگے چلنے کی راہ ہے، پھر آنے کی راہ نہیں +

(۳)

اے راہ!

گذرے ہوئے زمانوں کی اُن سکاہتوں کو تو اپنی اس خاکی گرفت میں یوں زبان بند کر کے نہ رکھ میں تیری خاک پر کان لگائے ہوں، میرے کان میں کہدے؟

راہ شب کے پردہ تاریک سے انگشت اشارہ برسائے خاموش ہے۔

اے پاؤں چلنے کی راہ!

ان سب مسافروں کی وہ آرزوئیں، ان کی فکریں، ان کی تمنائیں کیا ہوئیں؟

راہ خاموش ہے اور فقط مشرق سے لیکر مغرب تک ایک اشارہ کئے ہے +

اے راہ! تیرے سینے پر وہ قدم جو کبھی پھولوں کی طرح برستے تھے، آج انکا کیا ذکر تک بھی نہیں؟

کیا راہ کو خود اپنی ہی انتہا کی خبر ہے؟ جہاں مرجھائے ہوئے پھول اور خاموش شدہ نغمے پہنچ جاتے ہیں، جہاں ستاروں کی روشنی میں ابدی درد کی محفل چراغاں صدا قایم ہے۔ (وہیں اسکی بھی انتہا ہے) [ترجمہ از بی بی کا ٹیگور]

مدتوں کے فراموش شدہ قدموں کے نقوش کی ایک نظم دیکھی بھیڑی سر میں بندھی ہوئی!

اس عرصہ میں جسقدر مسافر اس راہ پر سے گذرے ہیں اُن کی زندگیوں کی حکایتوں کو اس راہ نے اپنے ایک ہی خط غبار میں لاکر کھینچ دیا ہے۔ یہی ایک لکیر چلی ہے مشرق سے لیکر مغرب تک۔ ایک دروازہ سے لیکر جس پر سونے کا شیر کھڑا ہے دوسرے دروازہ تک +

نومبر ۱۹۳۰ء

آئینہ کے سامنے

نیر

نیرنگ خیال

(گجراتی)

دہلی کے لاہوری دروازہ کے قریب ایک شاندار کوٹھی میں ایک پچیس سالہ نوجوان بیٹھا ہوا آج ہی خریدے ہوئے آئینہ میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا۔ جوانی کا عالم، دولتمند کا بیٹا، تر کی نژاد اور قدرت کا جنسہ داری سے عطا کیا ہوا قوی اور سڈول جسم اس تناسب اعضا سے نوجوان کا چہرہ حقیقتاً دلکش معلوم ہوتا تھا۔ اور آپ اپنا شیدا ہو کر آئینہ میں اپنی حسین صورت کو بار بار دیکھتا تھا۔ اس نے آئینہ میں اپنے محبوب عکس کو ایک شیریں اور طویل بوسہ دیا۔ اپنی اس حرکت کو کوئی دیکھتا تو نہیں؟ یہ جاننے کے لئے اس نے مڑ کر پشت کی جانب نگاہ کی +

تشنہ، پراز موسیقی اور برق وش نگاہ سے ایک مست شباب حسینہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً آئینہ ہاتھ سے رکھدیا سنبھلا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے پھر نگاہ پھیری تو وہ بجلی کی تڑپ کی طرح نظروں سے اوجھل تھی ——— وہی اور کون؟ آسمانی دوپٹے والی۔ اس کی ہمسایہ "میمونہ" اس وقت کسی کام سے کھڑکی تک آئی ہوگی +

سہانی اور دلکش صبح کو جلدی اٹھ کر اپنے پائیں باغ میں وہ گشت کر رہا تھا۔ گلاب کی پتیوں پر شبنم کے جڑے ہوئے موتی دیکھ دیکھ کر بشاش ہو رہا تھا۔ مطلع بالکل صاف تھا اور زمین گلریز بنی ہوئی تھی۔ ناگہاں اس کی نگاہ سامنے کے مکان پر پڑی۔ آئینہ کے سامنے زیر لب تبسم کرتی ہوئی "میمونہ" اپنے بال سنوارتی ہوئی نظر آئی۔ یہ تبسم اس کو دیکھ کر کیا گیا تھا۔ اس کے اپنے لئے تھا۔ اس خیال سے وہ پھولوں کے پودوں کو روندتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کا چیستر پھول کی پنکھڑیوں کو بیدردی سے بکھیر رہا تھا۔ آج وہ اپنی روح میں ایک نئی تازگی اور قلب میں ایک عجیب مگر پر لطف ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ آج "میمونہ" اس کو دیکھ کر متبسم ہوئی تھی۔ فرطِ انبساط اور نشۂ موسیقی سے مست آگے بڑھ رہا تھا +

نیچے راہ میں کھڑا ہوا شخص "میمونہ" سے باتیں کر رہا تھا۔ اور "میمونہ" ذوق ہم کلامی سے لذت اندوز ہو کر مسکرا رہی تھی +

نسیم صبح اپنی بھینی بھینی خوشبو سے فضا کو معطر کر رہی تھی۔ لیکن وہ اپنی خیالی لذت اندوزیوں سے ہوش میں آیا ہی نہیں۔ جو کچھ دیکھا تھا وہ سب صحیح تھا۔ تاہم "میمونہ" کا تبسم اس کے اپنے لئے ہی تھا۔ اس خیال کو بھی اسیقدر مستحکم اور درست سمجھ رہا تھا +

عرصہ گذر چکا ہے۔ ابتک کوئی نئی بات ظہور پذیر نہیں ہوئی لیکن تاہنوز وہ "میمونہ" کی خیالی تصویر کی پرستش کرتا ہے +

ایک روز دوپہر کو اس نے چنبیلی کا تیل سر میں ڈالا تھا۔ بال سنوارے ہوئے تھے۔ پان کھانے سے لبوں پر سرخی نمایاں تھی۔ آنکھوں میں مستی۔ سر میں نشۂ شباب اور جسم کے ہر عضو اور رگ و پے میں "عشق" ساری وطاری تھا۔ اس نے پھر آئینہ ہاتھ میں لیا۔ اس آئینہ میں اس کی شکل کیسی حسین کسقدر بھلی معلوم ہوتی تھی۔!!! معجزۂ دلکشی!

اس نے اپنی صورت بار بار دیکھی اور ——— آخر خود ہی بے ساختہ پیار آنے والی اپنی صورت کو بوسہ دیا۔ آئینہ لبوں سے دور کیا۔ گو۔۔۔۔ گو۔۔۔۔ یہ کیا؟ اس پر حیرانی و سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ آئینہ لبوں سے ہٹاتے ہی اس میں "میمونہ" کی دلکش صورت اس نے دیکھی! آئینہ میں جہاں لبوں اور تنفس سے تازہ نمی نمودار ہو گئی تھی۔ عین اس کے نیچے "میمونہ" کے آتشیں رخسار اور دو سیاہ ابرو تھے +

آج اس نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کا قصد نہ کیا۔ بدستور اسی حالت میں آئینہ لئے بیٹھا رہا۔ لمحہ بھر کے بعد "میمونہ" مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ اب اس نے آئینہ سے نظر ہٹا کر جہاں سے آئینہ میں یہ عکس پڑتا دیکھا۔ سامنے کے مکان میں "میمونہ" کھڑکی سے واپس جا رہی تھی۔ وہی آسمانی دوپٹہ اور

برق کی ایسی شوخی +

آئینے میں ایسا محو نظارہ تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ "میمونہ" نے اُس کے جسم کو مس کیا۔ ایک ناقابل بیان ارتعاش محسوس کیا۔ اور وہ آئینے کی نمی! آج وہ نمی اس کو زیادہ دلکش نظر آتی تھی۔ اُس نمی میں ایک روح تھی، سیمیقیت تھی۔ اگر بس چلتا تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کو محفوظ کر لیتا +

بہت روز یونہی گذر گئے۔ آئینہ لے کر اس طرح بیٹھنا اُس نے اپنا معمول بنا لیا مگر..... جو مسکراہٹ وہ اپنے لئے تصور کرتا تھا وہ کسی اور ہی کے لئے تھی۔ پھر بھی وہ اس خواب کو واقعہ ہی سمجھتا رہا +

"میمونہ" کو تو اس خواب کو یقینی سمجھنے والے شخص کی خبر ہی نہ تھی۔ اس طرح بہت دن گذر گئے +

ایک روز وہ آئینہ لیکر میمونہ کا انتظار کر رہا تھا لیکن آج نہ سامنے کے مکان کی کھڑکی کھلی اور نہ "میمونہ" کی دھن میں اور تصور میں ایک عرصہ سے مقصود نگاہ عکس آئینہ کو دیکھنے کا وہ عادی ہو گیا تھا۔ اس لئے اپنا چہرہ دیکھنا بھول گیا تھا۔ آج چونکہ "میمونہ" کا عکس نظر نہ آیا تھا۔ ایک آہٹ سی ہوئی اور یونہی سی نظر اپنے چہرے پر پڑ گئی +

مگر اُس کی تنقیدی نظر غیر مکمل ہی رہی۔ وہ کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا اور ناگہانی طور پر برق خاطف کے گرنے سے کوئی پریشان ہو جائے۔ یوں وہ حیران ہو کر آئینہ کو دیکھنے لگا +

آئینے میں اُس کا اپنا عکس جلوہ فگن تھا!

لیکن بجائے اپنی اگلی سی رعنائی و خوبی و بھرے ہوئے رخساروں کے اُس میں بے حجاب شخص کی بدنما اور کریہہ منظر صورت منعکس تھی +

اُس کا جسم مرتعش ہونے لگا۔ جانکنی کی حالت میں پڑا ہوا کوئی شخص جس طرح زندگی کے لئے جدوجہد کر رہا ہو، یوں وہ ادھر سے اُدھر اپنی گم شدہ جوانی اور رعنائی کو ڈھونڈھنے کے لئے آئینے تلاش کرنے لگا۔ جو آئینہ ہاتھ آیا۔ فوراً اُس میں اپنی صورت دیکھی۔ اُس میں ایک بدنما نحیف، قبل از وقت ضعیف، خفیف جھرّیوں والی..... ایسی بے رونق صورت نظر آئی

دھم سے ایک دھماکے کی آواز آئی اس نے غصہ سے آئینہ پھینکدیا +

تو کیا وہ حقیقت میں ایسا بدشکل ہوں؟ اس نے پھر اپنے اس پرانے رفیق آئینے کو اٹھا کر دیکھا۔ مگر آئینے نے تو وہی بدنما شکل پیش کی +

عین اُس وقت سامنے کے مکان میں "میمونہ" نظر آئی۔ اُس نے اپنی شگفتہ اور دائمی تبسم صورت آئینے میں دیکھی +

..... مگر یہاں اُس نے زور سے آئینہ زمین پر دے مارا +

تڑاق سے ایک آواز پیدا ہوئی۔ اور آئینہ چور چور ہو گیا۔ اُس کے ٹکڑوں کو کچلتا ہوا اندر کمرے میں چلا گیا اور

"میں اپنا گیا ہوا حسن، شباب اور رعنائی واپس لے ہی آؤں گا" +

ایک مستقل اور پختہ عزم کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر دیا +

(ترجمہ از گجراتی)

(خاص)

"بالم"

دلچسپ ناول و افسانے

سیلاب خون۔ حجم ۳۰۴ صفحات	قیمت عہ	زندگی کی صبح و شام۔ دس دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔	قیمت عہ
اسرار بالشوزم۔ حجم ۱۵۰ صفحات	قیمت ۱۲ر	طوفان زندگی " " " "	" عہ
حکایات شرلاک ہومز۔ جاسی افسانے	قیمت عہ	درس عبرت گیارہ " " "	" عہ
سیر گل۔ جلیل احمد قدوائی کی لاجواب تصنیف	قیمت عہ	تصویر معاشرت نو دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔	قیمت عہ
عروج زندگی دس دلچسپ افسانوں کا مجموعہ	قیمت عہ	ملنے کا پتہ:-	

منیجر نیرنگ خیال، مکڈونلڈ روڈ شاہی محلہ لاہور

ننھے کی یادگار

(افسانہ)

اُنہوں نے مُسکرا کر کہا" اولاد نرینہ اگر ہوئی تو تم سے بطور یادگار ایک ہیرے کی انگوٹھی لونگی۔ اور اگر لڑکی پیدا ہوئی تو تمہیں ایک سنہری گھڑی دونگی۔ کیوں یہ شرط منظور ہے نا؟"

گویا میں ان کی سعی میں برابر کا شریک ہوں۔ لیکن اگر اُنہوں نے زیادہ سرگرمی دکھائی اور نرینہ اولاد پیش کر سکیں تو بطور انعام ایک ہیرے کی انگشتری کی مستحق ہونگی۔ اور اگر میری کوشش بار آور ہوئی اور لڑکی پیدا ہوئی تو میری کامیابی کی یادگار کے طور پر وہ مجھے ایک سنہری گھڑی عنایت کرینگی +

یا یوں سمجھئے کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ میری رفیقۂ حیات نے اس کی تکوین و تخلیق میں خاص جد وجہد صرف کی ہے۔ اس لئے وہ انعام کی مستحق ہیں۔ اور اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی مساعی میں کوتاہی کی اس لئے وہ جرمانہ کی سزاوار ہیں۔ جسے ایک سنہری گھڑی کی شکل میں ادا کرینگی۔ یہ اور بات ہے انگوٹھی کی طرح گھڑی کی قیمت بھی مجھے اپنے ہی جیب سے ادا کرنی ہوگی +

کس قدر مضحکہ خیز اور کتنا ناقابل برداشت معاہدہ ہے۔ مگر وہ مُسکرا رہی تھیں اور اُن کی مسکراہٹ دنیا بھر کے سارے جواہرات اور تمام سُنہری گھڑیوں کی مجموعی قیمت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے مرمریں بازو میری گردن میں حائل کر دیئے۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا" میری پہلی ولادت کی بہترین یادگار رہی ہو سکتی ہے.....!

گویا انگوٹھی یا گھڑی بطور یادگار ہمیشہ باقی رہے گی اور بچہ خدا نخواستہ.....!

.....

قدرت کے کارندے اکثر ان ہی کی پاسداری کرتے ہیں۔ یہ بازی بھی اُن ہی کے ہاتھ رہی۔ اور ننھے کی یادگار ہیرے کی انگوٹھی مجھے خریدنی پڑی۔ انگوٹھی بہت بیش قیمت تھی۔ اس لئے لازمی طور پر اُنہیں تمام زیورات سے بلکہ ننھے سے بھی زیادہ محبوب تھی۔ خاندان بھر کی عورتوں نے اسکی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر اُسے اور بھی قیمتی بنا دیا تھا۔ وہ کسی رشتہ دار کے ہاں سے واپس آتیں تو ان کی زبانی انگوٹھی کے متعلق دوسری خواتین کی مدح سرائی سُننے کے لئے مجھے اپنے عزیز ترین وقت کا ڈیڑھ دو گھنٹہ ضرور صرف کرنا پڑتا +

ایک دن انگوٹھی گم ہوگئی.....

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہیں نسیان کا مرض ہے یا وہ بے سلیقہ واقع ہوئی ہیں۔ خدا کے فضل سے وہ بے حد بیدار مغز ہیں۔ اور میں اس حقیقت کا اعتراف کچھ اس خوف سے نہیں کر رہا ہوں کہ اشاعت کے بعد وہ یہ قصہ پڑھیں گی تو مجھے اور میری وجہ سے ننھے کو مشق ستم بننا پڑے گا۔ بلکہ واقعہ یہی ہے اور میں اپنے احباب سے بھی بارہا اس کا اعتراف کر چکا ہوں یہ اور بات ہے کہ وہ میری رطب اللسانی کو محض اپنے جوش گریہ اور طغیان غضب کا ثمرہ قرار دیتی ہیں۔ بہرحال وہ جیسا کچھ بھی خیال کریں میں نے اُن کے متعلق یہ رائے قایم کی ہے کہ حکومت ہند خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے اُن کی خدمات حاصل کرلے تو ملک سے سازش اور شورش کا نام و نشان مٹ جائے +

انگوٹھی گم ہوگئی لیکن مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ وہ میرے کتب خانہ میں گئیں اور ایسی ساری کتابیں اپنے کمرہ میں اُٹھا لائیں جن میں پولیس کے کارنامے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے واقعات اور اکتشاف جرائم کے طریقے درج تھے +

دو تین چار دن گزر گئے۔ وہ انگوٹھی کا سراغ نکالنے کے لئے فن سراغرسانی کے دقیق ترین معلومات جمع کر رہی تھیں۔ معلومات کا کافی ذخیرہ جمع ہوگیا تو ان کی روشنی میں تفتیش شروع ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہو رہا

تھا۔ مگر میں ابتک بے خبر تھا +

کتابیں اپنی جگہ پر رکھدی گئیں۔ اب ساری کتابوں کا ماحصل اُن کی نوٹ بک میں موجود تھا۔ اُنہوں نے خفیہ پولیس کی مشہور ترین شخصیت کا پارٹ ادا کرنا شروع کردیا۔ جس صندوقچہ میں انگوٹھی کی ڈبیہ رکھی ہوئی تھی اُس کی ہر پوزیشن کا فوٹو لیا گیا۔ اس پر جو نشانات تھے ان کا دونوں خادموں کی انگلیوں اور ہتھیلی کے نشانات سے مقابلہ کیا گیا۔ ایک کاغذ پر نوٹ کیا گیا کہ انگوٹھی کب اور کس طرح اُتاری گئی۔ صندوقچہ آخری بار کب کھولا گیا۔ اس وقت کمرے میں کون موجود تھا۔ کواڑوں کے درز اور روشندان کی جالی سے اندر کی کیفیت کہاں تک دیکھی جاسکتی ہے۔ کتنی دور پر کھڑے ہوکر کوئی صندوقچہ کھولنے کی ترکیب سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ آخری بار انگوٹھی رکھنے کے بعد رشتہ داروں میں سے کون کون ہمارے گھر میں اور کون اس کمرہ میں آیا۔ گذشتہ چار پانچ دن محلہ میں اور اقارب میں کس کے ہاں مسرّت کا اظہار ہوا۔ خادم اور خادمہ کے طرز عمل میں اس دوران میں کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ کسی میں اندازِ استغنا پایا جاتا ہے یا نہیں۔ خادم کے کن عورتوں سے تعلقات ہیں اور خادمہ کے کن مزدوروں سے +

اسی طرح تحقیق جاری تھی۔ خادموں پر پے در پے مبہم سوالات کی بوچھاڑ ہورہی تھی۔ اُن کے اور رشتہ داروں کی ہر حرکت کی نگرانی کی جارہی تھی۔ مگر یہ سب کچھ رازدارانہ ہورہا تھا۔ اُنہیں خوف تھا کہ مجھے اس کی خبر ہوگئی تو صدمہ سے شاید میری روح پرواز کرجائے گی +

افسوس ہے کہ انہیں اس مہم میں شاندار ناکامی ہوئی۔ انگوٹھی کا سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ سینگلز۔ کارٹر اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور سراغ رساں تو الگ رہے۔ اس مہم میں وہ شیخ عبدالعزیز بھی ثابت نہ ہوسکیں۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر اُنہوں نے اپنی ملنے والیوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں بالاتفاق آرا یہ تجویز منظور ہوئی کہ کسی عامل کامل سے نام نکلوایا جائے +

ایک عامل صاحب جو شہر میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ ایسے وقت بلائے گئے کہ میں دفتر گیا ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا۔ عامل صاحب عورتوں کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔ ان کے بالمقابل ان کا معمول لڑکا بیٹھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ تھا۔ عامل صاحب نے مرعوب کن لہجہ میں دعا یا منتر پڑھنا شروع کیا۔ وہ پے در پے زمین پر ہاتھ مار رہے تھے اور لڑکا پانی بھرے پیالہ میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ عامل صاحب نے اُس سے پوچھا کوئی نظر آرہا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا۔ جی ہاں ایک شخص!

عامل صاحب نے حکم دیا۔ اس سے کہو جھاڑو دیکر باہر چھڑک دے! لڑکے نے حکم کی تعمیل کی +

اسی طرح متعدد جن، بھوت، یا شیطان یا آپ اور جو کچھ سمجھ لیں۔ پیالہ کی دنیا میں ظہور پذیر ہوتے رہے۔ آخر میں جب جنوں کا بادشاہ حاضر ہوا۔ تو انگوٹھی کے متعلق سوالات شروع ہوئے۔ عورتیں سانس روک کر ہمہ تن لڑکے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ جنوں کا بادشاہ چلا گیا اور پیالہ میں عالم مثال کا عکس نظر آنے لگا۔ لڑکے نے کہا "کمرہ کے ایک گوشہ میں فلاں قسم کا صندوقچہ رکھا ہوا ہے۔۔۔۔ ایک عورت (جو بیان کردہ حلیہ کے مطابق میری خادمہ ہوسکتی تھی) کمرہ میں داخل ہوئی۔۔۔۔ وہ صندوقچہ کھول رہی ہے، اُس نے ایک روپہلی ڈبیہ کھولی۔۔۔۔ اس میں سے انگوٹھی نکال لی۔۔۔۔ اسے اُس نے اپنی چوٹی کی جڑ میں چھپالیا۔۔۔۔ وہ کمرہ سے نکلکر اپنے آشنا رشید کے گھر جارہی ہے۔۔۔۔ انگوٹھی اُسے دے دی۔۔۔۔ رشید نے اُسے اپنے گھر کے شمال مغربی حجرہ میں دفن کردیا"+

عامل صاحب نے اپنا فریضہ باحسن اسلوب ادا کردیا۔ حسب وعدہ پچاس روپے نقد گن دئے گئے۔ اور وہ یہ فرماتے ہوئے تشریف لے گئے کہ اگر خادمہ نے رشید سے انگوٹھی نہ لادی تو مجھے پھر یاد کرلینا۔ اس پر ایک جن مسلّط کردونگا +

عامل صاحب کی روانگی کے بعد عورتوں کی مجلس اس امر پر غور کرنے لگی کہ خادمہ کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہ وہ انگوٹھی خود بخود لاکر دیدے۔ اور اگر وہ یہ نہ کرے تو رشید کی خانہ تلاشی کس طرح کرائی جائے۔ کہ مجھے خبر نہ ہو اور انگوٹھی برآمد ہوجائے +

اس مجلس کی خواتین میں میری بیوی ہی سب سے زیادہ عقلمند اور زکی خیال کی جاتی تھی مشکل ہی سے کوئی خاتون اُنہیں مشورہ دینے کی ہمت کرسکتی تھیں۔ اس لئے مجلس پر خاموشی طاری تھی۔ آخر میری بیوی ہی نے سبقت کی۔ اُنہوں نے کہا کہ اُن کے آنے کا وقت قریب ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔ میں نے ترکیب سوچ لی ہے۔ کل آپ تن

کہ خادمہ نے انگوٹھی اپنی جگہ پر رکھ دی!
مجلس ختم ہوگئی اور خواتین اپنے اپنے گھر چلی گئیں +
دوسرے دن کانفرنس پھر منعقد ہوئی +
خادمہ برابر قسمیں کھا رہی ہے کہ اُس نے کبھی صندوقچی کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے +
"ظاہر ہے کہ جھوٹ بول رہی ہے۔ جنوں کے بادشاہ نے اسکا نام بتایا ہے۔ جو کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتے" +
خادمہ ایک مجرم کی طرح میری بیوی کے سامنے کھڑی ہے۔ میری بیوی ایک غضبناک شیرنی کی طرح اُس پر حملہ کر رہی ہے۔ کبھی بیدوں کا مینہ برسنے لگتا ہے۔ کبھی اتنے زور سے چٹکی بھری جاتی ہے کہ وہ غریب "سملاً اُٹھتی ہے۔ وہ فرطِ الم سے بیہوش سی ہو کر گر جاتی ہے تو ٹھوکروں کی باری آتی ہے۔ مگر ساری تدبیریں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ وہ لگاتار قسمیں کھا رہی ہے اور پیہم انکار کر رہی ہے۔۔۔۔۔

میری بیوی نے کہا۔ میں تجھے آخری موقعہ دیتی ہوں۔ فوراً اقرار کرلے ورنہ ابھی پولیس اور فوج آکر تجھے ہتھکڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ لیگی۔ دیکھ جلد اقرار کرلے ورنہ جیل والے تجھے مُشکی سے باندھ کر بیدوں سے تیری بٹیا اُدھیڑ دیں گے اور تو کتوں کی موت مر جائیگی۔ رشید تیرے کسی کام نہ آسکیگا۔ ابھی وقت ہے۔ ورنہ معاملہ پھر میرے اختیار میں بھی نہ رہیگا"

خادمہ کے جواب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔ اور سخت ترین قسمیں کھا رہی تھی کہ انگوٹھی کے متعلق اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں "مگر یہ بات بھلا ماننے کی ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جنوں کا بادشاہ جھوٹا ہو اور یہ سچی!"

میری بیوی کا ترقی پذیر تجسّر اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ وہ ٹیلیفون پر گئی اور کوتوال شہر کو صورت حال سے مطلع کر کے اُن سے درخواست کی کہ پچاس مسلح سپاہیوں کے ساتھ فوراً تشریف لائیں +

میں دفتر سے واپس آیا تو اپنے دروازے پر ایک پولیس مین کو دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کنڈی بجانے لگیں اور جمعدار سے کوئی بات پوچھے بغیر مجھے اندر کا رُخ کرنا پڑا۔ مجھے سوال کا موقعہ نہ دیتے ہوئے اُنہوں نے رو رو کر انگشتری کی گمشدگی کا واقعہ اور اس کے متعلق اپنی بدقسمتی کی پوری داستان سُنائی۔ اُن کی غیر معمولی دانشمندی کی داستان سُن کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں اُنہیں کوئی جواب دیئے بغیر جمعدار کے پاس آیا اور اُس سے کہا "جناب میرا خواہ کتنا ہی نقصان ہو جائے میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرا یا میرے خاندان کے کسی شخص کا نام پولیس کے رجسٹر میں درج ہو۔ میں اپنے نقصان سے دستبردار ہوتا ہوں۔ آپ کرم فرما کر تشریف لے جائیں" +

اُس نے جواب دینا چاہا "لیکن۔۔۔۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ لیکن کیا! آپ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں۔ آپ جیسے "آفیسروں" کے لئے یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آپ کی شرافت سے مجھے توقع ہے کہ ایک غریب کو کوتوالی کے تانے بانے سے بچانے میں دریغ نہ کریں گے +

جمعدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ بہتر میں کوشش کرونگا +

اس کے بعد وہ تشریف لے گئے۔ اور میں گھر میں آیا۔ میرا ایٹنگ روم خاصا آل انڈیا وطن کانفرنس کا پنڈال بنا ہوا تھا۔ میری بیوی صاحبہ پولیس کے خلاف زور شور سے تقریر فرما رہی تھیں۔۔۔ "کوتوال نے اپنے فرائض سے مجرمانہ بے پروائی برتی۔ اس نے میرے جذبات کی توہین کی۔ اس نے اس کا اندازہ کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میری انگوٹھی کتنی قیمتی اور تاریخی حیثیت سے کسقدر اہمیت رکھتی تھی۔ اس کے بجائے اگر میں کوتوال ہوتی تو ایسے مواقع پر چھاؤنی خالی کرا دیتی۔ میں نے اس سے سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔ مگر اُس نے ایک جمعدار بھیج دیا۔ اُس کا یہ مذاق کسقدر زہرناک اور ناقابل برداشت ہے۔۔۔۔۔

میں نے کہا۔ بہتر میں پولیس سے اس کا بدلہ لے لونگا۔ اور انگوٹھی بھی مل جائے گی۔ مگر اس وقت مجلس برخواست کیجئے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اور آرام کرنا چاہتا ہوں +

اجلاس منتشر ہوگیا۔ خواتین اپنے اپنے مکان پر روانہ ہوئیں۔ میں صوفے پر جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیٹھ گیا۔ اور جیب سے اُن کی انگوٹھی نکال کر اُنکے ہاتھ پر رکھدی۔ فرطِ حیرت سے وہ اُچھل پڑیں۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملی؟ کیا رشید نے دی ہے۔ دیکھو عامل صاحب نے کیسا صحیح نام نکالا تھا"

میں نے جواب دیا جی ہاں بالکل صحیح۔ اُس دن آپ کے غسل خانے میں رشید ہی نے تو غسل کیا تھا۔ اور وہی طاق میں انگوٹھی رکھ کر بھول گیا تھا!

انہیں بھی یاد آگیا۔ اور منفعل ہوکر بولیں "برا ہو میرے نسیان کا کسقدر شرمندہ ہونا پڑا۔ اور اس واقعہ کی وجہ سے ملنے والیوں میں نہ معلوم کب تک نگو بننا پڑے گا"۔

"مگر اس میں شک نہیں کہ آپ کی اس خود فراموشی نے اس یادگار کی تاریخی اہمیت" اور بھی بڑھا دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب اگر یہ گم ہوئی تو صرف کوتوال اور ہندوستانی فوج بلکہ آپکی امداد اور خادمہ پر گولہ باری کرنے کی خاطر اتحادی پیڑے بھی آموجود ہونگے +

(خاص) (سرجہ) **صدیق طبیب**

اے مری محبوب لڑکی!!

(از مس حجاب اسمٰعیل مدراس)

اشعار منشور

اے مری محبوب لڑکی! تو اپنی بات چیت کے انداز کو بدل دے!
تیرا بے ساختہ لہجہ، اور اڑہ طریق گفتگو دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے!
دیکھ! ہرنی کیسی مظلوم معلوم ہوتی ہے!
پر بعض اوقات وہ بھی اپنے بچے کو زخمی ہوتا دیکھکر خوفناک شیر کی طرح بپھر جاتی ہے
..... پر ترے مسلسل بھولے بھالے جملے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں +
دیکھ! بلبل کا حلاوت آمیز گیت دلوں کو لبھا لیتا ہے۔
پر بعض اوقات اس کے غمناک سروں میں انسان کو ایک تلخی محسوس ہوتی ہے! غم کی خلش!
..... پر ترے متواتر امرت بھرے فقرے لوگوں کے دلوں میں غلط فہمی پیدا کر دیتے ہیں +
اس لئے! اے مری پیاری! تو اپنی بات چیت کے انداز کو بدل دے!

(خاص) (حجاب اسمٰعیل)

اماں!

میں اپنے سینۂ حزیں سے نکلے ہوئے اشکِ پُرخوں کے موتیوں کا تیرے واسطے ایک ہار گوندھونگا +
چمکدار ستاروں نے اپنے ان دائروں کی شکلوں میں تیرے پیروں کی زینت کے لئے پازیب تیار کر دی ہیں۔ لیکن، پیاری اماں! تیرا ہار تیرے سینے پر جگمگ جگمگ کرے گا +
شہرت اور دولت کا تو مخرج ہے اور ان کو مہیا کرنے یا روک لینے کا دار و مدار محض تیری اور تیری ہی ذات پر منحصر ہے۔ لیکن، اے میری اماں! یہ میرا درد و غم سرتاپا مجھ سے ہی وابستہ ہے۔ اور جب میں یہ رنج و محن تیرے روبرو پیش کرتا ہوں، تو اے میری پیاری اماں! تو اپنی تملق جانفزا سے مجھے کچھ تسلی بخش دیتی ہے +

(بنگلور۔ گیتا نجلی) (خاص) **اخوت** عمریوری

تنقید و تبصرہ

نغمۂ دل اور حضرتِ عابد

(از جناب ملک باقر حسین رضوانی۔ بی اے۔ آنرز)

ستمبر ۱۹۳۰ء کے ادبی دنیا میں مکرمی جناب سید عابد علی صاحب عابد ایم اے۔ ایم او۔ ایل ایل بی نے محترمی جناب شیخ نذیر احمد صاحب ظفر کی گرانقدر تصنیف "نغمۂ دل" پر تبصرہ فرمایا ہے۔ عابد صاحب کے علی الرغم مجھے خوش قسمتی سے دونوں اصحاب سے تعارف کا فخر حاصل ہے اور میں اس معاملہ میں اس تشکیک سے مستغنی ہوں کہ عابد صاحب مجھے جانتے ہیں یا ظفر صاحب مجھے نہیں جانتے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ دونوں اصحاب اگر تجاہلِ عارفانہ کو بھی بروئے کار لائیں تو بھی مجھے جاننے پر تو ضرور مجبور ہوں گے۔ مجھے نہایت افسوس سے اس امر کا اظہار کرنا ہے کہ محترمی عابد صاحب نے اپنی حقگوئی" بلند بانگ دعووں اور مسحور کن خطابوں سے نہ مرعوب ہونے والی طبیعت" اور" جنبہ داری اور تعصب سے قصداً کام نہ لینے والی فطرت" کے بلند بانگ دعاوی ادا کرتے ہوئے بھی نغمۂ دل کے فاضل مصنف کی گرانمایہ تصنیف پر اس . . . . حد تک معاندانہ اور متعصبانہ انداز میں تنقید کی ہے جو عابد صاحب جیسے فاضل ادیب کی اس . . . ذہنیت کی مظہر ہے جس کے نادر نمونے ان جیسی شخصیتوں میں بایدو شاید ہی ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ مجھے عابد صاحب کی علمیت و فضیلت کے اقرار کرنے میں کوئی باک نہیں۔ بلکہ اس میں شک لانے والے کو کافر گردانتا ہوں۔ مگر بندہ پرور یہ کہاں کی حق گوئی ہے کہ حقائق سے چشم پوشی کی جائے؎

غرورِ علم نے سکھلا دیا ستمگر کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

مجھے اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ محترمی ظفر صاحب کی تحریر سراسر اسقام و نقائص سے پاک نہیں۔ مگر یہ دعویٰ بھی بلاخوفِ تردید کیا جا سکتا ہے کہ نوعمر فاضل مصنف کی نظم و نثر میں اردو ادب کے وہ گوہر پارے موجود ہیں۔ جن کی تابانی عابد صاحب جیسے کہنہ مشقوں کے شاہکاروں کو بھی شرمندہ کرتی ہے۔ عابد صاحب نے اپنے غیر متعصب ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ مگر کیا میں ان سے استفسار کر سکتا ہوں کہ کیا صحیح تنقید کسی تصنیف پر یہی ہے کہ اس کے معائب کو سپردِ قرطاس کر دیا جائے۔ اور محاسن کو سپردِ طاقِ نسیاں کر دیا جائے۔ دیکھئے میں آپکو بتاؤں کہ تنقید کس بلا کا نام ہے۔ کارلائل لکھتا ہے کہ" بہترین نقاد وہ ہے جو کسی چیز کے محاسن و معائب کو پیش کر کے اپنی رائے کو محفوظ رکھتا ہے"+

یقیناً آپکو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تنقید صحیح معنوں میں وہی ہے جس میں تصویر کے دونوں رُخ پیش کئے جائیں اور میں اس صحبت میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤنگا+

محاسنِ تحریر

"نسیمہ فردوس کی شگفتہ کلی فطرت کے منشائے خیال کا ایک جاندار عکسِ رنگیں ——— اپنی جوانی سے دنیا کو جوان بنائے ہوئے ہے۔ اس کے سنہری دراز بال ——— روحانیت کے شبنمی قطروں میں بھیگے ہوئے ہیں۔ اس کی آہو گیر آنکھیں دو کھلے ہوئے میخانے ہیں جن سے ہر وقت مستی اور کیف کی ایک الوہیانہ بارش ہوتی رہتی ہے"+

عابد صاحب نے نغمۂ دل کے ایک افسانے سے یہ اقتباس دے کر

اُس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ "مستی و کیف کی الوہیانہ بارش صداقت شعر کی حدود سے بہت دور جا پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کیف و مستی الوہیانہ ہو۔ لیکن یہ کہ ان کی بارش الوہیانہ ہو ایک ایسا تخیل ہے جو صرف ایک مریض کے دماغ ہی میں آسکتا ہے"۔

مجھے اس کے جواب میں یہی کہنا ہے کہ

"ہوتی نظر تو جلوۂ جاناں نہ دیکھتے"

آپ کہتے ہیں کہ بارش الوہیانہ نہیں ہو سکتی۔ میں کہتا ہوں کہ کسی صاحب نظر سے پوچھئے کہ بارش کے ایسے الوہیانہ کی صفت کیسی موزوں ہے اور یقیناً یہ تخیل اتنا پاکیزہ ہے جس کو ایک "مریض" کے دماغ کے سوا ہر ایک سمجھ سکتا ہے۔

میں یہاں محترمی ظفر صاحب کے افسانوں سے چند اقتباسات درج کرتا ہوں جن کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ادب میں ندرت خیال، جدت طبع اور پرواز تخیل کے یہ نادر اور فقید المثال نمونے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

"شمشاد جو زہرہ سے ایک سال چھوٹی تھی تخلیق و تعمیر کا ایک نادر ترین کارنامہ تھی۔ وہ نہ تو صحیح تھی اور نہ ملیح اور ان دونوں کیفیتوں سے بالکل جداگانہ ایک ایسی کیفیت کی مالک تھی جس میں صباحت اور ملاحت کے لاکھوں شرارے اور کچھ ان سے بھی زیادہ منظر نظر آتے تھے۔ اس کی ادائیں صنعتِ تخلیق کی انتہا معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی آنکھیں گداز اور مستیوں کا میخانہ تھیں۔ ایسا میخانہ جس کی فضا کیلے اور انگور کی شراب سے زیادہ مست ہو اور جس کی شراب وہ شراب ہو جس کے دیکھنے سے انسان مست ہو اور اتنا مست کہ پھر کبھی اسے مے نوشی کی تمنا نہ رہے۔ اس کے ہونٹ تو طلوعِ چاند سے زیادہ باریک تھے"۔

[حسن کا فاتح (نغمۂ دل)]

"طلعت اور نشاط ایک ہی خاندان کی دو کلیاں تھیں نورس اور نوطلوع نشاط حسن و شباب کی وہ تصویر تھی وہ تشکیل مرتب تھی جسے مجازی خدائے حسن کہہ دینا کوئی گناہ نہ تھا۔ وہ ایک نادر و عجیب مرقع شباب تھی"۔

قوت مشاہدہ

عابد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"فاضل مصنف ناتجربہ کار ہے۔ اور صرف ناتجربہ کار ہی نہیں۔ بلکہ اس کی قوت مشاہدہ اسقدر کمزور ہے کہ وہ ہزاروں مرتبہ دیکھی ہوئی چیزوں سے بھی صحیح نتائج نہیں نکال سکتا۔ خوش نصیب کا ہیرو اصغر نامی ایک نوجوان ہے جو کسی سادہ دل حسین عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے ایک دن وہ سیر کے لئے جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک عورت برقعہ میں ملبوس جا رہی ہے۔ یہاں فاضل مصنف رقمطراز ہے۔ "اصغر نے اسے دیکھا قرائن سے سادگی کے آثار ہویدا تھے"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اصغر نے کن قرائن سے عورت کی سادگی پر استدلال کیا۔ عورت برقعہ میں ملبوس تھی۔ اور برقعہ کی تراش خراش کے متعلق مصنف خاموش ہے"۔

میں یہ عرض کروں گا کہ فاضل نقاد نے یہ اعتراض کر کے اپنی قوت مشاہدہ کے فقدان کا ثبوت دیا ہے۔ مانا کہ فاضل مصنف برقعہ کی تراش خراش کے متعلق خاموش ہے۔ مگر "قرائن" کا لفظ تراش خراش کے علاوہ دیگر ظاہری اسباب سادگی پر حاوی ہے۔ اور آپکو تسلیم کرنا پڑے گا کہ برقعہ سے آپ بسا اوقات برقعہ پوش کی امارت و غربت، سادگی و پرکاری وغیرہ کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں" کیا آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا؟"

فاضل نقاد نے آگے چل کر یہ اعتراض کیا ہے کہ ایک برقعہ پوش عورت سرِ راہ اجنبی سے گفتگو نہیں کر سکتی۔ مگر عابد صاحب اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ احتیاج انسان سے بہت کچھ کروا سکتی ہے۔ تو آپ یقیناً یہ اعتراض نہ کرتے ایک شریف زادی کا باپ بیمار رہے۔ وہ محتاج ہے۔ اس لئے وہ اپنا دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہے۔ اور یہی وہ بات تھی جس کو فاضل مصنف نے آپکو محسوس کروانا چاہا تھا۔ مگر آپ نے نہیں کیا۔

اگر آپ کو قوت مشاہدہ کا مطالعہ کرنا ہو تو ذیل کی تحریر کو ملاحظہ کیجئے۔ دیکھئے کہ کن زوردار الفاظ میں مسرت کو قلمبند کیا گیا ہے:-

"یوسف اپنی شہنائی بجاتا ہوا روسا کے مکانوں کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی پسینے کے قطرے بہ بہ کر اس کے رخساروں پر نشان غربت بن گئے تھے"۔ (نغمۂ دل)

زندگی کے متعلق نقطۂ نظر

فاضل نقاد نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ مصنف نے زندگی کے متعلق غلط نقطۂ نظر قایم کیا ہے۔ بحث کی طوالت سے گریز کرتے ہوئے میں فاضل مصنف کا ایک جملہ پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک نوعمر مصنف کا زندگی کے متعلق کتنا معنی آفریں نقطۂ نظر ہے۔

"کوشش اور عمل جنس دنیا ہوا کرتی ہے۔ انسان کے لئے کچھ مقدر

نہیں۔ قوت عمل اور استقلال سے انسان دنیا کا بڑے سے بڑا کام بہت تھوڑے وقت میں کر سکتا ہے + (نغمۂ دل)

نغمۂ دل نظموں کے اشعار کا اقتباس عابد صاحب نے عجب پریشانی کے عالم میں کیا۔ یعنی کسی شعر کا کوئی مصرع کسی دوسرے شعر کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے۔ اور اس تبدیل ہیئت سے عوام الناس کو دھوکہ دیا ہے۔ عابد صاحب جیسے فاضل ادیب سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ ایسے خلافِ توقع ذرائع اختیار کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نغمۂ دل کو دیکھتے ہی . . . . . کچھ اس درجہ بے خود ہو گئے کہ اُن کو اپنی ذمہ داری کا احساس بھی نہ رہا۔ عابد صاحب "شاعر کے دل" میں سے ایک شعر یوں نقل کیا ہے

یادِ وفا و آدمیت کا نظامِ منجمل
نطق کی گنجائشوں کا مرمریں گوہر کہیں

درحقیقت یہ دونوں مصرعے دو جدا جدا اشعار کے ہیں۔ صحیح شکل یہ ہے:-

(۱) محفلِ عالم میں اسکو کہئے حسنِ زندگی
یادِ وفا و آدمیت کا نظامِ منجمل

(۲) رازِ مخفی کا اسے گنجینۂ بہتر کہیں
نطق کی گنجائشوں کا مرمریں گوہر کہیں

(نغمۂ دل صفحہ ۳۶)

اوصاف یہ ہے کہ یہ دونوں مختلف شعر ایک صفحہ پر بھی درج نہیں جن کا عابد صاحب نے ایک ایک مصرع لے کر ایک نیا شعر بنا ڈالا۔ اور اپنے خیال میں نغمۂ دل کے فاضل مصنف کی تصحیح کی۔ مندرجہ بالا اشعار اب پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ کسقدر صاف اور سادہ ہیں +

غزلیات و رباعیات غزلیات کے متعلق عابد صاحب نے ارشاد فرمایا ہے "غزلیں نسبتاً اچھی ہیں" مگر کس خاص معلومات کی وجہ سے آپ نے غزلیات اور رباعیات کے محاسن پر تبصرہ کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ کاش کہ اُن کی دستِ نظر کو یہ توفیق بھی ملی ہوتی +

میں یہاں چند اشعار اور رباعیات فاضل قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ کیجئے کہ محترمی ظفر صاحب کی شاعری کس اوج اور گداز سے پُر ہے۔ اور رباعیات تو اس درجہ وجد آفریں اور کیف آگیں ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نہ جانے عابد صاحب نے کیوں دامنِ انصاف ہاتھ سے چھوڑ دیا +

اب دیر نہ کر ساقیِ لاجام اُٹھا کر دے
تشنہ ہوں بہت دن سے پرکیف ذرا کر دے
خاموش نگاہوں کو غارت گرِ عالم کر
ایجاد نئی کوئی پھر طرزِ جفا کر دے
تو عہد وفا کر کے آغازِ محبت کر
آگے مری قسمت ہے جو چاہے خدا کر دے

.....

حال کھل جائے ابھی حسن کی معصومی کا
شکر کرتا ہوں کہ لب پر مرے فریاد نہیں
تیری بیداد کا انداز تغافل تو نہ تھا
تیری بیداد میں یہ تیری بیداد نہیں
میری ہستی کی یہ ہستی ہے کہ بے بود ہوں میں
میری بنیاد بس اتنی ہے کہ بنیاد نہیں

.....

عشق ہو دونوں دلوں میں تو ہو تکمیلِ وفا
تم نباہو جو ہم سے تو نباہیں کیونکر
گر گئی دل سے گرہ زلف کا ہے نفس بھی مجھ سے
میری گردن میں کوئی ڈالدے بانہیں کیونکر
ہم نے دیکھا ہے کہ اے زلف گرہ گیر ہوس
آج کوئی بھی تری قید سے آزاد نہیں

.....

دے کر تسلیاں دل حسرت نشاں کو میں
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے آستاں کو میں
کب تک سناؤں آپکو روداد بے کسی
سو بار کہہ چکا ہوں اسی داستاں کو میں
رفعت پسندیاں ہیں یہ میری نگاہ کی
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں

.....

رباعیات

وسعتِ دہر میں بے قدریٔ احساس نہ پوچھ
دوست سے بھی ہے شکایت مجھے دشمن کیسا

.....

بڑا مزا ہو جو یہ وقتِ خوشگوار آئے
کہ تو بھی آئے میرے گھر میں جب بہار آئے

.....

مے ہے کہ پری کوئی پری خانے میں
یا برقِ بلا کیف کے کاشانے میں
دیکھے سے ہوا جاتا ہوں مدہوش ظفر
کیا چیز چھلکتی ہے یہ پیمانے میں

.....

دل چوٹ نگاہوں کی تری سہتا ہے
جذبات میں ہیجان بپا رہتا ہے
دنیا میں حسینوں کی خدائی ہے ظفر
انسان کو انسان خدا کہتا ہے

.....

گل خانۂ ہستی کی مسرت بن کر
حوروں کے تبسم کی لطافت بن کر
آجاؤ مری خلوتِ تنہا میں کبھی
نورِ شبِ مہتاب کی طلعت بن کر

وغیرہ وغیرہ

(اقتباسات از نغمۂ دل)

آخر میں مجھے عابد صاحب سے یہ عرض کرنا ہے کہ ان کو چاہئے کہ وہ اس قسم تنقید سے باز رہ کر نوجوان انشا پردازوں کی کمر ہمت بندھایا کریں۔ نہ کہ معاندانہ انداز میں تنقید سے اُن کی حوصلہ شکنی کریں +

ملک محمد باقر نسیم

نہایت مفید اور دلچسپ کتابیں

عملیات اس کتاب میں پانچسو سے زیادہ ایسے مستند اور مجرب عملیات جمع کئے گئے ہیں جو سالہا سال کی خدمت و ریاضت کے بعد بھی کسی عامل سے مشکل معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب کے پندرہ باب ہیں (۱) اس میں ابتدائی معلومات ہے (۲) اس میں اسمائے حسنیٰ اور اعمال ہیں۔ (۳) محبت پیدا کرنے کے اعمال (۴) جدائی کے لئے اعمال (۵) کشائش رزق کے اعمال (۶) تسخیر خلائق کے اعمال (۷) امراکی تسخیر کے اعمال (۸) چوروں کی شناخت کے اعمال (۹) مفرور کی واپسی کے اعمال (۱۰) اہم مرض کا علاج بذریعہ اعمال۔ (۱۱) اولاد کے لئے اعمال (۱۲) آسیب زدہ کیلئے اعمال (۱۳) حل مشکلات کے لئے اعمال (۱۴) خاتمہ حضرت غوث الاعظمؒ۔ عملیات کی اس سے بہتر کتاب آجتک شائع نہیں ہوئی۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ۔ ٹائیٹل ہفت رنگ۔ قیمت تین روپے +

مذہبی معلومات اس کتاب میں اسلام کی تعلیم کا خلاصہ اس خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ تمام اہم اور ضروری باتیں جو مذہبی معلومات سے تعلق رکھتی ہیں درج کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد نئی روشنی کے نوجوان صرف ایک دن میں ارکان اسلام سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ زبان نہایت شستہ اور آسان۔ مذہبی معلومات ایک ایسی کتاب ہے جس میں اسلامی معلومات کو نہایت خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں اسلام کے عقاید توحید باری تعالیٰ فرشتے۔ آسمانی کتابیں خدا کے رسول قیامت مرنے کے بعد زندگی۔ تقدیر۔ عذاب قبر۔ روزہ نماز۔ حج۔ زکوٰۃ۔ غرضکہ تمام ضروری باتیں درج ہیں +

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:-

منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ شاہی محلہ۔ لاہور

نقد و نظر

(نیرنگ خیال کے ریویو ایڈیٹر جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے کے قلم سے)

نبی کامل (نبوت کا خاتمہ اتم)

مصنفہ جناب خواجہ کمال الدین صاحب صفحہ ۳۴۰ - پتہ مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل برانڈرتھ روڈ - لاہور +

خواجہ صاحب کی ذات علمی و عملی حلقوں میں تعارف سے بالاتر ہے وہ تقریباً ۱۷-۱۸ سال سے اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ حق کی خدمت جس خلوص و سکوت سے کر رہے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے قابل فخر و سبق آموز ہے۔ انہوں نے اپنی اور اپنے رفقائے کار کی مسلسل کوششوں سے بہت سی ان غلط فہمیوں کو جو یورپ میں اسلام اور بانیٔ اسلام (روحی فداہ) کے متعلق موجود تھیں - دور کرنے میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے - اسی سلسلہ انہوں نے آج سے چھ سال پہلے انگریزی میں "آئیڈیل پرافٹ" کے نام سے رسول اسلام (صلعم) کی سیرت شائع کی تھی اور نومسلم لارڈ فاروق ہڈلے نے اس پر ایک مقدمہ لکھا تھا۔ اب یہی کتاب اردو ترجمہ کی صورت میں مذکورہ بالا نام سے شایع کی گئی ہے - چونکہ کتاب مخالفین کی تسکین کیلئے لکھی گئی تھی - اس لئے اس میں محنت کا پورا پورا خیال رکھا گیا اور اسکا مطالعہ یقیناً مفید ہے +

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

مرتبہ جناب عبدالعلیم صاحب اجراری بی اے (جامعہ) صفحہ ۱۱۲ قیمت ۸ عہ

پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی +

اسی سلسلہ میں مسلمانوں کے آزاد قومی ادارہ جامعہ ملیہ دہلی کے ایک فاضل التعلیم نوجوان کی مساعی جمیلہ بھی قابل ذکر ہیں مسیحیت کو اسلام سے جو اشد عداوت ہے اور اس نے اس کے علماء و فضلا کو بھی حقیقت بینی اور صداقت نویسی سے دور کر دیا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہر اس مصنف نے جس نے اسلام، بانی اسلام یا متعلقات اسلام کے متعلق جب کبھی کچھ لکھا تو اس میں اسلام کو بدنام کرنے کی روح کارفرما رہی ہے - اور اس طرح غلط بیانیوں کا ایک انبار لگ گیا - اور چونکہ ان غلط بیانیوں کی تکرار جاری رہی - اس لئے یورپ اور اس کی پیرو کار جماعت نے ان کو صداقت کا درجہ دیدیا - اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ برطانوی دائرۃ المعارف کی طبع نہم میں جرمنی مستشرقین ولمازن نے "محمڈنزم" (اسلام!) پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ان تمام تبرہ و نشتر کو جمع کر دیا ہے - جو پیکر قدسی کی سیرت کو مجروح کرنے کے لئے یورپ کے کارخانۂ تعصب و صداقت کشی میں تیار کئے گئے تھے - چاہئے تو یہ تھا کہ اسی زمانہ میں ان کا مسکت جواب دیا جاتا لیکن افسوس کہ اس طرف توجہ نہیں کی گئی - اور ابتک وہ "غلطیہائے مضامین" کا دفتر موجود ہے - اس کمی کو محسوس کر کے اور اس خیال سے کہ ہمارے اکثر علماء بدقسمتی سے انگریزی سے ناواقف ہیں اس نوجوان نے ہمت کی اور نہ صرف یہ کہ ترجمہ کے ذریعہ اس کو اردو دان علما تک پہنچا دیا - بلکہ اپنی طاقت بھر اس پر ایک معقول مقدمہ لکھ کر اور حواشی کے ذریعہ اکثر الزامات کی تردید بھی کر دی ہے - ہم اس مذہبی و علمی کوشش کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور رینا زی صاحب کی تمدن عرب کا کفارہ سمجھتے ہیں - پھر ولمازن کا مضمون اس بات کا متقضی ہے کہ اس کا مفصل و جامع جواب لکھا جائے کہ جس طرح اصل مضمون بعض قلوب میں خلش پیدا کر سکتا ہے - اس کا جواب ان کو کامل اطمینان و تسکین دے سکے +

کشف الظلام

مترجمہ جناب سید شاہ محمد عزیز الدین صاحب پھلواری قیمت ۴ عہ - پتہ مترجم، پھلواری شریف ضلع پٹنہ +

مذکورہ بالا دو کتابیں ہماری مذہبی مساعی و ذہنیت کا ایک رخ تھا - زیر تنقید کتاب اس کا دوسرا رخ ہے - ہماری بدقسمتی سے خود ہمارے اندر بھی ایک ایسی بڑی جماعت موجود ہے جو صرف اپنی گڑی بازار کے لئے عجیب و غریب فقہی مسائل پر بیکار و فضول بحث کر کے ایک طرف تو قوم میں اختلاف کی خلیج وسیع کرتی ہے اور دوسری طرف قوم کا وقت اور پیسہ برباد کرتی ہے - کچھ عرصہ سے لاہور کی ایک بک ایجنسی امام تیمیہؒ اور امام قیم کے مصلحانہ خیالات کی اردو تراجم کے ذریعہ اشاعت کر رہی ہے - اس کو دیکھ کر ہمارے نوجوان مترجم نے زیارت قبور، استمداد و توسل، شفاعت وغیرہ کے مسائل کو ایک مرتبہ

مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا اور اس مقصد کیلئے تصنیف و تالیف سے نیچے اُتر کر "مقام ترجمہ" میں پہنچکر علامہ تقی الدین سبکیؒ کی "شفاء السقام" کو اُردو کا جامہ پہنا کر مشتاق مسلمانوں کے ہاتھ تک پہنچا دیا کہ وہ اس کے ذریعہ ہدایت و رشد حاصل کر کے "صراط مستقیم" پر چل کھڑے ہوں۔

اس وقت مسلمانوں کو تخریبی تصانیف کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام قوم کی قوت انہی جھگڑوں، مناظروں اور مناقشوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ ان کو تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ اس مسلمان مصنفین کا فرض ہے کہ اس نازک انقلابی زمانہ میں جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو جس سے کسی قسم کے اختلاف کا اندیشہ نہ ہو۔ نوجوان مترجم کا یہ کارنامہ اُن کی صلاحیت عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اگر اُنہوں نے اپنی استعداد کا صحیح و تعمیری مصرف لیا۔ تو وہ ملک و قوم کے لئے بہت مفید ہوگی۔ بہر حال اُن لوگوں کے لئے جو اس قسم کے خیالات سے متفق ہیں یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اور وہ اپنے خیال کے مطابق اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ضیاء الدین برنی } مصنفہ جناب سید حسن صاحب برنی وکیل صفحہ ۴۸ قیمت ہدیہ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی۔

ضیاء الدین برنی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ پہلا ہندی مسلم مورخ ہے اور چونکہ اس نے جو حالات و واقعات لکھے ہیں اُس کا وہ یا تو خود عینی شاہد ہے یا اُس نے باپ اور چچا سے جو اُس عہد کی اسلامی سلطنت کے اہم رکن تھے اور جنہوں نے ان واقعات میں عملی حصہ لیا تھا۔ بلا واسطہ سنے تھے۔ اس لئے اُس کی تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی یہ کتاب عرصہ ہوا سر سید نے اوٹ کی تھی۔ اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے اُسے شایع بھی کر دیا تھا۔ لیکن کسی نے ابتک اس کی مفصل سوانح عمری نہیں لکھی تھی۔ اور یہ کمی بہت بُری طرح محسوس کی جا رہی تھی۔ جناب اکبر خاں صاحب نجیب آبادی نے محض اپنے دعوے کے ثبوت اور برنی کی تاریخی اہمیت کو گھٹانے کے لئے اس غریب کو جس بُری طرح پیش کیا ہے۔ وہ بھی اس کی متقاضی تھی کہ جلد از جلد اس کی مکمل شکل پیش کر دی جائے اور ہم خوش ہیں کہ اس فرض کو اُس کے ہم وطن مورخ (سید حسن برنی) نے نہایت اچھی طرح انجام دیا ہے۔ یہ حالات پہلے رسالہ جامعہ میں مضمون کی صورت میں شایع ہوئے تھے۔ اور اب ان کو کتاب کی شکل میں چھاپا گیا ہے۔ "تاریخ ہند اور اسلامی ادبیات" سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ یقیناً نفع بخش ہوگا

علاء الدین خلجی } (انگریزی) مصنفہ جناب سلطان حمید وارثی صاحب ایم اے وکیل صفحہ ۹۶ قیمت ۱؎ پتہ رائے صاحب رام دیال اگروال الہ آباد +

ہندوستان کے مسلم فاتحین میں علاء الدین کا کوئی مقابل نہیں کر سکتا۔ اُس نے اپنے زور بازو سے جس طرح نئی حکومت کو وسیع تر کیا۔ اس نے جس طرح تجارتی، مالی، مذہبی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُس نے جس طرح ترقی کے دروازے تمام لوگوں پر یکساں کھول دیئے وہ ایسی چیزیں ہیں جو اس کے عہد حکومت کو بہت ممتاز کرتی ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے لائق مصنف نے خلجی انقلاب اور اُس کی رُوح کو جو علاء الدین کی شکل میں جادہ گر ہوئی اتنی اہمیت دی ہے +

اس کے علاوہ یہ کتاب اسقدر خوشگوار تبدیلی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ جو تعلیم یافتہ مسلمانوں میں "ذریعہ اظہار خیال" کے متعلق پیدا ہو رہی ہے۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب نے اپنے علمی کارناموں کو انگریزی میں پیش کر کے اپنے متبعین اور شاگردوں میں بھی یہ شوق پیدا کر دیا ہے۔ وہ بھی انگریزی کے ذریعہ علمی خدمت کریں۔ اگر ہمارے سلم گریجوایٹ ابتداہی سے اس کی طرف توجہ کرتے تو مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں ملک میں موجود ہیں وہ کب کی دور ہو چکی ہوتیں۔ بہر حال اب جبکہ یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا اس نونہال کو بار آور کرے +

علاء الدین کا عہد حکومت اگرچہ اس سے زیادہ مفصل تاریخ کا طالب ہے لیکن چونکہ یہ اوّلین کوشش ہے اس لئے تصنیف و مصنف دونوں ہمت افزائی کے مستحق ہیں +

رہنمائے صحت } مترجمہ جناب محمد اعظم خاں صاحب صفحہ ۱۲۸۔ پتہ مترجم نصیر لا عثمان پورہ حیدرآباد دکن +

مہاتما گاندھی نے اپنے سیاسی۔ مذہبی۔ معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کی بنا پر تمام دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل کر لی ہے۔ حفظانِ صحت، مرض، علاج، غذا وغیرہ کے متعلق بھی ان کے خیالات عجیب و غریب ہیں۔ انہوں نے اے گائڈ ٹو ہیلتھ کے نام سے اپنے خیالات کو ایک رسالہ کی شکل میں شایع بھی کر دیا ہے۔ اس رسالہ کا ایک ترجمہ عرصہ ہوا پنجاب سے شایع ہو چکا ہے اور ہم نے بھی اس کا ترجمہ سہ دو مرحوم میں شائع کرانا شروع کیا تھا۔ اب اسکا تیسرا ترجمہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس ہے اُمید کہ اصول حفظان

سے دلچسپی رکھنے والے ہندوستان کے بڑے رہنما کے خیالات کو بھی دلچسپی سے دیکھیں گے +

دیوان نشتر } از جناب عبدالکریم صاحب نشتر۔ چھپروی صفحہ ۱۱۲ قیمت ۱؎ پتہ شارہ ہند ۵۲ بنیا پاڑہ کریس کلکتہ +

جناب نشتر حضرت شمس مرحوم کے شاگرد اور جناب رضا علی وحشت کے ہمعصر ہیں۔ یہ کلکتہ اور شاید بیرون کے ان مشق شدہ شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دیوان زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے جس میں کہ رباعیاں اور چند قطعات بھی ہیں۔ شاعری میں لکھنؤ کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ عام شائقین نظم کے لئے یقیناً ان کا دیوان دلچسپیوں سے خالی نہ ہوگا۔ کسی آئندہ تقریب پر اس پر مفصل تنقید لکھیں گے +

زادراہ } مصنفہ جناب محمد ظفر صاحب ایم اے وکیل صفحہ ۸۰ قیمت درج نہیں پتہ انجمن رفیق الاسلام گوڑگانواں +

جناب محمد ظفر صاحب ان خاموش کام کرنے والوں میں ہیں جن کا مسلمانوں میں عام فقدان ہے۔ وہ اپنے محدود دائرہ میں رہ کر مسلمانوں کی دینی علمی و عملی تعلیم میں مصروف ہیں۔ اور اس سلسلہ میں چھوٹے چھوٹے رسالے شایع کر کے مفت تقسیم کراتے رہتے ہیں۔ یہ رسالہ اس سلسلہ کی آٹھویں کڑی ہے۔ کیا مسلمان اس اہم فرض میں ان کی عملی مدد کریں گے؟

موج تبسم } مصنفہ جناب شوکت تھانوی صاحب صفحہ ۶ قیمت ۶ پتہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ +

ظرافت خدا کی وہ عطا کردہ مخصوص نعمت ہے جس سے دنیا کی ایک بہت چھوٹی محدود جماعت مستفید ہوتی ہے۔ ظرافت دراصل وہ نور ہے جو غم خانۂ دل کی تاریکی اور ظلمتکدۂ قلب کی سیاہی کو دور کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ وہ چیز ہے جو کسی صورت سے بھی اکتسابی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خدا کی وہ دین ہے جو وہ اپنے برگزیدہ بندوں کو عطا کرتا ہے۔ ایک شخص مشق و محنت سے ایک اچھا شاعر، عمدہ مصور اور لائق تحسین مصنف یا مقرر بن سکتا ہے لیکن کوئی تعلیم، کوئی مشق، کوئی محنت اسے حقیقی بذلہ سنج و ظریف نہیں بنا سکتی۔ جو شخص بھی اس کی کوشش کرتا ہے وہ یا تو بیہودہ گو ہو جاتا ہے یا مضحکہ خیز چیزیں بکنے لگتا ہے +

پنڈت رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین مرحوم، حاجی بلغ العلیٰ کے بعد اردو ادبیات میں صرف دو ظریف مضمون نویس رہ جاتے ہیں، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور حضرت پطرس +

زیر تنقید کتاب جناب شوکت کے بعض مطبوعہ و غیر مطبوعہ مزاحیہ مضامین کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے بعض مضامین حقیقت میں ہنسنے ہنسانے کے لئے اپنے اندر غور و فکر کا سامان رکھتے ہیں۔ شوکت صاحب کو دنیائے ظرافت میں جو کمال حاصل ہے اور وہ جس طرح دامن ادب کو چھوڑے، برشتۂ تہذیب کو توڑے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں وہ ایسا کمال ہے جس نے اردو کی ادبی دنیا سے آن کے لئے تحسین و ستایش کا تحفہ حاصل کر لیا ہے۔ ہم ہر زندہ دل اور زندگی پسند اردو داں سے درخواست کریں گے کہ وہ اس سے محظوظ ہو کہ

خوش باش و مدے کہ زندگانی اینست

نجیب اشرف

فن اشتہار نویسی

اس کتاب میں اشتہار کے ذریعہ سے تجارت کرنا اور اشتہار کی مدد سے تجارت کو کامیاب بنانے کے وہ طریقے بتائے گئے ہیں۔ جن پر عمل کرنے کے بعد ایک معمولی سرمایہ والا بڑے سے بڑے سرمایہ والے سے دگنی زیادہ آمدنی پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں اشتہار دینے کی صورتیں۔ اشتہار بنانے کے طریقے۔ اشتہار لکھنے کے اصول۔ رسائل و اخبارات اور دوسری چیزوں میں اشتہار دینے کے لئے، وہ مشورے درج ہیں جو لاکھوں روپیہ برباد کرنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ کتاب لاجواب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (ع)

ملنے کا پتہ: منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو شاہی محلہ لاہور

منظومات

کلامِ سہیل

(از جناب اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

کیا حال دل کا اے غمِ جاناں بنا دیا
ہر نیشتر کو ناوکِ مژگاں بنا دیا

داغِ جنوں کا فیض مرے دل سے پوچھئے
ذرّے کو آفتابِ درخشاں بنا دیا

اس جانفزائے تاب کے قربان جائیے
ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا

حسنِ نظارہ سوز یہ جلوہ ہے یا حجاب
چشمِ ادا شناس کو حیراں بنا دیا

وارفتگانِ شوق کو کیا دیر کیا حرم
جس در پہ دی صدا درِ جاناں بنا دیا

برقِ جمالِ یار کی کوئی خطا نہ تھی
مجھ کو ہجومِ شوق نے حیراں بنا دیا

اللہ ری طلاطمِ طوفانِ اضطراب
کونین کو مرے لئے زنداں بنا دیا

کیا ایک میں ہی ہیں ہوں اس آئینہ خانہ میں
آنکھوں نے کھل کے اور بھی حیراں بنا دیا

اٹھی تھی بحرِ حسن سے ایک موجِ بیقرار
فطرت نے اُس کو پیکرِ انساں بنا دیا

اللہ ری موجِ شوق کی سحر آفرینیاں
برقِ شعاعِ حسن کو رقصاں بنا دیا

اے سوزِ ناتمام کہاں جائے اب خلیل
آتشکدہ کو بھی تو گلستاں بنا دیا

بزمِ ازل سے جھاڑ کے دامن چلا جو میں
ذرّوں نے مل کے عالمِ امکاں بنا دیا

اے ذوقِ جستجو تری ہمت پہ آفریں
منزل کو ہر قدم پہ گریزاں بنا دیا

محشر میں نقشِ نامِ محمدؐ نے اے سہیل
داغِ گناہ کو درہمِ ایماں بنا دیا

(خاص) سہیل

غزل

(از جناب رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری)

کیا راہ ہے راہِ محبت کی سانس آتے آتے ٹوٹ گئی
کیا بار ہے بارِ محبت کا دو گام میں ہمت چھوٹ گئی

وہ درد وہ چوکھٹ کیا چھوٹی اے ہمدم قسمت پھوٹ گئی
چاہا تھا کہ دل کو سمجھا لیں کچھ سوچ کے ہمت چھوٹ گئی

زنداں کی حقیقت ہی کیا تھی ہمت ہی یکایک ٹوٹ گئی
دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا دیوانوں کی قسمت پھوٹ گئی

ہمراز نہیں دمساز نہیں اللہ کوئی آواز نہیں
کیا عشق کی دنیا میں آتے ہی رہتی دنیا چھوٹ گئی

کیا پھر کوئی آئے گا نظر کیا پھر دنیا پلٹا لے گی
اک بار تو کوئی مست نظر دل والوں کی دنیا لوٹ گئی

اے دوست ترے جلنے والے جلتے ہیں جیسی مصیبت سے
دوزخ کی بھڑکتی آگ اس پر سو مرتبہ چھاتی کوٹ گئی

تم نزع میں دیکھ کے آتے ہو ہم دفن کئے آتے ہیں اسے
کچھ نم کو خبر ہے کتنی دور اک جاتی دنیا چھوٹ گئی

چاہا ہے جسے دکھتے دل سے اس کی بھی نگاہ کبھی ہوگی
ایسے کا جینا رہ جانا یہ آس بھی جس کی ٹوٹ گئی

تسکین کی باتیں کرتے ہو ہم جانتے ہیں جو ہونا ہے
جب اس سے بچھڑ کر جینا ہے تو یارو قسمت پھوٹ گئی

دنیا میں ہیں اور بیٹھے ہیں کھڑا اک محبت کا لے کر
کیا اپنی بھی مت ماری گئی کیا ساری سدھ بدھ چھوٹ گئی

متوالے ہوش میں رہتے ہیں یہ بھید اس وقت کھلا ہم پر
اے ہمدم دل کی بھری محفل وہ مست آنکھ جب لوٹ گئی

محشر کا دن جب ڈوب چلا انگڑائی لے لیکے اٹھے
اُن آنکھوں کے اے متوالو نیند اتنی جلدی ٹوٹ گئی

ہے درد سا درد محبت کا ہے چوٹ سی چوٹ محبت کی
آنکھیں بھی نہ لڑنے پائی تھیں اور منہ پہ ہوائی چھوٹ گئی

انصاف کسی کا کیا چاہیں کیا عشق کی رسم نرالی تھی
جو اپنے ساتھ کسی نے کئے اے مالک قسمت پھوٹ گئی

آگے شاید پڑتا ہے قدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں
یہ درد کی حد ہے فراق ہمیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

(خاص) (فراق)

رباعیات

(از حضرت شوکت بلگرامی مرحوم)

اس مئے سے ہے لبریز ایاغ ہستی — اس پھول سے سرسبز ہے باغ ہستی
سینہ میں نہیں ہے دلِ سوزاں شوکت — فانوس میں روشن ہے چراغِ ہستی

(۲)

مہمان جو قبروں میں ہیں ٹھہرائے ہوئے — ہیں بولنے کی سب وہ قسم کھائے ہوئے
اک شمع سرہانے پہ کھڑی روتی ہے — پروانے زیارت کو ہیں کچھ آئے ہوئے

(۳)

کاٹا بچپن کا عہد روتے روتے — اور کھوئی شبِ شباب سوتے سوتے
شوکت پیری میں یادِ خالق سوجھی — پہنچے منزل پہ صبح ہوتے ہوتے

(۴)

جھوٹی مشہور ہے کہانی میری — شوکت تلخ ہے زندگانی میری
ہستی کچھ بھی نہیں مگر ہے بدنام — پیری گردوں کی اور جوانی میری

(۵)

بچپن کا مزا لطفِ جوانی تو ہے — سرمایۂ عیش جاودانی تو ہے
اے تجھی پہ جان دیتا ہے جہاں — نیند آتی ہے جس سے وہ کہانی تو ہے

(۶)

جی بھر کے وہ آنکھوں میں سماتے جاتے — رہتے شوکت کو آزماتے جاتے
رونا تو یہ ہے کہ ہائے مانندِ نظر — کچھ دیر لگی نہ اُن کو آتے جاتے

شوکت

(فیر سلیوم)

(مرسلہ سید باقر شاہ حسن حیدرآبادی)

نظریات

تجھ سے گر ہو سکے تو اتنا کر — دل میں اس کا خیال پیدا کر
شعلۂ حُسن کے قریب نہ جا — ہاں مگر دور سے تماشا کر
چارہ گر کو پڑی ہے کیا میری — کیوں کہوں مَیں کہ مجھ کو اچھا کر
ذوقِ دیدار ہے اگر موسےٰ — دیکھ، ہاں دیکھ کر تقاضا کر
پہلے اپنی نگہ کو وسعت دے — پھر بقدرِ نظر تماشا کر
"موت" جب زندگی سے بہتر ہے — "زندگی" کی نہ پھر تمنّا کر
بیخودی میں خودی کو گُم کر کے — پھر اسی نام کو پکارا کر
ہر کسی کو بتا نہ حالِ تباہ — ہر کسی سے نہ ذکر اپنا کر
جب کسی کا ہو دیکھنا منظور — پہلے ہمّت کو اپنی دیکھا کر

تو ظفر ایک دم کا مہماں ہے
چھوڑ سب ذکر فکرِ عقبیٰ کر

(خاص) ظفر ہاشمی

عارف - سید محمد عارف صاحب فاطمی ملیح آبادی

(۷)

دل وہ آباد نہیں جس میں تری یاد نہیں — ہے وہ کافر جو تری راہ میں برباد نہیں
مسلکِ عشق کے قانون ہیں اور ورنکے لئے — مجھکو تو تیرے سوا اور ہی کچھ یاد نہیں
لذتِ درد میں ملتا ہے مزا مجھ کو سوا — تیری بیداد مرے واسطے بیداد نہیں

منظر - منظر صاحب صدیقی سیمابی اکبرآبادی

(۸)

قابلِ داد نہیں لائقِ بیداد نہیں — سچ ہے اے عشق کہ مٹی مری برباد نہیں
بعدِ مرنداں بھی جنوں اہلِ جنوں کا نہ گیا — گھر کو جاتے ہی مگر گھر کا پتہ یاد نہیں
یہ خدائی ہے کہ بھولا نہیں بندہ کو خدا — اور خودی یہ ہے کہ بندہ کو خدا یاد نہیں
یہ مراظرفِ محبت ہے بہ اندازۂ غم — خون روتا ہوں مگر نالۂ فریاد نہیں
نقش بر آب ہے یہ عالمِ فانی منظر — اس میں مضبوط کسی چیز کی بنیاد نہیں

وفا - منشی باقر حسین صاحب

(۹)

کونسا ظلم نہیں کونسی بیداد نہیں — اور میں ہوں کہ لبوں پر مرے فریاد نہیں
قیدِ افکار سے آزاد ہیں محبوس قفس — برق کا خوف نہیں موسمِ صیاد نہیں
لطف اندوز ہوں اس باغ میں شبنم کی طرح — دل لگانے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں
نقش ہے دل پہ ابھی تک مرے پیمانِ وفا — آؤ میں یاد دلاؤں جو تمہیں یاد نہیں
دل کو قربان کروں جاں کو تصدق کر دوں — دیکھ لینے کے لئے حسن خداداد نہیں

ایک میں ہوں کہ سمجھتا ہوں تمہیں جانِ وفا
ایک تم ہو کہ مجھے نامِ وفا یاد نہیں

شعر و شاعری کی کتابیں

نقش و نگار - جمیل احمد قادوائی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ نفیس عہ
گنجینۂ قوافی - نوآموز شعرا کی امداد کے لئے لاجواب ڈکشنری - ہر قسم کے قوافی کا گنجینہ - قیمت عہ
گلزارِ داغ - حضرت داغ کا مکمل دیوان بجم تین سو صفحہ - قیمت عہ
ترانۂ شوق - منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کی رنگین مثنوی - قیمت عہ
منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو - شاہی محلہ لاہور

غیر طرحی کلام

فانی - شوکت علی خانصاحب بی اے علیگ

(۱۰)

گریجوشِ ندامت بس اب تھمے کہ تو دامن نہ لے — جبتک حسرتہ کا ہر پہلو دل کا دامن تھام نہ لے
دل کی لاکھ وہ فضائیں گمراہ جو یوں آپ کھوئے — ہوش کے بس کا روگ نہیں ہوش تو پھر کام نہ لے
راحت کا مفہوم یہی ہے جو جدِ طلب سے باز نہ آ — پڑ رہنے دے دل کی یہ بیچینی پڑ لے جا آرام نہ لے
لغزش توبہ کے ہاتھوں مدہوش کھڑا تھا کوئی — مستی چشمِ یار اگر تو گرتے ہوؤں کو تھام نہ لے
ننگ ہے سعیِ عرضِ محبت فرضِ محبت پورا کر — اسکے سوا کچھ یاد نہ رکھ مجھے سے تو کا نام نہ لے
دل تو دل ہے دل کو پھر آ جانا تو آسان نہیں — درد وہ ہے جو دل میں اتر کر پھر آرام نہ لے
ہوتا ہے وہ ہو کے رہیگا مجبوری کی حد سے نہ بڑھ — مجھے بٹھائے اپنے سر آزادی کا الزام نہ لے
کافر صورت دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہے — کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

حسن پشیماں کو فانی یہ نہ تڑپنے تکلیف کرم
وضعِ شکستِ عشق نہ بنائے دیکھ کوئی الزام نہ لے

فانی - مولوی سید کلب حیدر صاحب جائسی

(۱۱)

قصہ طلب یعنی راہ طلب کے سوا بھی کچھ بھی نہیں — سرحدِ ہوش کو آگے بڑھ یہ جذبہ ادا بھی کچھ بھی نہیں
زاویہ سکونِ ساحل ہوں، موجِ آغوشِ طوفاں — میں نا بلد آبادی ہوں میری بربادی کچھ بھی نہیں
راہِ غم اور قافلۂ دل کس قدر بے خبر ہے منزل کی — شورِ جرس آواز ہی خود ہے بانگِ درا بھی کچھ بھی نہیں
اے گوشہ نشینِ یاس لے دل اے محوِ فریبِ آزادی — ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے بندِ وفا یہ تو آزادی کچھ بھی نہیں
ہستی کو عدم جس صورت میں حاصل ہو ہستی پائندہ ہے — یعنی تشکیلِ ثبات خوشی بزمِ گہِ شادی کچھ بھی نہیں
درد نہاں ظاہر ہو تو کیونکر نکلے آہ کی آواز میں سنکر — میں نے سوال کیا کیا گذری دل تیری شادی کچھ بھی نہیں

اب کیا پرسش ہو دل تڑپا آنسو پیئے بیٹھ گئے فانی
میری کہانی اس کے سوا جو تم کو سنا دی کچھ بھی نہیں

ہفتہ وار اخبار، تازیانہ میں اشتہار دیکر فائدہ اٹھایئے (منیجر)

کمزور بچوں کو طاقتور بنانا

میٹھی دوا قلیل ترین مقدار

جن بچوں کی ہڈیاں کمزور ہوں۔ کھاتے پیتے ہوں مگر جسم کی نشوونما کمزور ہو۔ زرد اور دُبلے رہتے ہوں۔ بار بار امراض کا نشانہ بنتے ہوں ان کے لئے

اکسیر مصلح شیر مادر

طلب فرمائیے۔ ماں بھی کھائے اور بچہ بھی۔ اس سے بچہ کی صحت آہستہ آہستہ بہتر ہوتی جاتی ہے +

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

خوشبودار گولیاں

منہ کی بدبو۔ دانتوں کی امراض۔ مسوڑھوں کی امراض۔ معدہ سے ابخرات کے اٹھنے کی وجہ سے ہو تو یہ گولیاں منہ میں رکھا کریں۔ چند دن میں دائمی فائدہ ہوگا +

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

کیمیاوی تیل

جن لوگوں کے اعضا گرم سرد ہو گئے ہوں یا کسی بیماری کے باعث اعضا میں کچھ وٹ اور سختی آگئی ہو۔ مانگیں۔ بازو یا ہاتھ یا پاؤں ناکارہ ہو گئے ہوں۔ وہ اس تیل کی مالش سے دوبارہ صحتیاب ہو سکتے ہیں +

صرف مالش کی دوا سے رگ اور پٹھے کھلتے جاتے ہیں۔ اور چند ہی دنوں میں ناکارہ اعضا پھر کام کرنے لگتے ہیں +

بالکل معجزہ معلوم ہوتا ہے +

قیمت فی شیشی تین روپیہ

ملنے کا پتہ

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

مُدر خاص

یہ نسوانی مرض کی لاجواب دوا ہے۔ ایام کی خرابیاں دور کر کے اخراج میں امداد دیتی اور درد و تکلیف کو رفع کرتی ہے۔

قیمت فی شیشی دو روپیہ

دافع زیادتی اخراج قیمت ایک روپیہ

دافع سیلان۔ فی شیشی تین روپیہ

ملنے کا پتہ

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

بواسیر کی دوا

ہر قسم کی خونی۔ بادی۔ بواسیری علاج کیا جاتا ہے۔ مسہ والی اور بغیر مسہ والی۔ مقعد کی امراض دور کرتی ہے۔ بے چینی +

تشویشی حالات ہمراہ آنے چاہئیں۔

قیمت فی شیشی پانچ روپے۔

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

شفائے نداں

پائیوریا کا حکمی علاج

بہترین قسم کی پائیوریا۔ پیپ خون۔ مسوڑے سے بدبو۔ مسوڑھوں اور دانتوں کے امراض کے لئے تیر بہدف نسخہ ہے +

قیمت فی شیشی دو روپے

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

معجون اکسیر الاجسام

یہ دل و دماغ، معدہ اور جگر کو قوت دینے میں مشہور ہے +

سات سال سے فروخت ہو رہی ہے۔

قیمت فی ڈبیہ چار روپیہ

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

سرمہ نور بصر

ہر گھر میں سرمہ استعمال ہوتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مفید سرمہ استعمال نہ کیا جائے۔

قیمت فی شیشی ہر

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

شیطانی خواب

خواب میں ہی انسان خراب ہو جاتا ہے۔ اس مرض کا مجرب علاج ہے۔

حبوب اکسیر

قیمت فی شیشی دو روپیہ

منیجر ہندی ویونانی دواخانہ شاہی محلہ لاہور

حکیم محمد یوسف حسن کی مشہور عالم طبی کتاب

طبِ مخفی

آج سے سات سال قبل شایع ہوکر بے حد مقبول ہوئی تھی۔ اس کتاب کی قیمت پانچ روپے فی جلد تھی۔ لیکن ایڈیشن اوّل کے ختم ہوجانے کے بعد تین سال تک یہ کتاب شایع نہ ہوسکی بالآخر شائقین فن کے اصرار اور آرڈروں کی بھرمار سے مجبور ہوکر طبِ مخفی کا سیکنڈ ایڈیشن

ارزاں ایڈیشن CHEAP EDITION

صرف عُشر فی جلد کا شایع کیا گیا ہے

طبِ مخفی کیا ہے

اطبائے جدید و قدیم کے پُر اسرار مجرّبات

(۱) طب مخفی میں ہندوستان کے ۲۰۰ کے قریب طبیبوں کے ذاتی مجرب نسخہ جات درج ہیں

(۲) طب مخفی میں حکیم محمد یوسف حسن کے ذاتی مطب کے تمام نسخہ جات درج ہیں۔

(۳) طب مخفی میں ۳۰۰ طبّی قلمی و مطبوعہ کتابوں کے مستند و تسلیم شدہ نسخہ جات درج ہیں۔ اور ہر کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۴) طب مخفی میں کیمیا کے متعلق بھی ایک باب ہے جسمیں بعض رموز بتلائے گئے ہیں +

کل ۴۵۰ صفحات کی ضخامت نسخہ جات کی تعداد دو ہزار سے زاید

اطبا اور تجربہ کار حضرات کا خیال ہے کہ دو سو کتابوں کے خریدنے سے اس ایک کتاب کا خریدنا زیادہ بہتر ہے اس کتاب پر آل انڈیا ویدک و یونانی طبّی کانفرنس سے تمغہ مل چکا ہے۔ قیمت عُشر محصول ڈاک ۸ر +

ملنے کا پتہ

مینیجر یوسفیہ کتب خانہ۔ بارود خانہ لاہور

موسم سرما

یونیفسری بجز

اپنا وزن - اپنی قوت بڑھالو - اپنا خون بڑھالو

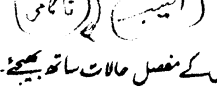
کمزوری کے علاج کے لئے بہترین اوقات ہیں۔ کیونکہ اس موسم میں مقویات کا استعمال حقیقی فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس لئے نوجوانی کی نا عاقبت اندیشیوں اور تباہ کن خرابیوں کے انسداد کے لئے ہم سے رجوع کیجئے۔ اور اپنے مرض کے مفصل حالات لکھ کر بھیج دیجئے۔ یا فارم تشخیص مرض ایک کا ٹکٹ بھیجکر منگوا لیجئے۔ یاد رکھئے کہ اس قسم کے امراض کا علاج صرف باقاعدہ اور مسلسل ہوتا ہے اور وہ بھی ہر شخص کے مزاج و عمر و ضرورت کے مطابق اگر آپ کو کوئی خاص مرض نہیں اور آپ صرف اپنی قوت کو برقرار رکھنے کے لئے یا معمولی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے کوئی دوا موسم سرما میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تو یقین کیجئے کہ

یا قوتی یونسفی سے بڑھ کر کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی۔ یہ دل و دماغ معدہ اور خاص اعضا کی تقویت میں بے نظیر ہے۔ گردوں کو طاقت دیتی اور شباب و جوانی کو قائم رکھتی۔ زایل شدہ قوت کو واپس لاتی ہے۔ بھوک لگاتی اور کھانا ہضم کرتی ہے۔ بہترین دوا ہے جو پندرہ سال سے فروخت ہو رہی ہے۔ قیمت فی بکس ایک پاؤ (۴۰ یوم کی خوراک) سات روپے +

دق و سل کا شافی علاج

دق و سل کے علاج کے لئے بہت سے اشتہارات اخباروں میں شایع ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص لکھتا ہے کہ اس کی دوا سب سے اچھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ تجربہ کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسی دوا واقعی مفید ہے +

دق پہلے درجہ میں ہو۔ آخری درجہ میں پھیپھڑوں سے خون آتا ہو یا ہضم۔ معدہ کی انتڑیوں میں ورم ہو۔ غدودیں پھولی ہوئی ہوں۔ طاقت روز بروز کم ہو رہی ہو۔ بخار رہتا ہو پسینہ رات کو آتا ہو۔ ڈاکٹروں نے مرض دق تشخیص کر لیا ہو تو اس معجز نما دوا کا استعمال ضروری ہے۔ یاد رہے کہ خانہ پری دق کا علاج دوسرا ہے۔ باقی سل و دق کی تمام حالتوں کے لئے یہ دوا مفید و مجرب ہے +



تسخیر رحمت

کا ایک بکس اس مرض کا حکمی و شافی علاج ہے۔ اس بکس میں چالیس یوم کی دوائیں ہیں مرض کے مفصل حالات ساتھ بھیجئے۔ تاکہ ہدایات بھیجنے میں آسانی ہو + قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک علاوہ +

ملنے کا پتہ

منیجر ہندی یونانی دواخانہ بارودخانہ لاہور

(جملہ حقوق محفوظ)

(اشاعت ۵۲۰۰)

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اس لئے ہمیشہ اس میں اشتہار دو

ایڈیٹر:- حکیم محمد یوسف حسن

قیمت فی پرچہ ۵ر- ویلریکب اسٹال پر ۶ر- چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و نرخ وی پی ہے۔ ممالک غیر سے ۸ شلنگ

نیرنگ خیال

"ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید و مثل کا"

فہرست مضامین

بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء

نمبر شمار			صفحہ
(۱)	حیات مانی	جناب مرزا عاشق علی بیگ خیال	۵
(۲)	شاہزادہ	جناب ڈاکٹر ضیاء الدین امرتسری	۹
(۳)	اورنگ زیب عالمگیر کے مقامات	جناب ظفر قریشی دہلوی	۱۱
(۴)	شیطان (افسانہ)	جناب مولانا صدیق ملیح	۱۵
(۵)	سیاح حوصلہ کا خانہ بدوش عجائب	مس جاب اسمعیل مدراس	۱۸
(۶)	استاد ادب	جناب اخوت عمر پوری	۲۱
(۷)	دُرِ نا سفتہ	جناب مسعود حسن دانا پوری	〃
(۸)	نپولین بوناپارٹ	جناب سید ہادی بی اے (علیگ)	۲۲
(۹)	〃	جناب عمر پوری	۲۷
(۱۰)	فسوانی خودسری (افسانہ)	جناب فخر حسن خاں تعلم بی اے سونی پتی	۲۸
(۱۱)	صبح کا منظر (نظم)		۳۵
(۱۲)	بھاشا کے ہندوستانی شعراء	جناب محمود آروی	۳۶
(۱۳)	میرا دوست فجو	جناب محمد خلیل الرحمٰن صاحب بی اے (علیگ)	۳۷
(۱۴)	ڈاک بابو	جناب اظہر علی فاروقی پروفیسر علوم اردو	۳۹
(۱۵)	غزل	جناب عزیز احمد۔ عزیز رامپوری	۴۲
(۱۶)	شیکسپیر فہمی	جناب فضل الرحمٰن صاحب سابق ایڈیٹر اخوت	۴۳
۱۷	پس پردہ	ایڈیٹر	۴۵
(۱۸)	شباب (غزل)	جناب سید شاہ محمد حسن نسیم عظیم آبادی	۴۹
(۱۹)	پیکر تصویر (〃)	جناب عزیز احمد کلیہ جامعہ عثمانیہ	۵۱
(۲۰)	زمزمۂ تغزل (〃)	جناب اقبال احمد صاحب سہیل	۵۲
(〃)	غزل	جناب شیخ عبداللطیف صاحب ایم اے کلکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول	〃

دمہ کی انوکھی دوا "گلشمال" کی ایک خوراک خورد سے اتنا فائدہ ہوتا ہے جو دوسری دواؤں سے ایک ماہ میں بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ سخت سے سخت دورہ چند منٹوں میں بند ہو جاتا ہے۔ نیا پرانا خشک تر دمہ ایک ہی شیشی کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ پہلی خوراک سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہو۔ تو دو واپس کر کے اکی قیمت مع دو طرفہ محصول ہم سے لے لیجئے۔ تکمیل تسلی کے واسطے دو خوراکیں نمونتاً اور واپسی قیمت کا اقرار نامہ ہر بار رسل میں بھیجا جاتا ہے۔

مینیجر گلشمال فارمیسی ۱۰ وکٹوریہ پارک شہر بنارس

نوٹ:- گردہ و مثانہ کے مریض اور سوزاک والوں کو نقصان دیتی ہے قیمت پتہ۔ محصول ڈاک

دیوان غالب مطبوعہ حجر مئی۔ قیمت تین روپے۔ ۳ے ر- کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی سے طلب فرمائیے:-

کریسنٹ پریس لاہور میں باہتمام علیم محمد یوسف حسن پرنٹر و پبلشر چھپا اور دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شائع ہوا۔

۶۸۶

شذرات

حضرت ریاض خیرآبادی کی یوسف نوازی

ایڈیٹر نیرنگ خیال کے قلم سے ایک افسانہ نیرنگ خیال اگست ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہی افسانہ لاہور کے ایک نئے ماہوار رسالہ روح ادب میں، دوبارہ شائع ہوا ہے۔ حضرت ریاض مدظلہ العالی کی نگاہ سے یہ افسانہ گذرا تو آپ نے اس سے متاثر ہو کر بدیں الفاظ یوسف نوازی فرمائی:۔

"میں نے آج روح ادب میں فسانۂ حیات دیکھا۔ بے ساختہ شگفتہ۔ رنگین و سادہ لٹریچر اور اس کے حسن بیان نے مجھے داد دینے کے لئے مجبور کیا۔ پنجاب زبان میں بھی کافی ترقی کر چکا ہے۔ اگر کچھ کمی ہے تو وہ بھی جلد پوری ہو جائے گی۔ فسانۂ حیات میں کثرت سے چبھتے ہوئے فقرے خاص کشش کو لئے ہوئے پائے گئے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ رومرد انی قلم عنانگیری سے بے نیاز تھا تکلف و تصنع کو دخل نہیں۔ جو کچھ ہے آمد ہے۔ قلم برداشتہ ہے۔" اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔ شاعرانہ نازک خیالیوں کا اس بے ساختگی سے ادا ہونا۔ نیاز و نگار کے لئے نہ ہو مگر میرے لئے تو موجب رشک ہے۔ البتہ عجلت کی وجہ سے کاتب کو صحت نگاری کا بھی موقعہ نہیں ملا"

حضرت ریاض مدظلہ العالی کا یہ بیش الفاظ میرے افسانہ کی داد دینا یوسف نوازی سے کم نہیں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ "پنجاب کا زبان میں بھی کافی ترقی کرنا" ایک خاص فقرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ پنجاب۔ یوپی اور دکن کی تخصیص نہ ہونی چاہئے۔ ہر صوبہ کے اردو داں اصحاب کا فرض ہے کہ وہ ملکی زبان کی ترقی کی کوشش کریں۔ اگر ہم اسے تسلیم کر لیں کہ یوپی اردو زبان کی ترقی کا گہوارہ ہے۔ تو اسے پنجاب یا دکن کی توہین نہ سمجھنا چاہئے۔ یوپی والوں کی مادری زبان کا تھم ہے۔ تو پنجاب اور دکن والوں کو زباندانی کا۔ اگر یوپی کے اہل قلم ہمیں زبان میں اصلاح دے سکتے ہیں تو پنجاب بلندی تخیل سے زبان کو ترقی پذیر دنیا کے ساتھ آگے بڑھا لیجانے کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس سلسلہ میں پنجاب اور یوپی کا نام ایک ہی سانس میں لینے کے ساتھ ہمیں حیدرآباد کو بھی نہ بھولنا چاہئے حیدرآباد کی مساعی بھی کچھ کم وزن نہیں رکھتی۔ باقی ہر زبان کا ایک "لوکل کلر" ضرور ہوتا ہے۔ زبان پر مقامی تاثرات ان کی نشوونما کبھی رک نہیں سکتی۔ دنیا کی تمام متمدن زبانیں ان اثرات سے معمور ہیں۔ انگلستان میں انگریزی بولی جاتی ہے۔ اس کے ملحقہ صوبوں ویلز اور سکاٹ لینڈ میں جانے پر آپ کو بین فرق معلوم ہوگا۔ اس طرح سے اردو جو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ اسپر پنجاب اور حیدرآباد میں مقامی رنگ چڑھا ایک فطرتی بات ہے۔ یوپی میں بھی شہری اور دیہاتی زبانوں میں فرق ہے۔ جو لوگ زبان کا جھگڑا صوبہ داری تقسیم سے کرتے ہیں۔ وہ ملک کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ انھیں حضرت ریاض کی طرح وسعت نظری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ انہی دنوں یوپی کے بعض اخبارات میں یوپی کے دو نوجوانوں نے نقد و نظر کے سلسلہ میں جو رنگ اختیار کیا ہے وہ زبان کی ترقی کے لئے سم قاتل ہے۔ ذاتی کاوشوں اور ہنگامی جوش و غصہ سے مغلوب ہو کر ایک قومی امانت کی تخریب شروع کر دینا حد درجہ المناک ہے۔ جو اہل قلم یوپی اور پنجاب کا جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔ اس سلسلہ میں گو ہمیں بار بار جوش دلایا گیا لیکن ہم نے دامن صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اصول کی پابندی انسان کا فرض اولین ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اسپر ابھی تک کاربند ہیں"

نیرنگ خیال کے قدیم اہل قلم کی طرف سے

سید حسن برنی صاحب بی اے ایل ایل بی بلند شہر سے لکھتے ہیں:۔ "تسلیم۔ پچھلے نیرنگ خیال میں آپ کا وہ نوٹ پڑھ کر مجھے بڑا لطف آیا۔ جس میں آپ نے نئے لکھنے والوں کو مخاطب کر کے کہا ہے۔ کہ "پرانے لکھنے والے کب تک لکھتے رہیں گے"۔

"میں انکی نمائندگی کرتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں۔ کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے اور ہاتھ میں قلم اور جب تک نیرنگ خیال کا سالنامہ زندہ و سلامت ہے وہ برابر لکھتے رہیں گے۔ اور جہاں تک ہو سکے گا ان کی کوشش بہترین لکھنے کی ہوگی"

سید حسن برنی کی نمائندگی اور ان کا اظہار خیال ہر آنکھ میں پر۔ یہ پرانے معاونین کی ہی برکت ہے کہ نیرنگ خیال کے قلمی معاونین کی فہرست میں ہر سال قابل قدر

اضافہ ہوتا ہے۔ جتنے اچھے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ اور آئندہ ہوں گے اُن کا کریڈٹ بھی آپ کا ہی حصہ ہے ؛

تصحیح گذشتہ نمبر ایک افسانہ چچا آنکھوں کن شائع ہوا تھا۔ یہ کسی روسی افسانہ کا ترجمہ نہ تھا۔ بلکہ محمد رافع الحمدی صاحب کا طبعزاد افسانہ تھا۔ جو روسی طرز کے افسانوں کی تقلید میں لکھا گیا تھا ؛

تصاویر اس ماہ نیرنگ خیال میں کوئی رنگین تصویر شائع نہیں ہو رہی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ لاہور کے تین پریس۔ سالنامہ کی تصویروں اور بلاکس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اتفاق سے ایک پریس کا بلاک ساز ایک سیاسی مقدمہ میں گرفتار ہو گیا۔ اور نیرنگ خیال کی تصاویر کی تیاری میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اسوقت سالنامہ کی تصاویر کا اتنا کام ہمارے سامنے ہے کہ ہم کسی صورت بھی دسمبر نمبر کے لئے کوئی نیا بلاک تیار نہیں کرا سکتے۔ ہم فضول بلاک شائع کرنے کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک مقامی ہمعصر نے کیا ہے۔ اس نے اس ماہ بھی اور گذشتہ ماہ بھی ریلوے کے دفتر سے استعمال شدہ بلاک حاصل کر کے چھاپ لئے ہیں۔ اُس کے ناظرین نے تو یہی سمجھا ہو گا کہ جناب مدیر صاحب ——— نے کم از کم ایک بلاک پر سو سو روپیہ خرچ کئے ہوں گے۔ اور مصلیہ عمارتوں و قدرتی مناظر کی رنگین تصاویر پیش کر کے اپنے مذاق کی داد حاصل کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک پھوٹی کوڑی خرچ کئے بغیر یہ بلاک حاصل کر لئے گئے تھے ؛

ہم اس ماہ کی کمی کو نیرنگ خیال کے جنوری نمبر اور عید نمبر میں پورا کر دیں گے۔ اور جو بلاک دسمبر نمبر کا بن رہا ہے وہ بطور زائد بلاک کے آئندہ ماہ پیش کر دیا جائیگا

اس ماہ ان ادیبوں کی تصاویر شائع کی جا رہی ہیں جنھوں نے نیرنگ خیال کے سالنامہ کو اپنے شاہکاروں سے مزین کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مغلیہ عمارت اور ایک صفحہ دنیائے فلم کے لئے مخصوص ہے۔ جس میں مسٹر خلیل احمد صاحب مشہور فلم ایکٹر کی تصویر شامل ہے۔ مسٹر خلیل احمد ہندوستان کی صنعت فلم سازی کے اولیں ستاروں میں سے ہیں۔ آپ دنیائے فلم پر چمکتے رہے ہیں۔ اور اسوقت تک کم از کم ایکسو فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ دوسری تصویر مشہور جاپانی ایکٹرس انیانے وونگ کی ہے۔ جو امریکہ اور انگلستان کی فلموں میں لازوال شہرت حاصل کر چکی ہے کسی مشرقی ایکٹرس کا مغرب میں جا کر اتنی کامیابی حاصل کر لینا بالکل عدیم المثال ہے ؛

جنوری نمبر اور عید نمبر رنگین تصاویر سے مزین و مرصع ہو گا ؛

ایڈیٹر

۱۹۳۱ء کی آمد اور ۱۹۳۰ء کا افتتاح

دسمبر نمبر ۱۹۳۰ء کا آخری پرچہ ہے۔ الحمد اللہ کہ نیرنگ خیال اپنے ہزارہا ناظرین کی دلچسپی اور تعلق طبع کا سامان ہر ماہ مہیا کرتا رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ہم نے کسی دو ماہ کا پرچہ بھی بکجا شائع نہیں کیا۔ اور ڈاکخانہ کی دستبرد کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنے ناظرین کی شکایتوں کو بغور سننے اور دوبارہ پرچہ بھیجنے کی طرف کامل توجہ رکھی ہے اور پرچہ کی تاریخ کو لاہور سے باقاعدہ روانہ ہوتا رہا ہے

جب سے پرچہ بڑے سائز پر ہوا ہے دفتر پر قریباً اڑھائی ہزار روپیہ سالانہ کا مزید بار پڑ گیا ہے لیکن ہمارے معاونین اور سرپرست بھی غافل نہیں رہے اور توسیع اشاعت میں کچھ نہ کچھ حصہ لیتے رہے ہیں۔ لیکن دو سو کے قریب اشاعت بڑھ جانے سے وہ خسارہ پورا نہیں ہو سکتا جو ہمیں اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ نیرنگ خیال کا ہر ایک خریدار اپنے دل سے فیصلہ کرے کہ جنوری سے کم از کم دو دوستے خریدار ضرور ہی مہیا کر دے گا۔ اگر آپ نے اس طرح کامل توجہ کی تو پھر نیرنگ خیال کی خوبیوں میں مزید اضافہ ہو سکے گا۔ دیکھئے ہندی کا رسالہ چاند ۱۵ ہزار چھپتا ہے۔ حالانکہ اسکا سالانہ چندہ ۹ روپے ہے۔ آپ تین ساڑھے تین روپیہ کا نیرنگ خیال بھی خرید نہیں سکتے۔ تو اردو زبان اور اسکا لٹریچر کیسے ترقی کر سکتا ہے ؟

جنوری نمبر ان اصحاب کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ جو شروع سال میں جنوری سے خریدار ہوئے تھے۔ انھیں اسی چندہ میں عید نمبر بھی ملے گا۔ جو بے حد دلچسپ ہو گا۔ اس کا حجم بھی زیادہ ہو گا۔ قیمت ایکروپیہ (عدد) ہو گی۔ مگر جنوری سے خریدار ہونیوالوں کو یہ پرچہ اسی چندہ میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور خاص نمبر۔ اقبال نمبر اور "داستانہائے قدیم کے عمر نسیان" بھی ملیں گے۔ پھر اس قلیل چندہ میں آپ کو نہ صرف رسالہ کی خریداری جاری رکھنی ہے۔ بلکہ اس کی اشاعت میں بھی حصہ لینا ہے۔ رسالہ کا سائز یہی رہے گا۔ اور عید نمبر بھی اسی سائز پر شائع ہو گا ؛

منیجر

سالنامہ

الحمدللہ کہ سوقت نیرنگ خیال کا سالنامہ دفتری کے پاس ہے جو اس کی سلائی وغیرہ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انشاء اللہ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں سالنامہ لاہور سے روانہ ہونا شروع ہو جائے گا۔ اور ان تمام اصحاب کے نام سالنامہ (بغیر) مع محصول ڈاک میں وی پی بھیجا جائے گا جنہوں نے پچھلے سال خریدا تھا۔ یا جنہوں نے امسال آرڈر بھیجا ہے۔ جن اصحاب کو ۱۵ تاریخ تک سالنامہ نہ پہونچے وہ سمجھ لیں کہ کسی وجہ سے انکا نام رجسٹر میں درج نہیں ہو سکا تھا۔ وہ دوبارہ ایک کارڈ لکھ کر منگوالیں۔ نیرنگ خیال کا سالنامہ اتنا اچھا اور اتنا نظر فریب ہے کہ ہم نے اپنے گذشتہ تینوں سالناموں کو شکست دیدی ہے۔ اس کا نام سالنامہ ۱۹۳۱ء ہے سالنامہ ۱۹۳۲ء کا ٹائٹل اتنا نظر فریب ہے کہ بڑے بڑے سالناموں کی تمام تصاویر کی خوبصورتی اس ایک ٹائٹل کے برابر بھی نہیں۔ اور یقیناً ہمارا ٹائٹل ہی ان کے پورے سالنامہ سے زیادہ جاذب نظر ہے۔ بعض احباب بار بار لکھ رہے ہیں کہ نیرنگ خیال کے سالنامہ کا سائز نہ بڑھایا جائے۔ یہ حضرات مطمئن رہیں کہ حسب اعلان ماہ گذشتہ ہمارا یہ خیال کسی مشکلات کے متکلب نہ ہوں گے۔ ہم ایک بار بہت بڑے سائز پر سالنامہ شائع کر چکے ہیں۔ مگر وہ عام طور پر ناپسند کیا گیا تھا۔ اس لئے ہم اسی سائز پر سالنامہ شائع کر رہے ہیں۔ سب سے کہ دسمبر تک اور سالنامہ ملا کر ایک جگہ جلد بندھوا سکیں گے اور آئندہ جنوری ۱۹۳۱ء سے دسمبر ۱۹۳۱ء تک کے تمام پرچے بھی سالنامہ جلد کرا سکیں گے۔

سالنامہ نیرنگ خیال کی انشاء و ریاداب اور بے مثل ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں آرٹ کا مرقع ہیں۔ بعض معاصرین روپیہ دو روپیہ والے گھٹیا درجہ کے بلاکس جمع کر کے زیادہ تعداد میں چھاپ رہے ہیں۔ اور درجنوں بلاک دو سرے رسائل سے عاریتاً مانگ لئے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے تمام بلاکس کی قیمت تو صرف نیرنگ خیال کے ٹائٹل کے برابر بھی نہ ہو گی اگرچہ اتنے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ اس قسم کا فرسودہ پرچہ شائع کرنا قابل افسوس ہے۔ اس "بڑے سالناموں والوں" کی یہ حقیقت معلوم کر کے ہمیں بے حد تعجب ہوا کہ ان کا معمولی دسمبر نمبر صرف چار سو چھپا ہے۔ جن رسائل کے خریداروں کی حقیقی تعداد انگلیوں پر شمار ہو سکتی ہو اور ابھی نصف ہزار تک بھی نہ پہونچے ہوں۔ انھیں دوسروں کو مورد طعن و تشنیع کرتے وقت "ڈینگ مارتے" ہوئے حقائق کو تو پیش نظر رکھنا چاہیے

سالنامہ نیرنگ خیال کا ایک ایک مضمون لاجواب اسکی ایک ایک تصویر بے مثل اور اس کا ٹائٹل اور دیگر خوبیاں حیرت انگیز ہیں۔ مفصل اعلان مضامین کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔

اگر آپ نے ابھی سالنامہ کے لئے آرڈر نہیں دیا تو انتظار کس بات کا ہے؟!

بعض مضمون نگار و شعرا

اپنا مجموعہ کلام اور شائع شدہ مضامین برائے اشاعت بھیجدیتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ نمبر میں ایک ایسی نظم شائع ہو گئی تھی۔ جو اس سے پیشتر کسی دوسرے رسالے میں شائع ہو چکی تھی۔ ہم نے اس کے نیچے بھی یہ سمجھ کر کہ یہ خاص طور پر ہمیں بھیجی گئی ہے۔ لفظ خاص لکھدیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی دوسرے رسالے میں طبع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ بعض احباب نے توجہ دلائی ہے کہ ایک دو ایسے افسانے بھی شائع ہوئے ہیں۔ جو دوسرے رسائل میں دیگر مضمون نگاروں کے قلم سے شائع ہو چکے ہیں۔ کسی غیر زبان کے کسی افسانہ یا مضمون کا ترجمہ اگر دو مختلف آدمیوں نے کیا ہو۔ تو انکو شائع کرتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ ہر مترجم افسانہ میں ایک خاص انداز تحریر کو پیش کرتا ہے۔ اس قسم کی غلطی بسا اوقات یوں بھی سرزد ہو جاتی ہے کہ اول تو تمام رسائل کا مطالعہ محال ہے۔ پھر اسکو یاد رکھنا کہ فلاں فلاں افسانہ چھپ چکا ہے اور بھی مشکل ہے۔ آخری وجہ یہ ہے۔ کہ بیشتر رسائل میں ترجمہ کے ساتھ اصل مصنف کا نام نہیں ہوتا۔ اس لئے بعض مترجم اپنے ترجمہ شدہ افسانوں کا دوبارہ ترجمہ کر لیتے ہیں۔ اور ایڈیٹر انھیں شائع کر دیتے ہیں۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر

حیاتِ مانی

(از جناب مرزا عاشق علی بیگ - خیال - مراد آبادی)

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۰ء میں ہم مانی کا تعارف ایرانی پیغمبر کے عنوان سے کرا چکے ہیں - اب اس وقت میں ایران کی اس جلیل القدر ہستی کی سوانح حیات پیش کی جاتی ہے ٭

پیشتر اس کے اصل موضوع سے بحث کی جائے - اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مانی کی سوانح حیات کے مسئلہ پر روشنی ڈالنا مشکل ہے - کیونکہ اس میں روایاتِ متضاد کا تناقض و پیچیدگی اسقدر موجود ہے - کہ اس کا سلجھانا - اور اس کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا کارے دارد کا مصداق بن چکا ہے - زمانہ نے مانی کے آثار کو نہایت بیدردی کے ساتھ مٹایا ہے - اور آج اس کی زندگی پر کوئی سیر حاصل تبصرہ کرنا دشوار سا کر دیا ہے ٭

بایں ہمہ جب ہم اس موضوع پر غور کرتے ہیں تو اس سلسلہ میں تین ماخذ ہماری رہنمائی کرتے ہیں ٭

(الف) وہ قصے اور روایتیں جو عوام کی زبانوں پر جاری ہیں ٭

(ب) وہ تحریریں اور مقالات جو مورخین نے اپنی تصنیفات میں لکھے ہیں ٭

(ج) وہ قلمی نوشتے اور کتبے جو ترکستان کے قدیم شہر تورفان کے کھنڈرات سے موجودہ صدی میں برآمد ہوئے ہیں ٭

پہلا ماخذ یعنی حکایات و افسانے - اسقدر متضاد اور بعید از عقل ہیں کہ حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھانا مشکل ہو گیا ہے - ان حکایات و روایات میں مانی کو کہیں تو شاعر بے بدل - کہیں نقاش بے مثل - کہیں موسیقی داں - فسوں کار - کسی جگہ پیغمبر معجزہ نما - کہیں ایک ذلیل انسان کسی میں ایک غلام زرخرید کبھی اس کو ایران کے اعیان و اشراف میں سے ایک وجیہ الشان ثابت کیا گیا ہے - لہذا ہر ہیں چاہئیں کہ کوئی ان پر تبصرہ و تضاد روایات کو سلجھائے اور تحقیقی حیثیت سے ان کا جائزہ لے - پھر کسی نتیجہ کو دنیا کے سامنے پیش کر سکے ٭

اب رہا دوسرا ماخذ یعنی وہ بیانات جو کتب و رسائل کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ان پر اس لئے اعتماد نہیں کیا جا سکتا - کہ یہ سب سے سب آلودہ تعصب اور کینہ وش ہیں - اور سرتاسر یہ بیانات مخالفین مانی کے لکھے ہوئے ہیں - اسواسطے ان سے بھی مانی کے متعلق مکمل اور صحیح معلومات حاصل کرنا دشوار ہے ٭

اب تیسرا ماخذ شہر تورفان سے برآمد شدہ آثار باقی رہ جاتے ہیں جو مانویت کے طالب علم کے لئے موثق اور سب سے صحیح ذخیرہ معلومات ہیں - بہرحال اس مقالہ میں ان تینوں ماخذوں کی مدد سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ٭

مانی ہر قوم کی زبان میں - مانی کے نام سے مشہور نہیں ہے - اس میں بھی بڑا اختلاف موجود ہے - عیسائی مورخین مانی کو کورپکوس کہتے ہیں - اور مغرب میں کورپکوس کے نام سے موسوم ہے بعض شرقی اہل قلم نے اس کا نام اقلورپقوس لکھا ہے - اور یہ اختلاف محض بلحاظ تلفظ ہے - جرمنی کے مشہور عالم کسلر نے مانی کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے - اس میں ثابت کیا ہے کہ لفظ کورپکوس عربی کلمہ مشترپک سے مشتق ہے - لیکن البیرونی - مسعودی - یعقوبی - فردوسی - نے مانی کا نام مانی ہی استعمال کیا ہے ٭

لفظ مانی کی علم اشتقاق کی رُو سے ابتک تحلیل نہیں ہو سکی - اور نہ اس کے معنی معین کئے جا سکے ——— جرمن مستشرق پروفیسر فرڈی زین نے اپنی کتاب "مانی ایران" میں لکھا ہے - کہ کلمہ مانی ہر صورت میں ایک مذہبی نام ہے - اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مانی اسکا لقب تھا - اصلی نام کچھ اور ہوگا ٭

یونانیوں نے اس کا نام مانیکوس لکھا ہے - جس کا عربی مادہ فاتاک ہے - مانی کا باپ فاتاک ہمدان کے فضلا اور شرفا میں سے تھا - جس کا اصلی وطن نیشاپور تھا ٭

مذکورہ واقعہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے - کہ جو لوگ مانی کو ایرانی نژاد خیال کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں :-

مانی کی ماں کا نام مائیس - اور اوتانیم - یا مریم تھا - اس کا سلسلہ نسب اشکانی خاندان کے سلاطین سے جا ملتا ہے ٭

مشہور ہے کہ فاتاک - ہمدان نے مدائن چلا گیا تھا - اور ایک مدت دراز کے بعد بہت ممکن ہے کہ شہر ماڈوریں میں ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں مانی پیدا ہوا - یہ زمانہ اردوان پنجم خاندان اشکانی کے آخری بادشاہ کے حکومت کا تھا ٭

مانی کی تعلیم و تربیت مورخین کا خیال ہے - کہ فاتاک مذہب صابی اور وثنی اور نفاذ مانی کی ولادت سے پہلے وہ ایرانی اور زردشتی مذہب تھا - لیکن مانی کی ولادت کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ بابل کی طرف چلا گیا - اور فرقہ مغتسلہ کا پیرو ہو گیا -

فاتاک نے مانی کی تعلیم و تربیت میں بہت ہی کوشش کی تھی۔ اور اس کو بچپن ہی سے مسائل دینی سے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ مانی بارہ سال کی عمر میں اپنے دین و مذہب کی اچھی خاصی واقفیت رکھتا تھا۔

مانی کی نبوت اور تبلیغ

فہرست العلوم میں لکھا ہے کہ فاتاک نے مانی میں ایک دن یہ صدائے غیب سنی:۔

"لے فاتاک گوشت نہ کھا۔ شراب نہ پی اور عورتوں کی معاشرت سے پرہیز کر"۔

کسکر کہتا ہے۔ کہ مانی خود بھی ان چیزوں سے پرہیز کیا کرتا تھا۔ یہ بھی کسکر ہی کی روایت ہے۔ کہ جس وقت مانی پیدا ہوا ہے اس کے چہرہ پر خاص قسم کی دل آویزی اور تبسم پایا جاتا تھا۔ نیز اس کے تولد کی حالت غیر معمولی اور تعجب خیز و معجز نما تھی۔ ۱۲ سال کی عمر میں ایک فرشتہ جس کا نام التوم تھا۔ وہ اسپر نازل ہوا۔ اور فضائے نور کے پیغامات اس کے پاس لایا۔ لیکن چونکہ مانی ابھی خورد سال تھا۔ اس لئے اس نے ابھی اپنی بعثت کا اعلان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب اس کی عمر ۲۴ سال کی ہو گئی۔ فرشتہ مذکور پھر آیا۔ اور اس سے حسب ذیل کلام عجیب کہا:۔

"اے مانی! بندائے نور کی طرف سے تجھ پر سلام ہو۔ میں تجھے خوشخبری دیتا ہوں کہ پروردگار نے تجھ کو اپنے پیغامات (مخلوق تک) پہونچانے کے واسطے اپنا برگزیدہ انتخاب کیا ہے۔ تاکہ تو ظلمت کے پردہ کو دور کر حقیقت کے چہرہ سے اٹھا سکے اور اختلافات مذہب کی تیرگی کو سچائی و صداقت کے انوار سے روشن کر سکے۔ خدائے برتر کے احکامات امر و نواہی احسن طریقہ سے اس کے بندوں تک پہونچا۔ تجھ کو اس مقدس اور اہم فرض کے انجام دینے میں عزم قوی اور عقیدہ محکم کو استعمال کرنا چاہئے"۔

مانی نے شاپور اول بن اردشیر بابکان کی تخت نشینی کے دن ۲۰ مارچ ۲۴۲ء کو اسی کے دن اپنی نبوت کا اعلان کیا۔

کتاب شاپورگان میں مانی کی شاپور سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ البیرونی لکھتا ہے:۔

"مانی نے نہایت مخصوص حلقہ میں اپنی دعوت خود اردشیر کے عہد حکومت میں شروع کر دی تھی"۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ساسانی دربار اور دارالخلافہ ایران میں مانی کے مذہب کو عروج نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت جلد اپنے بارہ معتقدین کے ساتھ مشرقی ایران اور ترکستان۔ ہندوستان کی طرف سیاحت کے واسطے روانہ ہو جاتا ہے

اس کے بعد ان ممالک میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے اپنے شاگردوں کو داعی بنا کر بھیجتا ہے۔

بنا بر روایات و قصص جس روز سے مانی نے اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ زردشتی علما کی طرف سے مخالفت و ایذا رسانی کا طوفان برپا ہو گیا۔ حالانکہ مانی نے شاپور کے بھائی پرویز سے تعلقات پیدا کر کے شاپور سے اپنے مذہب کی نشر و تبلیغ کی آزادی حاصل کر لی تھی۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو اپنا پیرو اور مرید بنا لیا تھا۔ لیکن پھر بھی مؤبدوں کی سخت مخالفت نے اس کے مذہب کو اپنی بنیادیں استوار نہ کرنے دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ ایران میں اس کے بہت سے معتقد اور متبع پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن خود مانی مشرقی ایران۔ ترکستان۔ ہندوستان میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

بہرام بن ہرمز کے عہد حکومت میں مانی پھر ایران کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور سب سابق مؤبدوں کی مخالفت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ بہرام اس کشمکش کو مٹانے کی خاطر ایک مجلس منعقد کرتا ہے۔ جس میں تمام زردشتی علما اور مانی کے درمیان گفتگو شروع ہوتی ہے۔ مؤبدان مؤبد کہتا ہے کہ

"جو کوئی شخص اپنے معبود کے احکام خلاف ورزی کرے۔ اس کی سزا یہ ہے۔ کہ اس کے حلق میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینا چاہئے"

مانی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ

"اس قسم کی وحشیانہ سزاؤں کو جائز رکھنے والا خدا عادل تو ہو نہیں سکتا یہ تو سراسر ہے"

اس مناظرہ کے بعد زردشتی علما مانی کے قتل کا فتوے دیدیتے ہیں۔ اور مانی بہرام کے حکم سے قتل کرا دیا جاتا ہے۔

مانی کے حادثۂ قتل کا سنہ ۲۷۶ یا ۲۷۷ ہے۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔

لیکن البیرونی کے قول کے مطابق شاپور اول نے اپنے بھائی کے ذریعہ سے مانی کے مذہب کو قبول کیا تھا۔ اور اس کے دل میں مانی کی بے انتہا محبت تھی۔

مگر جس وقت وہ مؤبدوں سے مناظرہ میں ہار گیا تو اس نے مانی کی جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا۔ اور یہ شرط لگا دی کہ وہ سرزمین ایران پر کبھی قدم نہ رکھے۔

جب مانی بہرام بن ہرمز کے عہد میں دوبارہ ایران میں پہونچا۔ تو بہرام نے غصہ ہو کر اس کو قتل کرا دیا۔

جرمن مستشرق پروفیسر اشپیگل نے ایک روایت آپی فانوس کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سیتانوس نامی ایک شخص عرب کا رہنے والا تھا۔ اس کو یونانی علمیات و ادبیات سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے عقائد مشرکین سے کافی واقفیت بہم پہونچائی تھی۔ وہ علمی مشغولیت کے علاوہ تجارت بھی کیا کرتا تھا۔ اور اس سلسلہ میں اس نے ہندوستان۔ مصر کی سیاحت کرکے کافی دولت جمع کرلی تھی۔ اس کے بعد ترک سفر کرکے اس نے ہیپ سلا شہر میں حکومت اختیار کی اور ایک خوبصورت عورت کو اپنا شریک زندگی بنالیا تھا۔

اس وقت جبکہ وہ تمام مذاہب مختلفہ کے مطالعہ کے بعد دنیاوی ثروت اور خانگی معاشرت کی بہشتوں میں پُرسکون ہو کر بیٹھا۔ تو اس نے چار کتابیں تصنیف کیں۔ ——— جس زمانہ میں وہ مصروف تصنیف تھا۔ اس نے فلسطین کے پیغمبروں کی شہرت سنی جو خدا اور اس کے بیٹے سے کلام کرتے تھے۔

سیتانوس نے محض اس خبر کی تصدیق کی خاطر قدس شریف کا قصد کیا۔ اور وہاں پہونچکر موسائی علما سے حضرت موسےٰ کے مذہب کے خلاف مناظرے اور مناقشہ کا بازار گرم کردیا۔ اور اپنی تعلیمات و نظریات کو ان کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ لیکن یہودی علما میں سے کسی نے بھی اس کے نظریات کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی تعلیمات عوام کے افکار میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کے ناقابل ثابت ہوئی تو بحالت ناامیدی اس نے فسوں گری اور ساحری۔ شعبدہ بازی سے معجزات دکھانے کی کوشش کی۔ جن کا علم اس نے ہندوستان و مصر کے دوران سیاحت میں حاصل کیا تھا۔ لیکن اس کی جادوگری نے سب سے پہلے اسی کی گردن میں موت کی رسّی ڈال کر اسکو ہلاک کردیا۔ وہ ایک دن ایک معجزہ (شعبدہ) دکھانے کے لئے چھت پر چڑھا اور وہاں سے چھلانگ لگائی۔ لیکن زمین پر گرتے ہی جان دیدی۔

تیرہ ہیمندوس اس کا ایک شاگرد تھا۔ وہ اس کے بعد اسکی تعلیمات اور کتب خانہ کا وارث بنا۔ اس نے اپنے استاد کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ چونکہ اس کے شاگرد کی اس کی بیوی سے ناچاقی تھی۔ اس لئے وہ اپنے استاد کی تمام میراث علمی لے کر ایران میں اقامت گزیں ہوگیا۔ اور جو کچھ اس نے اپنے استاد سے سیکھا تھا۔ اس کی تبلیغ شروع کردی۔ اور مہر پرستوں سے مناظرہ و مناقشہ میں مصروف ہوگیا لیکن قسمتی سے وہ بھی اپنی تعلیمات و نظریات کی صداقت لوگوں کے دلوں میں نقش نہ کرسکا۔ اور یاس و ناامیدی کی حالت میں اپنے استاد کی طرح سحر و ساحری و افسوں گری پر آمادہ ہوگیا تاکہ اس شعبدہ بازی ہی سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کچھ کر دکھائے لیکن اعجاز نمائی میں۔ اپنے استاد کی طرح خود بھی چھت پر سے گر کر ہلاک ہوگیا۔

ایران میں تیرہ ہیمندوس جس بوڑھی عورت کے گھر میں قیام پذیر تھا۔ تمام کتابیں اور سامان اسی کے قبضہ میں آیا۔ ایک مدت کے بعد اس عورت نے ایک غلام خرید ا۔ جس کا نام کورسکوس یا قورسقوس یا مانس تھا۔ وہ اس کے پاس رہا۔ حتیٰ کہ اس عجوزہ نے اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ سیتانوس کا ذخیرہ علمی اب کورسکوس یا مانی کے ہاتھ آیا۔

مانی نے ان کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور اپنی تعلیمات کا ان کو رنگ بنیاد بنایا اور جب اس نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی تو ایرانیوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور سوائے چند اشخاص کے کوئی اسپر ایمان نہ لایا۔

مانی کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔ کہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی تعلیمات کے دائرہ نفوذ کو وسیع کرسکے۔ کہ اس اثنا میں شاہ ایران کا بیٹا ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہوگیا جس کے واسطے کسی حاذق طبیب کی تلاش ہوئی۔ مانی نے اس امید پر کہ اس کی پرانی کتاب اس کو شہزادہ کے معالجہ میں کامیابی بخشیں گی۔ اور اس اعجاز مسیحائی سے وہ شہنشاہ ایران کو اپنا مذہبی پیرو بنا کر حکومت کی طاقت سے اپنی تعلیمات کو فروغ دے گا۔ فوراً ادا الخلافہ کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن معالجہ امید کے برخلاف صورت پذیر ہوا۔ یعنی شہزادہ مانی کے زیر علاج ہی انتقال کر گیا۔ اور مانی پابجولاں جیل خانہ میں ڈالدیا گیا۔

اس واقعہ سے پہلے مانی نے بائیس شاگردوں میں سے ترمن منتخب اور صاحب ہوش شاگردوں کو قدس شریف کی طرف اس لئے روانہ کیا تھا۔ کہ وہ کلیسا کے مذہب کا مطالعہ کریں اور اس مذہب کی بعض اہم کتابوں کو مانی کے واسطے روانہ کریں۔ اس کے یہ شاگرد جن کے نام علی الترتیب تو ماس۔ ہاوماس۔ آدا۔ تھے۔ جب منزل مقصود پر پہونچے تو یہاں کتابوں کے جمع کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اور ایک طویل عرصہ کے بعد ایران کو واپس ہوئے۔ یہاں خلاف امید مانی کو اسیر زندان پایا۔ بڑی مشکل سے وہ ان کتابوں کو جو انھوں نے مانی کے واسطے فراہم کی تھیں زندان میں اس کو پہونچا سکے مانی نے ان کتابوں کا قیدخانہ ہی میں نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا۔ اس گہرے مطالعہ کا ہی یہ اثر ہے کہ مانی نے بہت سی اہم اور مفید باتیں جو دین عیسوی سے اخذ کی تھیں وہ اس کی تعلیمات میں جلوہ گر ہیں۔

اس کے بعد مانی قیدخانہ سے بھاگ نکلتا ہے۔ اور عربستان پہونچتا ہے۔ وہاں رودخانہ استرانگا کے نزدیک بود و باش اختیار کرتا ہے

یہاں مانی کو ایک عیسائی راہب کے متعلق اطلاع ملتی ہے۔ جس کا نام مارسلوس ہے۔ لوگ اس کی بڑی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ وہ اس سے ملنے کا قصد کرتا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ کسی طرح اس کو اپنا مرید بنالے۔ اُسے امید تھی کہ اگر مارسلوس اس کا

مذہب اختیار کر لیا۔ تو صرف جزیرہ عرب ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں مانی کے نام کی شہرت ہو جائے گی۔

چنانچہ اس نے اپنے ایک شاگرد کی معرفت جس کا نام تیرآبون تھا۔ ایک خط مارسلوس کے نام بھیجا اور اس کو دعوتِ مناظرہ دی۔ مارسلوس نے جس کو قبول کر لیا۔ مارسلوس نے مانی کی تعلیمات کے متعلق پوری واقفیت مانی کے نامہ بر شاگرد سے باتوں باتوں میں معلوم کر لی۔ ایک عرصہ قلیل کے بعد مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ تو مارسلوس نے مانی کو سخت زچ اور لاجواب کیا۔ اور اس کے نظریات مذہبی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا کیونکہ وہ مانی کے عقائد کا پہلے سے علم حاصل کر کے مقابلہ کے لئے بالکل تیار تھا۔ اور مانی کو اس کے معتقدات کا کچھ بھی علم نہ تھا کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کر مانی کو مارسلوس کے شاگردوں سے جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ اور بڑی مشکل سے وہاں سے نجات پائی۔

باایں ہمہ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اور شہر دیوری پہونچا۔ وہاں بھی اس نے دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ مباحثہ کئے۔ اور پھر شکست کھائی۔ اس کے بعد نہایت خستہ حال ہو کر عرب کو واپس ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد شاہ ایران کے حکم کے مطابق اس کو گرفتار کر کے ایران کو بھیجا گیا۔ اور وہاں اس کی کھال کھینچ کر گھاس بھر کر شاہراہ عام پر آویزاں کر دیا گیا۔

یہ ہے مختصر سوانح حیات اس ہستی کی جس نے دنیا میں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنا چاہی تھی۔ لیکن بدقسمتی نے اس کا آخری دم تک ساتھ نباہ کر اس کو ہلاکت کی آغوش میں دے ہی دیا۔

(مرزا عاشق علی بیگ۔ خیال)

چار کتابیں

عملیات

اگر آپ اس فن کی معتبر صحیح اور لاجواب تصنیف مطالعہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں قدیم و جدید عملیات کو صحیح اور سمجھ میں آنے والے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ تو اس کتاب کو منگوائیے۔ اس میں اعمال تعویذ و وظائف۔ فالنامے وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔ حجم تین سو صفحات۔ لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ بہترین۔ قیمت تین روپے (ستے) علاوہ محصول ڈاک۔

فلاح دین و دنیا

یہ کتاب تیسری بار چھپی ہے۔ اسے شریعتِ اسلام کی سائیکلوپیڈیا کہنا چاہئے۔ مذہب اسلام کے متعلق اس میں ہر ایک ضروری مسئلہ موجود ہے۔ حجم ۵۷۰ صفحہ۔ کاغذ وغیرہ بہترین۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ (للہ)

ملنے کا پتہ:-

مینجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور

اسلامی زندگی

جس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد کے ماتحت اسلامی معاشرت سے تعلق رکھنے والے تمام ضروری و نازک مسائل کو نہایت تحقیق و تصدیق کے بعد معتبر کتابوں سے جمع کیا گیا ہے۔ جن کی اس پرآشوب زمانہ میں مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحہ۔ قیمت دو روپے چار آنے (محہ)

تذکرہ اولیائے ہند

اس کتاب میں ہندوستان بھر کے اولیاء اللہ کے سوانح حیات تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ اس میں قریباً تین سو اولیاء اللہ کا ذکر ہے۔ جس کے کشف و کرامات و ورد و وظائف اور احکام و نصائح وغیرہ سب کچھ درج ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت چار روپیہ (للہ)

پتہ:-

مینجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور

شاہزادہ

ٹیگور کا ایک شاہکار

(اس قصہ کی مثال میں انسان کی زندگی کی ابتدا اور انتہا کا نقشہ کھینچا گیا ہے)

(از جناب ڈاکٹر ضیاء الدین - امرتسری)

(۱)

شاہزادہ اپنا تاج و تخت چھوڑ کر چل دیتا ہے۔ ساتوں بادشاہوں کی ساتوں سلطنتوں سے نکل جاتا ہے۔ اور کسی ایسے ملک میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں کسی بادشاہ کی بادشاہت نہیں۔ بھائی بس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

شہروں اور دیہاتوں میں لوگ اپنے اپنے روزگار۔ گھر بار میں مصروف ہیں۔ لڑتے ہیں۔ جھگڑتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ شاہزادہ اپنی ہی سلطنت چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔

کیوں؟

کنوئیں کا پانی ہے تو وہ کنوئیں ہی میں مطمئن کھڑا ہے۔ تالاب اور جوہڑ کا پانی ہے تو وہ تالاب اور جوہڑ ہی میں تیرا ہے۔ لیکن جو پانی پہاڑ کی چوٹیوں پر ہے وہ چوٹیوں ہی پر ٹھہر نہیں رہ سکتا۔ بادلوں کا پانی بادلوں کی گرفت سے نکل ہی جاتا ہے۔ تو پھر شاہزادہ کو اس کی سلطنت میں باندھ کر کون رکھ سکتا ہے۔ وہ لق و دق صحرا دیکھ کر سہمتا نہیں مڑتا راستہ میں سات سمندر ہیں۔ اور تیرہ دریا۔ یہ انھیں پار کر جاتا ہے۔

انسان بار بار بچہ کی صورت میں آکر اسی پرانے قصہ کو ہمیشہ نیا سمجھ کر شوق سے سنتا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ چراغ کی لو چپ چاپ جل رہی ہے۔ بچے خاموش بیٹھے گالوں پر ہاتھ دھرے سوچ رہے ہیں۔ "ہم وہی شاہزادہ ہیں"۔

لق و دق میدان اگر ختم بھی ہو جائے تو پھر سامنے سمندر ہے۔ اسی سمندر کے عین درمیان ایک جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ میں جنات کا ایک قلعہ ہے۔ جس میں شاہزادی قید ہے۔

دنیا میں لوگ دولت چاہتے ہیں۔ نام اور آرام چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ ازلی شہزادہ جنات کے قبضہ سے شہزادی کو رہا کرنے کے لئے سفر اختیار کرتا ہے۔ سمندر میں طوفان ہے۔ کشتی ڈھونڈے نہیں ملتی۔ لیکن شہزادہ راہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

اس دنیا میں جو نئے پیدا ہوئے ہیں وہ اپنی ماں کی گود میں آکر ہی خبر پاتے ہیں کہ شہزادی قید ہے۔ راہ میں ناپید اکنار سمندر حائل ہے۔ اور مقابلہ ناقابل تسخیر جنوں سے ہے۔

(۲)

سامنے بحر ظلمات ہے۔ گویا فنا کے نیلگوں سمندر میں خواب کروٹیں لے رہی ہے۔ اس لئے شہزادہ گھوڑے کی پیٹھ پر سے اُتر پڑتا ہے۔ اس کا زمین پر قدم رکھنا ہی تھا کہ حیرت کی انتہا نہ رہی معلوم کسی زبردست جادوگر کا طلسم ہے۔

(دیکھتا کیا ہے کہ) ایک شہر آباد ہے۔ فراموش ہو رہی ہے آفس کے سامنے گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ ہے۔ باسہ چلنا دشوار ہے۔ تالی کے پتوں کی (بانسری بیچنے والا گلی کے سرے پر ننگے بدن چھوٹے چھوٹے بچوں کو شوق دلاتا ہوا۔ بانسری بجاتا چلا جا رہا ہے۔

شہزادہ کو دیکھتے کس بھیس میں ہے۔ کیا ڈھنگ ہے۔ کیا حال۔ کرتا پہنا ہے۔ بوتام کھلے ہیں۔ دھوتی بھی اچھی طرح سے دھلی ہوئی نہیں۔ جوتی نے دانت دکھا دیئے ہیں۔ ایک برہمن لڑکا شہر میں پڑھتا ہے۔ اور چند دوسرے لڑکوں کو پڑھا کر اپنے خرچ اور بوڑھے ماں باپ کی پرورش کرتا ہے۔

شہزادہ کہاں ہے؟

سمجھا یہ کے گھر میں۔ لیکن نہ تو دکھائی دیتا ہے اس کے لانے کے لئے ہیں اور نہ تیسری سے اس کے موتی جھڑتے ہیں۔ نہ لوگ اس کے قد کی مثال دیتے ہیں۔ نہ تشبیہ دیتے ہیں۔ شروع برسات میں نئی گھاس کی پتیوں کی آڑ میں جو ایک بے "نام پھول پیدا ہوتا ہے اس لڑکے کی مثال بس اسی پھول کی سی ہے۔

ماں مر چکی ہے۔ لڑکی باپ کی لاڈلی ہے۔ باپ غریب ہے لیکن کسی نہ کسی طرح سے اپنی لڑکی کا بیاہ دینا نہیں چاہتا۔ لڑکی کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ اور لوگوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

یہ بیچارا اکیلا انسان دل میں ٹھان کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ شہزادی کو قید سے چھڑا کر لائے گا۔

باہر اندھیرے جنگل میں بارش ہو رہی ہے۔ جھینگروں کی آواز سے جنگل گونج رہا ہے۔ بچے ہاتھ کا اون پروھرے اپنے اپنے سوچ میں غرق ہیں۔ جنات کے جزیرہ کا سفر کرنا ہوگا۔

آخر باپ بھی انتقال کر گیا۔ لڑکی چچا جان کے گھر آئی۔

کسی قابل خاوند کا سراغ ملا۔ اُس کے یہاں دولت کی کمی نہ تھی۔ عمر بھی کافی تھی پوتوں کی تعداد بھی ماشاء اللہ معقول ہی تھی۔ رعب و داب کی تو انتہا ہی نہ تھی۔

چچا جان نے کہا۔ "بیٹی تیری قسمت بھلی ہے!"

دفعتاً کیا دیکھتے ہیں عین مہندی کے روز دولہا غائب ہوا اور ہمسایوں کے گھر سے وہی برہمن لڑکا ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر پتہ چلا کر انھوں نے چھپا چھپا کر بیاہ کر لیا ہے اگرچہ ان کی ذات کا میل نہ تھا۔ لیکن دلوں کا میل تھا۔ لیکن لوگوں میں اب گاؤں گاؤں اس واقعہ کے تذکرے ہو رہے ہیں۔

انکی ماں کے کبھی نکلوتی بہو رونے پیٹنے دیوتا کے حضور میں منت مانی۔ اور سونے کا تخت نذر چڑھانے کی نذر کر کہا۔ اب میں دیکھتا ہوں اس لڑکے کو میرے ہاتھ سے کون چھین سکتا ہے۔

لڑکے کو عدالت میں لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ نہایت پرانے پرانے تجربہ کار گواہوں کو ساتھ لے کر چالاک وکیلوں نے اپنے دیوتا کی دس رات کا دن۔ اور دن کی رات ثابت کر دکھائی۔ لڑکے کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اس دن دیوتا کے حضور میں دو کوٹے کا بکرے بھینٹ چڑھائے گئے۔ نوبت ڈھول سنکھ وغیرہ کی آواز سے آسمان گونج اٹھا۔ لوگ خوش تھے اور کہتے تھے بھائی کلجگ تو ضرور ہے لیکن جو کچھ بھی ہو۔ دھرم ابھی زندہ ہے۔

(ترجمہ از بنگالی کا۔ بنگالی)

(۳)

اس کے بعد بہت کچھ ہے۔ قید سے مدت کا ٹکر لڑکا واپس آیا۔ لیکن راہ ابھی ختم ہونے نہیں آتی۔ دشت غربت میں مسافر کی منزل کا پتہ نہیں۔ وہ بے رفیق ہے۔ بے یار و مددگار ہے۔

اندھیرے میں کتنی ہی دفعہ اس نے ہاؤں۔ ماؤں۔ کھاؤں..... "آدم" کی خوفناک آوازیں سنیں۔ آہ۔ انسان کو نگلنے کے لئے اس کے چاروں طرف کسقدر اشتیاق موجود ہے۔

راہ کا اختتام نہیں۔ لیکن چلنے کی انتہا ہے۔ ایکدن وہ اسی مقام پر آ کر ٹھہر گیا۔ اس دن اس کی عیادت کے لئے کوئی نہ تھا۔ صرف ایک رحمدل فرشتہ اس کے سرہانے بیٹھا ساری رات جاگتا رہا۔ آپ عزرائیل تھے۔

اس موت کے فرشتہ کی چھڑی نے جونہی اسے چھوا۔ نہایت تعجب کا مقام ہے خواب اڑ گئی۔ شہر غائب ہوا۔

پھر وہی شہزادہ خودار ہوتا ہے۔ پیشانی پر اس کے وہی ازلی شہزادگی کا نشان ہے۔ جنات کے قلعہ کا دروازہ جا کر ہی توڑے گا۔ شہزادی کی تھکڑیاں جا کر کھولے گا۔

ہر زمانہ میں بچے اپنی ماں کی گود میں بیٹھے یہی خبر سنتے ہیں۔ وہ بے خانماں انسان نہ کسی دشت غربت میں کس طرف کو چل نکلا۔ سامنے اسکے کیا کیا سمندر موجیں مار رہا ہے۔

عالم تاریخ میں اسکی کونا گوں مثالیں ہیں۔ اور تاریخ سے باہر اسکی صرف ایک ہی صورت ہے۔

.....شاہزادہ۔

(ضیاء الدین)

پنکھڑیاں

مشرق اور مشرق کے جواہر رقم ادیبوں۔ ادبی کاوشوں کا لاجواب مرقع ہے۔ تخیل کی پرواز کے ساتھ بند و موعظت کا گرانمایہ شاہکار ہے۔ فلسفہ۔ جوش عمل۔ اخلاق محبت اور قانون فطرت کے متعلق سیکڑوں قیمتی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ یہ چیزیں قلم سے نہیں۔ خون دل سے لکھی گئی ہیں۔ آپ اس کتاب کو منگا کر لطف اٹھائیے۔

اس میں ہندوستان کے بیسیوں مشاہیر ادبا کے مضامین درج ہیں۔ قیمت دس آنہ (۱۰) عزیدارانِ نیرنگِ خیال سے آٹھ آنہ (۸)

ملنے کا پتہ:۔ منیجر نیرنگِ خیال بکڈپو۔ شاہی محلہ لاہور

اورنگزیب عالمگیر کے رقعات

(ہندوستان کے فاضل مورخ پروفیسر جادوناتھ سرکار کے ایک تاریخی مضمون کا خلاصہ)

اورنگزیب کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہندوستان کے ارمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں اورنگزیب کا عہد حکومت تین خصوصیات کی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔ اول یہ کہ تمام مغل فرمانرواؤں میں سب سے بڑا عہد حکومت اورنگزیب کا تھا (اکبر اعظم بھی بڑھکر) جو پورے پچاس سال پر حاوی تھا۔ دوم یہ کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں سلطنت مغلیہ کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا۔ اور وہیں سے اس کا زوال بھی شروع ہوا۔ سوم یہ کہ ہندوستان کی قدیم و جدید تاریخ لکھنے کے لئے کسی عہد حکومت کا مواد اسقدر آسانی سے نہیں ملتا۔ جتنا اورنگ زیب کے زمانہ کا۔

فرانسیسی۔ انگریزی۔ پرتگیزی۔ اور ڈچ فیکٹریوں کے جمع کردہ بہت سے حالات شائع ہوگئے ہیں۔ نیز اکثر مسودات بھی قابل استعمال ہیں لیکن خالص ہندوستانی مواد عام طور پر اسقدر دستیاب نہیں۔ ہم نہ تو اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ لکھتے وقت غیر ہندوستانی مواد سے سروکار رکھیں گے۔ اور نہ ان فارسی تواریخ سے کام لیں گے جو اس کے عہد میں لکھی گئیں۔ بلکہ ان دونوں صورتوں سے بھی بڑھ کر ایک اور قابل اعتماد ذریعہ معلومات ہے۔ جس سے اس وقت کی تاریخ مدون کیجا سکتی ہے لینگے ــــ یہ عالمگیر کے "رقعات" یا خطوط ہیں۔ یا دربار کے سرکاری "اخبار" ہیں۔ جو مختلف بڑے عظموں میں ایک عام بے نظمی کے عالم میں بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔

اورنگ زیب کے دربار یا جنگی مقام (کیمپ) سے زیر نگیں راجاؤں اور نوابوں یا صوبوں کے گورنروں کے نام جو گشتی خطوط یا ہدایتیں بھیجے جاتے تھے۔ اصلاحاً "اخبار" کہلاتے تھے

اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ لکھنے کے لئے ان سرکاری "اخبار" سے بڑھکر کوئی مواد نہیں ہوسکتا۔ یہ تمام اخبار احتیاط کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ بہادر شاہ اول کے زمانہ کے چار اخبار۔ محمد شاہ کے بیس اور شاہ عالم ثانی کے چنداں کے اخبار کے علاوہ اور کسی مغل بادشاہ کے عہد کا ایسا سرکاری ریکارڈ مورخ کو دستیاب نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے عالمگیر کا عہد حکومت ایک اور خصوصیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

کس طرح منشی خطوط کا مجموعہ تیار کرتے تھے ان سرکاری "اخبار" کے علاوہ اورنگزیب کی تاریخ کی تدوین میں ایک اور قابل اعتماد ماخذ وہ خطوط ہیں جو بادشاہ نے لکھے یا اسے لکھے گئے تھے۔ ان معاصرانہ خطوط سے اس وقت کے حالات و سیاست پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط نہ تو بادشاہ کے حکم سے جمع ہوئے۔ نہ کسی "وارالانشاء" نے انھیں یکجا کرنے کی زحمت گوارا کی بلکہ ہم ایک بالکل پرائیوٹ ماخذ کے مرہون منت ہیں جس نے ان رقعات کو یکجا کیا۔ اور ہمارے لئے ایک قابل قدر تاریخی مواد بہم پہنچایا۔ یہ ان منشیوں کا ادبی ذوق تھا۔ جو ان خطوط کو لکھا کرتے تھے۔ اور اپنے آقا کے لکھنے کے بعد ہر خط کی ایک نقل اپنے بستہ میں رکھ لیا کرتے تھے منشی اس قسم کے خطوط کی جملہ نقول یکجا کرکے ایک ابتدائی دیباچہ یا انتساب کے بعد دنیا کے مطالعہ کے لئے دیدیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں چھاپے کا رواج نہ تھا اس لئے میری مزاویہ ہے کہ ان خطوط کی ادبی قدر شناسی کے لئے لوگ اس کی نقلیں کرکے اپنے پاس رکھ لیا کرتے تھے۔ اور فارسی ادب کا بہترین نمونہ سمجھ کر انھیں قدیموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یا ابتدائی منشی انھیں سامنے رکھ کر "انشا" کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ خطوط کے یہ مجموعے اسوقت محض انشا و ادب کے عمدہ نمونوں کی حیثیت سے کام میں آتے تھے مگر اب انھیں تاریخی اہمیت و قدر حاصل ہے۔ مگر ان کے جمع کنندگان کو مطلق احساس نہ تھا۔ کہ ہم مستقبل کے مورخ کے ہاتھ میں کتنا قابل قدر تاریخی مواد دے رہے ہیں۔

تقریباً ہر منشی شہر لکھنے کے علاوہ "تاریخ" بھی نکال سکتا تھا۔ یعنی ابجد کے حروف کے لحاظ سے مختلف تاریخی یا ملکی اہمیت کے واقعات کو الفاظ کی حسابی صورت میں لکھ سکتا تھا۔ اسوجہ سے ہمیں تاریخوں کی تدوین بھی ایک گونا آسانی ہو جاتی ہے۔ ہر ان منشیوں کی عرقریزی کے ممنون ہیں۔

تقریباً ہر خطوط کا مجموعہ اس طرح کا ہوتا ہے۔ ابتدا میں خدا کی حمد اور رسول کی نعت ہوتی ہے (جو ہندو منشی بھی نہایت ذوق کے ساتھ لکھتے تھے) پھر حروف کی ابتدا انشا اور خطوط نویسی کے اصول اور ان کی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور پھر اصل خطوط کا مجموعہ شروع ہوتا ہے یعنی خطوط کے نیچے شان نزول بھی درج ہوتی ہے۔

ہندو منشی اور ان کا کام سترھویں صدی کے آخری دور میں اور اس کے بعد بھی تقریباً تمام منشی ہندو ہوا کرتے تھے۔ اور جس جس زمانہ گزرتا گیا

ان کے تناسب میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت کے شروع ہوتے ہی ہندوؤں نے دیوانی کے محکموں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔

اکبر کے اقتصادی رہبر راجہ ٹوڈرمل نے ہر سرکاری کاغذ کا فارسی میں لکھا جانا فرض قرار دیدیا تھا ورنہ اس سے پہلے شیر شاہ کے عہد میں ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہ ایک نقل ہندی میں ہوتی تھی۔ اور ایک فارسی میں۔ اس نئے حکم سے ہندوؤں کو فارسی کا گہرا مطالعہ کرنا پڑا۔ اور ہر شخص کو اسپر عبور حاصل کرنا لازم ہو گیا۔ چنانچہ اگلی صدی میں تقریباً ہر محکمہ میں ہندو کارپردازوں کی کثرت مصروف کار نظر آنے لگی۔ اور محکمۂ حساب تو کلیتاً ہندو کارندوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اکثر ہندو کارندے محکموں کے "نائب" اور "پیش دست" کے عہدوں تک ترقی کر گئے تھے۔

تیرھویں صدی میں اکثر شہزادوں اور رئیسوں نے اپنے فارسی خطوط لکھنے کے لئے ہندو منشی ملازم رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ کیونکہ ہندو منشی مسلمان منشی کے مقابلہ پر سستا ہوتا تھا نیز نسبتاً مسکین ہونے کی وجہ سے تندہی اور ایمانداری سے کام کرتا تھا۔

میرے خیال میں ہندو منشیوں میں سب سے بڑا اور قابل قدر منشی چندر بھان متخلص بہ "برہمن" تھا جو شاہجہاں کے وزیر سعد اللہ کا میر منشی تھا۔ اس شخص نے کئی عمدہ کتابیں چھوڑی ہیں۔ نیز اس زمانہ کی تاریخ میں چند خصوصی نظمیں بھی قابل لحاظ ہیں۔ اس کے پرائیویٹ خطوط سوائے ادبی خصوصیتوں کے کوئی تاریخی مواد ہم نہیں پہنچاتے۔

غرض اس طرح ترقی کرتے کرتے ہندو منشیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ ایک ہندو منشی آصف رام متخلص بہ مخلص محمد شاہ ثانی کا میر منشی مقرر ہو گیا۔ جو اس لائن کا انتہائی عروج سمجھا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان منشیوں کے درمیان کوئی اختلاف یا کشیدگی نہ تھی بلکہ دونوں باہم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے دوست ہوتے تھے۔ شادیوں بیاہوں۔ ناچوں اور تقریبوں میں اکٹھے شریک ہوتے تھے۔ غرض ایک دوسرے سے خوب مانوس تھے۔ حتیٰ کہ پیشہ وروں کی حیثیت سے بھی کوئی عناد یا حرص کا شائبہ نہ پایا جاتا تھا۔

ایک ہی پیشہ کے اعتبار سے برادری ہونے کے علاوہ ہندو مسلمان منشیوں کے درمیان ایک اور رشتہ صوفی مشربی کا بھی تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں تصوف نے ہندو مسلمانوں کے خیالات و جذبات کو اس طرح صلح کل اور خوش آئند بنا دیا تھا کہ کسی دوسرے جذبہ کے ماتحت مطلق نہ ہو سکتا۔ خطوط کے اکثر مجموعے صوفیانہ اشعار پر ختم ہوتے ہیں۔ جو ان کے ذہنی ارتقا اور ماحول پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سرکاری خطوط کیونکر لکھے جاتے تھے؟

{سرکاری خط و کتابت کی تحریر حد درجہ تصنع، مزین اور انشا و ادب کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھی۔ ہر خط کی طرز نگارش ان اصول پر مبنی ہوتی تھی۔ جو ابوالفضل نے اکبر کے خطوط لکھنے کے لئے اختیار کئے تھے ان رسمی القاب و آداب کی زنجیروں کے علاوہ منشیوں کو بادشاہوں اور شہزادوں کے مخصوص ناموں اور خود اختیار کردہ القاب کی طول طویل فہرست کو بھی خطوط میں جگہ دینی پڑتی تھی۔ فلس کیپ کی پہلی چھ سطریں اس کے لئے وقف ہوتی تھیں۔ اور مرتبت کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوتی رہتی تھیں۔

سترھویں صدی میں ہر شخص کے مرتبہ کے لحاظ سے مخصوص القاب مقرر تھے۔ بڑے سے بڑے شہنشاہ سے لے کر شہزادوں۔ راجوں اور فوجی و ملکی حکام غرض ہر شخص کے لئے مقررہ الفاظ اور خطابات تھے۔ جو "دستور العمل" میں درج ہوتے تھے۔ اور جنھیں منشیوں کو یاد کرنا پڑتا تھا۔

یہ خطابات وقتاً فوقتاً تبدیل بھی ہوتے رہتے تھے۔ "ظل اللہ" اس کے فرزند یا کسی بڑے وزیر کا ذاتی نام لینا۔ یا خط میں غیر مناسب طریقہ پر استعمال کرنا حد درجہ گستاخی سمجھی جاتی تھی۔ لڑکے ہمیشہ "صاحب عالم" سے مخاطب ہوتے تھے۔ اور عورتیں تو ہمیشہ مبہم عبارت میں مخاطب ہوتی تھیں۔ مثلاً "عفت مآب" "رابعۂ وقت" یا "پردہ نشین عزت و وقار"

ہر بادشاہ کو خلیفۂ اسلام اور "ظل اللہ" ہونے کے لئے علاوہ اور کئی خطابات بھی دیئے جاتے تھے۔ نیز انتقال کے بعد چند مخصوص نام بھی متعلق کئے جاتے تھے۔ چنانچہ بابر کو "فردوس مکانی" ہمایوں کو "جنت آشیانی"۔ اکبر کو "عرش آشیانی"۔ جہانگیر کو "جنت مکانی" شاہ جہاں کو "علیحضرت فردوس آشیانی" اورنگ زیب کو "خلد مکان" اور بہادر شاہ اول کو "خلد منزل" وغیرہ تحریری و تحریکی الفاظ سے بعد میں خطاب کئے جاتے تھے۔

اکثر زندہ شہزادے مخصوص طور پر مخاطب ہوتے تھے۔ مثلاً دارا شکوہ کو "شاہ بلند اقبال" "شاہ عالم" کو "مہر فلافت" "محمد اعظم" کو "شاہ عالیجاہ" سے خطاب کیا جاتا تھا۔

بادشاہ جب کسی سے ناراض ہوتا تھا تو اسے سخت الفاظ سے مخاطب کرنے کا حکم دیدیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب شہزادہ محمد اکبر نے بغاوت کی اور سلطنت کے دشمنوں سے جا ملا۔ تو اورنگ زیب نے حکم دیدیا۔ کہ دربار اور تمام سرکاری کاغذات میں اسے صرف "باغی" اور "اکبر بتر" کے ناموں سے یاد کیا جائے۔

خواہ کوئی خط بادشاہ لکھوائے۔ یا اس کے پاس کسی کا آئے کسی پر دستخط نہ ہوتے تھے۔ بلکہ نام کی مہریں ہوتی تھیں۔ معمولی سے معمولی خط پر بھی کئی کئی مہریں ثبت ہوتی تھیں۔ مگر فرمان پر اوپر بادشاہ کی مہر ہوتی تھی۔ اور نیچے وزیر کی یا جاگیر عطا کرنے کے

وقت کاغذ پر بادشاہ کا "پنجہ" بھی شنگرف میں ڈبو کر لگایا جاتا تھا۔ پنجہ کا ایک نقش ہر وقت اس غرض کے لئے تیار رکھا جاتا تھا۔

بادشاہ یا شہزادہ خط یا مراسلہ آخری بار پڑھ کر آخری سطر کے آخری لفظ کے بعد "صح" اس صورت میں لکھدیا کرتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندراج بالکل صحیح ہے۔ اور حاکم اس سے متفق ہے۔ بادشاہ کسی کی عزت افزائی کرنے یا خط کے حقیقی ظاہر کرنے کی غرض اپنے "قلم مبارک" سے اپنے مخصوص انداز میں چند الفاظ لکھدیا کرتے تھے۔ جن میں بالعموم حکم کی تعمیل اور بادشاہ سے تعاون و اطاعت کی نصیحت کی جاتی تھی۔ یہ الفاظ اور مخصوص فقرے "آداب عالمگیری" میں موجود ہیں۔

خط کا باقی حصہ جس کا ڈرافٹ منشی تیار کرتا تھا۔ بالعموم کسی "خوشنویس" سے لکھوایا جاتا تھا۔

جب کوئی سرکاری خط مکتوب الیہ کو پہنچتا تھا۔ تو اس کا منشی اس کی پشت پر وصولیابی کی تاریخ اور "عرض داوہ شد" کے رسمی الفاظ لکھدیا کرتا تھا۔

یہاں اس رسم کے ظاہر کرنے کی تو چنداں ضرورت نہیں۔ کہ جب کوئی فرمان کسی کے نام پہنچتا تھا۔ تو وہ کئی کئی میل آگے پہنچکر اسے وصول کرتا تھا۔ سر پر رکھتا تھا۔ اور آنکھوں سے لگاکر چومتا تھا۔ دکن کے بعض شہزادوں نے تو ایک چھ منزلہ عمارت "فرمان باڑی" کے نام سے مخصوص طور پر بنوالی تھی۔ جہاں اطلاع پاتے ہی وہ فرمان حاصل کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

خطوط کی قسمیں اور ان کے نام

مغل سلطنت کے خطوط بالعموم اور عالمگیر کے بالخصوص ذیل کی چند مشہور شقوں سے کسی میں سے ہوتے تھے۔

(۱) **فرمان احکام** - یہ صرف بادشاہ کی طرف سے کسی شہزادے۔ رعایا کے کسی فرد یا کسی باگذار حاکم کے نام ہوا کرتے تھے (یہاں فاضل مورخ کہتا ہے کہ رقعہ یا "رقعات" عامیانہ لفظ ہے۔ جو موجودہ دور نے ان خطوط کو دیا ہے۔ ورنہ اورنگزیب کے زمانہ میں یہ لفظ سرکاری طور پر مطلق استعمال نہ ہوتا تھا)

(۲) **نشان** - یہ وہ خطوط ہوا کرتے تھے جو خاندان کے شہزادہ ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے۔ اور سوائے "بادشاہ اعلیحضرت" کے ایک دوسرے کو بھیج سکتے تھے۔

(۳) **عرضداشت** - رعایا کا ہر فرد یا شہزادہ بادشاہ کے نام جو عرضی بھیجتا تھا۔ اس اس نام سے یاد کی جاتی تھی۔ فتح کا مراسلہ "فتحنامہ" کہلاتا تھا۔

(۴) **حسب الحکم** - وزیر بادشاہ کی ہدایات کے مطابق جو احکام صادر کرتا تھا۔ (اور جسے وہ اپنے ہی خط میں لکھتا تھا) حسب الحکم کہلاتا تھا۔ یہ موجودہ عہد کا "بائی آرڈر" سمجھنا چاہئے۔

(۵) **"احکام رمز"** - یہ مخصوص اشارے۔ اشعار۔ یا مقولے ہوتے تھے۔ جو بادشاہ منشی کو جستہ جستہ لکھوادیا کرتا تھا۔ تاکہ بعد میں پورا مسودہ تیار کرتے وقت وہ انھیں درج کردے۔ اورنگزیب کی عمر کے آخری سالوں کے یہ رموز و احکام دستیاب ہوتے ہیں مگر عجیب منتشر حالت میں۔

(۶) **سند** - کسی عہدہ پر فائز کرنے کے وقت اس عہدہ دار کو بھیجی جاتی تھی۔ مگر یہ بھی بالعموم "فرمان" ہی کہلاتے تھے۔

(۷) **پروانہ** - عدالت کی کارروائی۔ دربار کے کوائف یا انتظامی عملہ کے نام مراسلہ ہوا کرتا تھا۔

(۸) **دستک** - کسی کیمپ۔ دربار یا "خلوت خانہ" میں کسی شخص کی رسائی کے لئے ایک مہموں سی چٹ ہوا کرتی تھی۔ یا بالعموم حامل رقعہ لے جاتا تھا۔

(۹) **رقعہ** - ایک پرائیوٹ خط۔ دوستوں کے درمیان اس ہی سے خط و کتابت ہوتی تھی۔

(۱۰) **محضر** - یہ کسی مقامی فساد۔ جھگڑے یا سرکاری تفتیش کی رپورٹ ہوتی تھی جس میں گواہوں کے دستخط اور جو ری کے لوگوں کے نوٹ بھی شامل ہوتے تھے کسی مقام کے لوگوں کی شکایت "جو اعلےٰ حاکم کو بطور عرضداشت" بھیجی جاتی تھی۔ بالعموم "محضر نامہ" کہلاتا تھا۔ مگر سرکاری طور پر وہ "عرضداشت" کے کالموں میں ہی لکھا جاتا تھا۔

ایک تمثیلی منشی کی کتاب میں خطوط کی ترتیب و اندراج کچھ اسی طرح کا ہوتا تھا۔

(۱) اپنے آقا کی طرف سے۔ شہزادوں کے نام (بعض اوقات جوابات بھی منسلک ہوتے تھے)

(۲) اپنے آقا کی طرف سے۔ وزراء اعلےٰ حکام اور اپنے ماتحت افسران کے نام

(۳) " " " " - دوستوں۔ رشتہ داروں۔ کارندوں اور وکلائے دربار کے نام

(۴) " " " " - متفرق

بعض خطوط جو صد درجہ رازداری کے قابل ہوتے تھے مخصوص حروف میں لکھے جاتے تھے جنھیں سوائے اس شخص کے جس کے پاس ان حروف کی "کلید" نہ ہوتی کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ اسی قسم کے خطوط کے نمونے "آداب عالمگیری"۔ اور "ہفت انجمن" میں دئے گئے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں خطوط کے مجموعے بالعموم "نمونے کے خطوط" اور "سادے خطوط" یعنی صرف آداب والقاب کی سطور پر مشتمل ہیں۔ یا کسی نواب یا بادشاہ کے نام کسی مخصوص موقعہ کی مبارکبادی ہوتی تھی۔ مثلاً عید۔ پیدائش۔ یا فتح وغیرہ۔

"نگارنامہ منشی" اور "انشائے ہرکاراں" میں اعلےٰ حکام اور افسران کو خطاب کرنے اور ان کے شاہی القاب کے نمونے بکثرت درج ہیں۔ نیز نمونے کے خطوط بھی بکثرت ہیں۔

اورنگ زیب کے خطوط اب سوال یہ ہے کہ ایک بادشاہ کی طرف سے جو خطوط لکھے جاتے تھے وہ کہاں مل سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ میر منشی ان تمام خطوط کی نقلیں اپنے بستے میں رکھتا تھا۔ اور پھر انھیں مجموعی طور پر ترتیب وار جمع کر کے شائع کر دیتا تھا۔ (شائع کرنے کا مفہوم اوپر بیان ہو چکا ہے)

اورنگ زیب کا اولیں منشی ابوالفتح قابل خاں تھا۔ اس نے اپنے آقا کی ۴۰ برس کی عمر سے چالیس برس کی عمر تک وفاداری سے خدمت کی۔ اور جب متواتر محنت اور آنکھوں کے تیل نکلنے کی وجہ سے وہ اندھا ہو گیا۔ تو مجبوراً ملازمت چھوڑنی پڑی۔ اور آخر مئی ۱۶۶۲ء میں انتقال کیا۔ اس نے ۱۰۶۱ خطوط کا ایک مجموعہ چھوڑا ہے۔ جو ۱۶۵۰ء سے ۱۶۵۸ء تک کے خطوط پر مشتمل ہے۔ جو تاریخی حیثیت سے اہم ترین عہد ہے۔ یہ تمام خطوط بالکل مکمل ہیں۔ اس کا بہترین اور قابل قدر کارنامہ "آداب عالمگیری" ہے جس کی وفات کے بعد ایک دوسرے منشی میر صادق نے ۱۴۰ خطوط کی ایزاد کے بعد شائع کیا۔ یہ اضافی خطوط وہ تھے جو ۱۶۷۶ء سے ۱۶۷۸ء کے درمیان شہزادہ اکبر نے لکھوائے تھے۔

اورنگ زیب کی عمر کے آخری ایام (۱۷۰۱ء سے ۱۷۰۶ء تک) میں منشی عنایت اللہ خاں نے بہت تندہی سے کام لیا۔ اور تین قابل قدر خطوط کے مجموعے چھوڑے۔ لیکن یہ "آداب" کے برعکس معمولی نوٹوں پر مشتمل ہے۔ جو بعد میں پورے مسودات میں تبدیل ہوتے ہوں گے لیکن پھر بھی اس سے بہت کچھ مواد حاصل ہوتا ہے۔ "کلمات طیبات" میں ۶۷۶ خطوط کے کچے مسودے ہیں۔ "احکام عالمگیری" میں ۱۰۶ صفحات ہیں۔ اور ہر صفحے پر ۱۵ سطریں ہیں۔ گویا دو خطوط فی صفحہ ہیں۔ "کلمات اورنگزیب" میں ۹۷ صفحات ہیں ہر صفحہ پر ۱۴ سطریں ہیں۔ اور کل تقریباً ۱۰۰ خطوط ہیں۔

بدقسمتی ہے کہ ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۱ء کے درمیان کسی منشی نے خطوط کا کوئی مجموعہ ترتیب نہیں دیا۔ اس لئے اس زمانہ کو "تاریک عہد" کہتے ہیں۔ اگر پھر بھی بادشاہ کی طرف سے دوسروں کے نام جو خطوط روانہ کئے گئے تھے۔ وہ کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ اور ان سے اس وقت کے کوائف و سیاست پر روشنی پڑتی ہے۔

جاگیروں یا وظائف کی منظوری وغیرہ کے فرامین کسی صورت میں جمع نہیں کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اس طرح منتشر تھے۔ کہ انکا جمع کرنا۔ اور ترتیب دینا ایک پورے محکمہ کا کام تھا۔ اور جو کبھی نہ ہوا۔ سوائے کتب خانوں۔ قدیم جاگیرداروں کے ورثا اور آثار قدیمہ سے شغف رکھنے والے لوگوں کے فرامین اور کہیں دستیاب نہیں ہوتے

تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے جو خطوط اپنی طرف سے دوسروں کو بھیجے وہ تاریخی حیثیت سے اسقدر وقیع نہیں ہیں۔ جسقدر وہ خطوط جو شہزادوں۔ یا افسروں نے اس کے نام بھیجے۔ جن میں پر وہ بذات خود شریک ہوا۔ وہاں کسی سرکاری مراسلہ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس لئے ہم اس کی زندگی کے بہت سے اہم زمانوں سے بے خبر ہیں۔ اور اس قابل سند ماخذ سے بھی ہم محروم ہو جاتے ہیں۔

لیکن زندگی کے آخری ایام میں اورنگ زیب نے خطوط کے جو کچے مسودے منشیوں کو املا کرائے۔ وہ بہت ہی اہم اور قابل قدر ہیں۔ کیونکہ ان میں اورنگ زیب کے خیالات۔ جذبات۔ واحساسات۔ پالیسی تکست و فتح کے تاثرات۔ غرض ہر تاریخی ماٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ اور عالمگیر اپنے حقیقی پیکر میں دکھائی دیتا ہے۔ جو مورخ کے لئے ایک ضروری امر ہے۔

(ظفر قریشی دہلوی)

تین تین پیسہ میں ایک ایک تصویر

یعنی نیرنگ خیال کی ان تصاویر کا انتخاب جو وقتاً فوقتاً نیرنگ خیال میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجموعہ میں کل تیس تصاویر ہیں۔ جن میں سے دس تصاویر سہ رنگی۔ اور بیس تصاویر یک رنگی ہیں۔ تمام بڑے بڑے اور بہترین بلاک انتخاب کر لئے گئے ہیں۔ اور ہر تصویر آرٹ پیپر کے صرف ایک ہی طرف شائع کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ اپنی لائبریری میں رکھنے۔ یا آرائش کے لئے چوکھٹوں میں لگوا کر رکھنے کے لئے بہترین۔ اور لاجواب ہے۔ ٹائیٹل بھی خوشنما لگایا گیا ہے۔ اس قسم کے تصویری البم جو کلکتہ کے انگریزی رسائل شائع کیا کرتے ہیں۔ ان کی قیمت دو روپیہ ہوتی ہے۔ مگر ہم نے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ رکھی ہے۔ حالانکہ بعض تصاویر اتنی قیمتی اور نظر فریب ہیں۔ کہ ایک ہی تصویر اس قیمت میں بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ فی الفور طلب کیجئے۔ نیرنگ خیال کے خریداروں کو محصول ڈاک معاف

منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ شاہی محلہ لاہور

شیطان

(ایک افسانہ عربی زبان سے)

فجا حکیم جی کے قریب کھڑا تھا۔ حکیم جی اس کی بیمار ماں کے بستر سے لگے بیٹھے تھے۔ اس کی آکھڑی آکھڑی سانس بتا رہی تھی کہ وہ عالم سکرات سے گزر رہی ہے۔ مگر اس کے چہرہ سے اطمینان اور سکون مترشح تھا۔ وہ عمر کی ۷۰ منزلیں طے کر چکی تھی۔ اب اس کے دل میں کوئی آرزو باقی نہ تھی۔ اور بغیر کسی اضطراب کے فرشتۂ موت کو لبیک کہنے کو تیار تھی۔ وہ فجا اور حکیم جی کی گفتگو غور سے سن رہی تھی۔

حکیم جی نے کہا۔ "فجا! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تیری ماں عالم نزع میں ہے جلد ہی اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ اس لئے تجھے اس کے اس کے پاس موجود رہنا چاہئے۔ اور اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے"۔

فجا نے نہایت تیزی اور تر شروئی سے جواب دیا۔ "لیکن میرے لئے اپنی فصل کی نگرانی ضروری ہے۔ میں مرنے والی ماں کو تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر فصل کو نہیں چھوڑ سکتا ..... خدا شاہد ہے کہ اس کی بیماری کی وجہ سے میں پوری فصل کی نگرانی نہ کر سکا۔ اور اس سے جسقدر نقصان ہو چکا ہے۔ میرے لئے وہی ناقابل برداشت ہے"۔

اس نے اپنی ماں سے پوچھا۔ "کیوں ماں اس میں تیری کیا رائے ہے؟"

اس کی ماں بھی ایک زمیندار کی لڑکی۔ زمیندار کی بیوی۔ اور ایک زمیندار کی ماں تھی۔ اس نے اشارہ سے جواب دیا۔ کہ مجھے تنہا مرنے دے اور تو فصل کی کٹائی کی طرف توجہ کر"۔

لیکن حکیم جی دانت پیس کر بولے۔ "اف حد ہو گئی قساوت اور سنگدلی کی! اچھا اگر تیری فصل بھاگی جا رہی ہے۔ تو کم سے کم یہی کر کہ اس کی نگرانی کے لئے زینب کو بلا لے۔ ورنہ یاد رکھ کہ تیری باری آئے گی۔ تو تو بھی کتے کی موت مرے گا۔ اور تیرے حلق میں بھی کوئی پانی ٹپکانے والا نہ ہوگا"۔

فجا۔ بخل۔ وہم۔ اور خوف کے مختلف جذبات کے زیر اثر مبہوت سا کھڑا حکیم جی کا منہ تک رہا تھا۔ آخر لجاجت آمیز لہجہ میں حکیم جی سے سوال کیا۔ "آپ کے خیال میں زینب اس کا معاوضہ کیا لے گی؟"

حکیم جی نے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم۔ اور اس کا اندازہ ابھی سے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کا جتنا وقت صرف ہوگا اسی مناسبت سے اجرت لے گی۔ بہر حال محنتانہ خواہ کتنا ہی طلب کرے اسکو گھنٹہ بھر کے اندر یہاں موجود ہونا چاہئے۔ ورنہ فصل کو گولی مار اور تو اپنی ماں کی نگہداشت کر"۔

فجا نے کہا۔ "حکیم جی آپ خفا نہ ہوں۔ میں زینب کو ابھی بلائے لاتا ہوں"۔

زینب ستر سال کی ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس کا شوہر جو اس بستی کا گورکن تھا۔ بیس سال ہوئے مر چکا تھا۔ زینب کا مستقل وسیلہ معاش کفن دوزی۔ اور مُردوں کو غسل دینا تھا۔ وہ معاوضہ لے کر مرنے والیوں کو عالم نزع میں کلمہ اور دعا رود کی تلقین بھی کیا کرتی تھی۔ علاوہ بریں زینب کے جن بھوت کے تعویذ کی شہرت قرب وجوار کی کئی بستیوں تک پہنچ چکی تھی۔ اور اس سے بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہو ہی جاتی تھی۔

بچے اس کی شکل دیکھ کر ڈر کر بھاگتے۔ مگر گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اسے احترام اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اس کا چہرہ اس سیب کی طرح کمھڑا اور چھدرا تھا۔ جو سال بھر تک درخت ہی میں لٹکتا رہ گیا ہو۔ اس کی کمر دوہری ہو گئی تھی وہ چلتی تو معلوم ہوتا کہ اس کی ہیل کی چوخ کی طرح نیچے جھکی ہوئی ٹھوڑی اس کے قدموں سے جا لگے گی۔

زینب کا موضوع سخن جن بھوت یا پریوں کے خوفناک قصوں اور عالم سکرات یا مردوں کی تجہیز و تکفین تک کے واقعات تک محدود تھا۔ خصوصیت کے ساتھ وہ تلقین اور تجہیز و تکفین کے مشاہدات اس جوش و خروش سے بیان کرتی۔ کو یا کوئی شکاری اپنے شکار کے واقعات بیان کر رہا ہے۔

فجا اس کے ہاں پہنچا۔ تو وہ ایک سفید چادر سے جو میت کے غسل کی چادر معلوم ہو رہی تھی۔ اپنا کرتہ کاٹ رہی تھی۔ فجا نے نہایت ادب سے سلام کر کے خیر و عافیت دریافت کی۔

زینب نے جواب دیا۔ جیتا رہ بیٹا! میری کیا پوچھتا ہے۔ زندگی کے دن

کاٹ رہی ہوں۔ تیرا کیسے آنا ہوا۔ خیریت تو ہے؟

ہاں میں تو بخیریت ہوں۔ لیکن میری ماں!

کیوں اُسے کیا ہوا؟

وہ مر رہی ہے۔

زینب کی آنکھوں میں جن کو بڑھاپے نے زرد و بے آب کر دیا تھا۔ مسرت کی روشنی چمکنے لگی۔ اور اس نے ایک آہ بھر کر جو غم کی بجائے صرف خوشی کے غلاف سے مرکب تھی۔ کہا۔ "آف وہ بیچاری اس حالت کو پہنچ گئی تعجب ہے!

ہاں ہم نے اس کی زندگی سے قطعاً مایوس ہو چکے ہیں۔ اور اسے خدا کے سپرد کر چکے ہیں۔ مائی جی! تمھیں معلوم ہی ہے کہ فصل کی کٹائی کا موسم ہے۔ آج کل میں ادھر توجہ نہ کروں تو سال بھر بھوکوں مروں۔ اگر تم اس خدمت کو انجام دو اور مرنے تک میری ماں کے پاس رہو۔ تو تمھارا بڑا احسان ہوگا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا خدمت بھی کروں گا۔ میرا فقرہ فاقہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ غالباً تمھیں اس کا بھی علم ہوگا کہ مسلسل فاقوں ہی نے میری ماں کو قبل از وقت قبر کے کنارے لگا دیا ہے۔

زینب نے جواب دیا۔ میری دو نوں قسم کی اجرت مقرر ہے۔ اور اسے ایک پہر دن اور ڈیڑھ روپیہ رات اور عرباسے آٹھ آنے دن اور بارہ آنے رات کے حساب سے لیتی ہوں۔ آج تک کبھی میں نے اس میں تخفیف کی ہے۔ نہ کر سکتی ہوں۔

فجا صورت حال پر غور کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کی ماں معمر ہونے کے باوجود مضبوط جسم کی عورت ہے۔ اور حکیم جی کے علی الرغم ابھی وہ چھ سات دن سے کم میں نہیں مرتی۔ اس نے سوچا کہ کیوں روز و شب کے حساب سے اجرت مقرر کروں تو میرا دیوالہ ہی نکل جائے گا۔ اس نے سوچ کر کہا۔ "مائی جی سنو! مجھے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم دن رات کی بجائے اس کے مرنے تک سارے وقت کے لئے کوئی معاوضہ طے کر لیں۔ اور تمھاری خوش قسمتی سے حکیم جی کہہ چکے ہیں کہ وہ چند گھنٹے کی مہمان ہے اگر ان کی تشخیص صحیح نکلی تو تم فائدہ ہی فائدہ میں رہو گی۔ اور اگر خدا نے اس کی اجل میں کچھ تاخیر کر دی تو بھی تمھارا کوئی نقصان نہیں ہے ہاں میرا تھوڑا سا فائدہ ہو جائے گا۔

زینب نے ابتداءً اس تجویز کے خلاف اپنی دہشت زدگی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس نے آج تک اس خدائی امر کے متعلق کبھی جوئے کی طرح بازی نہیں لگائی تھی۔ لیکن پھر اس کی حریص فطرت اسپر غالب آئی۔ اور اس نے جواب دیا۔ "بہر حال مریضہ کو دیکھنے سے پہلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

فجا نے کہا۔ "بہتر۔ میرے ساتھ چلو!"

دونوں گھر کے قریب پہنچے تو فجا دل میں کہہ رہا تھا۔ "کتنا اچھا ہو کہ وہ مر گئی ہو اور مجھے بغیر کسی جرم کے جرمانہ ادا کرنے سے نجات ملے۔

لیکن وہ ابتک زندہ تھی۔ اور نہایت طمانیت اور سکون کے ساتھ بستر پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کسی درندے کے پنجے معلوم ہوتے تھے۔ لحاف کے اوپر تھے مگر سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ اور سینے سے موت کی خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔

زینب نے نبض دیکھی۔ کان لگا کر دل کی حرکت سنی۔ اور حجرے سے باہر آکر فجا سے کہا۔ "یہ ابھی دو دن میں مرے گی۔ جس کا نحتانہ میں کم سے کم ڈھائی روپے لونگی فجا نے گھبرا کر کہا۔ "ڈھائی روپے! تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟ ڈھائی روپے! تعجب ہے۔ ارے ڈھائی گھنٹے بھی تو اس کے زندہ رہنے کی امید نہیں!

وہ بھاؤ چکانے لگا۔ کبھی خفا ہوتا۔ اور چیخنے لگتا۔ کبھی عاجزی کرتا۔ اور گڑگڑاتا کہ میں بے حد غریب ہوں۔ فصل ٹڈیوں کی نذر ہو چکی ہے۔ جو بچی ہے وہ بھی کاٹنے نہ پر باد ہو رہی ہے۔ مائی جی کچھ تو رحم کرو!

اس کی آواز بیٹھ گئی۔ وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ مگر زینب کا دل نہ پسیجا۔ اور وہ واپس جانے لگی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ فجا کا دل ہلنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ کھیت میں جو کی بال ٹوٹ کر گر رہی ہو گی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "اچھا مائی جی مجھے منظور ہے! مجھے دھائی روپیہ ہی منظور ہے مگر میں دو دن اور چار دن نہیں جانتا۔ اسی معاوضہ میں تمھیں کفن دفن کے وقت تک خبر گیری کرنی ہو گی!

زینب راضی ہو گئی۔ فجا کو ماں کے آخری حق سے رستگاری نصیب ہوئی۔ وہ گھر سے نکلا۔ اور مزدوروں کا بندوبست کر کے کھیت کی طرف چلا گیا۔

زینب مریضہ کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنا کرتہ ساتھ لیتی آئی تھی اسے سینے میں مشغول ہو گئی۔

وہ سی رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نہ معلوم یہ بڑھیل کب مرتی ہے۔ دھوپ زرد ہو گئی۔ شام ہونے کو آئی مگر اس کی حالت جوں کی توں ہے.....

آفتاب ڈوب گیا۔ زینب نے چراغ ڈھونڈھ کر روشن کیا مگر پھونک مار کر اسے گل کر کے مریضہ کی طرف بڑھی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا گلا پکڑ لیا۔ لیکن اسپر رعشہ طاری تھا۔ اس کی لرزتی ہوئی خشک انگلیوں نے مریضہ کا گلا دبانے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر سوئی چراغ روشن کیا۔ اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

پہر رات گذرنے پر فجا گھر آیا اور ماں کی چارپائی کے قریب آکر دیکھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس نے سوچا کہ رات کو زینب کو روکنے سے اسے روٹی بھی کھلانی ہو گی اس نے زینب سے کہا۔ میں آگیا ہوں۔ اب تم جاؤ۔ مگر صبح سویرے آجانا۔

رات کو فجا اپنی ماں کے قریب سویا۔ صبح سویرے اُٹھ کر لیتی کے ساتھ روٹی کھائی

[illegible] اس [illegible] سے فارغ ہوتے ہی زینب آگئی۔ اور حالت دریافت کی۔
فجا [illegible] بدولی کے ساتھ جواب دیا۔ "لو زندہ ہے"
وہ کھسیانی سی ہو کر طرف چلی گئی۔ اور زینب کل کی طرح پیسنے میں مصروف ہوگئی
وہ سوچ رہی تھی کہ نہ معلوم اس کے مرنے میں دو دن صرف ہوں گے یا چار
دن یا پانچ [illegible] جائے گا۔ کاش میری انگلیاں یاری کرتیں اور رات ہی
اس کا خاتمہ کیا ہوتا۔ روز روشن میں تو اس کام کی ہمت نہیں پڑتی۔

وہ پھر سوچتی رہی۔ پھر کیا رگی اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ گویا وہ
بھول گئی کہ ایک مریضہ کے پاس بیٹھی ہے۔ جو جانکنی میں مبتلا ہے۔ مگر فوراً ہی اس نے
ہنسی روک لی۔ اور آگے بڑھ کر فجا کی ماں سے پوچھا "کبھی شیطان کو دیکھا ہے؟"
اس نے سر کی اشارہ سے جواب دیا۔ "نہیں!"

زینب اس کے کان کے قریب جھک کر زور زور سے شیطان کے خوفناک
قصے بیان کرنے لگی۔ اسی دوران میں اس نے کہا کہ انسان مرنے لگتا ہے تو ابلیس ملعون
منہ پر سیاہ نقاب ڈال کر اس کے سامنے آتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے سینگ آگے کو جھکے
ہوتے ہیں۔ وہ گدھے کی طرح زور سے چیختا ہے۔ جو شخص اُسے دیکھتا۔ اور اس کی
آواز سنتا ہے فوراً اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ زینب نے اپنے بیان کردہ
خیالات کی توثیق کے لئے اپنے متعدد مشاہدات بھی بیان کئے۔ اور فجا کی ماں کو یقین دلایا
کہ میں نے یہ واقعات بیسیوں مرنے والیوں کی جانکنی کے وقت اپنی آنکھوں سے
دیکھے ہیں۔

فجا کی ماں جبکا تنفس پہلے ہی بے ترتیب ہو رہا تھا۔ دہشت سے کانپنے
لگی۔ اور اس کا دم گھٹنے لگا۔

زینب نے چیخ کر کہا۔ "شیطان کی آواز آ رہی ہے۔ وہ دیکھو شیطان آگیا
اور یہ کہتی ہوئی وہ حجرہ سے باہر نکل گئی۔

فجا کی ماں اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وحشیانہ انداز میں
اپنے سامنے اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

زینب نے ایک بار کمال بیکٹری پھرتی سے اپنا گیرو اوڑھنی باندھ کر اپنی کبودی
شلوار اُتاری۔ اور دونوں پائنچوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر اسے سر اور چہرہ پر
ڈال لیا۔ ہاتھ آگے کو جھکا دیئے گویا شیطان کے سینگ ہیں۔ اور غیر مفہوم الفاظ
میں چیختی چلاتی حجرہ میں داخل ہوئی۔ اور چارپائی کے قریب پہنچ کر کودنے
پھاندنے لگی۔

فجا کی ماں شیطان کو دیکھ کر اور اس کی آواز سنکر دیوانی سی ہوگئی۔ اس نے
اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی طاقت سلب ہو چکی تھی وہ اٹھتے ہی
چارپائی کے نیچے گری۔ اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

زینب نے شیطان کا کامیاب پارٹ ختم کر دیا۔ اب وہ پہلے ہی کی طرح
متین تھی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس نے لاشہ کو چارپائی پر الٹا یا۔ اور خود فجا کو
اس کو خبر دینے چلی گئی۔

فجا نے یہ خوشخبری سنکر شکر ادا کیا کہ جلد ہی یکجوئی نصیب ہوئی۔ البتہ
اسے اس امر کا بے حد ملال ہوا۔ کہ زینب نے اسے ٹھگ لیا۔ اور اگر وہ اُسے
روزانہ اجرت پر رکھتا تو ڈھائی روپے کے بجائے اُسے صرف سوا روپیہ دینا
ہوتا۔

(صدیق طبیب)

سالنامہ! سالنامہ!! سالنامہ!!!

اگر گذشتہ سال آپ نے سالنامہ بذریعہ وی پی طلب کیا تھا۔ تو امسال آپ کو سالنامہ بذریعہ وی پی ارسال کر دیا جائے گا۔ آپ درخواست نہ کریں۔ لیکن اگر کسی وجہ سے آپ نے سالنامہ گذشتہ نہیں خرید تھا۔ تو اپنا نام درج کرا دیجئے تاکہ شائع ہوتے ہی بذریعہ وی پی آپ کو بھیجدیا جائے

منیجر رسالہ نیرنگ خیال۔ لاہور

سیاح عورت کا خط اپنے محب کے نام

طبع زاد

(از مس حجاب اسمٰعیل مدراس)

حائل ہماری راہ میں صحرا ہزار ہوں — رستے میں لاکھ سرپھلک کوہسار ہوں
خیگل ہو کوہسار ہو دریا ہو کچھ بھی ہو — آفت ہزار راہ میں برپا ہو کچھ بھی ہو
ہر فتنہ بے پناہ اگر ہے۔ ہوا کرے — ہر ذرہ سنگِ راہ اگر ہے ہوا کرے

مجھ سے کسی طرح تری الفت جُدا نہیں
تو خود جُدا نہیں تری صورت جُدا نہیں

(ایک ایشیائی گرم ساحل سے۔ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۳۰ء)

خوب صورت آدمی!

مسکراتے رہو۔ آمین

دو سال ہوئے۔ تمہارا محبت نامہ ملا تھا۔ مگر تم جانو۔ مجھ جیسی بیقرار ہستی۔ اور لاابالی روح سے یہ کہاں ممکن تھا۔ کہ فوراً جواب لکھ دیتی!

میں گہرے گہرے سمندروں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کا چکر لگا رہی تھی۔ بندرگاہوں اور شہروں میں گھوم رہی تھی۔ تم جانتے ہو میں اپنے مشرقی گرم اور بڑے سے آفتاب کی بچپن سے عاشق ہوں۔ پس میں ایشیائی ریگستانی ممالک کی تپتی ہوئی چمکیلی فضاؤں کا لطف اٹھا رہی تھی۔ ان ہنگاموں۔ جھگڑوں۔ اور پیچ در پیچ الجھنوں میں بھلا تم اور تمہارا خط ——— مجھے کیا خاک یاد رہ سکتے ہیں یا یہاں ——— ان تمام دلکش آلام۔ دلچسپ مصائب میں گرفتار رہنے کے باوجود۔ اگر کوئی شے میری روح۔ میرے دل۔ اور میرے جسم اور میرے خیال میں سمائی ہوئی تھی۔ تو وہ صرف ایک شخص۔ ایک خوبصورت۔ نیلگوں چشم۔ بہادر شخص کی محبت تھی۔ (اور یقیناً تم اتنے کند ذہن نہیں ہو کہ پہچان نہ سکو کہ وہ کون شخص ہے!) اور انشاء اللہ زندگی کے آخری لمحوں تک یہی حالت رہے گی۔ خیر ——— اب جانے دو۔ کم فرصتی کے موقعوں پر عاقل محبت کی فضول اور پیچیدہ بحثوں میں نہیں الجھا کرتے۔ بار بار اظہار محبت کرنا۔ اور مضبوطی عشق کی دلائل پیش کرتے رہنا۔ پرانے زمانے کی تہذیب ہے۔ اس لئے محبت اللہ عاشقی کو اب اک ڈھکن دار صندوقچے میں بند کر کے پہلے میری سرگذشت سُن لو؛

مگر کیسی عجیب بات ہے۔ کہ جب کبھی میں اپنی سرگذشت کسی دوست۔ کسی سہیلی کسی ہلیس کو سنانے بیٹھتی ہوں۔ تو سب سے پہلے جو حرکت مجھ سے سرزد ہوتی ہے۔ وہ اک بلند اور بے ساختہ ہنسی ہوتی ہے۔ کیونکہ میں سوچنے لگتی ہوں۔ کہ ایک سیاح عورت ایک بھری آزاد خیال عورت اسپر مستزاد اک ناول نویس ادیب عورت۔ اپنی سرگذشت کیا کہکر سنائے گی؟ اے خدا! کیا کیا سنائے گی! اپنی کتاب زندگی کے کون سے باب کو پیش کرے گی؟

میرے محبوب دوست! یونہی سیاحوں کی زندگیاں بجائے خود ایک دلچسپ افسانہ ہوتی ہیں۔ اسپر طرہ۔ اک عورت۔ اک خاتون سیاح کی زندگی! ——— یا اللہ! میں اس کو کیا کہوں! کس چیز سے تشبیہہ دوں؟ شاعر کا خواب کہوں۔ یا مصور کا تخیل؟ غرض وہ کوئی ایسا ویسا افسانہ نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں سمجھ لو۔ کہ الف لیلہ کی ایک طویل کہانی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کون سا قصہ کس جگہ سے شروع کروں۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم تھوڑے دنوں کے لئے اپنی فوجی خانہ بدوش خونی زندگی کو خیرباد کہہ کر سیدھے میرے پاس مہمان ہو کر چلے آؤ۔ اور تمام حالات زبانی سن لو۔ اس طرح تمہاری تشنی ہو جائے گی؛

ان تمام باتوں سے قطع نظر ——— مجھے اپنے مشاہدات زندگی و تجربات سیاحی کی بنا پر اب یہ ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کہ انسان کو اگر مکمل آزادی

اس چھوٹی سی دنیا میں کہیں نصیب ہو سکتی ہے۔ تو وہ صرف اس کے گھر "پیارے گھر" "میٹھے گھر" کی چار دیواری میں! لاریب!! گھر انسان کی ایک آزاد جنت ہے۔ مجھے اپنے سفری تجربوں میں سب سے پہلے تجربہ ہوا۔ وہ یہی ہے۔ ہاں کبھی! یاد رکھو وہ زندگی فضول اور بے کیف ہے۔ جو گھر سے باہر گذرتی ہے۔ اور جس شخص کا دنیا میں کوئی گھر ہی نہیں۔ اس کی بدنصیبی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں!

تم فانگی بے لطفیوں۔ گھر بلا مصائب اور میری زندگی کے لیے در پے حادثات صدمات سے تو کما حقہ واقف ہو۔ اور یہ بھی جانتے ہو۔ کہ یہی اسباب تھے کہ میں سیاحت پر آمادہ ہو گئی۔ اور ایک مدت کے لئے گھر کو خدا حافظ کہا۔ اور تلاش سکون میں ساحل بندرگاہوں پر ماری پھرتی رہی۔

اگرچہ سفر نے میرے صدمات میں کسی قدر کمی ضرور کر دی۔ غم کا بوجھ عارضی طور پر ہلکا ضرور ہو گیا ——— پر آہ ——— میں دیوانی تھی۔ کہ گھر سے باہر اطمینان قلب اور سکون روح کی تلاش میں سرگرداں نکلی۔ پگلی تھی کہ گھر کے در و دیوار سے متوحش ہو کر سفر پر چلی گئی۔ یاد رکھو۔ اور اچھی طرح یاد رکھو۔ انسان کا اطمینان سچی مسرت گھر کی سرزمین میں مقید ہے۔ اور جو شخص ان نعمتوں کو اپنے دروازے کے باہر تلاش کرتا ہے وہ سخت غلطی پر ہے۔ تم اپنے مکان کے کمروں میں مسرت کو تلاش کرو اپنے گھر کے ذہنی کونوں میں سکون کو ڈھونڈھو۔ گھر سے باہر ان چیزوں کا فقدان ہے

میں اک دن بھی خوش نہ رہی۔ میری خوشیاں عارضی۔ میری امیدیں بناوٹی۔ اور میری مسکراہٹ مصنوعی! باوجود ان تمام دلچسپیوں اور مسرتوں کے جو مجھے میری بحری سیاحت میں میسر ہوئے۔ میں نے اک دن بھی جدا ہونے کے بعد روح کا سکون اور ضمیر کا چین محسوس نہیں کیا! خیر بھئی خدا کے لئے اب ان ڈرانی اور غیر افسانوی قصوں کو جانے دو۔ میں اپنے سفری افسانے تمہیں زبانی ہی سناؤنگی اب سب سے پہلے ایک خوشخبری سن لو۔ کہ اب میں معبود کی عنایت سے پھر اپنے "شیریں گھر" واپس آگئی ہوں۔ اے خوشا بخت!

وہ جہازی آدمیوں کی مکروہ ہمراہی۔ وہ بے ربط محبت۔ فضول اظہار عشق۔ وہ وفا بازیاں۔ مکاریاں۔ نفس پرستی ——— غرض ان تمام دنیوی دوزخی مناظر سے خدا کا شکر بجا لاؤ۔ کہ اب میں بہت دور ہوں۔

اب میں اپنے گھر کی روحانی فضا میں ہوں۔

جونہی گھر کا دروازہ نظر آیا۔ ایسا محسوس ہوا۔ کہ میرا ستارہ بخت بدنصیبی کے گھرے بادلوں سے دفعتاً باہر نکل آیا۔ میرے کتے اور طوطے نے گھر کو پہچان کر دروازے ہی پر بے ڈھنگی بے ڈھنگی اور مسرت کے جنون میں ڈوبی ہوئی چیخیں مارنی شروع کیں

ادھر خود میری یہ حالت ہو رہی تھی۔ کہ اگر مجھے محلہ داروں کی تیز قوت سامعہ کا خیال نہ ہوتا۔ تو یقیناً میں بھی ان کے ساتھ بے تحاشہ آزادی اور بے ساختگی کی چیخیں مارنے لگتی۔ پھر تو "شیریں گھر" اور "شیریں گھر" کے ساتھ پورا محلہ نعرۂ مسرت میں ڈوب کر رہ جاتا۔

خیال تھا۔ کہ نہایت ہی متانت اور بارعب انداز سے دروازہ کھول کر اندر جاؤنگی۔ اور چونکہ دنیا کی بہت لمبی سیاحت کی ہے۔ اس لئے نہایت مہذب باوقار اور شائستہ طریق سے گھر نوکروں سے گفتگو کروں گی۔ اپنے پالتو جانوروں پیار سے لگاؤنگی ——— پر جونہی زینے پر قدم رکھا۔ متانت اور سنجیدگی کا خیال بابل کی طرح اڑ گیا۔ پورے جسم سے دروازے کو دھکیل کر سیدھی دالان کی طرف بھاگی پھر باغ کے کنوئیں کی طرف دوڑی۔ جس میں شفاف پانی اپنے قدیم انداز میں ابل رہا تھا۔ یہ میرے گھر کی باؤلی تھی ——— گھر کی! اس لئے اس کو متواتر بوسے دیئے۔ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ جھک جھک کر یاسمین کے گھر بلا پھولوں کو سینے سے لگاتی رہی۔ ہار سنگھار کی ٹہنیوں کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ مگر خیر ——— میں یہاں اپنے ان شاعرانہ احساسات اور افسانوی جذبات کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ میری انتہائی بدقسمتی سے تم شاعر نہیں ہو! صرف ایک فوجی آدمی ہو! اور شاید تم جانتے ہو گے کہ میں مردوں کے لئے شاعری کو اتنا ضروری نہیں سمجھتی۔ جتنا بہادری اور دلیری کو سمجھتی ہوں۔ ایک بزدل شاعر کو عورت کبھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتی! مگر ایک غیر شاعر فوجی کو ہزار جان سے پسند کرتی ہے۔ اس لئے مجھے اپنی بدقسمتی کا بالکل گلہ نہیں! کمروں کے دروازے اک بیخودی کے عالم میں پٹا پٹ میں نے کھولے میں نے کھولے۔ اور اندر گھس گئی۔ ہر چیز ——— گھر کی ہر چیز مجھے فردوسی عطیہ اور انعام الٰہی معلوم دیتی تھی۔ میں بس جنت میں اک جدید کی طرح چہچہا رہی تھی۔ اک مدت مدید بعد "گھر بلو آزادی" ملی تھی۔ جنون کی سی کیفیت طاری و ساری تھی آزادی کی خواہش میرے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ فریقہ کے وحشیوں کی طرح کود دوں..... بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ ملاقاتی کمرے اور طعام خانے کی کرسیوں کو آزادی کے جوش اور مسرت کی شدت میں سر پر لے ناچوں۔ میری بوڑھی، تانزو ناش نے میری ان حرکات پر اظہار ناراضی کیا۔ کہنے لگی "کیا واہیات ہے بی بی! ایسی بھی کیا وحشت! غسل کر لو۔ اسباب درست کر لو نماز پڑھ لو۔ آرام کرو"

مگر میں نے اس بوڑھی لونڈی کے لباس کا دامن پکڑ کر زور سے کھینچا۔ اور اک غزل گاتے ہوئے باغ میں بھاگی۔

ہاں! اس وقت مجھے عمر خیام کی رباعیاں رہ رہ کر یاد آرہی تھیں اور میں نے اور میرا خوش رنگ ہمجولی گا رہی تھی:

کتا ——— میرا وفادار رفیق تھا۔ یہی میرے پیچھے پیچھے کھوکھتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ اور فطرت ——— جس کے جذبات میں بالکل میرے دلی کیفیات اور موجودہ احساسات سے ملتے جلتے ہیں گھر کی آزادی کو محسوس کرکے شریر انداز میں مچل رہی تھی۔ ملاقاتی کمرے کے صوفوں کی بکلمی۔ اپنی سرخ اور خمدار چوخ چوخ سے کتر کتر کر نیچے قالین پر پھینک رہا تھا۔ میں نے ہی اسے اس موقع پر منع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ خود میری یہ حالت ہو رہی تھی۔ کہ اگر پروردگار نے مجھے بھی ایک لمبی سی اینڑ چوخ عطا ہوتی تو یقیناً میں بھی اس بلا کام میں اس کی شریک ہو جاتی! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک زمانہ کے بعد گھر کا پایا ہے چھوٹ کر آئی ہوں ——— غرض میرے پیارے شخص! میں کیا کہوں۔ گھر پہنچ کر مجھے اس بات کا کس شدت سے احساس ہوا۔ کہ دنیا میں اگر کچھ آزادی اور صحیح مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ تو وہ اپنے گھر کے کونوں میں اگھر کی چہار دیواری میں! ——— انسان نے؟

میں ہوٹلوں۔ کلبوں۔ ہندر گاہوں۔ اور پر تکلف جہازی کمروں کی شاندار زندگی سے بیزار ہو گئی ہوں۔ اعلیٰ درجہ کی سوسائٹیوں۔ لائق لوگوں کی فلسفیانہ بحثوں۔ عالموں کی دقیق گفتگوؤں اور مہذب دنیا کی جان لیوا پابندیوں۔ غرض ان ساری بناوٹی باتوں سے تنگ آگئی ہوں۔ وہ سب پابندی اور قید و سلاسل کے اسباب ہیں۔ تم جانتے ہو۔ قوم عرب کا بہادر اور خونخوار خون۔ کبھی غلامی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا!

میں اپنی قسمت کے ستاروں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اب میں جو چاہوں آزادی سے کر سکونگی۔ کوئی میری کسی حرکت کی پرسش نہ کرے گا۔ دل چاہتا ہے دل چاہتا ہے کہ گھر بھر میں آزادی کا پورا پورا لطف اٹھاؤں۔ بعض اوقات بے اختیار دل (میرا شریر دل! خدا کی پناہ اس سے!!) بھی چاہنے لگتا ہے۔ کہ گھر کی دیواروں اور گھر کے کمروں سے ٹکریں مارتی پھروں۔ یا خواب گاہ سے اندرونی حصہ تک بھاگوں۔ اور وہاں سے پھر واپس آؤں۔ غرض جو چاہوں کروں۔ جو نہ چاہوں نہ کروں! اس لئے کبھی کبھی کھانا بھی نہ کھاؤنگی۔ اور کبھی شام کی چائے بجائے پانچ کے شب کے گیارہ بجے پیونگی تاکہ مجھے یقین ہو جائے۔ آپنے خوشگوار خواب کا یقین ہو جائے کہ میں اب مکمل طور پر آزاد ہوں۔ اور اپنے گھر میں ہوں۔ گویا "جنت" میں ہوں۔ اور اس دوزخی دنیا سے جس کو تم ممکنوں کی اصطلاح میں "مہذب دنیا" کہتے ہیں۔ بہت دور ہوں اور محفوظ ہوں!

خدا کی پناہ! تم لوگوں کی مہذب سوسائٹی اور متمدن زندگی ——— !! یہی وہ خطرناک چیز ہے۔ جو ہماری ابدی آزادیوں اور پیدائشی حقوق کی دشمن ہے اور انسان کو قید سلاسل کا بندہ بنا چھوڑتی ہے۔ مہذب دنیا اور متمدن سوسائٹی کی زندگی۔ زندگی کا ہے کو ہوئی؟ پگلے آدمی! غلامی ہے۔ اسے غلامی کہو:

اب میں صبح تمام اپنے "میٹھے گھر" کے نیچے پتھریلی چٹانوں پر طلوع و غروب ——— ہوتے ہوئے اور مرتے ہوئے سورج کا چہرہ لہروں و ٹھیتی ہوں اور صحرا کی زندگی پر نازاں ہوں۔ جب اذان کی آواز صحرا کے پرسکون فضا میں گونج اٹھتی ہے۔ تو میں مقدس مذہب کی عقیدت سے سرشار دل لئے ہوئے واپس اپنے گھر آجاتی ہوں:

مجھے ڈر ہے۔ تم میرا یہ خط پڑھ کر ہنسو گے۔ مجھے پاگل کہو گے۔ مگر میں تو "مہذب" پاگل بننا چاہتی ہوں۔ تم میری آزادی کی کیا قدر جانو! ابھی کل تک تم خود اس ہو۔ اس تم بالکل بچے ہو۔ تلواروں اور رسالوروں کی آوازوں نے عقل کو تمہارے دماغ سے اور تمہارے دماغ کو عقل سے کسی قدر فاصلے پر ہٹا دیا ہے۔ پگلے آدمی! ایک دفعہ تم ایشیائی ساحلوں اور گرم گرم آفتاب کی کرنوں والے صحرا کی چٹانوں پر زندگی بسر کرکے دیکھو۔ پھر تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی:

ہاں! میرا اور اندلس یہ حال ہے کہ آزادی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے عجیب عجیب کام کر رہی ہوں۔ نئے نئے طریقے دماغ میں چلے آتے ہیں۔ کل ہمارے کرنل واٹسن آئی۔ ایم۔ ایس (میرے طبی مشیر) مجھے دیکھنے آئے تھے۔ اس وقت میں سمندری غسل کے لئے جا رہی تھی۔ سر میں درد تھا۔ اور اعضا شکنی بھی شروع ہو گئی تھی۔ انھوں نے منع کرتے ہوئے کہا کہ ایسی حالت میں سمندری غسل مضر ہوگا۔ مگر میں کب رکنے والی تھی بھلا! میں نے کہا کہ:

"ڈاکٹر صاحب! اٹھا رکھئے اب ان طبی نصیحتوں کو! میں اپنے شیریں گھر میں ہوں۔ جس کی فضا آزاد ہے۔ آپ جہازی ڈاکٹر نہیں ہیں۔ میرے گھریلو ڈاکٹر ہیں"۔

یہ کہتے ہی میں نیلے نیلے سمندر میں کود پڑی۔ اور مچھلی کی طرح تیرنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب ساحل پر کھڑے نصیحت کرتے رہے کہ نمونیہ ہو جانے کا اندیشہ ہے وغیرہ

"میں اپنے گھر کی آزاد فضا میں ہوں"

میں نے چلا کر کہا۔ اور گرجنے والی موجوں پر مرغابی کی طرح اٹھنے لگی:

دوسری صبح ——— کو ——— میں کیا کہوں تم سے! کہ اس آزادی کا نتیجہ کیا ہوا؟ ——— اگرچہ میں ——— مکمل طور پر ایک مشرقی پنچھی

صبح تھی - پر میرے لئے نہایت تکلیف دہ! سر میں درد - جسم میں بخار - دماغ میں اُلجھن - دل میں بیچینی! سو اس سے معلوم ہوا - کہ آزادی حد اعتدال تک اچھی ہوا کرتی ہے - اس سے بڑھ کر مضر - بلکہ جان لیوا - ولولے اور خوشیاں خاک میں مل گئیں - اور میں ایک معذور ہرنی کی طرح مجبور پلنگ پر پڑی ہوں - اور آہستہ آہستہ - ع

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

گا رہی ہوں - جی گھبرایا - تو لیٹے لیٹے تمہارے خط کا جواب لکھنا شروع کر دیا ارادہ ہے اپنے سفری تجربات - مشاہدات اور بحری واقعات کو قلمبند کروں - اور ایک ضخیم کتاب شائع کروں - جس کا نام ہوگا - "سیاح عورت"

لو ــــ خدا حافظ ــــ !

انہیں افسانۂ دل ڈرتے ڈرتے سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے!

(حجاب اسمٰعیل)

استاد ادب

والدین کی تربیت اور استاد کی جان توڑ کوششیں جو بات ایک تازہ اور غیر مصفا دماغ میں پیدا نہیں کر سکتیں عشق ہزار آسانی کر سکتا ہے ؛

عشق ایک فاضل معلم ہے - ایک بہترین رہنما ہے - یہ ایک ایسا باغبان ہے جو نا اہل سے نا اہل ریگستانِ داغ میں سبز اور سنہری کیاریاں لگا کر انسان کو ایک خوشگوار - دلکش اور جانفزاء باغیچے میں تبدیل کر سکتا ہے -

پہلے پہلے عشق حیا - شرم - عاجزی اور انکساری کا سبق دیتا ہے - جب ان لطیف اور نازک پودوں کی جڑیں جاندار دماغ میں جگہ کر لیتی ہیں تو یہ ابھرنا اور پھیلنا چاہتے ہیں - جنون اور وحشت کو جو عشق کے دو خاص ہمرکاب ہیں - اپنی نرم اور پُر بہار پتیوں میں چھپا لینا چاہتے ہیں - میدانِ جنگ گرم ہوتا ہے اور حیا - شرم عاجزی اور انکساری - جنون اور وحشت پر قابو پا لیتی ہیں ؛

کیا اس طرح انسان کی زندگی اخلاق و ادب کا حسین ترین مجسمہ نہیں بنجاتی ؟

(جون ڈرائیڈن - سائمن اینڈ افیجینا)

(اخوت عمر پوری)

دُرِ ناسُفتہ

(۱) جس مقدس ہستی کے قبضۂ قدرت میں آپ کی جان ہے - اس کے گرانبہا عنایات کے شکریہ ادا کرنے سے آپ اسی طرح قاصر ہیں جس طرح "مرغ شکستہ پر" اُڑنے سے ؛

(۲) علم باپ ہے - اور اتقا ماں ؛

(۳) سچا دوست تریاق سے زیادہ سود مند ہے - اور برہمنشین سمِ قاتل سے زیادہ مضر ہے ؛

(۴) شریف انسان وہ ہے جو دوسرے کی اذیت کو گوارا نہ کرے ؛

(۵) جن کے آباؤ اجداد شریف ہوتے ہیں - ان میں فخر و مباہات زیادہ پاؤ گے ؛

(۶) کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی ؛

(مسعود حسن - دانا پوری)

نپولین بوناپارٹ

(سید ہادی - بی اے علیگ)

نپولین بوناپارٹ کا نام آج بھی تمام دنیا میں روشن ہے۔ اگرچہ اس کے دشمنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس کے کارہائے نمایاں ایسی خوفناک اور نفرت آمیز شکل میں پیش کئے جائیں۔ کہ لوگ اس کو بہت برا آدمی سمجھنے لگیں۔ نپولین دراصل اتنا بڑا مدبر سیاسی۔ اتنا بڑا سپہ سالار۔ غریبوں کا اتنا بڑا حامی اور لیلیٰ آزادی کا ایسا سچا پرستار تھا۔ کہ جب تک تدبر ملکی۔ سیف آزمائی۔ اور حب الوطنی کی دنیا میں قدر و منزلت کی جائے گی۔ اسوقت تک اس کا نام نامی عزت۔ اور محبت کے ساتھ لیا جائے گا۔

پیدائش اور ابتدائی حالات بحر متوسط میں ایک چھوٹا جزیرہ کارسیکا واقع ہے۔ جو اٹلی اور فرانس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس جزیرے کے صدر مقام اجے شیو میں نپولین بوناپارٹ ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک درمیانی درجہ کے وکیل تھے۔ جن کا خاندان اگرچہ قدیمی شرفا کا خاندان تھا لیکن اس کی مالی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ نپولین کے بڑے اور چھوٹے اور بھی کئی بھائی بہن تھے۔ جس زمانہ میں نپولین پیدا ہوا تھا انھیں دنوں میں جزیرہ کارسیکا۔ فرانس نے اٹلی سے خرید لیا تھا۔

نپولین چھ سات سال کا ہوا تو اسکول میں داخل کر دیا گیا لیکن اسے پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا۔ بجز حساب کے وہ اور کسی مضمون میں خاص طور سے ہوشیار نہ تھا۔ وہ کھیل کود کا شائق تھا۔ اور کھیل لڑائیوں میں اپنے ہم عمروں کا رہنما ہوتا تھا۔ ماں کی بہت کچھ تنبیہ و تادیب کی وجہ سے اس نے ابتدائی تعلیم تو ختم کر لی لیکن آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ کوئی بارہ تیرہ سال کا ہوا تو اس کے والد نے کوشش کر کے اپنے دو لڑکوں کو مزید تعلیم کے لئے حکومت فرانس سے وظیفہ حاصل کر لیا۔ اور

فوجی تعلیم نپولین فوجی تعلیم کے لئے برین کے مشہور ملٹری اسکول میں داخل ہوا۔ جو فرانس کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ نپولین برین اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں پہونچا تو اس کی طبیعت بہت گھبرائی۔ کیونکہ اگرچہ وہ فوجی تعلیم پسند کرتا تھا۔ لیکن دوسرے لڑکے اس کو بہت چھیڑتے تھے۔ وہاں فرانسیسی زبان بولتے تھے۔ اور عمدہ اور قیمتی لباس استعمال کر سکتے تھے۔ نپولین ایک چھوٹے سے جزیرہ کی دہقانی سی زبان کا عادی تھا۔ اور باوجود زبان سیکھ لینے کے اس کا لہجہ مختلف اور نامانوس تھا۔ جسپر اس کے ہم سبق بے طرح پھبتیاں اڑاتے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے نپولین اپنے کمرہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ اور اپنا زیادہ تر وقت پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔ برین کے اسکول میں اسے گذشتہ زمانے کے مشہور جرنیلوں اور سپہ سالاروں اور دیگر مشاہیر کے حالات پڑھنے کا بہت شوق پیدا ہو گیا۔ پلوٹارک کی لکھی ہوئی مشاہیر یونان و روما کے سوانح حیات وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ تاریخ و جغرافیہ اور مشہور لڑائیوں کے حالات پڑھنے سے اسے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

نپولین پانچ سال برین کے اسکول میں رہا اور اپنے وقت کو نہایت خوبی سے استعمال کیا۔ اس زمانہ میں اس نے بجز اپنے ایک ہم عمر کوئی بورونی کے کسی اور سے دوستی نہیں کی۔ یہ بورونی آگے چلکر شہنشاہ نپولین کا پرائیویٹ سکرٹری بنا اور اسی کے روزنامچہ اور تحریری یادداشتوں سے ہم کو نپولین کی زندگی کے اصلی حالات بلاکم و کاست معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق نپولین کو برین کی تعلیم کے بعد فوج میں داخل ہونے سے قبل ایک سال پیرس دارالسلطنت فرانس کے ملٹری کالج میں بغرض تکمیل فن رہنا پڑا۔ برین اور پیرس کی تعلیم گاہ چھوڑنے کے وقت افسران نے نپولین کی قابلیت اور چال چلن کے متعلق نہایت عمدہ ریمارک لکھے تھے۔

فوجی ملازمت نپولین ابھی پیرس کے ملٹری کالج میں تھا کہ ۱۷۸۵ء میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جو تمام خاندان کے ساتھ وطن مالوف میں رہتا تھا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد انیس سال کی عمر میں نپولین کو ایک فرانسیسی رجمنٹ قلیل سی تنخواہ کی جگہ مل گئی۔ اپنی رجمنٹ کے ساتھ ایک مدت نپولین۔ فرانس کے مختلف مقامات میں بطور معمولی فوجی افسر کے مقیم رہا۔ اس دوران میں بوجہ قلت تنخواہ اسکو بہت تکالیف و مصائب اٹھانا پڑیں۔ وہ زمین پر سوتا اور اپنا کھانا خود تیار کرتا تھا۔ جو اکثر صرف نشک روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ گاہ بگاہ وہ کسی قسم کا شوربا بھی تیار کر لیا کرتا تھا۔ وہ کپڑے بھی موٹے اور معمولی قسم کے استعمال کرتا تھا۔ والد کی وفات کے

بعد وہ گاہ بگاہ اپنی ماں کی مالی امداد کیا کرتا تھا۔ ایشیا میں شاید اسی لئے غریبی کو رحمت سمجھا جاتا ہے۔ کہ اس کی وجہ سے انسان میں لاتعداد خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ہزاروں گناہوں اور برائیوں سے بچا رہتا ہے۔ اسی غربت اور ناداری کے زمانہ نے نپولین کی اتنی عمدہ تربیت کی کہ وہ آئندہ چل کر دنیا کا مشہور اور قابل ترین سپہ سالار سمجھا گیا۔ باوجود قلت آمدنی کے نپولین نے اپنا خرچ کبھی اپنی آمدنی سے زیادہ نہیں بڑھنے دیا۔ وہ نہایت کفایت شعار تھا۔ اور قرض لینے سے سخت نفرت کرتا تھا۔ مقروض اور در و منگو آدمی کے اوپر وہ کبھی رحم نہیں کرتا تھا۔ اور ان دونوں باتوں کو دنیا کا بدترین عیب سمجھتا تھا۔

انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء میں شہرۂ آفاق انقلاب فرانس شروع ہوا۔ تو نپولین فرانسیسی۔ فوج میں ملازم تھا اور کپتان کے عہدہ تک ترقی کر گیا تھا۔ فرانسیسی پبلک انقلاب میں کامیاب ہو رہی تھی اور آخر کار ۱۷۹۳ء میں انقلابیوں نے اپنے بادشاہ لوئی کو قتل کر کے جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ نپولین ذاتی طور سے ملوکیت اور شہنشاہیت کو ناپسند کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ اکثر بادشاہ اسی قابل ہیں۔ کہ ان کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔ لیکن فرانسیسی انقلاب پسندوں نے جس جا اور بے جا کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ وہ اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب پسندوں کا نعرۂ جنگ "حریت۔ مساوات اور اخوت" تھا۔ یہ الفاظ ہیں کہ ان کو ہر ملک کے باشندے اپنا نصب العین قرار دے کر اپنے ملک کی شخصی یا تحکمی حکومتوں کے خلاف برسرپیکار ہو سکتے تھے۔ اپنے ممالک کو اس بلائے بے درماں سے محفوظ رکھنے کے لئے متعدد یورپین ممالک نے کوشش کی کہ وہ فرانس کے شہنشاہیت پسند گروہ کی امداد کریں۔ تاکہ جذبات حریت و مساوات کی چنگاری اسی آتشدان میں سرد ہو جائے جہاں سے وہ اٹھی تھی۔ اس غرض سے برطانیہ پرشا (جرمنی) اور آسٹریا کی زبردست حکومتیں فرانس پر حملے کر رہی تھیں قبل اس کے کہ آسٹریا کی فوجیں فرانس میں داخل ہوں۔ آسٹریا اٹلی کو فتح کر لینا چاہتا تھا۔ فرانس کو ضرورتاً اٹلی کی امداد کرنا پڑی۔ آسٹریا کو اٹلی میں شکست دینے کیلئے فرانسیسی حکومت نے نپولین کو بطور جرنیل انتخاب کیا۔ نپولین۔ کوہ آلپس کو حیرت انگیز جرأت کے ساتھ عبور کر کے بجلی کی طرح آسٹروی

پہلی بڑی کامیابی فوج پر گرا اور اٹلی سے باہر بھگا دیا۔ یہ بات کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی تھی۔ کہ ایک عظیم الشان فوج برف سے ڈھکے ہوئے یورپ کے بلند ترین پہاڑوں کو عبور کر سکتی ہے۔ نپولین کے اس فوجی کارنامے نے تمام یورپ میں تہلکہ ڈال دیا۔ اور دوست دشمن اس نوعمر جرنیل کی بہادری پر عش عش کرنے لگے۔

اٹلی کی فتوحات سے نپولین کا نام تمام دنیا میں روشن ہو گیا۔ اور فرانسیسی لوگ اسے اپنے ملک کا بہترین جرنیل سمجھنے لگے۔

پہلی شادی نپولین کی شادی کی داستان بھی ایک گونہ دلچسپ ہے۔ اٹلی کی مہم پر روانہ ہونے سے کچھ قبل ۱۷۹۶ء میں نپولین پیرس کے قریب ایک مقامی سرکشی فرو کرنے میں مصروف تھا کہ اُس کو ضرورتاً نظر محفوظ ماتقدم قرب و جوار کے اُن باشندوں کے اسلحہ بھی لے لینے پڑے جو سرکشی میں شریک نہیں تھے اسی سلسلہ میں جوزفائن نامی ایک حسین اور شریف خاندان فرانسیسی بیوہ کے مرحوم خاوند کی تلوار بھی آ گئی۔ وہ سرے روز جوزفائن نے اپنے کم سن لڑکے کو بھیجکر یہ تلوار واپس منگائی۔ نپولین نے کم سن بچے سے محبت سے بات چیت کی۔ اور تلوار اس کو واپس دیدی۔ دوسرے دن لڑکے کی ماں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے نپولین کے پاس آئی۔ اگرچہ عمر میں جوزفائن نپولین سے دو سال زیادہ تھی لیکن سروقد جوزفائن کے حسام ناز نے اور اس کی شیریں کلامی اور اس کے مادہ حسن نے جنگجو اور کشور کشا نپولین پر وہ بجلی گرائی کہ وہ بجلی گرائی کہ وہ سوجان سے فریفتہ ہو گیا اور اسی وقت شادی کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

معرکۂ نیل نپولین اٹلی کی مہم سے فارغ ہوا تھا کہ اُس کو ٹیپو سلطان بادشاہ میسور کا خط ملا جس میں سلطان نے نپولین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی تاکہ میسور اور فرانس دشمن انگریزوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکالدے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نپولین کی دور بین نگاہ ٹیپو سلطان کی مدبرانہ تجویز کی تہ تک پہنچ گئی اور اس نے فرانسیسی بیڑا جمع کر کے مصر کی طرف رُخ کیا۔ تاکہ وہاں سے اپنے آپ کو کسی طرح ہندوستان پہونچائے۔ لیکن دریائے نیل کے دہانہ پر بگانہ روزگار انگریزی امیر البحر لارڈ نیلسن مع برطانوی بیڑے کے موجود تھا۔ ۱۷۹۸ء میں اسی مقام پر نیلسن اور نپولین کے درمیان نہایت سخت بحری جنگ ہوئی۔ جس میں نپولین کو شکست ہوئی۔ اپنی مشرقی اسکیم کا اسطرح خاتمہ ہوتے دیکھ کر نپولین کو سخت افسوس ہوا۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والا شخص نہیں تھا۔ ابھی وہ اپنی فوجی نقل و حرکت پر غور کر رہا تھا۔ کہ فرانس میں سیاسی ابتری پھیل گئی۔ ڈائرکٹریٹ جو جدید قسم کی جمہوری حکومت فرانس میں قائم کی گئی تھی۔ وہ کمزور ثابت ہوئی اور نپولین نے فوراً پیرس پہنچکر کمزور حکومت کا خاتمہ کیا اور تین شخصوں کی کنسولیٹ حکومت قائم کی۔ جن میں سے ایک خود وہ بھی تھا۔

اعلان شاہی چند سال کے تجربہ سے ظاہر ہوا کہ دو تین آدمی آپس کے مشورہ سے مضبوط حکومت قائم نہیں کر سکتے اس لئے تمام مایا اور تمام

فوج کے شدید اصرار سے ۱۸۰۴ء میں نپولین نے اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ اول جو فائن مکر نبی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے طمع نفس کی وجہ سے شہنشاہی اختیار کی۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے اعلان شہنشاہی ذاتی اغراض کے لئے نہیں کیا۔ اگر اس مقصد سے کیا ہوتا تو وہ یقیناً شہنشاہی کو قائم بھی رکھ سکتا تھا۔ وہ اس سلطنت پر قانع رہتا۔ جو اس کو مل چکی تھی۔ اور دیگر حریفوں سے اُس وقت من مانی شرائط پر صلح کر لیتا۔ اور اپنی سلطنت اپنے خاندان کے لئے محفوظ کر لیتا۔ اس نے ہمسایہ ممالک سے اس لئے لڑائیاں جاری رکھیں کہ فرانس کی ترقی اُن کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی اور وہ تمام یورپ کا مالک بنکر فرانس کا نام تمام دنیا میں روشن کرنا چاہتا تھا۔ حب الوطنی اور ملک گیری اور جہانبانی کے اس حد سے بڑھے ہوئے جذبہ کو بُرا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن نپولین کے اعلان شہنشاہی کو بُرا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ موجودہ زمانہ میں بھی مثالیں ملتی ہیں۔ کہ ملک کی خدمت اور خیر خواہی کے لئے تاج شاہی ضرور تاً اول درجہ کے خیر خواہان ملک کو اپنے سر پر رکھنا پڑا۔

کوڈ نپولین یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نپولین صرف صاحب سیف ہی تھا۔ وہ نہایت دور اندیش حکمراں۔ بے نظیر سیاسی مدبر اور فراروشن خیال بادشاہ تھا۔ اس میں مذہبی تعصب نام کو نہیں تھا۔ غریبوں۔ بیواؤں۔ اور دوسری عورتوں اور بچوں پر ہرگز کوئی سختی نہیں رکھتا تھا۔ نپولین کا تیار کردہ قانون تعزیرات فرانس اسقدر منصف مزاجی کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ وہ آج تک فرانس میں رائج ہے۔ اور دوسرے متمدن ممالک اُس سے نقل کر کر کے اپنے لئے قوانین وضع کرتے ہیں۔ جیسا کہ صاحب سیف کو ہونا چاہئے۔ وہ میدان جنگ میں غنیم کی فوج پر ضرور ہلاکت بار حملے کیا کرتا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد وہ اپنے اور غنیم کے زخمیوں کا نہایت توجہ سے علاج کراتا تھا۔ اور نار و اموقعہ پر کسی کی جان خطرہ میں دیکھ کر چین ہو جاتا تھا۔ اور جب تک کہ اُسے ورطۂ ہلاکت سے نکال نہ لیتا۔ آرام نہیں کر سکتا تھا۔

معرکہ ٹریفیلگر و آسٹرلز تین حکومتیں نپولین کی شدید دشمن تھیں۔ انگلینڈ۔ پرشا (جرمنی) اور آسٹریا۔ کیونکہ نپولین خود بحری فوج کا جرنیل نہیں تھا۔ اور فرانس کا جغرافیائی پوزیشن کچھ اس طرح کا ہے کہ بہ نسبت انگلینڈ کے اسکی بحری قوت باوجود کوشش زیادہ ترقی نہیں کر سکتی۔ نیز انگلینڈ خوب سمجھتا تھا اس کی قوت کا راز فن جہازرانی میں انتہائی ترقی کر لینے میں ہے۔ ولیم پٹ جیسا مدبر مغرور انگلینڈ کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے ملک کی آمدنی کی بیش قرار رقمیں جنگی جہاز تعمیر کرانے میں اور اپنے حلیفوں کو امداد دینے میں صرف کیں ۱۸۰۵ء میں فرانسیسی بیڑے کا مقابلہ انگریزی بیڑے سے اسپین کے جنوب میں ٹریفیلگر کے قریب ہوا۔ برطانوی بیڑا لارڈ نیلسن کی سرکردگی میں تھا۔ یہ بحری جنگ نہایت سخت اور فیصلہ کن تھی۔ نیلسن نے اپنا جھنڈا بلند کیا۔ جسپر لکھا ہوا تھا۔ "انگلینڈ کو آج اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ اس کے سب پرستار اپنا اپنا فرض ادا کریں"۔ بخلاف اس کے ولنیوو فرانسیسی امیر البحر نے اپنا وہ علم بلند کیا۔ جسپر لکھا ہوا تھا۔ "جو فرانسیسی آج غنیم کی آگ کی زد سے دور رہے۔ وہ اپنی جائے تعیناتی سے دور رہے"۔ سخت آتشباری ہوئی اور سیکڑوں جہاز غرق ہونے کے بعد فرانسیسی بیڑے کو پسپا ہو جانا پڑا۔ اگرچہ برطانیہ کا بھی شدید نقصان ہوا۔ اور خود لارڈ نیلسن بھی اسی معرکے میں کام آیا۔ اس بحری شکست سے ایک سال بعد ۱۸۰۶ء میں خود نپولین نے آسٹریا اور روس کی افواج کو یکجا آسٹرلز کے مقام پر ایسی شکست فاش دی کہ ولیم پٹ اسی صدمہ میں فوت ہو گیا۔ اور شہنشاہان آسٹریا و روس نے پوری اطاعت قبول کی۔

دوسری شادی اور انتہائی عروج ۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۸۱۲ء تک نپولین کا ستارہ اقبال نصف النہار پر تھا۔ ان سات برسوں میں بھی لڑائیاں جاری رہیں۔ کیونکہ برطانوی امداد جلد جلد مغلوب حلیفوں کو متواتر بغاوت پر آمادہ کر دیا کرتی تھی۔ سیاسی وجوہ کی بنا پر نہایت افسوس کے ساتھ ۱۸۰۹ء میں نپولین نے ملکہ جوزفائن کو طلاق دی۔ اور شہنشاہ آسٹریا کی لاڈلی شہزادی نازنین و نازآفریں میری لوئیسی کے ساتھ شادی کر لی۔ جس کی عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی۔ ایک سال بعد اس کے بطن سے نپولین کا اکلوتا لڑکا پیدا ہوا۔ جو آگے چلکر "روما کا چھوٹا بادشاہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

موقت یعنی ۱۸۰۶ء میں مملکت برطانیہ کی تجارتی ناکہ بندی اور جنگ جزیرہ نما اسپین و اٹلی کے علاوہ پرشا (جرمنی) آسٹریا اور روس کے شہنشاہان عرش نپولین کے مطیع و منقاد تھے۔ نیلسن کے ہاتھوں فرانس کی بحری افواج نے شکست کھائی تو نپولین نے برطانیہ کو زیر کرنے کی ایک اور تدبیر نکالی۔ وہ انگریزوں کو "بقالوں کی قوم" کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔ اور اب اس نے اپنے زیر نگیں ممالک کو حکم دیا کہ وہ اپنا قافلہ اور دیگر اشیاء انگریزوں کے ہاتھ نہ فروخت کریں۔ اور نہ سامان تجارت کسی طرح انگلستان بھیجیں۔ یہ تدبیر اگر کامیاب ہو جاتی تو خود انگریز مورخ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ برطانیہ کو گھٹنے جھکانے پڑتے۔ کیونکہ اس وقت انگلینڈ زراعت صنعت و حرفت کے میدان میں بہت پیچھے تھا۔ اور اپنی ضروریات کے لئے ہر آن بیرونی ممالک کی اشیاء کا محتاج تھا۔ لیکن نپولین کے حلیفوں نے دھوکے سے کام لیا۔ اور

شہنشاہ سے کہا کہ انگلستان کے ساتھ تجارت قطعاً بند کر دی گئی اور پوشیدہ طور سے برطانوی بندرگاہوں پر روس۔ جرمنی۔ اور آسٹریا کا اسباب تجارت پہنچتا رہا۔ نیز جنگ جزیرہ نما اسپین و پرتگال اسی زمانہ میں شروع ہو کر ۱۸۱۴ء تک جاری جزیرہ نما اسپین و پرتگال پر فرانسیسی قبضہ تھا۔ اسپین میں پے در پے بغاوتیں ہو چکی تھیں۔ اس لئے نپولین نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے بھائی جوزف۔ نپولین کو اسپین کا بادشاہ بنا دے۔ کیونکہ بجز اس کے وہاں امن قائم ہونا دشوار معلوم ہوا۔ برطانوی روپیہ نے اسپین کے بعض لوگوں کو بغاوت پر دوبارہ آمادہ کر دیا۔ اور سر جان مور اور آرتھر ویلزلی برطانوی افواج لے کر باغیوں کی امداد کے لئے جزیرہ نما میں پہونچے۔ اول الذکر برطانوی جرنیل نے تو سخت شکستیں کھائیں۔ لیکن آرتھر ویلزلی نے چند فتوحات حاصل کیں۔ جن کے صلہ میں وہ ڈیوک آف ویلنگٹن بنائے گئے۔

نپولین ڈریسڈن میں ۱۸۱۲ء میں زار روس نے اعلان کر دیا کہ وہ نپولین کے کانٹی نینٹل سسٹم کی پابندی نہیں کرے گا یعنی انگلستان سے تجارت جاری رکھے گا۔ اگر نپولین اس وقت خاموش رہتا تو دوسرے ممالک بھی فوراً ایسا ہی اعلان کر دیتے۔ اس لئے زار کی سرکوبی ناگزیر تھی۔ اور وہ عظیم الشان فوج لے کر روس پر حملہ کرنے کے لئے فرانس سے نکلا۔ راستہ میں وہ اپنے وفادار حلیف بادشاہ سکسنی (جرمنی) کے شہر ڈریسڈن میں کچھ دنوں ٹھیرا۔ میری لوئسی اس وقت شہنشاہ کے ساتھ تھی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت نپولین کا ستارہ اقبال اپنے بلند ترین نقطہ پر تھا۔ اعادہ اطاعت، و اظہار وفاداری کے لئے شہنشاہ آسٹریا، اور بادشاہ پرشا (جرمنی) ڈریسڈن آئے ہوئے تھے۔ اور یورپ کی بے شمار چھوٹی حکومتوں کے وفاداروں اس طرح جمع تھے جس طرح موجودہ زمانہ میں بڑے درباروں کے موقع پر ہندوستانی ایجنسیوں کے اظہار اطاعت کے لئے جمع ہو جاتے ہیں لیکن نپولین کا یہ حال تھا کہ اپنی فوج سے ایسے اوقات میں بھی غافل نہ رہتا تھا جب معمول صبح کو فوج کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ فوج کے ہر دستہ سے دو چار آدمیوں کو پاس بلا کر فرداً فرداً دریافت کیا کرتا تھا۔ کہ آیا ان کو باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔ کھانا باقاعدہ طور سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کوئی سختی تو نہیں کی جاتی۔ اس قسم کی باتیں سپاہیوں کے دل میں گھر کر لیتی تھیں۔ اور وہ خوش ہوتے تھے کہ ایسا بڑا شہنشاہ جس کے سامنے تمام یورپ کے شہنشاہان سرکش گردن جھکاتے ہیں۔ ہمارے معمولی آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ دراصل نپولین کی قوت کا راز اسی میں پنہاں تھا کہ وہ اپنے ہر سپاہی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا تھا۔ اور جب تک اسے فتح کر لینا آرام نہ لیتا تھا۔ اسی وجہ سے تمام فوج اس پر فریفتہ تھی۔ اور اس کے ادنیٰ اشارے پر جان نثاری کے لئے تیار رہتی تھی۔

ماسکو کا حملہ زار روس کے خلاف نپولین نے پانچ لاکھ کی عظیم الشان فوج ساتھ لی اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ڈریسڈن سے نکلا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ یکلخت ماسکو دارالسلطنت روس پر قبضہ کر لے۔ ماسکو صدر ہا میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور اتنی بڑی فوج کے ساتھ میدان پر میدان مارتا ہوا نپولین بہت جلد ماسکو پہنچ گیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہاں پہنچ کر شہر کو بالکل خالی پایا۔ نہ کوئی روسی فوج مقابلہ کے لئے آئی۔ نہ اظہار اطاعت کیلئے حاضر ہوئی۔ نہ زار اور اس کے درباریوں کا کچھ پتہ نہ لگا۔ نہ باشندوں میں سے کوئی شخص وہاں موجود۔ اگر ایک فوج شہر پر سے قبضہ اٹھا لے۔ میدان جنگ کو پیٹھ دکھا دے۔ تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کو شکست فاش ہوئی لیکن یہ فاک آؤٹ دشمن اور روسی حکومت کے لئے ایک بڑی فتح ثابت ہوا۔ سردی کا موسم بالکل قریب تھا۔ دو ہر دو ملک کی کھیتیاں فرانسیسی حملہ آور فوج اور روس کی بھاگنے والی فوج اور ہملک نے بالکل پامال کر دی تھی۔ فرانسیسی سپاہی روس کے موسم سرما کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ گرم ترملک میں رہنے کے عادی تھے۔ نپولین کو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں ٹھیرنا ہلاکت کا موجب ہوگا۔ اس لئے فرانس واپس آنے کا حکم دیا۔ ستمبر کا مہینہ آ چکا تھا اور سردی خوب شروع ہو گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں بڑی مصائب و دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ راستہ میں فوج کو کافی سامان رسد نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ تمام کھیت و خرمن وہ برباد سے دیکھتے ہوئے تھے۔ تھوڑا بہت کچھ سامان فراہم کیا جاتا۔ تو تازہ دم روسی فوجیں ان کے قافلہ لوٹ لیں۔ ہوا سے خوراک زمہریری کی عادی نہیں۔ لوگ مرے جاتے تھے۔ بے شمار انتظامی اور موسمی تکلیف کی وجہ سے لاکھوں فرانسیسی سپاہی واپسی کے سفر میں ہلاک ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مہم میں حملہ آور فرانسیسی فوج کی ساٹھ فیصدی حصہ ہلاک ہو گیا۔ قصہ مشہور ہے۔ کہ اس واپسی سفر کے دوران میں ایک گرتا ہوا فرانسیسی سپاہی اپنے ساتھی سے کہتا ہے۔ کہ "میں گر گیا ہوں۔ مہربانی کر کے اپنا ہاتھ بڑھا دو۔ کہ اس کے سہارے سے کھڑا ہو جاؤں" دوسرا سپاہی جواب دیتا ہے "بھائی میرے تو دونوں ہاتھ کٹ کر گر گئے۔ ڈکشنری سے ہاں کا لفظ کاٹ دو تو کچھ کر سکتے ہو"۔

ابتدائے زوال اور پہلی شکست روس پر فوج کشی نپولین کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ابھی تمام فرانسیسی افواج اپنے وطن نہیں پہونچی تھیں کہ نپولین کو معلوم ہوا کہ اس کے حلیف بغاوت کرنے والے ہیں۔ بادشاہ پرشا

(جرمنی)، روس کا ساتھی ہو چکا تھا۔ اور آسٹریا جلد ہی اعلان کرنے والا تھا۔ یہ سنکر نپولین اپنی فوج سے پہلے پیرس ہو نچا۔ اور دوسری فوج تیار کر کے حملہ آور ہوا اور ۱۸۱۴ء میں لوتھرن اور ڈریسڈن کے مقامات پر سرکشوں کو شکستیں دیں لیکن لیپزگ کے مقام پر خود ایسی شکست کھائی کہ ہر طرف اس کا پلہ ہلکا ہو گیا۔ پرشا (جرمنی)، آسٹریا اور روس کی متحدہ افواج نے اُمنڈ کر فرانس پر حملہ کیا۔ اس ٹڈی دل کے مقابلہ میں نپولین نے اپنے فوجی کمال کے وہ جوہر دکھائے اور وہ داد شجاعت دی کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ لیکن اس کی فوج میں پہلے کی سی جرأت اور زندہ دلی باقی نہیں تھی۔ اس کے اول درجہ کے فوجی افسروں کا جوش اور ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنی انتہائی کوشش سے جی چراتے تھے۔ اسوجہ سے اتحادی فوج کو شکست نہ دی جا سکی۔ اور فرانس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ نپولین نے اپنے آپ کو فاتحین کے سپرد کر دیا۔ جنہوں نے فیصلہ کیا کہ نپولین اور اس کے خاندان کا تخت فرانس پر کوئی حق باقی نہ رہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن کارسیکا کے قریب کے ایک جزیرہ ایلبا میں صرف کرے۔ اپنے پیرس کے شاندار محل سے آخری مرتبہ نپولین نکلا۔ تو اس کی فوج کے سپاہی جو راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہوئے تھے۔ زار زار رو رہے تھے۔ نپولین نے ان سے یوں خطاب کیا۔ "تمام یورپ نے میرے خلاف ہتھیار اٹھا لئے ہیں۔ خود فرانس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اور اپنے لئے دوسرے حکمران چن لئے ہیں ..... تم ان حکمرانوں سے وفاداری کرو۔ میری قسمت پر آنسو نہ بہاؤ ..... میں تم سب کو فرداً فرداً گلے نہیں لگا سکتا۔ لیکن تمہارے جرنیل سے معانقہ کرتا ہوں"۔

نپولین نے جرنیل کو گلے لگایا۔ اور فرانسیسی جھنڈا طلب کیا۔ جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ جھنڈا قریب لایا گیا۔ تو اس کو بڑے پیار سے بوسہ دیا اور بولا۔ "خدا حافظ میرے بچو! خدا حافظ میرے رفیقو! مجھ کو بھولنا مت۔ خدا حافظ"۔ یہ کہتا ہوا نپولین اس گاڑی میں داخل ہو گیا جو اس کے لئے لائی گئی تھی۔ جزیرہ ایلبا میں نپولین کچھ دنوں رہا تھا کہ اسے خبر ملی کہ فرانسیسی فوج اپنے نئے حکمرانوں سے خوش نہیں ہے۔ موقع پا کر وہ جزیرہ سے نکل آیا اور فرانس پیرس کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی آمد کا حال سنتے ہی لوگ اس کے استقبال کو تیار ہو گئے۔ فرانس کا نیا بادشاہ اپنا محل خالی چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ تمام فوج اس کی امداد کے لئے تیار ہو گئی۔ شہر کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے گئے۔ اور اب نپولین حسب سابق پیرس اور فرانس کا مالک تھا۔ لیکن یہ دور کا بھی بہت کم عرصہ تک قائم رہا۔ ملک جو زمانہ انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری ملکی سیاسی بے وفائیاں ہوئیں۔ وہ نپولین کے

معرکۂ واٹرلو شکست اور گرفتاری

شہرۂ آفاق لڑائی ہوئی۔ جس میں ڈیوک آف ویلنگٹن کی سرکردگی میں انگریزی افواج کامیاب ہوئیں۔ نپولین کے ہاتھ سے میدان جنگ وہ ایک فرانسیسی بندرگاہ پر اس نیت سے پہونچا کہ جہاز پر سوار ہو کر امریکہ چلا جائے لیکن بندرگاہ پر معلوم ہوا کہ سب بندرگاہوں پر انگریزوں نے ناکہ بندی کر رکھی ہے اور اس جال سے خلاصی ناممکن ہے۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو برطانوی افسران بحری کے حوالہ کر دیا۔ حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ اس مرتبہ نپولین کو اتنی دور بھیجا جائے کہ وہاں سے وہ کسی طرح نہ نکل سکے۔ چنانچہ جزیرہ سینٹ ہلینا تجویز ہوا جو یورپ سے بہت دور بحر اوقیانوس میں افریقہ اور جنوبی امریکہ کے قریب قریب وسط میں واقع ہے۔ نپولین کے ساتھ اس کے چند افسر اور ملازم بھی بھیجے گئے۔ جن میں سے بعض اپنی بیویوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ سر ہڈسن لو اس جزیرہ کا گورنر تھا۔ جو اس عظیم الشان شخصیت کا نگراں کار بنایا گیا۔ یہ ایک ناقابل برداشت اور دون فطرت آدمی تھا۔ اس سے نپولین کا جلد ہی بگاڑ ہو گیا۔ لیکن نپولین اپنے آپکو قیدی کی حیثیت میں سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے کوئی شکایت نہ کی اور گورنر سے ملاقات ترک کر دی۔

اسیری کی زندگی اور کریکٹر

یہ کہنے کی بظاہر ضرورت ہے۔ کہ سینٹ ہلینا میں نپولین کا وقت نہایت بدمزگی سے گذرا تاہم وہ شیشۂ اپنی پر قانع رہا۔ اور صبر و شکر کے ساتھ ایام گذارنے لگا۔ وہ اپنا وقت جلاوطنی کے رفیقوں سے گفتگو کرنے میں یا مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ گاہ بگاہ باغبانی کا مشغلہ بھی کیا کرتا تھا۔ جزیرہ سینٹ ہلینا کے قیام کے دوران میں بسا اوقات ایسا ہوتا تھا۔ کہ اس کے ملازمین یا افسروں میں آپس میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعہ پر ہمیشہ نپولین آپس میں صلح کرایا کرتا تھا۔ آپس میں اقوام و ملل کو صلح و آشتی میں رکھنا۔ اور جنگ سے گریز کرنا دراصل اس کی فطرت میں داخل تھا۔ جب جنگ ناگزیر ہوتی۔ تو وہ اس سے جھجکتا نہیں تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ہمیشہ امن و صلح کا خواہاں رہتا تھا۔ اپنی شہنشاہی کے زمانہ میں وہ کہا کرتا تھا کہ آئندہ نسلیں کہیں گی کہ میں جنگ اور خونریزی کا خوگر تھا۔ اور یہ کوئی نہ دیکھے گا کہ میں آج کن حالات میں ہوں۔ اور دشمنان فرانس کس طرح میرا ملک ہڑپ کرنے کی فکر میں تھے۔

اگر میں آج ہی اپنے حریفوں پر حملہ کر کے انھیں شکست نہ دیدوں - تو وہ کل ہی زیادہ قوی ہو کر میرے اوپر چھپٹیں گے - اور ممکن ہے کہ میں ان کو پھر شکست نہ دے سکوں" اپنی شہنشاہیت کے زمانہ میں جو خطوط نپولین اپنی ملکہ کو لکھا کرتا تھا - اُن سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انتہائی درجہ کا گرم دل رکھنے والا خوش مزاج اور وفادار خاوند تھا - جس شخص میں یہ خوبیاں ہوں - وہ ہزاروں خوبیوں کا مالک ہوگا ؛

وفات جزیرہ سینٹ ہلینا میں کوئی چھ سال گذار کر نپولین سخت بیمار پڑا اور ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی جو لوگ اس کے قریب موجود تھے - بیان کرتے ہیں - کہ آخری الفاظ جو اس کی

....

....

کمزوری اور دھیمی آواز کے سمجھے جا سکے - یہ تھے " فوج - فوج کا سردار " معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ یگانۂ روزگار فوجی جرنیل اپنی زندگی کا خود ہی محاسبہ کر رہا ہوگا - اور خود ہی عبرت حاصل کر رہا ہوگا - ایک دن تھا کہ وہ ایسی افواج قاہرہ کا سردار تھا - جن کے نام سے تمام یورپ کانپتا تھا - اور آج کا بھی ایکدن ہے کہ وہ بے یار و مددگار قیدی کی شکل میں اپنے دشمنوں کے ہاتھ میں دم توڑ رہا ہے ؛

نپولین کو فوت ہوئے کوئی ۱۹ سال گذرے تھے کہ فرانسیسیوں کے دلوں میں شاید بصداق - " بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد " - نپولین کی محبت کی چنگاری پھر چمکی اور وہ اسکی لاش اس دور دراز جزیرے سے بڑے تزک و احتشام سے لائے اور پیرس کے مشہور اور شاندار قبرستان میں دفن کیا جہاں اسکی فوج کے اور بے شمار رفیق مدفون تھے ؛

(سید محمد ہادی - بی اے علیگ)

؟

نیند جو کہ ایک معصوم بچے کی آنکھوں میں چکر لگاتی رہتی ہے ——— کیا کوئی بتا سکتا ہے - کہ وہ کہاں سے آتی ہے ؟

ہاں ! ایک افواہ ہے - کہ یہ ایک ایسے جنگل میں پناہ گزیں ہے جو جگنو کی چمک سے کبھی کبھی ہلکا سا روشن ہو جاتا ہے - وہ بہت سے گنجان درختوں میں گھرا ہوا ایک ایسا پودہ ہے - جو کہ آج تک نہیں دیکھا جا سکا - اُسپر بہت ہی شرمیلی دو پُر سحر کو پنلیں ہیں - انہیں پر سے نیند ننھے بچے کی آنکھوں کو بوسہ دینے کے لئے اُڑ آتی ہے ؛

تبسم جو کہ سوتے ہوئے بچے کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہے ——— کیا کوئی جانتا ہے - کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی ؟

ہاں ! ایک اڑتی ہوئی سی خبر ہے - کہ ایک مرتبہ بڑھتے ہوئے چاند کی ایک ننھی زرد کرن موسم خزاں کے ایک دوڑتے ہوئے بادل سے ٹکرا گئی - اگلی صبح آسمان پر تبسم سحر کی دوڑتی ہوئی دکھائی دی - یہی اس تبسم کا مخرج ہے - جو سوتے ہوئے ننھے بچے کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہے ؛

ٹھنڈی - نرم اور شیریں تازگی جو بچے کے بازوؤں پر لہلہاتی ہے ——— کیا کوئی جانتا ہے کہ یہ اتنے عرصہ تک کہاں پوشیدہ رہی ؟

ہاں ! جب بچے کی ماں ایک نوجوان لڑکی تھی - یہ ایک نازک اور خاموش محبت کی شکل میں اُس کے دل کی گہرائیوں کے اندر گھومتی رہی ——— - یہ ٹھنڈی - نرم اور شیریں تازگی جو بچے کے بازوؤں پر لہلہاتی ہے ؛

(ٹیگور - کریسنٹ مون)

(اخوت عمر پوری)

دلچسپ ناول و افسانے { سیلاب خون - حجم ۳۰۴ صفحات قیمت عہ | حکایات شرلاک ہومز جاسوسی افسانے قیمت عہ
اسرار بالشوزم - ؍ ۱۵۰ ؍ ؍ ۱۲ | سیر گل - جلیل احمد قدوائی کی لاجواب تصنیف ؍ عہ
عروج زندگی - دس دلچسپ افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ | طوفان زندگی - دس دلچسپ افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ
زندگی کی صبح شام ؍ ؍ ؍ ؍ عہ | دس عبرت گیارہ ؍ ؍ ؍ ؍ عہ
منیجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور

زنانی خودسری

(افسانہ)

(۱)

"ضرورت ہے" ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند حسین ہفتدہ سالہ لڑکی کے لئے ایک شوہر کی جو تمام مردانہ خصوصیات تعلیم کے ساتھ کم از کم پانسو روپیہ ماہوار کی آمدنی کا مالک ہو۔ اور حسن ظاہری کے ساتھ ادبی محاسن بھی رکھتا ہو۔ تصاویر مطلوب ہیں"

ہر چند صغیر اشتہاری شادی کا موافق نہ تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح شوہر کی تلاش کرنا گویا لڑکی کو نیلام میں رکھ دینا ہے۔ یا پھر اپنے آپ کو سخت امتحان میں مبتلا کر دینا۔ اس لئے جب اس نے اخبار میں یہ اشتہار دیکھا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے اسے خیالی لذت تو ضرور حاصل کرلی۔ لیکن کوئی خلش اپنے دل میں پیدا نہیں کی..... اخبار دیکھ کر وہیں میز پر رکھ دیا اور اپنے کاروبار کے کاغذات دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

صغیر نہ صرف تعلیم کے تازہ ترین معمول کے لحاظ سے تعلیم یافتہ کہا جا سکتا تھا کہ اپنے اخلاق و آداب کے اعتبار سے بھی وہ ایک جنٹلمین کا انسان تھا۔ بالغ سنہ نکلنے کے بعد اس کے والدین نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کاروباری ملازمت حاصل کرے۔ مگر اس نے اس بات کو رد کر دیا۔ اور آخر کار ایک مختصر سرمایہ سے میل آہن کا کاروبار لاہور میں شروع کر دیا۔ اول اول اسے سخت مشکلیں اٹھانی پڑیں۔ اور احباب نے بھی ہمت شکنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چونکہ وہ ایک راسخ عزم اور پکے ارادہ کا آدمی تھا۔ اس لئے اس نے ثابت قدمی نہ چھوڑی۔ اور تین سال کے اندر اندر اس نے ہندوستان کے بڑے تاجروں میں رسوخ پیدا کر کے اپنا ایسا اعتبار قائم کر لیا۔ لاہور کی تمام مصنوعات اور اکثر پیداوار اس کے ذریعہ سے منگائی جانے لگیں۔ اور چوتھے سال مال روڈ پر اپنا باقاعدہ دفتر قائم کر کے اس کو زیادہ وسعت دیدی۔ اسی اثنا میں اس کے والدین کو شادی کا اشتیاق ہوا۔ وہ بارہا کوشش کرتے تھے۔ مگر صغیر کے منہ سے نفی میں جواب سنتا تھا۔ اسکو خیال تھا۔ کہ جب تک میں اپنے پاؤں پر نہ کھڑا ہو جاؤں گا۔ شادی کا نام نہ لونگا۔ کیونکہ اب اس کی ماہوار آمدنی ہزار روپیہ کی تھی۔ اس لئے اس کو اس وقت کوئی خاص عذر نہ تھا۔

شادی کے متعلق وہ نہایت سادہ خیالات رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک بیوی کا مفہوم ایک ایسے انیس و ہمدم کا تھا۔ جو ہر ابھی ہو اور اندھا بھی۔ اسکی کل کائنات شوہر کی ذات ہو۔ اور اس کے بعد اشغال کا تنہا شوہر کے اسباب آسائش کی ذہانی حسن ناہری کے لحاظ سے وہ خود بھی اپنے آپ کو حسین سمجھتا تھا۔ اس لئے حسین عورت کی تمنا بھی نہ کرتا تھا۔ ایک بے عیب بانوہ صحیح و توانا جسم مطلق الضنا۔ محبت کرنیوالا دل۔ غور کرنیوالا دماغ۔ یہ وہ خصوصیات تھیں۔ جنھیں وہ اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جاہل عورت سے پسند نہ تھی خواہ وہ تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی تعلیم یافتہ سے وہ نفرت کرتا جو تربیت صحیح نہ پیدا کر سکے۔ ہاں اگر تعلیم ظاہری کے ساتھ ہی تربیت باطن بھی کسی میں موجود ہوتی تو وہ اس کی بہت قدر کرتا۔ اسکی عمر سولہ سے ۲۵ سال کی ہو چکی تھی۔ اور اس کے تمام قوائے بخیہ ہو کر اس بات کے منتظر تھے کہ کوئی شریک آئے۔ لیکن اول تو صغیر کا انہماک زیادہ اسے غور کرنے کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔ اور اگر رات کی تنہائیوں میں وہ اس پر غور کرتا تو سخت الجھن میں مبتلا ہو جاتا کیونکہ اس کے خاندان میں کوئی لڑکی اس قابل نہ تھی۔ کہ وہ اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔ یوں تو حسن و تعلیم کے لحاظ سے متعدد لڑکیاں قابل انتخاب نظر آتی تھیں۔ لیکن ان کی ذہنیت کو وہ اپنے مذاق سے منافی پاتا تھا۔ جو لڑکیاں حسین تھیں مشکل یہ تھی کہ حسین سمجھتی تھیں۔ جو تعلیم یافتہ تھیں وہ بالکل حسن تربیت سے معرا نظر آتی تھیں اور حقوق شوہر کے خیال سے غافل۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حسن کا قدر شناس تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ غرور حسن کے سامنے اپنی نادانیاں پیش کرنے کی وہ قوت اس کے پاس نہ تھی۔ وہ تعلیم کو پسند کرتا تھا لیکن خرابی یہ تھی۔ کہ وہ ایک حد تک عورت کو اپنا پابند دیکھنا چاہتا تھا۔ اور ہر تعلیم یافتہ عورت اس خیال سے منحرف نظر آتی تھی۔ الغرض جس زمانہ میں اس نے

یہ اشتہار دیکھا وہ اسی الجھن میں گرفتار تھا۔ اور بعض اوقات پریشان ہو کر چاہتا تھا۔ کہ کسی نہ کسی طرح اس جھگڑے کو ختم کر دینا چاہئے۔ تاکہ سکون قلب حاصل ہو۔ اور زیادہ انہماک و اطمینان کے ساتھ اپنے تجارتی مشاغل میں داخل ہو آخر کار اسی وقت ایک تصویر بکس میں سے نکالی گئی۔ اور اپنے دوست نصیر سے تمام حالات تعلیمند کرا کر لفافہ میں بند کر کے لفافہ کو ڈاک کے سپرد کر دیا۔

(۲)

مولوی عبداللہ تھے تو پرانے زمانہ کے تعلیم یافتہ انسان۔ چونکہ ذہین بہت تھے اس لئے ہر جدید چیز کی طرف ان کی طبیعت جلد راغب ہو جاتی تھی۔ جب تک خود انھوں نے اسکول کی ملازمت اختیار نہ کی تھی۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ لیکن حسن اتفاق سے انھیں ایک زنانہ ہائی اسکول کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ اور اس اسکول کے بانی سے تبادلہ خیالات ہوا تو وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی بن گئے۔ اور اپنی اکلوتی لڑکی نور جہاں کو بہت مسرت کے ساتھ مدرسہ میں داخل کر دیا۔ نور جہاں نے میٹرک پاس کرنے تک آٹھ دس سال کا زمانہ اسکول کی چار دیواری میں بسر کیا۔ اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے۔ کہ وہ سارے مدرسہ میں اپنی ذہانت اور حسن کی وجہ سے مشہور تھی۔ جسوقت وہ میٹرک کے امتحان میں ممتاز درجہ پر کامیاب ہوئی تو اراکین مدرسہ کو تعجب نہ ہوا کیونکہ اس امر کا سبکو یقین تھا۔ یہ خیال تھا کہ امتحان کے بعد مدرسہ کی تمام مجالس اس سے محروم ہو جائیں گی لیکن اتفاق سے ایک معلمہ کا انتقال اسی سال ہو گیا۔ اور نور جہاں کا اس جگہ تقرر ہوا۔ تنخواہ قلیل تھی۔ مگر محبت کی وجہ سے نور جہاں نے اس کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا اور وہیں بورڈنگ میں رہنے لگی۔

نور جہاں حسن کے لحاظ سے کوئی حضر صیت اپنے انداز میں کم نہ رکھتی تھی۔ اس کے سکھ رکھاؤ نے ایسی دلکشی اس کے اندر پیدا کر رکھی تھی۔ کہ ہر ایک دیکھنے والی نگاہ اسے ماہ جبیں لکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے جسم کے مناسب ملبوس میں جدتیں پیدا کرتے رہنا وہ اس کا چہرہ و پیشانی کی ساخت کے لحاظ سے اس نے بالوں کو مخصوص طور پر سنوارنا وہ اسکا مختلف موقعوں پر اپنی آواز میں نشیب و فراز پیدا کرنا۔ وہ اس کا دلربایانہ صنعت کے ساتھ چشم و ابرو کو جنبش میں لانا وہ اس کا اپنی ہنسی کو نہایت نرم و شیریں بنا کر پیش کرنا۔ وہ اس کا سارے جسم میں ایک لچک پیدا کر کے ذرا جھوم جھوم کر چلنا اور اسی طرح کی بہت سی خصوصیات جو پہلے قصداً پیدا کی گئی۔ اور اب عادت سے بالکل فطری معلوم ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں، وہ فطرت کی طرف سے بہترین صناعانہ دماغ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اور صنعت گری کے نازک ترین پیچ و خم اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہوتے تھے۔ وہ نقاش بھی تھی۔ اور شاعرہ بھی۔ وہ خوش تقریر تھی اور اچھی مضمون نگار بھی۔ عمر کے لحاظ سے وہ بہت بلند حوصلہ واقع ہوئی تھی خدا جانے اسکو کیونکر یقین ہو گیا تھا۔ کہ دنیا میں وہ غیر معمولی ترقی و شہرت حاصل کرنے آئی ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہ ہر شخص کو اپنے سے خرد تر سمجھتی تھی اور اپنے حکم کی تعمیل اسی طرح چاہتی تھی۔ جیسے کوئی فرمانروا ہو۔ انتظام خانہ داری سے جن صفات کا ایک عورت میں ہونا ضروری ہے۔ وہ اس میں موجود تھیں لیکن ان کاموں کی طرف سے اس کو بالکل رغبت نہ تھی۔ اور بہت ذلیل سمجھ کر نظر انداز کرتی۔ یعنی وہ ایسے معمولی مشاغل میں اپنا وقت صرف کرنا اپنے مقصود زندگی کے خلاف تصور کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس سے زیادہ بلند کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور ایسی باتوں میں اسکو اپنا دماغ صرف نہ کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ ایسی عورت کے لئے انتخاب ہمدم کا مسئلہ بہ نسبت صغیر کے کہیں کہیں زیادہ اہم تھا۔ اور اس کے باوجود سیکڑوں پیغام آنے کے اس نے کسی کو پسند نہ کیا تھا۔ کہیں اس کو حسن کم نظر آتا تھا۔ تو کسی جگہ دولت کم ہوتی تھی۔ دولت و حسن کا اجتماع بھی اگر کہیں ہوتا تھا تو صورت اسے جابر نہ نظر آتی تھی۔ یہ بھی عیب نہ ہوتا تو تعلیم کی طرف سے وہ غیر مطمئن ہو جاتی۔ بعض بعض پیغام ایسے بھی آئے کہ اس نے صرف اس بنا پر انکار کر دیا۔ کہ "صورت سے ذوق ادب ظاہر نہیں ہوتا"۔

الغرض یہ تمام مراحل طے ہو چکے اور کسی میں کامیابی نظر نہ آئی۔ تو تنہا دیا گیا۔ جب ایک ماہ بعد خطوط مع تصاویر کا ایک انبار اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے کامل ایک ہفتہ کے غور کے بعد صغیر پر نظر پسندیدگی سے دیکھکر سویمبر کے اس ملکہ کی طرح جو کامیاب عاشق کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالکر اپنی رضامندی کا اظہار کرتی تھی۔ ایک تار کے ذریعہ سے منظوری کی اطلاع دیدی صغیر جو تصویر بھیجکر بالکل غافل ہو گیا تھا۔ اور اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے کب اشتہار دیکھا تھا۔ دفعتہً تار کے ملنے سے چونک پڑا اور اپنے کاغذات علیحدہ رکھ کر سوچنے لگا۔ کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ تھوڑی دیر کے بعد تار لے کر گھر روانہ ہوا۔ اور والدین کی رائے دریافت کی۔ ماں جس کو اپنے نور نظر کی شادی کا اشتیاق ایک مدت سے تھا۔ تار کو دیکھ کر فوراً رضامند ہو گئی۔ اور تاریخ تقریب مقرر کر کے ایک ماہ بعد دونوں کا عقد بڑی دھوم دھام سے کر دیا۔

نورجہاں و صغیر کی شادی کو ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ اور کوئی بات اس سے زیادہ محسوس نہیں کی گئی۔ کہ وہ صغیر کے والدین سے بہت کم تعلقات رکھنا پسند کرتی ہے اور ان کے وجود کو بیکار سمجھ کر حقیر خیال کرتی ہے۔ چونکہ شادی کا زمانہ چند روز تک حکومتِ شباب کا دور ہوتا ہے۔ اور تمام تنقید و تحقیق سے بے نیاز۔ اس لئے صغیر کو بھی اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ کہ نورجہاں کس قسم کی لڑکی ہے اور وہ کس حد تک صحیح معنی میں اس کی شریک زندگی بننے کی اہل ہو سکتی ہے۔ لیکن جب یہ سیلاب گزر گیا۔ طوفان کم ہوا۔ اور رفتہ رفتہ مدہوشی دور ہونی شروع ہوئی تو ایک نے دوسرے پر تنقیدی نگاہ ڈالنی شروع کی اور سب سے پہلے جو بات نورجہاں کی اپنے خلاف مزاج محسوس کی وہ صغیر کا تاجرانہ حساب و کتاب۔ اور اقتصادی انتظام تھا۔ اس طرح جو بات صغیر کے دل میں کھٹکی وہ نورجہاں کی آزادی جسے وہ خود سری اور خود نمائی تعبیر کر سکتا تھا۔ نورجہاں کی تقسیم اوقات اسطرح تھی۔ کہ صبح آٹھ بجے اٹھتی اور غسل سے فارغ ہونے کے بعد وہ تقریباً دو گھنٹہ تبدیل لباس اور بناؤ سنگھار میں صرف کرنے کے بعد نو بجے تک چائے سے فارغ ہوتی تھی۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ ہارمونیم اور پیانو کے لئے وقف تھا۔ گیارہ بجے کے قریب صغیر کو دفتر سے اس کی ڈاک آجاتی تھی۔ وہ اپنے کمرے پڑھنے کے کمرہ میں چلی جاتی۔ یہاں وہ خطوط کا جواب دیتی۔ مضامین لکھتی۔ اور عموماً گوئی میں وقت صرف کرتی۔ یہاں تک ایک بج جاتا۔ یہ وقت صغیر کے دفتر سے آنے کا ہوتا تھا۔ دونوں ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے کے بعد پھر نورجہاں پیانو نوازی میں مصروف ہو جاتی اور صغیر آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا۔ اور نورجہاں دو بجے بستر پر جا کر سو رہتی اور چار بجے بیدار ہوتی اور دو گھنٹہ پھر تبدیل لباس میں صرف کرتی۔ اگر پانچ بجے صغیر آگیا تو خیر ورنہ تنہا گاڑی میں سوار ہو کر تفریح کے لئے نکل جاتی۔ چونکہ وہ زنانہ کلب کی ممبر ہو گئی تھی۔ اس لئے کبھی وہاں بھی چلی جاتی۔ اور کھیل کود میں دو گھنٹہ صرف کر کے ۸ بجے کے قریب گھر واپس آجاتی۔ اور ایک گھنٹہ کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر تک پیانو کا شغل جاری رہتا اور ۱۰ بجے بستر پر جا کر گھنٹہ دو گھنٹہ کوئی کتاب دیکھتی اور سو جاتی۔

ایک رات صغیر زیادہ دیر کر کے گھر آیا چونکہ ایک خاص تجارتی مسئلہ پر اس نے اپنا دن بھر دماغ صرف کیا تھا۔ اس لئے اس کی طبیعت مضمحل تھی اور بہت تھک گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر واپس پہونچ کر اس ضمحلال میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ لیکن جب وہاں پہونچ کر یہ معلوم ہوا کہ نورجہاں ٹھیک وقت پر بغیر ایک لمحہ کے انتظار کئے ہوئے کھانا کھا چکی تھی تو اس کی تکالیف میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ اور اس نے اس غم میں کھانا بھی نہ کھایا۔ نورجہاں نے اسکو محسوس کیا لیکن ایک دفعہ سے زیادہ اصرار بھی نہ کیا اور خود بھی خاموش ہو کر آرام کرسی پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگی۔ صغیر نے صورتِ حالات کو اچھی طرح سمجھا اور اس میں شک نہیں کہ اُسے غیر معمولی صدمہ پہونچا۔ لیکن اس نے بہت ضبط سے کام لے کر اپنے دل سے دور کرنیکی کوشش کی اور نہایت لطف سے نورجہاں سے دریافت کیا "آج مضمحل کیوں ہو" طبیعت کیسی ہے۔ نورجہاں نے پیشانی پر شکن ڈال کر جواب دیا۔ اچھی ہوں۔ یوں ہی کچھ دردِ سر کی شکایت ہے صغیر بولا کہ تم نے مجکو دفتر کیوں نہیں لکھ بھیجا۔ کوئی دوا لیتا آتا۔ نورجہاں "مجھ کو کیا علم تھا کہ آپ کو میری زندگی اسقدر عزیز ہے"۔

صغیر جو طعنہ تشنیع کی گفتگو سے زیادہ کسی چیز سے نفرت نہ کرتا تھا۔ یہ جواب سنتے ہی برہم ہو گیا۔ اور بولا کہ "ہاں مجکو آپ کی زندگی عزیز تو نہیں ہے کیونکہ آپ نے اس کا احساس ہی میرے اندر اسوقت تک پیدا نہیں کیا لیکن انسانیت کا یہ ضرور تقاضا ہے۔ کہ میں آپ کی صحت و عافیت کا خواہاں رہوں"۔

نورجہاں۔ درست ہے۔ لیکن اگر انسانیت ایک شخص کے حقوق کو پامال کر سکتی ہے۔ تو اسکی صحت و عافیت کی طرف بھی متوجہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آپ کی یہ پرسش حال انسانیت تو نہیں۔ مگر ظاہر داری ضرور قرار دیجا سکتی ہے

صغیر "آپ کے اس حسن استدلال کی داد دیتا ہوں۔ لیکن کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ میں نے آپ کے کن حقوق کو پامال کیا"

نورجہاں۔ خیر جانے دیجئے۔ اس اجمال کی تفصیل اور زیادہ تلخ ہو جائیگی

صغیر۔ میرے لئے اتنی تلخ نہ ہوگی۔ جتنی آپ کو محبوب کر دینے والی ہوگی کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا سینہ شکوؤں سے لبریز ہے۔ اور اگر آپ کہ اپنے حقوق کی پامالی کی نارواشکایت ہے۔ میں اس کے جواب میں جائز گلہ مندیاں پیش کر سکتا ہوں"۔

نورجہاں جو حد درجہ محرور المزاج تھی یہ جواب سنکر غصہ سے بیتاب ہو گئی کتاب کو علیحدہ پھینک کر سی پر اٹھ بیٹھی اور اس نے حظ و خال میں جوش غضب کا انتہائی رنگ لئے ہوئے بولی۔ کہ مہربانی فرما کر اپنی شکایات بیان کیجئے۔ میں بھی آج ایک فیصلہ کر لینا چاہتی ہوں۔ اور اس سوگوار زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد

صغیر۔ مجکو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ آپ مجکو انگریز کو خیال کرتی ہیں

اور آپ ہندوستانی خاتون ہو کر شیوہ ہائے مغرب کیوں پسند کرتی ہیں۔ کبھی آپ نے اپنی تقسیم اوقات پر بھی غور فرمایا ہے۔ وہ کتنی بے پروائیوں اور خود آرائیوں سے مرکب ہے۔ لطف یہ ہے کہ مغربی خواتین کی پیروی کرنے میں آپ نے وہ باتیں تو حاصل کر لیں جو تمدن کی انتہائی ترقی کے ساتھ اُن میں عیب کی صورت سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اور آپ نے اُن باتوں کو ترک کر دیا جنھیں ہم محاسن کہہ سکتے ہیں۔ یہ آپ کا دن چڑھے بیدار ہونا ضرورت سے زیادہ آسائش میں وقت صرف کرنا۔ مشاغلِ لہو و لعب میں مصروف رہنا اور ایک لمحہ کے لئے یہ نہ سوچنا کہ آپ کے فرائض کیا ہیں۔ اور میرے ساتھ آپ کا تعلق نکاح کن ضروری امور کا مقتضی ہے اگر یہ باتیں قابلِ ستائش ہیں۔ تو افسوس میرا دماغ ان خوبیوں کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ میں نے اسوقت تک آپ کے حالات و مشاغل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ شاید آپ میری ساکت زندگی سے میری منشا کو سمجھ سکیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میرا خیال غلط نکلا۔ اور مجبوراً مجھے ظاہر کر دینا پڑا۔ کیونکہ نہ مجھ کو آپ کی پیانو نوازی سے دلچسپی ہے۔ اور نہ آپ کی غزلگوئی سے نہ آپ کے لباس کی حسین اختراع میرے اندر جذبات شیفتگی پیدا کر سکے ہیں۔ اور نہ آپ کے بالوں کو مختلف انداز سے سنوارنا مجھے مالوف کر سکتا ہے۔ میرے اندر اگر کوئی چیز فتادگی پیدا کر سکتی ہے تو وہ صرف آپ کی سیرت ہے۔ آپ کا حسنِ نظم ہے اور آپ کا ہر وقت میرے اسبابِ آسائش فراہم کرنے میں منہمک رہنا۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ میری زندگی کو تلخ بنائیے۔ یا خوشگوار۔ اس گھر کو آباد کیجئے یا برباد۔ آئندہ میں اس مسئلہ میں آپ سے کوئی گفتگو نہ کرونگا۔ کیونکہ مجھے اس کی فرصت نہیں۔ صغیر کی اس طویل تقریر کے جواب میں نورجہاں کچھ بیان کرنا چاہتی تھی کہ صغیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس واقعہ کے بعد کا ہفتہ صغیر کے لئے اسقدر مصروفیت کا تھا۔ کہ وہ مشکل سے کسی وقت ایک آدھ گھنٹہ کے لئے گھر آتا تھا۔ چونکہ اُسکو کاروبار کے سلسلہ میں ولایت جانا ضروری تھا۔ اور وقت کم تھا۔ اس لئے اُس کو تمام کاغذات مرتب کرنے۔ ملازموں کو ضروری ہدایات سے مطلع کرنے اور مختلف مقامات کی حظ و کتابت کرنے میں بہت زیادہ انہماک سے کام لینا پڑا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اُسنے ایک ہفتہ تک نورجہاں کو دیکھا بھی نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ شب کو بہت نازک وقت آتا تھا اور طلوع آفتاب سے قبل دفتر چلا جاتا تھا۔

ایک ہفتہ کے بعد اپنے اسباب کی تیاری میں مصروف ہوا اور دوسرے روز صبح کو اس کی روانگی طے پا گئی۔ تو اُس نے نورجہاں کو ایک تحریر بھیجی کہ:۔

میں ایک تجارتی کام کے سلسلہ میں کل صبح ڈاک سے بمبئی جا رہا ہوں اور وہاں دو دن قیام کے بعد لندن چلا جاؤں گا۔ میرا یہ سفر کم از کم چھ مہینے کا ہوگا۔ اس زمانہ میں اگر آپ یہاں نہ رہنا چاہیں تو گھر جا سکتی ہیں۔ سود و پیما ہوار آپ کو برابر پہونچتے رہیں گے۔ نورجہاں جس کے اوپر اس ہفتہ میں حسرت و افسوس انفعال و ندامت کے خدا جانے کتنے دور گزر گئے اس تحریر کو پا کر سخت حیران ہوئی کہ وہ کیا کرے۔ چونکہ فطرت اس کی بُری نہ تھی اس لئے اُسپر صغیر کی نصیحت کا اثر تو ضرور ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی خود سر طبیعت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے صغیر سے معافی چاہتی۔ وہ ایک ہفتہ تک برابر رویا کی اور بار ہا خیال آیا کہ صغیر کو بلا کر معاملہ کو صاف کرے۔ لیکن اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ اب جو یہ تحریر اُس کو ملی تو اُسے پہلے سے سکتہ سا ہو گیا لیکن بلعجہ غور سے یہ جدائی اُسے غنیمت معلوم ہوئی۔ اور اُس نے اپنے گھر جانا پسند کر کے صغیر کو اطلاع دیدی۔

(۴)

صغیر کو ولایت گئے ہوئے تین ہفتہ کا عرصہ گذر گیا ہے۔ اور اس اثنا میں صرف ایک خط نورجہاں کے نام موصول ہوا ہے۔ اُسپر دورِ مغربیت شدت سے طاری ہے۔ مختلف رسائل میں اس کے افسانے نکل رہے ہیں۔ غزلیں شائع ہو رہی ہیں۔ ملک کے وہ رسائل و جرائد جن کے سامنے کوئی اخلاقی پہلو نہیں ہے اس میں اور زیادہ شوق پیدا کر رہے ہیں۔ اور بہت سے نوجوان جن کے لئے خواتین سے خط و کتابت کرنا بہترین ذریعہ تفریح ہے اور شاید اسی قدر امید افزا بھی ہے۔ آفرین و تحسین کے خطوط بھیجے جا رہے ہیں۔ اور نورجہاں ہر روز اپنے نشہ میں اضافہ محسوس کرتی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی زندگی اور بھی پُرلطف بسر ہو رہی تھی۔ کہ ایک دن صبح کی ڈاک میں اُسے میرٹھ سے ایک خط ملا۔

محترمہ۔ میری زندگی کا بڑا حصہ ادبیات ہی کے مطالعہ میں گزرا ہے لیکن باور کیجئے کہ جب سے آپ کی تحریر میری نگاہ سے نہ گزری تھی۔ میں کسیطرح قیاس نہ کر سکتا تھا۔ اردو زبان کے بھی ایسے ایسے لکھنے والے موجود ہیں۔ کہ اسے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے تمام مضامین کا انگریزی ترجمہ شائع کراؤں اور اہلِ مغرب کو بتا دوں کہ مشرق اس باب میں بھی ان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چونکہ میں ایک ہفتہ کے اندر خود لکھنؤ آنیوالا ہوں۔ اس لئے اگر آپ نے اجازت دی تو خود حاضر ہو کر اس مسئلہ پر بحث کرونگا۔

بشیر احمد میرٹھ کے ایک مشہور خاندان کا فرد تھا اور اُس کا باپ ایک خوشحال زمیندار تھا۔ لیکن بشیر نے ولایت سے آکر باپ کی جائداد کو اس بُری طرح ضائع کیا تھا کہ دو سال کے عرصہ میں مکان بھی فروخت ہو گیا۔ چونکہ ولایت میں بھی اُسنے اپنی زندگی سراسر اوباشی میں بسر کی تھی۔ اور ہندوستان کے شباب کی میر مستیاں جنکی پر تھیں اس لئے اُس نے میرٹھ شہر میں واپس آکر بھی وہ وتیرہ اختیار کیا تھا۔ اور جب ساری جائداد تباہ و برباد ہو گئی۔ تو پھر اُسنے تہذیب و شائستگی کی تمام ممکن نمائشوں کے ساتھ مکر و فریب کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ چونکہ اس کی صورت غیر معمولی حسین تھی۔ اور اسی کے ساتھ بے انتہا دلکش اداؤں کا بھی مالک تھا۔ اسلئے وہ جنس لطیف کے افراد پر نہایت آسانی سے قابو پا جاتا تھا۔ اور اسطرح گذشتہ دو سال کے عرصہ میں میرٹھ کی دو متمول بازاری عورتوں کو تباہ کر چکا تھا۔ چونکہ اب میرٹھ کے قرب و جوار میں ہر شخص اُسکی حرکات سے واقف ہو چکا تھا اس لئے یہاں اُس کے لئے میدان تنگ ہو گیا تھا۔ اور وہ اب اس فکر میں تھا کہ اس شہر کے باہر اپنا فریب کا جال پھیلائے۔ اس کا حلقۂ تعارف بہت وسیع تھا خط و کتابت کے ذریعہ غائبانہ تعارف حاصل کر لینا اس کے نزدیک معمولی کام تھا۔ چند ماہ سے وہ اردو رسائل میں نور جہاں کے مضامین دیکھ رہا تھا۔ خدا جانے اسے کس نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ حسین بھی ہے اور دولتمند بھی۔ چنانچہ ایک دن بیٹھ کر اُس نے ساری سکیم مرتب کر لی اور میرٹھ سے لاہور کے ایک رسالہ سے نور جہاں کا پتہ دریافت کر کے خط اُس کو لکھا۔

اس سے قبل نور جہاں کی تحسین میں متعدد خطوط آ چکے تھے۔ اور اُس نے لوگوں کو جواب بھی دیا۔ لیکن اس خط نے ایسا میدان شہرت و ترقی کا اس کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ جسوقت اس نے خط محصول کیا وہ چند لمحوں کے لئے از خود رفتہ ہو گئی۔ اور بشیر کو اطلاع دیدی کہ میں آپ سے ملنے کو تیار ہوں۔

پندرہ دن کے بعد جب اسکندر شام کو بشیر احمد کی تحریر پہونچی کہ میں آج صبح کو لکھنؤ آ گیا ہوں ..... اور ہوٹل میں مقیم ہیں۔ تو نور جہاں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ کوئی فرشتہ ہے جو اُسے دفعتہً زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہونچا دے گا۔ چونکہ وہ عزیز مہمان کو گھر نہ بلا سکتی تھی۔ اس لئے اُسنے جواب دیا کہ کل سہ پہر آپ کے پاس حاضر ہوں گی۔ آخر کار وہ سہ پہر آ گئی۔ نور جہاں ایسے ملبوس میں آراستہ ہو جو اس کی خوش ذوقی کا منتہائے نظر ہو سکتا تھا ریشمی برقعہ سر پر ڈال کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔

جسوقت نور جہاں ہوٹل پہونچی تو وہ پہلے ہی سے تیار تھا۔ چنانچہ اُس نے دروازہ سے نکل کر اس کا استقبال کیا اور اپنے کمرہ کی اس فضا میں سے آیا جو اسوقت عطریات سے بسی ہوئی تھی۔ نہایت معذرت کے ساتھ اُسنے نہایت ادب کے ساتھ مغربی انداز سے سر خم کر کر کرسی پیش کی۔ اور پھر سامنے بیٹھکر پہلے اُس نے تکلیف دہی پر معذرت چاہی اور پھر نور جہاں کی ادبیت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ کہ میں کامل دس سال یورپ کے صرف اس حلقہ میں بسر کئے ہیں۔ جو وہاں کے لٹریچر کی جان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو اثر مجھ پر آپ کی انشا نے کیا۔ وہ اسقدر عجیب و غریب ایسا قوی و شدید ہے۔ کہ مشکل سے میں اسے محو کر سکتا ہوں۔ آپ کے افسانوں کا دلکش پلاٹ آپ کے جذبات کی پاکیزگی۔ آپ کی زبان کی حلاوت۔ آپ کے انداز بیان کی ندرت۔ میں حیران ہوں کہ ہندوستانی خاتون کیونکر ایک ایسے بلند معیار ادب کو حاصل کر سکتی ہے۔ اور افسوس کرتا ہوں اس ملک پر جو اپنے ہاں کے ایسے بے بہا جوہر کی قدر کرنے میں تجاہل سے کام لیتا ہے۔ میں نے آپ کے متعدد افسانے غزلیں مطالعہ کیں اور میں ان سے اسقدر متاثر ہوا کہ بغیر آپ کی اجازت حاصل کئے ہوئے میں نے بعض افسانوں کا ترجمہ انگریزی میں شروع کر دیا ہے۔ جنھیں میں آپ کی خدمت میں پیش کرونگا۔ چونکہ یہ مسئلہ بغیر آپ کے طے نہ ہو سکتا ہے اس لئے میں نے خود یہاں آکر آپ کو تکلیف دی ہے۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گی۔

نور جہاں جو اتنی دیر میں بشیر کی صورت و وضع اس کے انداز و اطوار اور کمرہ کے سامان سے اس کی دولت مندی اور خوش ذوقی کے متعلق بہترین رائے قائم کر چکی تھی۔ اسکی تقریر کی لذت سے مخمور ہو گئی۔ اور اُسکی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کیونکر اس شخص کے عظیم احسان کا اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ اور اُسکے معاوضہ میں وہ کیا چیز پیش کر سکتی ہے۔ اُسنے پہلے نہایت لطف و ہمدردی کے لہجہ میں بشیر کے اسقدر زحمت برداشت کرنے پر اظہار خوشنودی کیا اور پھر بولی میرے متعلق آپ نے جو رائے ظاہر کی اُمید خواہ کتنا ہی مغالطہ سے کام لیا ہو۔ لیکن میرے لئے حوصلہ افزا ضرور ہے۔

نور جہاں دو گھنٹہ تک یہاں بیٹھی رہی۔ اور اس عرصہ میں بشیر جسقدر مظاہرہ اپنی خوش ذوقی بلند فکر۔ پرستاری محبت اور اُس کے ساتھ جاہ و دولت کا کر سکتا تھا۔ اُسے ختم دیا اور نور جہاں اس کے انداز و دعووں سے اسدرجہ مسحور ہوئی کہ جسوقت وہ اٹھی تو صرف یہ خیال اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ کہ کیسی خوش نصیب ہے وہ عورت جو اس کی آئندہ ہمدمی کی عزت

حاصل کرے ؟

چونکہ بشیر بہت ہی سوچنے والا تھا۔ اور اپنی گفتگو سے ایک انسان کا سحور کر لینا اس کے لئے نہایت معمولی امر تھا۔ اس لئے اُس نے دوران گفتگو میں نور جہاں کی زندگی کا سارا حال دریافت کر لیا تھا۔ وہ ایک ہفتہ تک یہاں پر مقیم رہا۔ اس زمانہ میں اس نے نسائیات اور فلسفۂ نکاح پر اسقدر متعدد بار اور ایسے حسن و استدلال سے بحث کی کہ نور جہاں کی نقاب اس کا مقابلہ نہ کر سکی اور نہ اس کی خاندانی غیرت و خودداری اب وہ بالکل بے حجاب اُس کے روبرو بیٹھتی تھی۔ نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتی تھی اور صدور جہ کی آزادی کے ساتھ وہ محبت سے اس کے ساتھ سینما جاتی۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پارک میں ٹہلتی۔ الغرض وہ اپنے آپ کو دنیا میں ایک مستقل ذی اختیار ہستی سمجھ کر آزادی کی ان منازل سے گزر رہی تھی۔ جہاں نہ والدین کا خیال حارج ہو سکتا ہے۔ نہ شوہر کا وجود ؟

ایکدن صبح جب نور جہاں بشیر کے پاس جانے کے لئے تیار تھی۔ کہ اچانک صغیر کا تار کلکتہ سے موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں خلاف امید جلد واپس آگیا ہوں۔ اور گرانڈ ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو کلکتہ آکر مجھ سے مل جاؤ۔ میرا یہاں صرف چار دن قیام اور ہوگا ؟

اس خبر نے نور جہاں کو سخت سراسیمہ بنا دیا اور وہ اسی عالم اضطرار میں تار لئے ہوئے بشیر کے پاس پہونچی۔ بشیر نے تار پڑھ کر ایک مصنوعی قسم کے ساتھ کہا۔ کہ فطرت بھی کسقدر ظالم ہے۔ دیکھئے آج ہی دہلی کے پبلشر کا خط آیا ہے۔ کہ آپ کا مدہاں پہونچنا ضروری ہے۔ تاکہ آپ کے مجموعۂ مضامین کے ترجمہ کا حق اشاعت باضابطہ طور پر وہاں رجسٹری ہو سکے۔ میں نے اسوقت تک آپ سے ذکر نہیں کیا تھا۔ کہ معاملہ طے نہ ہوا تھا۔ لیکن اب وہ بالکل تیار ہے۔ صرف معاوضہ کا سوال رہ جاتا ہے میں نے اسکو دس ہزار روپیہ لکھے تھے لیکن وہ صرف چھ ہزار دینے پر آمادہ ہے۔ باقی اشاعت کے بعد ادا کر دے گا۔ معاف فرمائیے گا۔ میں نے اس مسئلہ میں خود رائی سے کام لیا۔ اور آپ سے استمزاج نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا۔ آپ میری ہر تجویز کو قبول کر لیں گی ؟

نور جہاں لاکھ ذہین و ہوشیار تھی۔ مگر پھر بھی عملی دنیا سے ناواقف تھی اس لئے بشیر کی گفتگو نے اسپر سحر کا اثر کیا۔ اور وہ ایسا محسوس کرنے لگی کہ اسوقت دنیا کی شہرت و عزت۔ جاہ و دولت اس کے قدموں پر پڑی لوٹ رہی ہے۔ نہ صغیر کا خیال اس کے سامنے تھا اور نہ والدین کا۔ وہ اسوقت اپنے آپ کو کوئی ایسی دنیا میں دیکھ رہی ہے۔ جہاں زر و جواہر اُسپر نثار کئے جا رہے تھے نمود و شہرت کی دیوی اسپر سایہ فگن تھی۔ ملک اسکی قابلیت پر دیوانہ وار ہو رہا تھا۔ اور مشرق سے لے کر مغرب تک اس کی تصویریں اس کے مضامین رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ الغرض وہ اس وقت اپنے کو طبقہ انسان سے بہت بالا خیال کر رہی تھی۔ اور سمجھ رہی تھی کہ میرا صغیر جیسے معمولی انسان سے تعلق رکھنا یقیناً انسانیت کی توہین ہے ؟

اس لئے اس نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ اور بشیر سے کہدیا کہ میں ہر وقت دہلی جانے کیلئے تیار ہوں۔ خواہ صغیر سے میرا تعلق رہے یا نہ رہے۔ بشیر کو اس جواب پر ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ اس نے نور جہاں کی طبیعت کا اندازہ کر کے جس افسوں سے کام لیا تھا۔ وہ کبھی ناکامیاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اُسے یقین تھا۔ کہ اسوقت وہ اُس عالم میں ہے۔ کہ اگر صغیر سامنے ہوتا۔ تو اسے اپنے ہاتھ سے ہلاک کرنے میں کوئی عذر نہ کر سکتی تھی ؟

صغیر کو یقین تھا کہ اس کے چند ماہ کی غیر حاضری نے نور جہاں کی مزاجی حالت میں بہت تغیر پیدا کر دیا ہوگا۔ اور اب وہ زیادہ امن کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔ اس لئے وہ کلکتہ سے تاسے کر نہایت شوق سے نور جہاں کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب دو دن تک اُس کا کوئی جواب نہ آیا۔ اور نہ وہ خود آئی تو اس کو تشویش پیدا ہوئی۔ اور وہ بغیر مزید انتظار کئے ہوئے سیدھا گھر پہونچنا چاہتا تھا۔ کہ اب تجارتی معاملہ کے متعلق اسکو رنگون جانا پڑا۔ اس لئے اس نے نور جہاں کو دوسرا تار بھیجا۔ کہ آپ بجائے کلکتہ جانے کے سیدھی لاہور پہونچئے۔ میں بھی دس دن کے بعد رنگون ہوتا ہوا وہاں پہونچ جاؤنگا۔ لیکن یہ تار اُسوقت پہونچا۔ جب نور جہاں دہلی پہونچ چکی تھی۔ اور اس کے والد مولوی عبداللہ نے غیرت و شرم کے مارے گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیا تھا ؟

(۵)

رائل ہوٹل دہلی کی بالائی منزل پر ایک کمرہ میں بشیر و نور جہاں ایک ہفتہ سے مقیم ہیں۔ اور اتنے عرصہ میں دہلی کی حسن پرور اور نشہ بخش فضا جتنی لذتیں اور سرشاریاں مہیا کر سکتی ہے۔ وہ سب ان کو حاصل ہیں۔ بشیر کا مکر و فریب آہستہ آہستہ اپنی گرفت کو مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ اور نور جہاں کی سادہ دلی رفتہ رفتہ اخلاق کی تمام پابندیوں سے آزاد ہوتی جاتی۔ یونہی لاہور کے زمانۂ قیام ہی میں بشیر نے فلسفۂ اخلاق کے بہت سے نکات اسے سمجھا کر ضرورت سے زیادہ آزاد بنا دیا۔ لیکن اب دہلی اتر کر تو بے شرعی اور بے عصمتی کی کوئی ادا ایسی نہ تھی جو اُس نے نور جہاں پر مسلط نہ کر دی ہو۔ برقعہ اور اُسکی نقاب تو پھر بھینکدی گئی۔ پردہ سے دفعتہ

باہر آتے ہی جو فطری جھجک ہونی چاہئے دور ہوگئی۔ اور وہ بشیر کے ساتھ دن کے وقت موٹر پر سوار ایسی بے حجابانہ پھرتی تھی۔ گویا کبھی اس کے خاندان میں یہ رسم تھی ہی نہیں وہ بشیر کے ساتھ سینما میں جاتی تھیٹروں میں اس کی ہم آغوش ہوتی۔ ہوٹلوں میں تم کے تم لڈ جاتی تھی۔ الغرض ایمان و اخلاق عصمت و شرافت کے تمام جذبات اس کے دماغ سے محو ہو چکے تھے۔ اور اپنے خیال میں وہ ایسی زندگی بسر کر رہی تھی جس کے لئے وہ وضع ہوئی تھی۔ بشیر کی امیدافزا باتیں اسے سارے عالم سے بے نیاز کئے ہوئے تھیں۔

الغرض نورجہاں کی اس معصیت کوش زندگی کے دو ایام گزر گئے اور بشیر کے مواعید نے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنے کا موقعہ نہ دیا کہ اس کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ بشیر کے متعلق بشیر روز یہی کہتا تھا کہ ابھی تک وہ کمبخت واپس نہیں آیا ہے اور نورجہاں اس کا یقین کر لیتی ہے۔ آخر جب پندرہ دن کے اندر بشیر کے تمام اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور اپنی کامیابی سے بھی سیر ہو گیا۔ تو اس نے ہوٹل میں آخری مرتبہ صدور جنکیل کے ساتھ سامان نشاط مہیا کر کے اور انتہائی کیفیات لذت سے سرشار ہونے کے بعد اس فسانہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

(۶)

نورجہاں صبح دس بجے کے قریب بیدار ہوئی تو اس کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ کمرہ بہت کچھ سنسان نظر آتا ہے۔ اور بشیر موجود نہیں ہے۔ اس نے خیال کیا کہ باہر کسی ضرورت سے گیا ہوگا۔ لیکن جب اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا اسباب بھی غائب ہے یہ خیال کر کے شاید چوری ہو گئی ہے۔ اور اپنے زیورات کے صندوقچہ کو بھی کھلا ہوا پایا جو صغیر کا عطیہ تھا اور جس میں کم از کم چھ ہزار کا مرصع زیور موجود تھا۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہ چوروں نے صرف بشیر کا سامان کیوں چرایا ہے اور سوائے زیور کے میرے سامان کو کیوں ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے ساتھ اس کو فکر ہوئی کہ بشیر کہاں ہے۔ شاید وہ پولیس کو اطلاع کرنے گیا ہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ مجھ کو بیدار نہ کرتا۔ الغرض وہ اسی عالم اضطرار میں سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ کہ کونے کی میز پر اسے ایک چمکدار چیز نظر آئی وہاں جا کر دیکھا وہ ایک آبدار چھری تھی۔ جس کے نیچے ایک تحریر دبی ہوئی تھی۔

"میں آپ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہوں۔ اور ان لذتوں کے معاوضہ میں جو آپ کو میرے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ آپ کے زیور کا بکس لے جاتا ہوں آپ میری حرکت نہ کیجئے گا۔ کیونکہ میرا نام و پتہ آپ کو سب غلط معلوم تھا۔ مجھے اس امر کا کامل احساس ہے۔ کہ آپ نے ہمیشہ میری بات کو نہایت لطف سے مانا اور کبھی میری خواہشات کی مخالفت نہیں کی اس کے اعتراف میں یہ چھری پیش کرتا ہوں کیونکہ دنیا میں اسقدر لذتیں حاصل کرنے کے بعد غالباً آپ کو زیادہ جینے کی تمنا نہ ہوگی"

مصرعہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" (بشیر)

اس کے بعد نورجہاں نے کیا سوچا اور کیا کیا۔ اس کا حال تو معلوم نہیں لیکن شام کے وقت دہلی کی جامع مسجد کے ہر اخبار پر یہ عنوان ضرور سرخ الفاظ سے نظر آتا تھا۔

"رائل ہوٹل میں ایک خاتون نے خودکشی کر لی" (خاص)

(نام اور مقام فرضی ہیں)

(قیصر حسن خاں متعلم بی اے سونی پتی)

فن اشتہار نویسی

اس کتاب میں اشتہار کے ذریعہ سے تجارت کرنا اور اشتہار کی مدد سے تجارت کو کامیاب بنانے کے وہ طریقے بتائے گئے ہیں۔ جن پر عمل کرنے کے بعد ایک معمولی سرمایہ والا بڑے بڑے سرمایہ والے سے دگنی زیادہ آمدنی پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں اشتہار دینے کی صورتیں۔ اشتہار بنانے کے طریقے۔ اشتہار لکھنے کے اصول رسائل و اخبارات اور دوسری چیزوں میں اشتہار دینے کے لئے وہ مشورے درج ہیں۔ جو لاکھوں روپے برباد کرنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ کتاب لاجواب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ:-

منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ شاہی محلہ لاہور

صبح کا منظر

اُٹھا جو حجابِ یمن آرائے سحر کا رُخ زرد ہوا ماہِ دو ناہید و قمر کا
جلوہ جو بڑھا روئے دل آرامِ نظر کا کچھ اور ہوا رنگ نباتات و شجر کا
تابندہ جو رخ تھا فلکِ نیلوفری کا
عالم پہ گھٹا ٹوپ تھا انوارِ سحری کا

وہ نور کا تڑکا وہ سماں اسکا دل آویز وہ عطر فشاں بوئے صبا غالیہ آمیز
وہ نغمۂ مرغانِ خوش آواز جنوں خیز خوشبو جو کہیں پھول کی دھیمی تو کہیں تیز
جلوہ جو کسی عالمِ باطن کا عیاں تھا
اِک جُل کے عجب دلکش و دلخواہ سماں تھا

جاں بخش فضا دشت کی جنگل وہ سہانا گرمی کی سحر وہ گلِ خودرو کا زمانا
چھن چھن کے درختوں کے اِدھر نور کا آنا کترا کے دبے پاؤں ستاروں کا وہ جانا
حسنِ گلِ رخسار دکھایا کہیں تھم کے
نظروں سے کبھی ہو گئے غائب کبھی چمکے

بلبل کا نشیمن میں الگ شور مچانا منہ کھولے ہوئے اڑ کے کسی شاخ پہ آنا
ہٹنا کبھی گل سے کبھی منقار بڑھانا شوخی سے صبا کا کبھی ڈالوں کو ہلانا
مشکل ہے چھپاؤ جو چھپیں راز کی باتیں
خلوت تھی تو معشوق سے تھیں ناز کی باتیں

ہلکی سی وہ سردی تو وہ سبزے کی طراوت خوشبو وہ سمن کی گلِ رعنا کی وہ نکہت
دیتی تھی جو قدرت سبق صنعت و حکمت خنگل کی زباں پر تھی گلستاں کی حکایت
ہر شے کا غرض حسنِ خداساز جدا تھا
ہر باب میں ہر فصل کا انداز جدا تھا

پتے کے بھی بوٹے گلِ تر تا ثمر اہی فیروزی و الکاری عنابی و کاہی
سرخی ہے کہیں زردی کہیں سبزی و سیاہی اس صنع میں کیا اہم ہے تمیز نگاہی
یاں تھا اسی صنعت صناعِ زمیں میں
بچھا ہوا ابریشمِ یمنی تھا چمن میں

اللہ رے عروسانِ چمن زاد کی پوشاک خود بادِ صبا مشاطگی کرتی تھی جو اس کی
ذرے سے کھلا تھا نہ یہ پارہ الماس ہمت خوشی کوئی و ہمہ تا سہ و اس کی
پھولوں پہ کبھی قمریاں کبھی آنکھیں تھمکتیں
رہ رہ کے چہکتے تھے طیورِ شجروں پر

وحشی جو بیاباں میں تو جنگل میں درندے اڑتے ہوئے آپ اپنی ہوا میں نہ پرندے
ناچار تھے سب اپنی غرض کے تھے جو بندے بچوں کے کہیں جال کہیں بھوک کے پھندے
تھی دامِ تعلق سے رہائی نہ جہاں کو
چیونٹی کو جو تھی فکر وہی پیلِ دماں کو

فرحت سے سحر کی متاثر تھے سب اشجار تھے مدرکِ حساس ہر اک رتِ جاندار
سر تھے جو زمیں پر تو دھری خاک پہ رخسار خاموش بظاہر مگر آہستہ یہ گفتار
تیشوں سے کٹیں جسم کہ سر سے جلیں ہم
یا رب کہیں تا زیست یہاں نہ ٹلیں ہم

بھاشا کے ہندوستانی شعراء

اگرچہ ہندوستان میں زبان بھاشا کے شعراء بکثرت ہوئے ہیں لیکن اگران کی زندگی پر مختصر سا تبصرہ بھی کیا جائے تو کافی وقت کی ضرورت ہے۔ بھاشا کے جن چند شعرا کے نام اور ان کے مختصر حالات ہمیں معلوم ہوئے ہیں۔ وہ ذیل قلمبند کئے جاتے ہیں ؛

راجہ کمان۔ یہ چتوڑ کے مشہور راجہ تھے۔ یہ بہت بڑے سنسکرت کے عالم اور سنسکرت اور بھاشا کے قابل شاعر تھے۔ چندر بردے مہاراجہ پرتھی کے دربار کے مشہور شاعر تھے۔ ان کو سنسکرت عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ پشتو اور کئی زبانوں میں کمال حاصل تھا ؛

کنہیا۔ چتوڑ کے مشہور عالم جو سنسکرت زبان میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔

تلسی داس۔ گوسائیں داس اکبر بادشاہ کے زمانے میں ساٹیں تھے مگر بڑے قابل اور عالم تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن ان کی لکھی ہوئی رامائن فلم طور سے مشہور ہے ؛

[illegible] بادشاہ کے مشہور وزیر ادارت کے برہمن تھے۔ ان کے لطیفے مشہور [illegible] راجہ حاضر جواب اور ظریف تھے ؛

[illegible] ٹوڈرمل بھی دربار اکبری کے رکن خاص تھے۔ انھوں نے بھاگوت [illegible] جی کی الہامی کتاب مانی جاتی ہے) کا ترجمہ کیا ہے اور بھاشا کے شا[illegible]

[illegible] بادشاہ کے درباری شاعر تھے۔ بڑے قابل اور حاضر جواب تھے ؛

[illegible] یہ ہندوستان کے اکبر زمانے کے مشہور استاد تھے۔ انھیں علم موسیقی میں کمال [illegible] ؛

ناجھ جی۔ آپ دکن کے رہنے والے تھے۔ آپ کی تصانیف میں بھگوت مال زیادہ مشہور ہے ؛

کھمان۔ یہ اندھا تو تھا مگر فن شاعری میں یدطولےٰ رکھتا تھا۔ مہاراجہ نوالر کے کہنے پر ایک شب میں سات سو اشلوک کی کتاب تیار کر دی تھی ؛

کیشو داس۔ یہ بھاشا کا مشہور شاعر ریاست ارچھا میں تھے۔ ریاست کی طرف سے ان کو معقول جاگیر ملی ہوئی تھی۔ کئی کتابیں ان کی تصنیف کردہ ہیں

کبیر جی۔ بنارس کے رہنے والے اور ذات کے نور باف تھے۔ ان کی شاعری ہندوستان میں مشہور ہے۔ ان کے دوہے درد سے بھرے ہوئے اور دوسرے اخلاق سے مالا مال ہیں ؛

نانک جی۔ پنجاب میں تھے آپ سکھوں کے متبرک گرو ہیں آپ کی کتاب گرو گرنتھ نہایت مشہور ہے ؛

کاتی داس تواری۔ یہ اول تو اورنگ زیب کے دربار میں تھا مگر آخر میں مہاراجہ کشمیر کے دربار میں چلا گیا تھا۔ اتنے بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں ؛

آس کمان۔ یہ پہلے مسلمان تھے انکا نام سید ابراہیم تھا مگر یہ بندرابن میں جا کر ہندو ہو گئے۔ یہ بھاشا کے بہترین شاعر تھے ؛

جے سنگھ۔ مہاراجہ جے پور اپنے زمانے کے بے نظیر شاعر اور عالم تھے۔ اور علم ہیئت کے متعلق انھوں نے ایک مشہور کتاب تصنیف بھی کی تھی ؛

آفتاب رائے۔ آپ نہ صرف بھاشا بلکہ سنسکرت کے بھی عالم اور شاعر تھے۔ آپ کا اصلی وطن کشمیر تھا لیکن عذر کے بہت قبل آپ وہاں سے ہندوستان چلے آئے تھے ؛

پنڈت لیکھرام۔ آپ سنسکرت۔ فارسی۔ عربی وغیرہ کے عالم تھے لیکن بھاشا اور اردو میں بھی شاعری کیا کرتے تھے ؛

گیا نچند۔ یہ شاعر اپنے زمانے کے بڑے استاد گذرے ہیں ؛

لچھمی نرائن۔ آفتاب رائے کی طرح آپ میں تمام صفات موجود تھیں۔ آپ عرصہ دراز تک محکمہ پولیس میں افسر رہے۔ اور پنشن لینے کے بعد ۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے ؛

(محمود آردی)

میرا دوست فجّو

از جناب محمد عبدالوحید سنبھلی - بی اے - (علیگ)

پدری محبت تقاضۂ فطری ہے - ہر باپ اپنی اولاد سے یکساں محبت رکھتا ہے - مگر اس کا اظہار بالکل جدا - اگر ایک امیر باپ اپنے بیٹے کو صد ہا روپیہ کے قیمتی کھلونے خرید کر اس کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے - تو ایک غریب شخص اپنے بچہ کو ڈیڑھ پیسہ کی سیٹی دلا کر اس کی حسرت کو پورا کر دیتا ہے لیکن تجربہ اس کا شاہد ہے کہ اظہار محبت اور بچہ کا شوق اس کی تربیت پر گہرا اثر رکھتا ہے - جس طرح اظہار محبت جدا ہے اسی طرح بچوں کے شوق بھی جدا ؛

میرے ایک دوست حکیم جی ہیں ایکدن انکا نوکر میرے پاس آیا اور کہنے لگا "میاں نے حقہ کی چار چلمیں منگوائی ہیں" - میں نے بغیر کسی اپ وپیش کے دیدیں - دوسرے دن میں بازار جا رہا تھا - اتفاقاً راستہ میں حکیم جی سے ملاقات ہوئی - میں نے دیکھا کہ ان کے نوکر کے سر پر چلموں کا ایک ٹوکرا رکھا ہے - پوچھا اتنی چلموں کا کیا کروگے کل ہی تو آپ نے مجھ سے منگوائی تھیں - ہنسے، اور فرمایا "کیا تمھیں خبر نہیں - جمعہ خاں (حکیم جی کا لڑکا) چلموں سے کھیلا کرتا ہے اور روزانہ پانچ چلمیں توڑ تا ہے" - تو یہ ہیں ہنسی سے بیتاب ہو گیا - میرے ایک عزیز نہایت کنجوس واقع ہوئے ہیں - گھر سے رفیع آباد اور آگرہ میں ہیڈ مولوی ہیں - ایک دفعہ تعطیل میں جب گھر آئے - تو میں نے ان کے ایک بڑے بکس کو ڈورے کے خالی گٹوں سے بھرا ہوا دیکھا - پوچھا "یہ کس لئے لائے ہو - فرماتے ہیں - اگرہ میں بچوں کا کوئی کھلونا ہی نہ مل سکا - تو جوتے والوں کی دکانوں سے ریل کے یہ خالی گٹے لے آیا ہوں" واللہ عجیب دماغیت ہے، غرض یہ ایک ہلکا خاکہ ہے - پدری محبت اور بچوں کے شوق کا - میرا دوست فجّو جب بچہ تھا - اُسے کتوں کے مارنے کی عادت ترقی کرتی رہی اور اب وہ اس کا شوقین ہو گیا - اُس نے اس کام میں ایسا تجربہ حاصل کر لیا تھا - کہ موٹے سے موٹے کتے کی پچھلی ٹانگیں پکڑیں - اور گھما کر دے پٹکا - ہم لوگ اس حرکت پر خوب ہنسا کرتے - اگر کسی دن گھر میں کتا آن پھنسا - سمجھ لو خیر نہیں - محلہ کے کتے فجّو کی صورت دیکھ کر بھاگنے لگے - سڑک پر کھڑے ہوئے - کتے کے برابر فجّو گیا - اور نہایت صفائی سے اُس کے سر پر چپت رسید کر دیا ؛

فجّو ایک لانبے قد کا آدمی تھا - اس کا منہ زیادہ چوڑا اور صورت خنک فناک تھی فجّو کے سر کے بال نہایت لانبے اور موٹے تھے - اور خود ہی سُور کے بالوں سے مشابہت دیا کرتے - جب آٹھویں دن سر کی صفائی کرتے تو میری سن لائٹ کی ٹکیہ نصف سے زیادہ ایک دفعہ میں رگڑ ڈالتے - دماغ بالکل ٹھس تھا - کوئی کچھ کہدیتا یقین کر لیتا - اسکی سادگی کا ہر وقت ہم لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے - ایکدن تمکا رکا ذکر ہو رہا تھا - کالج کے ایک شریر دوست نے یہ کہدیا - کہ آج دو کالے ہرن پرنسپل کے دفتر میں آن گھسے - فجّو نے یقین کر لیا اور کہا - "ہاں کالج جنگل میں ہے وہیں سے آگئے ہونگے - تھے کتنے کتنے بڑے" - فجّو کی زبان موٹی تھی - اور الفاظ صاف شکل سے نکلتے - تمام عمر میں ایکدن جو انگریزی بولے تو آل آر فری کے بجائے آل آل پلی ہی بول پڑے" - سارے ہندوستانی شعراء کے کلام میں سے فجّو کو صرف یہ ایک مصرعہ یاد تھا - "نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا" اس مصرعہ کو خود ہی منحوس بھی کہا کرتے - کیونکہ جب کبھی امتحان کے دن جس پرچہ کے قبل اس کو پڑھا اس میں ناکامیاب ہو گئے لیکن پڑھتے ہر وقت تھے - موقع ہو یا نہ ہو طبیعت کی صفائی کا حال نہ پوچھئے آپ کا کمرہ گذشتہ زمانہ کے مہیب قید خانوں کی زندہ یادگار تھا - جس میں ایک تین ٹانگ والا ٹکس آنے والے کو ہر وقت سلامی دیتا - ایک چارپائی بھی پڑی تھی - مگر بدقسمتی سے اسکی ایک پٹی پایہ کے سوراخ سے ایک بالشت باہر جھانکتی رہتی - اور بے خبر زوار کے گھٹنے کی ایسی قدمبوسی کرتی کہ بیچارہ چیخ کر گر پڑتا - ان دو چیزوں کے علاوہ کمرہ کے فرنیچر میں ایک چوکی بھی شامل تھی - لیکن اسکی مشینری کچھ ایسی عجیب کہ اگر ذرا بھی لاپروائی سے بیٹھے دھڑ سے چوکھٹے کے درمیان میں جا پڑے - کمرے میں بے دروں کی الماری پر جو ایک سُرخ پردہ پڑا تھا - اُس سے دوسرا کام پاخانہ کے دروازہ پر ڈالنے کا بھی لیا جاتا ؛

خدا معلوم فجّو نے کیسے پانچویں مرتبہ انٹرنس پاس کر لیا - اب کتا تھا - سب انسپکٹری پولس کے واسطے درخواست دیدی اور ساتھ ہی ساتھ خاکی کوٹ پہننا بھی شروع کر دیا - اکیلا بیٹھا بیٹھا خوب منصوبے سوچتا - خیال میں کبھی گھوڑے پر سوار ہوا جا رہا ہے - کبھی کسی سپاہی کو سلام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے

ایکدن میں نے پوچھا۔ "فجو اگر تم تھانیدار ہوگئے تو پہلا کام کیا کروگے" فجو ہنسے اور بولے۔ "یار پہلے دن تو مٹھائی پیٹ بھر کر کھاؤنگا"۔ اتفاقاً ستمبر میں پروانہ آگیا جسمیں تحریر تھا کہ ماہ اکتوبر کی ۱۵ تاریخ میں بمقام آگرہ انتخاب امیدواران عمل میں آئے گا۔ اب فجو خوش تھا۔ نماز بھی شروع کردی۔ اور ہر وقت اپنے انتخاب کی مانگ کی۔

۸ اکتوبر کی شام کو ہم لوگ سینما دیکھنے گئے۔ ۱۱ بجے شب کو واپسی ہوئی رات میں کافی تعداد کتوں کی ملی۔ اپنی عادت کے مطابق فجو گلیوں اور بازاروں میں انکو مارتا چلا آرہا تھا لیکن اب وہ کتوں کو اپنی نوکیلی سیاہ چھڑی سے مارا کرتا کیونکہ ایک دفعہ کسی کتے نے جھنجلا کر اُس کے ہاتھ میں کاٹ لیا تھا۔ اتفاقاً ایک کتیا سڑک کے ایک جانب پڑی اپنے چھوٹے چھوٹے پلوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ فجو نے اس کے چھڑی ماری۔ خدا معلوم اس کے چھڑی ماری۔ خدا معلوم چھڑی کیسے پڑی کہ بیچاری کی آنکھ باہر نکل آئی۔ خوف اور تکلیف میں وہ روئی اور دودھ پینے والے بھوکے بچوں نے اپنی معصوم آواز میں فجو کو شاید بد دعائیں دیں۔ فجو بدستور ہنستا ہوا چلا آیا۔ میں جب سویا تو خواب میں بے زبان کتیا کی صورت مجھے نظر آئی۔

خدا کسی کو بے وقوف نہ بنائے۔ کیونکہ بیوقوف انسان کی تربیت اگر دنیا بھی خراب ہوتی ہے۔ تو وہ انتہائی ظالم اور بے رحم ہوجاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سی چیزیں ہم کو نقصان پہونچاتی ہیں۔ مگر ہمیں یہ کب اختیار ہے کہ ہم ان کو جسمانی تکلیف پہونچائیں۔

دوسرے دن صبح کو میں سو رہا تھا کہ آدمیوں اور عورتوں کے متواتر شور و غل نے میری آنکھ کھولدی۔ میں باہر گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ڈاکٹر معشوق علی صاحب کے اسپتال پر آدمیوں کا ہجوم ہے۔ پوچھا معاملہ کیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ٹرمی ٹکل سے اندر پہونچا۔ تو یہ دیکھ کر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی کہ فجو کے قمیص کا اگلا حصہ خون سے تر ہو رہا ہے۔ فجو کے چھوٹے بھائی سے جو وہیں کھڑا رو رہا تھا دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے کہا۔ "کبوتر والے کمرہ میں بلی آن گھسی تھی۔ یہ اُسکو اپنی چھڑی سے مارنے گئے۔ اُسے جب بھاگنے کا راستہ نہ ملا تو حملہ کردیا اور ایسا پنجہ مارا۔ کہ بھائی صاحب کی آنکھ کاڈیلا باہر آن پڑا"۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ "کچھ نہیں آنکھ بیکار ہوگئی۔ آہ۔ فجو کانا ہوگیا!

واقعات و حالات کی رفتار کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ انسانی دماغ ضرور سلسلہ قائم کرلیتا ہے۔ حالانکہ اس کا نام توہم پرستی ہے۔ کیا بات والی کتیا کی بے گناہی اور اس کے ننھے بچوں کی بد دعائیں بلی کے نوکیلے پنجہ میں ظاہر ہوئیں۔

ہفتہ جلد ختم ہوگیا۔ فجو انتخاب کے موقع پر آگرہ گیا۔ مگر کمیٹی نے ایک جسمانی عضو نہ ہونے کے باعث فجو کو ناکامیاب ٹھہرادیا۔ فجو کو اپنی آنکھ جانے کا اسدرجہ صدمہ نہ تھا۔ جتنا کہ انتخاب میں نہ آنے کا۔ اُس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ فجو شاید دنیا سے بے دل ہوتا جارہا ہے۔ اس واقعہ نے اُس کی زندگی میں اہم تبدیلی کردی۔

کچھ عرصہ بعد مجبوراً فجو نے محکمہ جنگلات میں اوورسیر ملازمت کرلی۔ اور وہ پیلی بھیت کے بن میں بھیجدیا گیا۔ جب کبھی چھٹی پر آتا تو اپنی ناکامیابی سب انسپکٹری پر اظہار افسوس کرتا گویا کہ ابتک اُسپر تھانیداری کا بھوت سوار تھا۔ اس نے اپنی زندگی اعلےٰ مقصد اسی کو ٹھہرایا تھا۔ اور وہی غائب ہوگیا۔ مگر اب کتے مارنیکی عادت کم ہوگئی تھی۔

ایکدفعہ انسپکٹر جنرل پولس بغرض شکار بن میں گئے اور اسی ڈاک بنگلہ میں مقیم ہوئے۔ جسکا محافظ فجو تھا۔ صاحب کی میم بھی ہمراہ تھی۔ دوسرے دن شیر کے شکار کے لئے مچان باندھا گیا۔ رات کو جب وہ گیا تو بطور امداد کے فجو کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ فجو کے پاس رائفل یا بندوق تو تھی ہی نہیں۔ وہی کتیا والی سیاہ چھڑی ہاتھ میں لے گئے۔ اور صاحب کے پیچھے مچان پر جا بیٹھے۔ ۱۱ بجے کے قریب شیر آیا اور اس نے نیچے بندھے ہوئے بکرے کو پھاڑ ڈالا۔ صاحب نے فیر کیا۔ مگر شیر نہ خالی گیا۔ شیر نے غضبناک ہوکر جست لگائی۔ اور صاحب کی میم کو آن دبایا صاحب تو بے ہوش ہوگئے۔ فجو نے اپنی بدحواسی میں جلدی سے شیر کے اپنی چھڑی مار چھڑی کی نوک تیز تھی۔ تقریباً چار انچ شیر کی آنکھ میں جا گھسی۔ وہ تکلیف و بدحواسی میں نیچے گر گیا۔ جھٹ سے صاحب کی میم نے فائر کیا شیر ختم تھا۔ صاحب جب ہوش میں آئے میم نے کل واقعہ سنایا۔

انسپکٹر جنرل چند دن بعد وہاں سے چلنے لگا۔ اس نے چلتے وقت فجو کو انعام دیا اور تشکرانہ الفاظ کہے اس کے جانے کے دو ہفتہ بعد فجو کے پاس ایک رجسٹری شدہ لفافہ آیا۔ جس میں یہ تحریر تھا۔ "آپ کی بہادری اور احسان کے صلہ میں ہم اپنے اختیارات سے آپ کو سب انسپکٹری پر نامزد کرتے ہیں.....

"انسپکٹر جنرل"

ارے فجو تھانیدار ہوگیا۔

(محمد عبدالوحید سنبھلی)

ڈاک بابو

(از جناب محمد اظہر علی فاروقی۔ پروفیسر ادوے پرتاب کالج)

بابو کو پہلی نوکری ادلا پور کے ڈاک خانہ میں ملی۔ اگرچہ گاؤں کچھ بڑا نہ تھا۔ تاہم نیل کے کارخانہ کے ایک انگریز مالک کی سعی و کوشش سے ڈاک خانہ کھل گیا تھا۔

ڈاک بابو کا وطن مالوف کلکتہ تھا۔ اس دور دراز گاؤں میں بابو کا دل نہ لگتا رہتا۔ اس کا دفتر اور رہنے کا کمرہ پھوس کے ایک تاریک چھپر کے نیچے تھا۔ جس کے قریب ہی گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے گھرا ہوا گندے پانی کا تالاب تھا۔ جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔

نیل کے کارخانے کے مزدوروں کو دن بھر کام سے فرصت نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی سوسائٹی میں تعلیم یافتہ طبقہ کے واسطے کوئی دلبستگی نہیں اور یوں بھی شہر کلکتہ دوسروں سے ربط و ضبط پیدا کرنے میں زیادہ ماہر نہیں ہوتے اور غیروں کی نظروں میں وہ یا تو متکبر اور یا سادہ لوح ٹھہرتے ہیں۔ باوجودیکہ ڈاک بابو کے پاس کام کچھ زیادہ نہ تھا۔ تاہم اس کا میل جول گاؤں میں کسی سے نہ تھا۔

دل بہلانے کے لئے وہ کبھی کبھی شعر کہنے میں اپنا وقت گذارتا تھا۔ اکثر وہ ایسے جذبات ادا کرتا تھا کہ زندگی کو شیریں اور پرکیف بنانے کے لئے درختوں کے ہرے ہرے پتوں کی ہلکی ہلکی جنبش اور نیلگوں آسمان پر مست بادلوں کا حرام ناز ہی کافی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر الف لیلہ کی کہانیوں کا کوئی دیو ایک رات میں تمام درختوں اور پتوں کو اڑا کر لے جاتا۔ اور انکی جگہ پتھروں کی ایک سڑک چھوڑ کر عالیشان عمارتوں کی دو رویہ قطاروں کو بادلوں کے نظارہ میں حائل کر دیتا۔ تو یہ بے چارہ اس انقلاب کو اسی طرح ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا۔ گویا اس کو دوبارہ زندگی عطا ہوئی ہے۔

ڈاک بابو کی تنخواہ کم تھی اس لئے وہ اپنا کھانا خود پکایا کرتا تھا۔ کھانے میں اسی گاؤں کی ایک یتیم لڑکی۔ رتن بھی شریک ہو جاتی جو بابو کا کچھ کام کر دیا کرتی تھی

شام کے وقت جب گوالوں کے گھروں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیتا اور جھاڑیوں میں جھینگر شور مچانے لگتے۔ جب باؤل فرقہ کے گداگروں کے گانے کی آواز ان کے جھونپڑوں میں گونجنے لگتی۔ اور جب بانس کے پودوں کے کسی گھنے جھنڈ میں بیٹھ کر پتوں کی جنبش کا مشاہدہ کرنے والا شاعر اپنی روح میں ایک پُراسرار جنبش محسوس کرتا۔ ڈاک بابو اپنا چراغ جلاتا اور پکار کر کہتا۔ "رتن!"

رتن باہر بیٹھی ہوئی اس آواز کا بے چینی سے انتظار کیا کرتی تھی۔ وہ اندر داخل ہونے سے پہلے پوچھتی۔ "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

ڈاک بابو کہتا۔ "ہاں! تم کیا کر رہی ہو؟" رتن جواب دیتی۔ "میں چولھے میں آگ سلگانے جا رہی ہوں"

ڈاک بابو نے کہا۔ "اچھا! آگ سلگانے کو رہنے دو۔ پہلے مجھے حقہ بھر دو"۔

رتن کوئلوں کو دہکانے کے لئے اپنے پھولے پھولے گالوں سے پھونکیں مارتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی۔ اس طرح ڈاک بابو کو اس سے بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا۔ غالباً مہر سکوت کو بابو اس طرح توڑتا تھا۔ "اچھا رتن! بتاؤ تم کو اپنی اماں کی کوئی بات یاد ہے؟"

رتن کو کچھ باتیں یاد تھیں اور کچھ وہ بھول چکی تھی وہ ماں سے زیادہ باپ کی لاڈلی تھی۔ اس لئے باپ اسے زیادہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ دن بھر کے کام کے بعد تھکا ماندہ شام کو گھر آیا کرتا تھا۔ اور ایک آدھ شام کا منظر رتن کی نظروں کے سامنے پھرتا تھا۔ رتن ڈاک بابو کے پاس بیٹھ جاتی اسوقت اسے پرانی باتیں خوب یاد آنے لگتی تھیں۔ اس کا ایک ننھا بھائی۔ یاد آتا تھا۔ جس کے ساتھ مل کر اس نے ایک ابر آلود دن کو تالاب کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کا شکار کھیلا تھا۔ اہم واقعات کے بجائے اسے زیادہ تر اسی طرح کی معمولی معمولی باتیں یاد تھیں۔ باتوں باتوں میں کافی وقت گذر جاتا۔ اور ڈاک بابو کا کھانا پکانے کو دل نہ چاہتا۔ تب رتن ٹھٹھر جلدی سے آگ جلاتی۔ اور دن کی بچی ہوئی روٹی اور سالن گرم کر لیتی جو ان کے رات کے کھانے کے لئے کافی ہوتا۔

کسی وقت ڈاک بابو بھی اس وسیع خالی چھپر کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا۔ جہاں اس کی چھوٹی میز پڑی تھی۔ اپنے گھر والوں کے تصور میں محو ہو جاتا تھا۔ اسکی بہن اور دوسرے احباب (جن کے لئے اس جبری جدائی میں اس کا قلب مضطرب رہتا تھا) باری باری اسے یاد آتے۔ ہر وقت انکی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرتی لیکن وہاں بجز کارخانہ کے مزدوروں کے کوئی نہ تھا۔ جس سے وہ اپنے حالات کہتا

اور اس کو وہ خودداری کے خلاف سمجھتا تھا۔ البتہ گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی رتن کے سامنے وہ بے باکانہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے چند روز بعد نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی بھی اس کے سامنے اس کے گھر والوں کے سامنے اس کو بھائی۔ بہن اور اماں کہہ کر بیان کرتی۔ گو یا وہ برسوں اس کے ساتھ رہ چکی ہے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ رتن نے اپنے ذہن میں ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نقش قائم کر لیا تھا۔

برسات کا زمانہ تھا۔ ایکدن دوپہر کے وقت بادل برس کر کھل چکا تھا۔ ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ میں تمازت اس اور بھیگی پتیوں سے جو خوشبودار بخار اٹھ رہا تھا۔ وہ جسم پر اسطرح محسوس ہوتا گویا تھکی ماندی زمین کی گرم سانس ہے قریب ہی ایک جھاڑی میں ایک پرند بیٹھا تھا۔ جس کی غم انگیز صدا سے ہوا شام تک پیہم گونجتی رہی۔ غالباً وہ قدرت کے دربار میں کوئی شکوہ کر رہا تھا۔

ڈاک بابو کو کام سے بالکل فرصت تھی۔ درختوں کے پتے غبار دھل جانے کے سبب صاف و شفاف نکل آئے تھے۔ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے پسماندہ ٹکڑے فلک نیلگوں پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈاک بابو کی نگاہ اس خوبصورت سین پر جمی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں اس طرح خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ "کاش موقعت میرا کوئی ہمجنس ہوتا۔ کوئی دردمحبت کا معالج انسان میرے سامنے ہوتا۔ کاش میں بھی کسی سے ہمکنار ہو سکتا۔" وہ اسی طرح باتیں کر رہا تھا اور سوچتا تھا کہ شاید یہ پرندبھی یہی باتیں کہنا چاہتا ہے۔ اور غالباً یہ پتے بھی سرگوشیوں میں انھیں جذبات کے اظہار کی سعی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات کون جانتا ہے۔ اور اس کا یقین کس کو ہو سکتا ہے کہ ایک کم تنخواہ پانے والے دیہاتی ڈاک بابو کا دل بھی اپنے خشک اور دماغی احساسات کو مغلوب کرنے والے کاروبار کے درمیانی وقفہ میں اس قسم کے جذبات کا مرکز بن سکتا ہے

ڈاک بابو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پکارا۔ "رتن! رتن!!" اسوقت رتن امرود کے درخت کے سایہ میں لیٹی ہوئی کچے امرود کھانے میں مشغول تھی۔ اپنے آقا کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہتی ہوئی بھاگی۔ "بھیا! آپ نے مجھے بلایا ہے؟" ڈاک بابو نے کہا۔ "ہاں۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمھیں کچھ پڑھنا لکھنا سکھا دوں۔" چنانچہ سہ پہر کا بقیہ حصہ اس نے رتن کو الجد سکھانے میں گذارا۔ اس طرح تھوڑے دنوں میں رتن کچھ شد بد پڑھنے لگی۔

بارش کی کثرت سے نیل تک ایک ہو رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب کی برسات کا خاتمہ ہی نہ ہوگا۔ کالے کالے بادلوں کی فوج آسمان پر کوچ کر رہی تھی گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ گڑھیے۔ کھائیاں۔ خندقیں سب پانی سے بھری تھیں۔ رات دن مینہ کی تڑاتڑ اور مینڈکوں کی ٹرٹر! ٹرٹر!! برابر سنائی دیتی تھی۔ گاؤں کی سڑکیں آمدورفت کے قابل نہ رہی تھیں۔ ہر قسم کا لین دین اور بیوپار ڈونگیوں کے ذریعہ ہو رہا تھا۔

ایک رات جب گھنگھور گھٹا چھائی تھی۔ کالے کالے بادل چھائے تھے۔ ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی۔ ڈاک بابو کی کسن شاگرد۔ دیر تک باہر اسکی آواز کی منتظر رہی۔ اور جب خلاف معمول بہت دیر تک بابو نے اسکو نہ بلایا تو اپنی بیٹھی کتاب لے کر آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنے آقا کو پلنگ پر لیٹا دیکھ کر وہ الٹے پاؤں واپس آنا چاہتی تھی کہ اس نے دفعتہً اپنا نام سنا "رتن" وہ فوراً واپس آئی۔ اور کہنے لگی۔ "بھیا آپ سو رہے تھے؟" ڈاک بابو نے خیرف آواز میں جواب دیا "میں اچھا نہیں ہوں۔ میری پیشانی چھو کر دیکھو کتنی گرم ہے"

غربت اور تنہائی میں اسے تیمارداری کے واسطے کسی محبت والے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی ماں۔ اپنی بہنوں کو اپنے پاس موجود خیال کرنے اور اپنے آپ کو محبت آمیز فضا میں سمجھنے کے لئے (جو عورت ذات ہی پیدا کر سکتی ہے) تصور کرتا۔ اپنی پیشانی پر کھنکھناتی ہوئی چوڑیوں والے نرم و نازک ہاتھوں سے چھونے کا تصور کرتا۔ اس غریب الوطن کی یہی دلی آرزو تھی۔ رتن مجھ سے ایک کمسن لڑکی تھی۔ فوراً ایک ماں کے فرائض ادا کرنے کے لئے مستعد ہو گئی۔ اس نے گاؤں کے ویدکو بلایا۔ اور اس کی دی ہوئی گولیاں مریض کو مناسب اوقات پر دیتی رہی۔ وہ ڈاک بابو کے لئے دلیا پکاتی۔ تمام شب اس کے سرہانے بیٹھے بیٹھے گذار دیتی اور اس سے بار بار پوچھتی۔ "بھیا! آپ پہلے سے کچھ اچھے ہیں؟"

کچھ عرصہ بعد بابو اپنے بستر مرض سے اٹھا۔ لیکن وہ بہت لاغر اور کمزور ہو گیا تھا۔ اب اس نے اپنے دل میں یہاں سے تبادلہ کرانے کا نتیجہ کر لیا۔ اور کلکتہ کے دفتر میں اس مضمون کی درخواست بھیجدی کہ یہ مقام میری صحت کے ناموافق ہے اس واسطے مجھ کو کسی دوسری جگہ بھیجدیا جائے۔

رتن تیمارداری کے فرائض سے سبکدوش ہو کر پھر باہر بیٹھا کرتی تھی۔ لیکن ڈاک بابو نے اب اسکو بلانا چھوڑ دیا۔ بعض اوقات وہ کھڑکی سے اندر جھانکتی۔ اور وہ اسکو کبھی کرسی پر بیٹھا ہوا اور کبھی اپنے بستر پر دراز پاتی۔ بیچاری لڑکی اپنا آموختہ بار بار دہراتی تاکہ ڈاک بابو کو فرفر سنا سکے۔ آخر ایک ہفتہ انتظار کے بعد اس کو وہی آواز سنائی دی۔ "رتن!" لڑکی کا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور وہ حسب عادت جلاتی ہوئی بھاگی۔

"بھیا! آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

ڈاک بابو نے کہا "ہاں۔ میں کل جا رہا ہوں"

رتن نے پوچھا۔ "بھیا! کہاں جارہے ہو؟" "میں اپنے مکان جارہا ہوں"۔ "آپ کب تک واپس آئیں گے؟" "میں اب نہیں آؤنگا"۔

اس کے بعد رتن نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ڈاک بابو نے خود ہی بتایا کہ تبادلہ کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ ملازمت چھوڑ کر جارہا ہے۔

بہت دیر تک دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ چراغ کی لَو دھیمی پڑ گئی تھی۔ اور ایک کونہ میں چھت کے ایک سوراخ میں سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر نیچے مٹی کے برتن میں جمع ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد رتن کھانے کا بندوبست کرنے کے لئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ لیکن اب اس کے چلنے پھرنے میں وہ پہلی سی پھرتی مفقود تھی۔ اس کے ننھے سے دماغ میں کئی نئے خطرات پیدا ہوگئے۔ جب بابو کھانا کھا چکا تو لڑکی نے اچانک اس سے کہا۔ "بھیا! آپ مجھ کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے؟"

ڈاک بابو نے ہنسکر کہا۔ "واہ! کیا انوکھا خیال ہے"۔ لیکن اس نے لڑکی کو یہ سمجھانا ضروری نہ سمجھا۔ کہ اس میں کیا قباحت ہے۔

تمام شب سوتے جاگتے بابو کا مضحکہ خیز جواب لڑکی کے دماغ میں چکر تا رہا "واہ! کیا انوکھا خیال ہے؟"

صبح جب بابو بیدار ہوا تو اس کے واسطے نہانے کے لئے پانی موجود تھا وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح دریا پر نہانے نہ جاتا تھا۔ بلکہ یہاں بھی حسب دستور کلکتہ گگروں میں پانی لے کر نہاتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ رتن اسکی روانگی کا وقت دریافت نہ کرسکی۔ اس لئے وہ علی الصباح دریا پر جاکر پانی لے آئی۔ تاکہ جسوقت اسے ضرورت پڑے پانی تیار ہو۔ نہانے کے بعد ڈاک بابو نے رتن کو آواز دی۔ وہ چپ چاپ اندر داخل ہوئی اور اپنے آقا کا حکم سننے کے واسطے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ بابو نے کہا۔ رتن! میرے جانے کے بعد تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نئے آدمی سے تمہاری خبر گیری کی تاکید کرتا جاؤں گا"۔ بیشک یہ الفاظ کچھ تسلی بخش تھے۔

لیکن افسوس! عورت کے دلی جذبات کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

ڈاک بابو نے رتن کو کئی بار لعنت ملامت کی تھی۔ لیکن اس کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔ آج یہ محبت آمیز الفاظ اس کی برداشت سے باہر تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میرے متعلق کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہونگی"۔

ڈاک بابو گھبرا کر چپ ہوگیا۔ اس نے کبھی رتن کی یہ حالت نہیں دیکھی تھی۔

نیا بابو وقت پر آموجود ہوا اور ڈاک بابو نے کام اس کے سپرد کرکے رخصت ہونے کی تیاری کی۔ روانگی کے وقت اس نے رتن کو بلایا اور کہا "لو! شاید کچھ دنوں تک تمہارے کام آسکے" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے کچھ رقم نکالی۔ رتن اس کے قدموں پر گر کر رونے لگی۔ اور بولی۔ بھیا! "اللہ مجھے کچھ نہ دیجئے۔ آپ میرے واسطے کسی قسم کی زحمت نہ فرمائیں"۔ یہ کہکر وہاں سے اٹھی اور کہیں چلی گئی۔

ڈاک بابو نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنا بیگ اٹھایا۔ چھتری اپنے شانہ پر رکھی اور ایک قلی کے ساتھ جو اس کا ٹین کا ٹرنک اور بستر صندوق سر پر رکھے تھا کشتی سوار ہونے کے لئے آہستہ آہستہ چل دیا۔

جب وہ سوار ہو چکا اور کشتی چلنے لگی۔ تو چلنے لگی تو برسات کے چڑھے ہوئے دریا کا پانی جو زمین سے کسی غمزدہ کے آنسوؤں کی طرح اُبل رہا تھا۔ کشتی کی پیشانی کے ساتھ ٹکراتا اور آہیں بھرتا نظر آتا۔ اسوقت ڈاک بابو کا دل بھر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دنیا خود گاؤں کی اس غمزدہ لڑکی کے غم میں شریک ہوکر آنسو بہا رہی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اسکے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ واپس جاکر اس بدنصیب لاوارث لڑکی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ لیکن ہوا بادبانوں میں بھر چکی تھی۔ اور تیز رو موجیں کشتی کو کنارے سے بہا کر دریا کے وسط میں پہنچا چکی تھیں۔ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اب صرف مرگھٹ کا بیرونی منظر اس کے سامنے تھا۔

مسافر بنتی ہوئی موجوں کے سینہ پر سوار اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے دنیاوی بے شمار ملاقاتوں اور جدائیوں اور سب سے زیادہ موت پر (جسکے بعد واپسی محال ہے) فلسفیانہ غور و خوض کرتا جارہا تھا۔

لیکن رتن منطق و فلسفہ سے انجان تھی۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ڈاکخانہ کے گرد چکر لگاتی تھی اور سوچتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا "بھیا" پھر واپس آجائے۔ اسی لئے وہ اس جگہ کو نہ چھوڑ سکتی تھی۔

(اظہر فاروقی)

غزل

ابھی خطرہ نہیں کوئی وفورِ دردِ ہجراں سے
ابھی کچھ کچھ تسلی دل کو ہے قاتل کے پیکاں سے

اگر فرصت ہو فکرِ بخیۂ چاکِ گریباں سے
نتائج بھی مرتب ہوں جنونِ فتنہ ساماں سے

خدا جانے گرفتارانِ بندِ غم پہ کیا گزرے
کہ آوازِ سلاسل بھی نہ آئے آج زنداں سے

تماشا دیکھتے جاؤ مرے انجامِ الفت کا
کدھر جاتے ہو منہ پھیرے ہوئے گورِ غریباں سے

محبت کی ہر اک تلخی کو سہ سکتا ہوں میں لیکن
یہی تھا عہد و پیماں ہاں ذرا کہئے تو ایماں سے

مریضِ عشق کی تکلیف کم ہونا تو ناممکن
تجھے اے چارہ گر کیا فائدہ پھر فکرِ درماں سے

نچھاور کر دیا ہے قطرۂ خوں تیرِ مژگاں پر
کہ آخر بیوفائی بھی تو ناممکن تھی مہماں سے

وہ دیوانہ ہوں کچھ احساس رسوائی نہیں مجھکو
جنازہ ہے مرا اٹھے تو اٹھے کوئے جاناں سے

ابھی نامِ خدا کم سن ہو کچھ آتا نہیں تم کو
جلانا عاشقوں کا سیکھ لو شمع شبستاں سے

یہ دل اور مستحق تیرِ مژگاں شکر یہ تیرا
مرا سر اٹھ نہیں سکتا ستمگر بارِ احساں سے

دکھا کر اک جھلک او چھپنے والے کچھ خبر بھی ہے
کہ اب ہر اک منہ تکتا ہوں اپنی چشمِ حیراں سے

پروں کو نوچ لے پرواز کا اندیشہ مٹ جائے
جدا کرتا ہے گر صیاد تو مجھ کو گلستاں سے

اٹھا لے دستِ جنوں خنجر چلا دے میری گردن پر
اشارے ہو رہے ہیں پے بہ پے ابروئے مژگاں سے

مرے دل پر نگاہِ ناز سے اپنے ستم ڈھا کر
تجاہل دیکھئے کیسے بنے بیٹھے ہیں نادان سے

دکھانے ہی کی قدرت ہے نہ کہنے ہی کی طاقت ہے
غلط کیا یاس ہے مجھکو علاجِ دردِ پنہاں سے

لبوں کی مہرِ خاموشی حریفِ مدعا کیوں ہو
مرے اللہ تو تو ہے قریں میری رگِ جاں سے

عزیز اب نشترِ فصاد کی خاطر نہیں ممکن
بہا ہے خونِ دل بن بن کے آنسو چشمِ گریاں سے

(عزیز احمد۔ عزیز رامپوری)

شیکسپیر فہمی

(از جناب سید فضل الرحمن صاحب سابق ایڈیٹر اخوت لکھنؤ)

شیکسپیر کی قدر دانی میں ہر زمانہ میں دقتیں حائل رہی ہیں۔ جس زمانہ میں وہ زندہ تھا اسوقت لوگ اسکی صحیح قدر نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ زندگی میں بہت کم قابل لوگوں کی قدر ہوتی ہے۔ اس کے ہمعصروں نے جو اس کے حالات و مکالات لکھے ہیں۔ اس سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے زمانہ میں اس کے ڈرامے مقبول عوام تھے۔ اور شیکسپیر ایک خوبصورت اور خوب شکل انسان تھا۔ اس کی گفتگو نہایت مزیدار ہوتی تھی۔ اور وہ بڑا زندہ دل و حاضر جواب و حاضر دماغ تھا۔

شخصیت پسند نقاد اس کے زمانہ کے جن کو اس کے ماننے کا موقع ملا۔ اس کے متعلق انھوں نے صرف یہی لکھا کہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب تھا۔ وہ ایکٹر تھا۔ ڈرامہ نویس اور اپنے پیشہ سے کافی آمدنی اس کو حاصل ہوئی تھی۔ اس کا کام تھا کہ وہ تھیٹر جانیوالوں کی دلپسندی اور دلچسپی کا سامان مہیا کرے۔

جس زمانہ میں وہ زندہ تھا اس کی پوجا کسی نے نہیں کی۔ کیونکہ اسوقت لندن کے شرفا ایکٹروں اور ڈراما نویسوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انکی سوسائٹی سے سخت متنفر رہتے تھے۔ اگرچہ شاہی درباروں میں ایکٹروں کی قدر تھی۔ اور قانون کے طلبا اور فوجی نوجوانوں۔ ایکٹروں کے فیشن ایبل وضاع کی نقل کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود بھی اس کی سوسائٹی میں شرفا اور روساء کے کوئی نہیں وہ صرف ناچنے والے اور گانے والے انسان سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ شیکسپیر اپنی زندگی میں صرف ایک ناچنے والا اور گانے والا اور ایکٹ لکھنے والا ڈراما نویس سمجھا جاتا تھا۔ اور شہر کے لوگ ایکٹروں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ انکو حکومت کا دشمن کہا جاتا تھا کیونکہ رسالوں اور دربار شاہی کے لئے گانا گانا اور ناچنا اخلاق کے لئے ویسا ہی تباہی انگیز تھا۔ جیسا کہ کیڑے درختوں اور پودوں کو پھولوں اور پھلوں کو چوس لیتے اور خراب کر دیتے ہیں۔ دربار میں وہ خادم تھے اور اس زمانہ میں خدمتگذاری کوئی عزت کی چیز نہ تھی۔ خواہ بادشاہ کی ہو یا رعایا کی۔

۱۶۲۳ء تک شیکسپیر یا اس کی تحریروں کی کسی نے کوئی پروانہ کی اس سن میں اس کی تصنیفات مولیو اڈیشن کی شکل میں شائع کی گئیں۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ اور شیکسپیر کو شہرت حاصل ہونے لگی اور ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ دنیا اسکی مداح و معترف ہوگئی۔ اسی مولیو اڈیشن کے ساتھ بین جونسن کا شیکسپیر کے متعلق لکھا۔ کہ اسکا کلام روحوں کو تازہ کرنیوالا ہے۔ اور ہر ڈراما پسند انسان اس کے کلام کی تعریف کرتا ہے۔ اس کو پڑھکر خوش ہوتا ہے۔ اور حیران ہو جاتا ہے کہ یہ کیسا انسان ہے جس نے فطرت کے چہرہ سے نقاب کو اُلٹ دیا ہے۔ بن جانسن کی تعریف کے نو برس بعد ملٹن نے شیکسپیر کے متعلق صرف یہی لکھا۔ کہ وہ ایک اعجاز آمیز تصنیف کا مصنف ہے لیکن شیکسپیر کے پڑھنے والے زیادہ تر اس کو ایکٹر ہی سمجھتے رہے۔ جن لوگوں نے شیکسپیر کی تقلید میں ڈرامے لکھے۔ اس میں صرف وہ شاعری کی تقلید کر سکے لیکن کوئی اسکے جیسا ڈرامہ کوئی نہیں لکھ سکا۔ لوگوں نے اس کا خاکہ اتارا لیکن اس کے روح اور معنی آفرینی کو کوئی نہ پہونچ سکا۔

سر جان سکلنگ نے شیکسپیر کی تقلید میں ڈرامے لکھے۔ لیکن وہ شیکسپیر کی کوئی بات اپنی تحریروں میں سوائے شاعری کی نقل کے نہ پیدا کر سکا۔

رسٹوریشن کا جو زمانہ انگلستان پر گذرا اس میں عوام نے اور شیکسپیر کے مداحوں تک نے اس کے ٹریجڈی کی بڑی بُری گت بنائی۔ لیکن نئی نسل نے شیکسپیر کو غور سے پڑھا۔ اور اس کی شہرت جس کا وہ مستحق تھا زندہ رکھا۔

۱۶۲۳ء دو صدیاں ایسی گذریں کہ لوگوں نے شیکسپیر کو خوب پڑھا اس کے متعدد اور بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کی تصنیفات کی بہتیری شرحیں لکھی گئیں۔ اس کی سوانحعمری لکھی گئی۔ اس کی تحریروں کے متعلق بے شمار رسالے لکھے گئے۔ کتابیں لکھی گئیں۔ یہاں تک کہ آج انگریزی زبان بولنے والی قومیں شیکسپیر کو اپنی زبان کا سب سے بڑا شاعر تصور کرتی ہیں اور اس کی پوجا کرتی ہیں۔ اپنے وقت کا ناچنے اور گانے والا درباری ایکٹر آج دنیا تہذیب کا

سب سے بڑا اور مستند شاعر ہے!

اسقدر زمانے کے گذرنے کے بعد لوگوں نے شیکسپیر کی قدر جانی ہے۔ یہی وہ شاعر ہے۔ جس نے انسانیت کے متعلق سب شعراء عالم سے زیادہ لکھا ہے۔ اور ایسے خوبصورت طریقہ سے راز ہائے سربستہ فطرت انسانی کو اس نے دنیا کے سامنے بے نقاب پیش کیا ہے۔ جیسا کسی اور شاعر یا مصنف نے نہیں پیش کیا۔ تین صدی سے دنیا اس کی تصنیفات سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ مذہبی علما اس کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں۔ تو ان کو اسکی تحریروں میں خدا نظر آتا ہے۔ فلاسفر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو فطرت ان کے سامنے بالکل بے نقاب نظر آتی ہے۔ ایک سپاہی پڑھتا ہے تو اس کا شجاعانہ جذبہ جنگ جاگ اٹھتا ہے۔

مدبرین جب اس کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انکا دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ جو شیکسپیر پڑھتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن اصلی قدر شیکسپیر کی یہ نہیں ہے کہ اس کی پوجا آنکھ بند کرکے کی جائے اگرچہ حقیقت یہ ہے۔ کہ آج ہر انگریزی جاننے والا شخص جو شیکسپیر کو پڑھ سکتا ہے وہ اسکی پوجا کرتا ہے۔ بن جانسن نے بھی یہی کہا تھا کہ لوگ اس کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور پھر اسکی پوجا کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ شیکسپیر پرستی بت پرستی سے کم نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ہم شیکسپیر کی تنقید اس زمانے میں کرنے بیٹھیں تو ہم اسکی قدر دانی میں کمی کریں گے بالے پروائی برتیں گے۔ اصل مصیبت شیکسپیر کی اصلی قدر دانی نہیں کر سکی۔ اسکی اندھی پوجا ہے جو انگریزی دنیا اس کی آج کرتی ہے۔ ناقدری سے بڑھ کر یہ کم مصیبت نہیں ہے کہ کسی کی قدر آنکھ بند کرکے کی جائے۔ یہ دانائی نادانی سے کم نہیں ہے۔ شیکسپیر کی زندگی میں لوگوں نے شیکسپیر کی تصنیفات کو نہیں پڑھا۔ یہ ان کی ناقدر دانی اور جہالت کا ثبوت ہے اس زمانہ میں اس کو اسقدر پڑھا۔ کہ بس آنکھ بند کرکے اس کی ہر خرابی کو بھی خوبی سمجھنے لگے۔ ایسے نادان پرستار اصلی خوبیوں کی کیا قدر کریں گے؟

جمہوریت پسند لوگ دنیا میں برابری کی تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن شاعر اور اس کے کلام کے پڑھنے والے میں جیسے جذبات و تعلقات کی مساوات ہوئی ہے۔ ویسی مساوات کہیں نہیں پائی جائی۔ شاعر اپنا ہیرو اور اور پوجاری نہیں ڈھونڈھتا پھرتا۔ اور نہ وہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس کے مرید و مطیع ہو جائیں۔ وہ حیات اور سوسائٹی انسانی کے متعلق اپنے خیالات اور نتائج افکار اور تجارب لکھ جاتا ہے۔ تاکہ اس کا پڑھنے والا اپنے خیالات افکار اور تجارب سے ان کو ملائے۔ جبکہ شاعر اور اس کے پڑھنے والے کے خیالات بالکل مل جاتے ہیں۔ تو دونوں میں خود بخود ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا شاعر کے کلام میں اپنے خیالات کی ہو بہو تصویر دیکھ کر اپنے شاعر کی قدر کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر پڑھنے والے کے خیالات اور افکار شاعر کی نگارشات سے متفق نہیں ہوتے۔ تب بھی اس میں بہت سی چیزیں سوچنے کی ہوتی ہیں۔

شیکسپیر کو سمجھنے اور اس کی قدر دانی کی پہلی شرط یہ نہیں ہے کہ اس کی سوانحعمری سے واقفیت ہو یا اس کی تصنیفات کی تاریخ کو جاننا چاہئے۔ بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ انسان کو انسانی زندگی۔ اور انسانی جذبات کا علم ہو وہ بھی انسانی زندگی اس انسان کی جس کا دماغ ہر واقعہ سے ایک اثر لیتا ہے۔ اور کسی دوسرے کے اثر کا وہ دماغ غلام نہیں ہے۔ اس کی تصنیفات میں آزاد انسان کے جذبات و خیالات جو حیات جذبات انسان کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ موجزن ہیں۔ لہذا اس کے سمجھنے کے لئے ایک ایسا آزاد دماغ ہونا چاہئے۔ جو انسان کے جذبات اور تلاطمات حیات سے واقف ہو۔ نہ تو کسی شاعر نے شیکسپیر کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اور نہ تو بہت لوگوں نے شیکسپیر کو اصلی معنوں میں جس میں اس نے اپنی تحریروں کو لکھا ہے جاننے کی کوشش کی ہے۔ اگر ایک انسان انسان کے جذبات و کیفیات زندگی کو سامنے رکھ کر شیکسپیر کے ڈراموں کو پڑھے تو پھر وہ اصلی معنوں میں شیکسپیر کو سمجھ سکتا ہے۔

(ماخوذ از ریلز شیکسپیر)

(سید فضل الرحمٰن)

پیکرِ تصویر

(کسی کی تصویر دیکھ کر.....)

عیاں لفظوں میں سرِ پیکرِ تصویر کیونکر ہو
صحیفہ حسن کا منت کشِ تفسیر کیونکر ہو
ترے جلووں کے آگے بے نیازوں نے جبیں رکھدی
جہانگیری سے عاری حسن کی تاثیر کیونکر ہو
نہاں تصویر کی ہر جنبشِ پنہاں میں تو خود ہے
بتا دے پھر تیری۔ تری تصویر کیونکر ہو

تجھے ڈھونڈھا جہانِ رنگ و بو کے ہر گزار و میں
تجھے پایا خیالستاں کی دلکش نوبہار و میں

مرے سینے میں آ حسن و الم کی داستاں ہو کر
جلا دے حسنِ کاکل دل کو برقِ جانستاں ہو کر
تجھے معلوم کیا؟ میں کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں اب
چراغِ کشتہ محفل ہوں اٹھتا ہوں دھواں ہو کر
مرا دل بے زباں ہے بے زباں تصویر تو بھی ہے
کریں خاموش باتیں بے زبانوں کی زباں ہو کر

پھر اپنی راز کی باتیں شہیدِ راز ہو جائیں
جلیں سوزِ دروں سے ساز بے آواز ہو جائیں

(خاص) (عزیز احمد) (کلب)

زمزمۂ تغزل

(از جناب اقبال احمد صاحب سہیل)

صحنِ حرم میں کنجِ صنم خانہ چاہئے
اے بیخودی مجھے ترا کاشانہ چاہئے

دو تیلیاں قفس کی ہیں ان کی بساط کیا
مرغِ اسیر ہمتِ مردانہ چاہئے

چلنا سنبھل کے وادیٔ اُلفت میں ہے حرام
یاں ہر قدم پہ لغزشِ مستانہ چاہئے

فیضِ تپش سے خود نکل آتے ہیں بال و پر
ہاں دل میں بے قراریٔ پروانہ چاہئے

ہر گوشہ اس چمن کا درِ مے فروش ہے
ہاں آب و گِل میں شورشِ مستانہ چاہئے

ہر ذرّہ کوئے شوق کا صحرا فروش ہے
اب اور کیا تجھے دلِ دیوانہ چاہئے

ساقی سبو بدوش ہے اے ذوقِ تشنہ کام
دستِ طلب میں جرأتِ رندانہ چاہئے

وہ سامنے ہے منزلِ مقصود اے جنوں
بس چند گام لغزشِ مستانہ چاہئے

آخر کلیم سنّی پڑیں لن ترانیاں
اب بھی کہو گے عجز گدایانہ چاہئے

(سہیل)

غزل

(از شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج پیشاور)

پی کے کہتے ہیں کہ پی اچھی نہیں
بیخودی میں یہ خودی اچھی نہیں

جیتے جی شرمندگی اچھی نہیں
موت بھی مانگی ہوئی اچھی نہیں

آپ کے وعدہ پہ کیوں جیتے رہیں
آسرے کی زندگی اچھی نہیں

ایک صورت پر در و دیوار ہے
اتنی شوریدہ سری اچھی نہیں

اک نہ اک دن منہ کی کھا بیٹھو گے تم
آئینہ سے دل لگی اچھی نہیں

رہنمائی خضر کی معلوم ہے
اجنبی کی دوستی اچھی نہیں

شیخ کو دیجے زکوٰۃ مے کدہ
میرے حصے میں کمی اچھی نہیں

عرش کتنی دور ہے یہ آگیا
نالۂ دل! اب کمی اچھی نہیں

آبِ کوثر کی طلب میں اے تپش
خجلتِ تر دامنی اچھی نہیں

(تپش)

(خاص)

پسِ پردہ

یورپ کی فلم ساز کمپنیوں کا تعصب

(ایڈیٹر کے قلم سے)

امریکہ اور یورپ کی تیار کردہ متحرک تصاویر کی بیشتر کھیپ ہندوستان میں آچکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سفید رنگ اقوام نے جہاں کہیں مشرقی تہذیب و تمدن کو پیش کیا ہے۔ اس کو انتہائی حقارت و نفرت کے جذبات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ مشرقی معاشرت کا مذاق اڑایا اور مشرقی بادشاہوں کو مسخروں، اور بھانڈوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس سے مشرقی بادشاہوں اور مشرقی اقوام کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات مغربی دنیا میں پیدا ہونے لازمی ہیں۔ چنانچہ متحرک تصاویر نے مشرق اور مشرقی اقوام کے متعلق مغرب میں بدترین خیالات کی نشر و اشاعت میں کافی سے زیادہ حصہ لیا ہے۔

اگر آپ کو پراپیگنڈا کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ اور آپ اس کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ اس قسم کی فلموں کو ہندوستان میں داخل ہونے کی اجازت دے کر گویا ہم ان کی خوبیوں اور انکی صحت پر صریح تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ ہندوستانی بورڈ آف سنسر یعنی وہ جماعت جو بمبئی اور کلکتہ میں مغربی ممالک کی ارسال کردہ فلموں پر نظر احتساب رکھتی ہے۔ ہمیشہ اس معاملہ میں رواداری اور وسعت نظری سے کام لیتی رہی ہے۔ اور وہ صرف یہ جانتی ہے کہ مغربی تہذیب کے چند عریاں مناظر کو کاٹ دیا جائے یعنی کوئی عورت ننگی غسل کرتی ہوئی نظر نہ آئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہمارے محتسب کبھی اس عالمگیر پراپیگنڈا کی روک تھام کی طرف توجہ نہیں دیتے جو مغرب مشرق کے خلاف کر رہا ہے۔

جن لوگوں نے ڈرامہ حسن۔ یا الف لیلہ کے قصے یا دیگر ان افسانوں کو پردہ تصویر پر دیکھا ہوگا۔ جس میں مشرقی اقوام کو پیش کیا گیا ہے۔ تو انھوں نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ مشرقی بادشاہوں۔ ان کے آئین و رسوم اُن کے تزک و احتشام ان کے حرم الغرض ہر چیز کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب مغربی اقوام کے قابل ترین سفیر مشرقی درباروں میں دن دن بھر کھڑے رہتے تھے۔ لیکن تنگ کرنے کے پاؤں متورم ہو جاتے اور مارے خوف کے ان کے جسم کی ایک ایک بوٹی کانپتی تھی آج انھیں بادشاہوں کو وہ بھانڈ اور مسخروں کی صورت میں پیش کر کے تاریخ و تمدن کی تضحیک کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ اس قسم کی فلموں سے مشرقیوں کے خلاف عالمگیر جذبات تنفر کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔

بعض لوگ ان فلموں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ شاید ہمارے آباؤ اجداد ایسے ہی تھے۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ مشرقی بادشاہوں کا رعب و جلال اور تزک و احتشام وغیرہ بے مثل ہوتا تھا۔ آپ نے پردہ تصویر پر یہ نہیں دیکھا کہ رچرڈ شیر دل کو کس آن بان سے پیش کیا گیا ہے۔ رچرڈ شیر دل جب اس زمانہ کے مطابق اپنی وحشت و بربریت کا اظہار سر دربار گوشت کھانے اور مرغ کی ٹانگ پر بار بار منہ مارنے سے کرتا ہے۔ تو اس میں بھی ایک شان دکھائی دیتی ہے۔ لیکن مشرقی بادشاہوں کو تو اس ہیئت کذائی سے دکھایا جاتا ہے کہ توہین کے درجے تک پہونچا ہوا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہمارے محتسب اس قسم کی فلموں کو ہندوستان میں داخل ہونے سے روک دیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر۔ ترکی۔ جاپان۔ چین وغیرہ تمام مشرقی ممالک میں ایسی فلموں کو داخل نہ ہونے دیا جائے۔ ممالک کا نام لکھتے وقت چین کا نام آجانے سے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ امریکہ میں جسقدر فلمیں تیار ہوتی ہیں اُن میں بدترین بدمعاش کا پارٹ ہمیشہ چینی کیریکٹر کو دیا جاتا ہے اور ان تصاویر کو دیکھ دیکھ کر ہمارے دماغ میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ چینی بدمعاش لٹیرے۔ ٹھگ۔ چور۔ رہزن اور خدا جانے کیا کیا کچھ ہیں۔ کیا چین کی ۴۰ کروڑ کی آبادی ایسی ہی ہے؟ اگر یہ غلط ہے اور یقیناً غلط ہے تو دیکھنا چاہئے کہ امریکہ کا پراپیگنڈا کیا رنگ لا رہا ہے۔ امریکہ اور جاپان میں چونکہ جذبۂ مخالفت ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس لئے وہ جاپانی تو نہیں اُن سے ملتی جلتی قوم چین کو ہی تختۂ مشق بنائے رکھتے ہیں۔ تاکہ امریکہ کی پبلک اور تمام دنیا میں ان لوگوں کے خلاف جذبات

[illegible] ہے۔ اور جنگ کے وقت پر کسی چیز یا کو بھڑکانے میں آسانی ہو۔

حال ہی میں ایک ڈرامہ۔ فاضل نامی ہندوستان دکھایا گیا ہے۔ ہندوستان کی [illegible] دکھایا جا رہا ہے۔ بہت کم لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ اس ڈرامہ میں مشرقی ذہنیت کی تذلیل کی گئی ہے کوشش کی گئی ہے فاضل نامی ڈرامہ جو ہندوستان میں بھیجا گیا ہے۔ یہ اصل ڈرامہ سے بہت مختلف ہے۔ اصل ڈرامہ کے [illegible] میں لکھا گیا تھا جس میں یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ فاضل [illegible] اس لئے نہیں تھا کہ [illegible] ہندوستان میں بھیجا گیا ہے۔ وہاں یہ دکھایا گیا ہے [illegible] ہیں [illegible] سے حاصل کرنے [illegible] گویا کرنی ہیں۔ اپنی عادات کا کسی اچھے جذبے کا مالک مشرقی نہیں ہو سکتا۔ اسے کو [illegible] مغربی نژاد ہونا لازمی ہے۔ اگر فاضل کو مغربی نژاد نہ دکھایا جاتا تو مغربی [illegible] ڈرامہ کو دیکھنے پر تیار نہ ہوتی۔ یا اگر مغرب میں اس ڈرامہ کی ضرورت نہیں [illegible] تو مشرقی ممالک میں چوکا پھیری گئی ہے۔ اس میں یہ فقرہ بڑھا دیا گیا ہے۔

کہ فاضل دراصل کسی فرنگی کا بیٹا تھا۔ جسے عربوں نے ورثہ کر لیا تھا تاکہ مشرق میں مغرب کی بیٹی نہ ہو۔ اور ایک جنگی ولایتی ایڈی ایک عرب کی محبت میں گرفتار ہو کر مغربی کیریکٹر کو دھبہ نہ لگائے۔ اس کے علاوہ اس ڈرامہ میں فاضل کا ایک نرم یادداشتہ عورتوں کی ایک جماعت دکھائی گئی ہے۔ جو سراسر غلط اور لغو ہے۔ اصل ڈرامہ میں مصنف نے اسکا کہیں ذکر نہیں کیا۔ وہاں صرف اسقدر تذکرہ موجود ہے کہ فاضل ایک نکاح کرتا ہے۔ جسپر یورپین عورت حسد کرتی ہے۔ فاضل اسکی تشریح یوں کرتا ہے۔ کہ یہ شادی ناگزیر ہے۔ کیونکہ چین کے زنانہ سے سکی منگنی ہو چکی تھی۔ اگر وہ انکار کر دے تو جس قبیلہ سے وہ لڑکی تعلق رکھتی ہے وہ اس کا جانی دشمن ہو جائے گا۔ اور دونوں قبیلوں میں دائمی جنگ وخصومت کی بنیاد پڑ جائے گی۔ ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے۔ کہ کسی عرب کی لڑکی کو جو منسوب ہو چکی ہو۔ روکر دینا جنگ مول لینے کے برابر ہے۔ اس چیز کو فاضل ڈرامہ میں درجنوں داشتہ عریاں عورتوں کے حرم کی صورت میں دکھایا گیا ہے جس کا اصل ڈرامہ میں تذکرہ نہیں ہے۔ گو دوسری شادی کا بھی خفیف سا اشارہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انجام دکھانے میں خاص طور پر شرارت کی گئی ہے فاضل نامی ڈرامہ جو ہندوستان میں دکھایا گیا ہے۔ اس میں فاضل بھی مر جاتا ہے حالانکہ اصل افسانہ میں فاضل کی منکوحہ مغربی بیوی فوراً ہی کیپٹن تک پہنچ جاتی ہے۔ اور سمجھوتہ ہے کہ فاضل مر چکا ہے۔ لیکن اس کو بھگا لانے [illegible] والے سامان بھی اسکی دیکھ بھال کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ اور اس یقین کے باوجود کہ فاضل مر چکا ہے۔ وہ عورت ہر وقت اسی کی یاد میں محو رہتی ہے۔ ادھر فاضل کا زخم درست ہو جاتا ہے۔ اور وہ صحت یاب ہو کر جزیرہ غیرت سے بیتاب ہو کر فرانس جاتا ہے۔ اور وہاں جا کر اپنی بیوی کی انگلی میں زہریلے نشتر والی انگوٹھی پہنا کر اس کا خاتمہ کر دیتا ہے اور خود زندہ و سلامت وطن کی طرف واپس لوٹتا ہے۔ فاضل نامی ڈرامہ کا اصل عربی نجیرت کے نام سے نیرنگ خیال کے عید نمبر میں شائع ہو گا۔ جو عربی سے ترجمہ کرایا گیا ہے۔ ناظرین اس اجمالی قصہ کو پڑھ کر بے حد محظوظ ہوں گے اور اندازہ کریں گے۔ کہ کس طرح سے مغربی دنیا مشرقی افسانوں کو تباہ کرنے کی عادی ہے۔

مغربی فلم کمپنیوں کا کہاں تک رونا روئیں۔ ہمیں اپنے گھر کی خبر بھی لینی ہے یہاں بھی [illegible] کام کر رہا ہے۔ مسلمان بادشاہوں، اور مسلمانوں کی روایات کا مسخر اڑایا جاتا ہے۔ بعض فلم کمپنیاں دیدہ دانستہ ایسا رویہ اختیار کر رہی ہیں۔ بعض اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے ان حرکات کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہندوستان کی فلم ساز کمپنیوں میں جاہل اور کندۂ ناتراش کارکنوں کی کثرت ہے۔ خود ہندوستانی اپنی تضحیک کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ اگر انہیں تضحیک ہی کرنی ہے تو مغربی اقوام کی تضحیک کریں۔ جس طرح سے مغربی دنیا کی فلمیں عربوں۔ مسلمانوں۔ چینیوں۔ اور الف لیلہ کے قصوں پر مشتمل ہیں ہم بھی مغرب کی تاریخ و تمدن سے واقعات لے کر پیش کر سکتے ہیں۔ جب مغربی ایکٹر مشرقی لباس پہن کر پارٹ کر سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ مشرقی ایکٹر مغربی لباس پہن کر پارٹ نہ کرے۔ کہا جائے گا کہ ہمیں اپنی تہذیب و تمدن کو پیش کرنا چاہئے۔ یہ خیال تو اچھا ہے۔ لیکن طیکہ ہندوستانی فلمیں ایسا کر سکیں۔ ہندوستانی فلم ساز کمپنیاں تو جو کچھ پیش کر رہی ہیں۔ وہ ہندوستان اور مشرق کی عزت میں بٹہ لگانے والا ہی ہے۔

دنیا میں اسوقت فلم سازی ایک منفعت بخش [illegible] کروڑوں روپے کا [illegible] کاروبار ہے۔ صنعتی نقطۂ نگاہ سے [illegible] اس لحاظ سے بھی کہ اخباروں اور کتابوں سے زیادہ یہ پراپگنڈہ کا ذریعہ فلمیں ہیں۔ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ان پر اس پیرایہ میں نظر و تنقید کی جائے۔ جس سے ہندوستان میں اس صنعت کو فروغ دیا جا سکے۔ اور جو نقائص یہاں ابتدائی میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی اصلاح کی جا سکے۔ اگرچہ ہمیں اپنے وقت عزیز کا ایک معقول حصہ اس کی نظر کرنا پڑے گا۔ لیکن اب اس حماقت سے زیادہ چشم پوشی بھی نہیں کی جا سکتی نیرنگ خیال کو فن ڈرامہ اور تمثیل سے ابتدا ہی سے خاص تعلق رہا ہے۔ اس لئے یہ ذمہ

ہمیں ہی ادا کرنی پڑیگی۔ ہم نیرنگ خیال کے چند صفحے اس ضروری کام کے لئے وقف کر دیں گے۔

اور ان صفحات میں ہندوستان کی صنعت فلم سازی پر بڑی سختی سے تعمیری مقالے لکھے جائیں گے۔ نیرنگ خیال کو ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کم از کم بیس ہزار آدمی پڑھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یقین واثق ہے کہ دو چار سال کے اندر ہی ہم اس سلسلہ میں بہت زیادہ خدمت کر سکیں گے۔

(ایڈیٹر)

لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے نہایت عمدہ انعامی اسکیمیں

جناب عبدالرحیم صاحب ریاض بی اے۔ بی ٹی۔ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نہایت عمدہ تاریخی افسانوں اور دلچسپ سبق آموز کہانیوں کے سٹ لکھے ہیں۔ یہ کتابیں سکولوں کی لائبریریوں کے منظور شدہ ہیں۔ ٹائیٹل خوشنما اور دیدہ زیب ہیں۔ کتابوں کی قیمتیں کم ہیں۔ ہر اسکی لائبریری اور پڑھے لکھے گھروں میں ان کو منگوا کر ان سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

(۱) [illegible] کے کرن پھول۔ قیمت چھ آنہ۔
(۲) [illegible] اخلاق۔ قیمت
(۳) وفا شہزادے۔ قیمت
(۴) غریب سپاہی۔ "
(۵) قسمت والی شہزادی "
(۶) عزیز
(۷) سچ
(۸)

کوئی نسخہ زیادہ ناپایاب نہیں لیکن سفید ضرور ہیں۔ ضخامت ۵۰ صفحات نیرنگ خیال کے حق داروں سے قیمت ایک روپیہ (عہ) نوٹ

حکیم محمد حسن علی ہمایوں مدرسہ تعلیم القرآن لاہور

سے طلب کریں

سٹوڈنٹ انڈی پنڈنٹ

ہمدرد ورڈ بکھنہ

گھر پر ہر قسم کا مال مہیا کر دیں۔ لاہور میں بھی اس قسم کی ایک ایجنسی قائم کی گئی ہے جو آپ کو لاہور سے ہر قسم کا مال خرید کر بھیج دیتی ہے۔ کمپنی ابھی تک برابر دیانت اور محنت سے کام کر رہی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ آپ سے کچھ نہیں لیتی بلکہ دکاندار سے لیتی ہے۔ مثلاً آپ کو ایک ٹوپی کی ضرورت ہے بازار میں چار روپے کی ملتی ہے۔ یہ ایجنسی دیکھ بھال کر آپ کے سائز کے برابر ٹوپی خرید تی ہے۔ اور دکاندار کو بجائے چار روپے کے تین روپے ۱۴ دیتی ہے اور دو آنہ نفع کما لیتی ہے۔ کیونکہ دکاندار تھوک ایجنسی کو مال تاجرانہ نرخ پر مہیا کرتے ہیں۔ پھر یہ آپ کے لئے بوٹ۔ گرگابی یا سلیپر آپ کے بتلائے ہوئے نمبر اور سائز کا خریدتی ہے۔ پھر ازار بند مہیا کرتی ہے۔ پھر کتابیں۔ پھر دیگر اشیاء۔ ان سب کا بنڈل بنا کر اصل قیمت بازاری نرخ کا وی پی کرتی ہے۔ اور آپ کو گھر بیٹھے ہر قسم کا مال ملجاتا ہے۔ ایجنسی بھی ایک آرڈر میں دو آنہ سے لے کر ایک

نہایت مفید اور دلچسپ کتابیں

مذہبی معلومات - خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کہ تمام اہم اور ضروری باتیں جو مذہبی معلومات سے تعلق رکھتی ہیں۔ درج کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد نئی روشنی کے نوجوان صرف ایک دن میں ارکان اسلام سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ زبان نہایت شستہ اور آسان۔ مذہبی معلومات ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں اسلامی معلومات کو نہایت ہی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ ہمیں اسلام کے عقائد۔ توحید باری تعالےٰ پر آسمانی کتابیں۔ خدا کے رسول۔ قیامت۔ مرنے کے بعد زندگی۔ قبر عذاب قبر۔ روزہ نماز۔ حج۔ زکوٰۃ۔ غرضکہ تمام ضروری باتیں درج ہیں + قیمت ایک روپیہ (عہ)

عملیات

زیادہ ایسے مستند اور عملیات جمع
ں کے بعد ہی عامل سے نتیجہ

ہیں: